Courtesy www.pdfbooksfree.pk

GREEN FORCE

1 گرین فورس

PDFBOOKSFREE.PK

ایم اے راحت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرین فورس

(حصہ اوّل)

ایم۔اے راحت

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار لاہور

فون:042-7352332-7232336

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیفٹیننٹ کرنل رحیم احمد شاہ کی پوری زندگی ایسے شان دار کارناموں سے بھری ہوئی تھی جن پر پوری قوم فخر کرتی تھی۔ لاتعداد تمغے سینے پر سجائے جب وہ کسی نئے تمغے کے حصول کی تقریب میں جاتا تو تالیاں بند ہونے کو نہ آتی تھیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اہم شعبے سے متعلق رہا تھا اور شاید ابھی برسوں اس کی فوجی خدمات جاری رہتیں کہ قدرت کی طرف سے اس کی چھٹی کا وقت آ گیا۔ ایک مہم کے دوران اس کی ایک ٹانگ چور چور ہوگئی۔ ہڈیاں کرچی کرچی ہوگئی تھیں۔ کوئی علاج نہیں ہوسکا تھا۔ زندگی بچانے کے لئے ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے بعد ظاہر ہے فوج سے ریٹائر ہوگیا۔

ہنستا بولتا رحیم احمد شاہ بجھ گیا۔

''یہ تو مناسب نہیں ہے شاہ جی۔ آپ اپنا فرض تو اچھی طرح پورا کر چکے ہیں۔ اللہ نے زندگی دی ہے تو اسے خوشی سے گزار دو.....'' ایک دوست نے کہا۔

''یار بس ایک دکھ ہے۔''

''کیا شاہ جی؟''

''ابھی تو دشمن پر بڑی ضربیں لگانی تھیں۔ یہ ساری آرزوئیں دل میں رہ گئیں۔''

''اللہ مالک ہے۔ اب یہ کام دوسروں کو کرنے دو۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' رحیم شاہ بے دلی سے کہتا۔ کافی دن وہ بجھا بجھا رہا۔ لیکن بھرا پرا خاندان تھا۔ بچے بچیاں، محبت کرنے والے رشتے ناتے دار آخر کار بہل گیا۔ لیکن دل کی کسک دور نہیں کر سکا تھا۔ دوسری دلچسپیوں میں وقت گزارنے لگا۔ خاندانی زمین دار تھا۔ حکومت سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ خاندان کے نادار لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور طویل و عریض کوٹھی میں خوب رونق ہوگئی۔

بہت سی دوسری دلچسپیوں کے ساتھ طبیعت میں پرستی بھی تھی۔ ولیوں اور درویشوں سے دلی رغبت رکھتا تھا۔

چنانچہ یہ بھی کچھ مشاغل زندگی میں شامل کر لیے تھے۔ جب فوجی زندگی میں تھا تو ان کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن وقت سے پہلے ریٹائر ہونے کے بعد اس طرف بھی رغبت کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ زمینیں بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ تھیں جو سردار پور کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ آبائی زمینیں تھیں۔ اور تقریباً تین پشتوں سے کرنل رحیم شاہ کے خاندان کی ملکیت تھیں۔ جانے پہنچانے لوگ تھے۔ سردار پور دارالحکومت سے قریب ترین آبادی تھی۔ بلکہ اگر اسے دارالحکومت کا نواحی علاقہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ لیکن دارالحکومت کی نسبت نہایت ہی پر فضا جگہ تھی۔ خاص طور سے اس کے مشرقی علاقے میں پھیلے ہوئے پہاڑی میدان تو ایک طرح سے ایک پکنک پوائنٹ ہی بن گئے تھے۔ وہاں لاتعداد پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے اور ایک جگہ بلندی سے ایک آبشار گرتا تھا۔ جس نے علاقے کی زمین کو اس قدر پرفضا بنا دیا تھا کہ شہری آبادی سے لاتعداد افراد اس طرف آ جاتے تھے۔ اور جنگل میں منگل منا لیا کرتے تھے۔ آبشار کا یہ علاقہ بھی کرنل رحیم شاہ کی ملکیت ہی تھا۔ جب عملی زندگی میں تھے تو کوئی دوسرا مشغلہ نہیں دریافت ہوا تھا۔ لیکن اب سردار پور میں ایک ایسی جدید و قدیم کوٹھی بنوائی گئی تھی جو سردار پور جیسی جگہ کے لیے بڑی نادر و نایاب تھی۔ رحیم شاہ اب اس کوٹھی میں رہتا تھا۔ لیکن شہری آبادی سے چولی دامن کا ساتھ تھا۔ کوٹھی میں رہنے والے شہری اور دیہاتی زندگی کا بھرپور مزہ لیتے تھے۔ سردار پور ہی کے ایک نواحی علاقے میں ایک مزار تھا جسے نامعلوم پیر کے نام کا درجہ دیا جاتا تھا۔ پتا نہیں کب اس مزار کی تکمیل ہوئی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ بڑی نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ بس وہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ جمعرات کی جمعرات مزار پر قوالیاں ہوا کرتی تھیں۔ کافی زائرین آ جایا کرتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد رحیم شاہ کو بھی اس کے بارے میں علم ہوا تو وہ خاص طور سے وہاں جانے لگا۔ اور باقاعدگی سے قوالیوں میں شرکت کرنے لگا۔ یہ بھی ایک اچھا مشغلہ تھا اس کے لیے اس دن بھی وہ مزار پر چھٹن میاں جمن میاں قوال کی قوالی سن رہا تھا۔ یہ بس روایتی قوال تھے اور لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ کرنل رحیم شاہ اپنے حواریوں کے ساتھ قوالیوں کی طرف متوجہ تھا کہ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی والی مثل غالباً اس شخص پر صادق آتی تھی۔ دبلا پتلا پچکا ہوا چہرہ غیر ضروری ہاتھ پاؤں جو بس یوں لگتا تھا جیسے کسی انسان کی تشکیل کرنے کے لیے بدن سے جوڑ دیے گئے ہوں۔ لمڈھینگ کا لفظ بھی اس پر صادق آتا تھا۔ لیکن رحیم شاہ اسے دیکھ کر بری طرح چونک پڑا تھا۔

''ارے صوفی صاحب!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ یہ شخص تو کسی طور بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ اس شخص سے جس قدر متاثر ہوا تھا۔ وہی جانتا تھا۔ ایک بہت ہی اہم سلسلے میں دشمن ملک کے خلاف کام کر رہا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی درپیش ہو گئی تھی کہ فوجی حکام کو محکمہ پولیس سے بھی رجوع کرنا پڑا۔ کرنل رحیم شاہ کا خیال تھا کہ بہت بڑی غلطی کی گئی ہے۔ معاملہ جس پائے کے لوگوں کا تھا وہ پولیس کے بس کی چیز نہیں تھی۔ لیکن پھر صوفی کو اس مشن پر بھیجا گیا اور کرنل رحیم شاہ کو تقریباً ایک ماہ تک صوفی کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا۔ کرنل رحیم شاہ اس سے زیادہ جھلاہٹ کا شکار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس میں رہ کر اس نے جو بیش بہا کارنامے سرانجام دیے تھے۔ انہیں اس کے خیال کے مطابق ملیامیٹ کرنے کے لیے یہ ریگستان کا جانور اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس ریگستان کے جانور نے جب اپنی عقل کے گل کھلائے تو کرنل رحیم شاہ کو اس کے سامنے کان پکڑنا پڑے ہر چیز ہی تو تھی اس کے اندر۔ گیارہ افراد کو تنہا رسیوں سے

باندھ کر لے آنا فلمی کہانی میں تو چل سکتا ہے، عملی طور پر یہ ایک ناممکن کام ہے۔ لیکن صوفی نے ان کی ہڈیاں پسلیاں توڑی تھیں اور پھر وہ جو کچھ بچے تھے۔ انہیں رسیوں میں باندھ کر اس نے کرنل رحیم شاہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ یہ وہ گیارہ افراد تھے جو پڑوسی ملک کی سیکورٹی سروس کی ناک کے بال سمجھے جاتے تھے اور رحیم شاہ کے ملک میں ایک بدترین سازش کر رہے تھے۔ رحیم شاہ شدت حیرت سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ صوفی نے جس طرح ان سب کو اپنے جال میں پھانسا تھا اس کی تفصیل نے رحیم شاہ کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ واقعی اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ رحیم شاہ کا سارا نظریہ ختم ہو گیا تھا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ جو کچھ اس کے دماغ میں نہیں آیا، صوفی نے اس بارے میں کہاں سے سوچ لیا؟ اور یہ صوفی آخر ہے کیا چیز؟ پھر اس کے بعد جب کیس ختم ہو گیا تو رحیم شاہ نے تھوڑا سا وقت نکال کر صوفی کی صحبت میں گزارا اور درحقیقت وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ صوفی بھی کوئی درویش ہی ہے۔ جو اپنی عالمانہ قوتوں سے اس طرح کے کارنامے سرانجام دے لیا کرتا ہے۔ لیکن صوفی نے اسے اپنے مخصوص سادہ انداز میں بتایا تھا۔

''درویش رحم کریں جناب! ولی؟ درویش اور عالم بننا تو دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور انسان ہر طرح کے مشکل کاموں کا بیڑا اٹھا لے لیکن بہتر تو یہ ہے کہ وہ کبھی عالم اور درویش بننے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ گھر کے رہے نا گھاٹ کے، دین بھی گیا دنیا بھی گئی۔ یہ تو بہت بڑا درجہ ہے میں آپ سے اپنے تجربات کا ایک حصہ عرض کروں جناب! انسان کی اپنی ایک پہنچ اور گنجائش ہوتی ہے۔ اگر وہ بہت زیادہ دین دار بننے کی کوشش کرے تو سیدھی سی بات ہے کہ دردیشیت کی منزل میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر وہاں سے امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ امتحان معمولی نہیں تھے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے گا کہ ان امتحانات سے دوچار ہو کر درویشوں کے کرم سے کھاٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔ بات بڑی جان دار تھی۔ کرنل رحیم شاہ خود بھی اس سے متفق تھا۔ چنانچہ خاموش ہو گیا اور واقعی یہ سوچنے لگا کہ بس ایک حد ہی مناسب ہوتی ہے۔ کیونکہ خود بھی اسی زندگی کا عادی تھا اس کے بعد وہ دوسری مصروفیات میں لگ گیا۔ لیکن صوفی کبھی اس کے ذہن سے نہیں نکل سکا تھا۔ بعد میں بہت سے دوسرے معاملات سامنے آ گئے۔ بیمار ہوئے ٹانگ کٹ گئی۔ اور صوفی بھی ذہن سے اوجھل ہو گیا لیکن اس وقت ایک نگاہ دیکھ کر اس نے صوفی کو پہنچا لیا تھا۔ چنانچہ شدت جوش سے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور صوفی کے قریب پہنچ گیا۔

''صوفی صاحب۔''

''حق اللہ۔'' صوفی نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

''ذرا ادھر تو دیکھیے جناب۔''

''سبحان اللہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ..... واہ واہ۔'' صوفی نے بدستور گردن پختے ہوئے کہا۔ بہ مشکل تمام کرنل رحیم شاہ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا وہی مدقوق چہرہ پانوں کی دھڑی ہونٹوں پر جمی ہوئی لیکن اس وقت یہ پان دان خالی تھا۔ ظاہر ہے ورد ہو رہا تھا۔ جو منہ میں پان لے کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میلی کچیلی شیروانی، کھلے پائنچوں کا پاجامہ، وہی انداز مستانہ جو صوفی کی شان تھی۔ بمشکل تمام رحیم شاہ کی طرف دیکھا اور کرنل نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے پہچانے صوفی صاحب۔"

"پہچان لیا درویشوں کے کرم سے۔"

"اتنی جلدی۔"

"حق اللہ..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... اللہ ہو۔" صوفی اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور رحیم شاہ نے سمجھ لیا کہ اس وقت وہ جذب کے عالم میں ہے۔ چنانچہ وہ الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ رات کو تقریباً پونے دو بجے رحیم شاہ کے ساتھیوں نے کہا کہ اب اٹھا جائے بہت وقت ہو گیا ہے ویران فاصلہ طے کر کے کوٹھی میں پہنچنا ہو گا۔

"ممکن نہیں ہے دوستو! تم میں سے جو جانا چاہے چلا جائے۔ میں آجاؤں گا۔ قوالی ختم ہوئی تو صوفی صاحب سے ذرا رابطہ کرنا ہے۔" لیکن شکر تھا کہ دو بجے قوال تھک گئے اور محفل قوالی کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ تب کہیں جا کر صوفی کی حالت بہتر ہو سکی کرنل رحیم شاہ اپنی بیساکھی ٹیکتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"صوفی صاحب۔"

"سلام عرض کرتا ہوں جناب۔ سیلوٹ نہیں مار سکتا۔"

"آپ یہ بتایئے آپ نے مجھے پہچان لیا۔"

"پہلے بھی عرض کیا تھا درویشوں کی دعا سے۔"

"مجھے تعجب ہوا۔ آپ کے حلیے میں تو خیر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھا ہوں۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس کے انداز میں کوئی خاص تپاک نہیں تھا۔ لیکن کرنل رحیم شاہ اس سے بہت متاثر تھا کہنے لگا۔

"صوفی صاحب! کہاں قیام ہے آپ کا۔"

"جناب من! اس سامنے والے درخت کے نیچے۔" صوفی نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بس مزار اقدس پر حاضری دینی تھی۔ قیام بھلا کون سی بڑی چیز ہے۔ سرہانے اینٹ رکھ کر آرام سے سو جاتا ہوں جو نیند آتی ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔"

"ارے واہ! کوئی اور ہے آپ کے ساتھ۔"

"جی ہاں۔"

"کون ہے۔"

"اینٹ۔" صوفی نے جواب دیا۔

"نہیں میرا مطلب ہے اہلیہ وغیرہ۔"

"اس سلسلے میں نااہل ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"واہ۔ اہلیہ کے ساتھ نااہل۔"

"جی ہاں۔ وہ جو عرض کیا ہے نا کہ۔

جو اہل ہوتے ہیں انہیں ملتی ہے اہلیہ
ہر شخص کے نصیب میں منے کی ماں کہاں

کرنل رحیم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر کہا۔

"صوفی صاحب! آپ نے ایک لفظ کہا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ میں وہ لفظ نہیں دہراؤں گا۔ آپ یہ بتایئے کہ آپ مجھے کس طرح پہچانتے ہیں۔"

"آپ کرنل رحیم شاہ صاحب ہیں۔ ملٹری انٹیلی جنس سے آپ کا تعلق رہا ہے۔"

"اوہ۔ واقعی باکمال شخصیت ہے آپ کی صوفی صاحب! آپ نے ایک لفظ اور استعمال کیا کہ میرا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہے نہیں۔"

"معذرت خواہ ہوں کسی پر نکتہ چینی کرنا میرا مزاج نہیں رہا۔ درویشوں کی دعا سے اللہ تعالیٰ آپ سب پر رحم کرے۔ ہم پر بھی۔ ایک ٹانگ ضائع ہونے کے بعد لازمی امر ہے کہ آپ ملٹری میں نہیں رہے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ریٹائر کر دیے گئے ہوں گے۔" صوفی نے کہا۔

"ماشاء اللہ ذہنی رسائی اس قدر بے مثال ہے آپ کی۔ اچھا خیر چھوڑیے ان باتوں کو میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتا ہوں۔ یہیں سردار پور میں میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ آپ سے بہت ہی اہم گفتگو کرنی ہے۔"

"ہم مزار پر آئے ہیں اور بزرگوں کی قربت سے دور نہیں رہنا چاہتے۔ آپ براہ کرم زحمت نہ کریں۔ ہم یہیں بہت خوش ہیں۔"

"مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے صوفی! بے شک آپ کل صبح آجایئے۔ ویسے بھی رات کو اب آپ کو سونا ہی ہے۔ تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔" اس کے بعد صوفی نے ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم۔" اور اس کے بعد کرنل رحیم شاہ اس کو ساتھ لے کر اپنی قیام گاہ پر چل پڑا تھا۔ اہل خاندان سو چکے تھے۔ گھر میں خوب رونق رہا کرتی تھی۔ بہت سے افراد تھے۔ لیکن اس وقت سب سو چکے تھے۔ چنانچہ رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

"صبح ہی صبح مزار کی تقریبات نہیں شروع ہو جاتیں۔ آپ آرام سے رات گزاریں، صبح کو ہمارے ساتھ ناشتا کریں اس کے بعد مشاغل طے کر لیے جائیں گے۔ میں بھی آپ کو بتاؤں کہ مجھے ولیوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت ہے اور میں اکثر مزارات پر جاتا رہتا ہوں۔"

"واہ۔" اچانک ہی صوفی کا چہرہ کھل گیا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر تو ٹھیک ہے۔"

"آیئے میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔" صوفی کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور کرنل رحیم شاہ اس کے بارے میں سوچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کرنل رحیم شاہ نے اپنے اہل خاندان کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک معزز دوست کو لے کر آیا ہے ناشتے پر ان سے تعارف کرائے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو جوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے صوفی ایک نایاب چیز تھا۔ میلا کچیلا لباس جو اس نے چہرہ دھو کر پہن ڈالا تھا۔ غالباً نہایا نہیں تھا۔ چونکہ چہرہ تو بے شک صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن گردن پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ سب نے حیرانی سے کرنل رحیم شاہ کے اس مہمان کو دیکھا۔ کرنل رحیم شاہ بڑی نفیس طبیعت کا انسان تھا۔ اس کے شناساؤں اور دوستوں میں بھی بڑے سلیقے کے لوگ نظر آیا کرتے تھے۔ یہ عجیب و غریب مہمان سب کے لیے باعث دلچسپی تھا بلکہ جب وہ اندر داخل ہوا تو کرنل کے بھتیجے نے پاس بیٹھی ہوئی کزن کے کان میں کہا۔

''اب یہ بھی ہوگا یہاں۔ میرا خیال ہے چچا جان کوئی عجائب گھر بنانا چاہتے ہیں۔'' کزن نے پاؤں دبا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔ کیونکہ کرنل کے کان بہت تیز تھے سرگوشیاں بھی آسانی سے سن لیتا تھا۔ بہر حال صوفی کا سب سے تعارف کرایا گیا۔ باقی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کرنل نے کہا۔

''صوفی صاحب! شاید آپ نے غسل نہیں کیا۔''

''جی۔ صرف منہ دھو لیا تھا۔''

''کیوں غسل کرنے میں کوئی دقت تھی۔''

''جی ہاں۔''

''ارے کیا۔''

'وہ اصل میں سامان کا تھیلا کوئی حضرت چوری کر کے لے گئے۔ پہلے تھیلے ہی کو تکیہ بنایا تھا۔ ایک دن کی تو بچت ہو گئی تھی درویشوں کے کرم سے، اس میں کچھ کپڑے تھے۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ ایک معذرت نامے کے ساتھ تھیلا واپس آ جائے گا چونکہ لباس ہمارا تھا اور ہم لباس صرف اس چیز کو سمجھتے ہیں جو بدن پر پہن لی جائے۔ اب ہمارا یہ لباس اس کے کس کام کا؟ لیکن بد بخت واپس نہیں آیا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے سنایا اور کرنل رحیم شاہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''خیر اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے کپڑے کا بندوبست کر دوں۔''

''نہیں کپڑے ہیں ہمارے پاس بہت سے۔''

''اب یہ بتائیے کہاں تعینات ہے آج کل۔''

''لال پل پر۔ ہر مال دس روپے کا ٹھیلا لگاتے ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیا۔'' کرنل رحیم شاہ نے حیرانی سے صوفی کو دیکھا۔

''جی ہاں۔ بہ فضل تعالیٰ سو ڈیڑھ سو کی روز کی بچت ہو جاتی ہے کچھ ہمارے کام آ جاتے ہیں اور کچھ ان لوگوں کے جو ہم سے کسی نہ کسی شکل میں متعلق ہیں۔ مثلاً بدرو، کہابیہ، کباب بنانا آتے نہیں ہیں بس خواہ مخواہ سیخ پر طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ احمق کہیں کا اور بھی کچھ افراد ہیں۔''

''آپ کی بات میرے بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔'' کیا آپ تھانا لال پور پر ہیں۔''

''جی نہیں۔ تھانوں سے ہمارا تعلق ختم ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس جناب! تغیرات زمانہ تو انسان کی زندگی سے منسلک ہوتے ہی ہیں۔ نئے آئی جی صاحب کے کان بھر دیے گئے کہ ہم محکمے کے قوانین سے بغاوت کرتے ہیں۔ اب دیکھیے نا ذمے داری تو ذمے داری ہوتی ہے۔ لباس اور انسان کی اپنی ضروریات و مشغولیات ذاتی مسئلہ ہوتی ہیں۔ مگر آئی جی صاحب نے دشمنوں کی بات پر یقین کر لیا ہمیں طلب کیا گیا، کہا گیا استعفا لکھیں۔ لکھ دیا۔ دوسرا حکم ملا کہ اس کے بعد پولیس ایریا کی حدود میں نہ آئیں۔ ہم نے سوچا کہ اپنے سے اعلا عہدے داروں سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ اب کسی بھی علاقے کے تھانے سے کوئی سو گز دور سے نکلتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اب ہر مال دس روپے بیچا کرتے ہیں۔'' کرنل رحیم شاہ حیران رہ گیا۔ صوفی جیسی اعلا شخصیت اس قدر ذہین اور قابل انسان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے۔ صوفی کی مرنجان مرنج فطرت سے بھی واقف تھے۔ ظاہر ہے وہ اس طرح کا انسان تھا۔ اس سے جو کچھ کہا گیا اس نے کر ڈالا لیکن کرنل رحیم شاہ کو اس سے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں طویل عرصے سے جو کھچڑی پک رہی تھی۔ صوفی کو دیکھ کر وہ کھچڑی ایک دم تیار ہونے لگی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''قیام آپ کا وہیں دارالحکومت میں ہے۔''

''جی ہاں۔ ایک حلقہ ہے ہمارا۔ بمن خان تندور والے نیاز اللہ بیگ اور دوسرے تمام افراد جو کہتے ہیں نا کہ مردم کے ساتھ وہ ہمارے لیے ایسی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''ہاں آپ روایتی لوگ ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کی دوستی کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ ایک خوش نصیب انسان ہوگا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ اور صوفی جھک جھک کر اسے آداب کرنے لگا۔

''کرم نوازی ہے آپ کی ورنہ ہم کہاں اور آپ کہاں۔'' تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ایک بات بتائیے صوفی صاحب! ظاہر ہے آپ یہاں مزار پر آئے ہیں۔ ابھی تو اس مزار کی تقریبات مزید تین دن چلیں گی کیا تینوں دن یہاں قیام رہے گا آپ کا۔''

''جی پہلے ہمارے ساتھ حکیم سرفراز حسین آنے والے تھے لیکن بعد میں ان کا کچھ ارادہ ملتوی ہو گیا تو ہم تنہا ہی آ گئے۔ عرس کی تمام تقریبات میں شرکت کریں گے۔''

''تو ایک پیشکش اگر آپ میری قبول کر لیں تو آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

''آپ حکم فرمائیے بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''اگر ان دنوں میں آپ میرے ہی ساتھ قیام کریں تو کیا حرج ہے۔ عرس کی تقریبات تو شام کو چھ بجے کے بعد شروع ہوتی ہیں اسی وقت قوالیاں وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ سارا دن آپ وہاں کیا کریں گے۔ گرمی اور دھوپ سے تپیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے حضور من لیکن اس مہذب ماحول میں ہم جیسے بے تکے شخص کی مداخلت کچھ غیر مہذب سی نہیں ہو جائے گی۔''

''بالکل نہیں ہوگی۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں آپ کے پرستاروں میں سے ہوں۔ آپ نے مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہچان لیا ہے۔ تو ماضی کے وہ لمحات بھی آپ کو یقیناً یاد آ گئے ہوں گے جن میں میری اور آپ کی قربت رہی۔ اور آپ نے بے مثال کارنامے سرانجام دے کر مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ صوفی صاحب میں آپ سے اتنی اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ آپ یقین کریں آپ کامل جانا میرے لیے اس قدر دلکش اور دلچسپی کی بات ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ میری ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہیں۔"

"شرمندہ کر رہے ہیں آپ ہمیں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے شرمائے ہوئے انداز میں گردن جھکا کر کہا پھر بولا۔

"اب اگر ایسا ہی ہے اور آپ سچے دل سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو بھلا انکار کی کیا گنجائش ہے ایک ہم ذوق مل جائے تو زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہم آپ سے دست بستہ التجا کرتے ہیں کہ ہماری ایک خواہش پوری کر دیجیے۔"

"ہاں ہاں حکم، حکم، حکم۔"

"وہ دراصل مزار شریف پر تو پان کھانا مزار کی بے حرمتی ہے یہاں کوئی پر ذوق انسان نہیں ملا جو پان کا شوقین ہو ہم ترسے ہوئے ہیں اگر اس کا....."

"ارے آپ فکر ہی نہ کریں میری خالہ جان میرے ساتھ رہتی ہیں اور صوفیہ خالہ کو ہم پان خالہ کہتے ہیں۔ سارے دانت جھڑ چکے ہیں لیکن پان چٹکی میں ڈال کر کچلتی ہیں اور پھر کھاتی ہیں اعلا درجے کا قوام، زبردست تمباکو میں پہلے اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

"اے سبحان اللہ۔ اس کا مطلب ہے کہ ماشاء اللہ باذوق ہیں اور اعلا مزاج رکھتے ہیں حضور کچھ زحمت ہو جائے۔"

"بس ابھی لیجیے۔ کرنل رحیم شاہ خود اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے ملازموں کو مزید ہدایات دینی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد پانوں سے لدے پھندے داخل ہوئے۔ بہت سی کلوریاں بنوائی تھیں۔ چھالی، زادہ قوام غرض ہر چیز وافر مقدار میں۔ صوفی تو جیسے ان پر عاشق ہو گیا تھا۔ بڑی محبت اور خوشی کے ساتھ اس نے دو تین کلوریاں منہ میں رکھیں اور پھر جگالی کرنے لگا۔ بہت دیر تک کرنل رحیم شاہ نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ پر جب کرنل رحیم شاہ نے یہ دیکھا کہ منہ تو اگال دان ہی بنا ہوا ہے تو اس نے خود ہی سلسلہ شروع کیا۔

"قمیص، پائجامہ مہیا کر دیے جائیں گے مگر شیروانی کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔"

"غم غم..... غم غم..... غم غم۔" صوفی نے آخری غم غم چھت کی طرف ہاتھ کر کے کہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ شکریہ ادا کر رہا ہے۔ بہر حال کرنل رحیم شاہ نے خود خاطر مدارات کی تھی صوفی کی اور صوفی نہال ہو گیا تھا۔ شام کو چھ بجے کرنل رحیم شاہ صوفی کو ساتھ لے کر اپنی جیپ میں بیٹھ کر مزار چل پڑا اور پھر تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک قوالیوں کی محفل میں ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ رحیم شاہ نے صوفی کے ہاتھوں قوالوں کو نوٹ دلوائے تھے اور یہ بھی ایک دلچسپ طریقہ کار ہوتا ہے۔ ایک کے ہاتھ میں نوٹ رکھے جاتے ہیں اور نوٹ رکھنے والا اس کے ساتھ چھدکتا ہوا قوالوں تک پہنچتا ہے۔ اور قوالوں کو یہ نوٹ پیش کیا جاتا ہے۔ قوال اپنی جگہ سے اٹھ کر خود بھی پھدک پھدک کر یہ نوٹ قبول کرتا ہے۔ اور نوٹ پیش کرنے والے واپس آ

جاتے ہیں لیکن بعض اوقات قرب و جوار کے حضرات کو بھی شرارت سوجھتی ہے تو وہ کسی ایک شخص کو نارگٹ بنا لیتے ہیں۔ اور وہ بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ دوسرا کوئی شخص نوٹ لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اس کے ہاتھوں پر رکھ کر اسے پھر اسی طرح پھدکاتا ہوا قوالوں کی طرف لے جاتا ہے۔ صوفی کی شخصیت ایسی لمڈھینک تھی کہ لوگوں نے اسے تاڑ لیا اور ساڑھے بارہ بجے تک صوفی کو تھکا تھکا کر رکھ دیا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کے بعد قوالی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور عرس کی محفل آج ذرا جلدی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ صوفی کو نجات ملی۔ کرنل رحیم شاہ اس کو اپنے ساتھ لے کر چل پڑا تھا۔

"آپ تھک گئے ہوں گے صوفی صاحب۔"

"نہیں نہیں۔ بھلا ایسی کیا بات ہے یہ تو محفل ادب ہوتی ہے۔ اور ادب کی ان محفلوں میں تھکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"آپ باکمال ہیں کل ہماری اور آپ کی نشست ہو گی۔" پھر دوسرے دن ناشتے کے بعد کرنل رحیم شاہ صوفی کو لے کر اپنے کمرے میں گھس گیا تھا جب کہ اس کے اہل خاندان ناشتے کی میز سے اٹھ کر قہقہے لگاتے ہوئے صوفی پر تبصرہ آرائیاں کر رہے تھے۔ نوجوان لڑکوں کا خیال تھا کہ صوفی کوئی خلائی مخلوق ہے۔ جو کرنل رحیم شاہ کو مل گئی ہے۔ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ لیکن کرنل رحیم شاہ صوفی سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتا تھا۔ تنہا کمرے میں اس نے صوفی کو بلایا اور کہا۔

"صوفی صاحب! جس مہم میں میرا اور آپ کا ساتھ ہوا تھا وہ ملک کی بہتری کے سلسلے میں ایک ایسی خطرناک مہم تھی کہ اگر آپ بڑی زبردست ذہانت کے ساتھ ان دشمنوں کی کاوشوں کو ناکام نہ بناتے تو بے شمار انسانی زندگیاں تو ضائع ہوتیں ہی لیکن ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اس بڑی مہم میں آپ نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا میں اسے مرتے وقت تک نہیں بھول سکوں گا۔"

"دعائیں ہیں بس درویشوں کی جناب! بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں یہ پیروں، فقیروں اور درویشوں ہی کی دین ہے کہ عقل بروقت کام کر جاتی ہے۔ حق اللہ..... حق اللہ۔"

"بے شک صوفی صاحب! اس سلسلے میں میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اچھا مجھے ایک بات بتائیے۔ طویل عرصہ آپ نے محکمہ پولیس اور محکمہ سراغ رسانی میں کام کیا ہے اور بیش بہا کارنامے سرانجام دیے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مجھے ملی تھی جب آپ کو اس مہم میں شامل کیا جا رہا تھا۔ صوفی صاحب وطن کی محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔"

"حضور من! جس طرح انسان کو ماں کے سائے سے پیار ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ماں کی چھاتی سے چمٹ کر زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور ماں کا وہ سینہ اور دوپٹے کا پلو جو اس کے وجود پر ڈھکا ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے نہ ہو تو تیز دھوپ گرد و غبار زندگی کو داغ دار کر دے۔ وطن بھی ہماری ماں ہے اس کا آنچل ہماری ماں کے دوپٹے کا پلو ہے۔ میں اپنے وطن عزیز کو ماں کی طرح ہی پیار کرتا ہوں۔"

"سبحان اللہ صوفی صاحب! کیا عظیم بات کہی ہے آپ نے۔ آئی جی صاحب نے آپ سے استعفا لے لیا۔ اس کے بعد آپ کے دل میں یہ خیال نہیں ابھرا کہ آپ کچھ کریں میرا مطلب ہے کہ وطن کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے وطن کے معاملات سے پیچھے نہ ہٹیں۔"

"بات اصل میں یہ ہے جناب کہ تکنیکی طور پر تو مجھے کتنی ہی بار سرزنش کی گئی ہے معطل کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ برخاست تک کر دیا گیا ہے۔ پھر بلا لیا گیا ہے یہ نوکری تو آنی جانی چیز ہے۔ اس کے بعد میں نے چند افراد کے ساتھ مل کر ڈی ڈی ٹی لمیٹڈ کی بنیاد رکھی تھی۔ وہاں سے بھی یاران طریقت مجھے اٹھا لے گئے۔ اور پھر پولیس میں گھسیٹ لیا گیا۔ محکمہ سراغ رسانی کے کچھ اعلا افسران بھی مجھ سے پرخاش رکھتے ہیں۔ بس یہ ہے ساری صورت حال کیا عرض کر سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد آپ نے وطن دشمنوں کو معاف کر دیا۔"

"نہیں کوئی وطن دشمن میرے سامنے ہی نہیں آیا۔"

"صوفی صاحب! ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمارا ملک جس طرح بڑی طاقتوں کا آلہ کار بن گیا ہے اور ان کے بوجھ تلے دب گیا ہے اور جس طرح وہ بڑی طاقتیں ہمارے دشمنوں کی پذیرائیاں کر رہی ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان بدترین حالات میں میری یا آپ کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔"

"ہرگز نہیں جناب! لیکن ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے کہ ہم اپنے طور پر کیا کر سکتے ہیں اگر ذاتی طور پر کاوش کریں تو غدار وطن کہلا دیے جائیں گے۔ ملکوں کے قوانین ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ بتایئے ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں صوفی صاحب! اصل بات یہی ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کا ایک حل سوچا ہے کہ اگر مجھے اس جسمانی نقص کا شکار نہ ہونا پڑتا تو آپ یقین کریں کہ میں اپنی زندگی کے حالات آپ کو بتاؤں میں نے اپنے اعلا حکام کے حکم پر بہت کچھ تو کیا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی میں ہر اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنواتا تھا۔ جو وطن دشمن افراد کی سرکوبی کے لیے ہوتا تھا۔ دیکھیے..... وطن دشمن صرف سرحد پار کے لوگ ہی نہیں ہیں۔ یا وہ نہیں ہیں جنہوں نے ہماری حقیقت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ وطن دشمن ہر وہ شخص ہے جو وطن میں رہنے والے کسی بھی اہل وطن کو کوئی ذہنی مالی یا جسمانی نقصان پہنچائے۔ منشیات فروش یا قومی راز بیچنے والے ہر اسمگلر، چور، یا ڈاکو ان میں سے ہر شخص وطن دشمن ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہر شخص وطن کا مقروض ہے اور وہ ایسے وطن دشمنوں کو جو کسی بھی ایک فرد کے لیے نقصان کا باعث بنے گرفتار کرائے تو گویا اپنا فرض پورا کرتا ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے درویشوں کے کرم سے۔"

"صوفی صاحب! وقت نے مجھے میرے منصب سے ہٹا دیا مگر میرا دل ہر وقت اس احساس سے تڑپتا رہتا ہے کہ کاش! میں وطن کی خدمت کر سکتا۔ صوفی صاحب! تھوڑا سا معذور ہو گیا ہوں تنہا ذہن سب کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو حوصلہ بڑھ گیا۔ میں کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد..... ارشاد....." صوفی نے دلچسپی سے کہا اور پان کی ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھ لی۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن بنانا چاہتا ہوں جو خفیہ طور پر وطن دشمنوں کے خلاف کام کرے۔ وزارت داخلہ کے فرسٹ سیکرٹری سر سلطان میرے گہرے دوست ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے بہترین

وسائل ہیں۔ میں ان سے کام لے سکتا ہوں بشرطے کہ ہمارے پاس کچھ ٹھوس بنیاد ہو۔ آپ میرا مطلب یوں سمجھیں کہ فرض کیجیے ہم کچھ ایسے اشخاص کے خلاف کام شروع کرتے ہیں جو کسی بھی طرح وطن دشمنی پر آمادہ ہیں۔ تو آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی گرفتاری اور ان پر مقدمہ چلانے یا سازش کرنے کے الزام میں انہیں سزا دلوانے میں ذمے دار حکام ہمارے ساتھ ہو سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہو گی کہ ہم انہیں ٹھوس ثبوت پیش کر سکیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم منظر عام پر یہ کام کریں گے ہم اپنے آپ کو پوشیدہ بھی رکھ سکتے ہیں اور اس سلسلے میں ہم اپنی اس آرگنائزیشن کو کوئی نام بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ وہی پیدا ہوتا ہے کہ میرے ساتھ اب تو کھل کر یہ بات کہوں گا کہ آپ شریک ہو جائیں۔ صوفی صاحب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زمینوں ہی کی آمدنی اتنی آ جاتی ہے کہ اگر ہمیں لاکھوں روپے ماہوار بھی اس کام پر خرچ کرنا پڑیں تو ذرا بھی دقت نہیں ہو گی اس کے علاوہ میرے پاس اور بھی بہت سا سرمایہ محفوظ ہے۔ جسے میں اپنے وطن کے لیے خرچ کر سکتا ہوں۔ اس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہو گی۔" صوفی سوچ میں ڈوب گیا۔ اگال دان لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ چنانچہ گہرے رنگ کا ملغوبہ اس میں منتقل ہوتا رہا اور پھر صوفی نے آنکھیں بند کر کے نعرہ لگایا۔

"حق اللہ..... حق اللہ۔"

"کیا آپ نے کوئی فیصلہ کر لیا۔"

"جی میں حاضر ہوں۔ میں تیار ہوں۔" کرنل رحیم شاہ اتنا خوش ہوا کہ بے اختیار اس نے بغیر بے ساکھی کے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر صوفی کو گلے لگا لیا۔

"بہ خدا زندگی دوڑا دی آپ نے میرے اس مردہ وجود میں۔ صوفی صاحب بے حد شکریہ میری اس تجویز کو قبول کرنے کا۔ اب آیئے ہم مزید خیالی بات چیت کرتے ہیں اور اس کے بعد اس بات چیت کو کاغذ پر منتقل کر دیا جائے گا۔"

"جی۔"

"صوفی صاحب! ہمیں اس سلسلے میں ایک آرگنائزیشن بنانا پڑے گی۔ زیادہ نہیں بس کچھ افراد پر مشتمل ایک باقاعدہ آرگنائزیشن اور یہ افراد بھی ہم زندگی کے عام شعبوں سے لیں گے ہم انہیں خود تربیت دیں گے اور تربیت دے کر انہیں اپنے قابل بنائیں گے۔ بہت زیادہ اعلا پیمانے کے لوگ ذہنی طور پر زیادہ ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہمیں عام افراد میں سے اپنی ٹیم منتخب کرنا ہو گی۔"

"بجا ارشاد فرمایا آپ نے اصل میں تھوڑی سی نچلی سطح کے طبقے کو کسی بڑے کام کے لیے بالکل ناکارہ قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ درویشوں کی دعاؤں سے وہ بھی صاحب عقل ہوتے ہیں۔"

"بالکل میرا بھی یہی نظریہ ہے بلکہ میرے کچھ تجربات بھی ہیں اس سلسلے میں۔"

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے درویشوں کی دعا سے۔"

"صوفی صاحب! اب آپ طویل عرصے تک گھر نہیں جا سکیں گے۔ میرے ساتھ ہی رہیں گے ویسے بھی دارالحکومت چند کلو میٹر کے فاصلے پر ہے آپ اگر مناسب سمجھیں تو وہ جگہ چھوڑ دیں۔ جہاں آپ کا قیام ہے میں آپ کے لیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایک منٹ، ایک منٹ جناب! درویشوں کی دعاؤں سے بات اصل میں یہ ہے کہ جن لوگوں کے درمیان ہم رہ رہے ہیں۔ وہی بات وہاں آ جاتی ہے کہ ان سے زیادہ قابل اعتماد ہمارے لیے اور کوئی نہیں ہیں۔ وہ بس آپ یوں سمجھ لیجیے گا کہ ہمارے سب سے قریبی عزیز، سب سے قریبی دوست، ہمارے محسن، ہمارے ساتھی۔ زندگی موت کے ساتھی ہیں ہمارے لیے۔ رہنا تو ہم انہی کے درمیان پسند کریں گے لیکن جو فرائض ہمارے سپرد کیے جائیں گے آپ یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی انجام دہی کے لیے آپ ہمیں کبھی خود سے دور نہیں پائیں گے۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے صوفی صاحب! لیکن کچھ دن تو آپ ہمیں دیجیے گا نا۔"

"میں آپ سے عرض کر چکا ہوں۔ ملازمت تو نہیں کر رہا کوئی۔ بس ہر مال دس روپے بیچ رہا ہوں۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ رزق تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوتا ہے۔ جہاں سے بھی مل جائے۔"

"میں آپ سے عرض کر چکا ہوں نا کہ لاکھوں روپیہ میرے پاس بے کار پڑا ہوا ہے۔ صوفی صاحب وہ ہمارے کسی نہ کسی کام تو آئے گا ہی۔"

"جی۔" صوفی نے جواب دیا۔ اور اس کے بعد بقیہ معاملات طے ہو گئے۔ عرس تو تین دن کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ لیکن صوفی کرنل رحیم کے ساتھ ہی رہ پڑا تھا۔ دونوں کے درمیان خفیہ میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اس میں منصوبے بنائے جاتے تھے۔ طے کیا جا رہا تھا کہ ٹیم کس طرح سے منتخب کی جائے۔ ہیڈ کوارٹر کہاں بنایا جائے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"دارالحکومت میں ہم کوئی عمارت خرید لیتے ہیں جسے اپنی خفیہ میٹنگوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ یہ سارے کام میرے ہیں میں کرلوں گا۔ آپ اپنے طور پر ایسے لوگوں کا انتخاب کر لیجیے جو ہماری اس فورس میں شامل ہو سکیں۔ اور اس فورس کا نام کیا رکھا جائے۔"

"گرین فورس۔" صوفی نے جواب دیا اور کرنل رحیم شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"منظور۔ اس کا مقصد ہے کہ اب ہمیں گرین فورس کی فارمیشن کرنا ہو گی۔"

"انشاء اللہ۔ انشاء اللہ۔" کوئی پانچویں دن کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"آج ستائیس تاریخ ہے نا صوفی صاحب۔"

"درویشوں کے کرم سے۔"

"چلنا ہے ذرا ستائیس تاریخ کو۔" تقریباً ساڑھے پانچ بجے کرنل رحیم شاہ سنٹرل جیل کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ پانچ بج کر پینتیس منٹ پر دروازے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ گٹھے ہوئے بدن اور دراز قامت کا آدمی تھا۔ گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں گھنی ڈاڑھی کے ساتھ جو اس کے چہرے کو اور خوفناک بنائے ہوئے تھیں۔ بال ہانڈی کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ لباس بوسیدہ تھا۔ لیکن چال میں ایک وقار اور متانت تھی۔ جیل کے پھاٹک سے باہر نکل کر وہ ایک طرف چلا تو کرنل رحیم شاہ بیساکھی ٹیکتا ہوا اس کی جانب چل پڑا۔ صوفی کو اس نے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ جیل سے رہا ہونے والا اسی طرف آ رہا تھا۔ کرنل رحیم بیساکھی ٹیکتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اور جس انداز میں کھڑا ہوا اس پر جیل کے پھاٹک سے نکل کر آنے

والا چونک کر کرنل رحیم کو دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون کی سرخی لہرا رہی تھی۔ پھر اس کی انتہائی گونج دار آواز ابھری۔

"کیا بات ہے کون ہو تم۔"

"میں رحیم شاہ ہوں دلاور خان کرنل رحیم شاہ۔" رحیم شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا۔" جیل کی کوٹھری سے نکل کر آنے والا دو قدم پیچھے ہٹ گیا اس نے غور سے کرنل کو دیکھا اور پھر اچانک ہی اس کے چہرے کی ساری سختی دور ہو گئی۔

"سر! آپ۔ سر! یہ کیا ہوا؟" اس نے افسردگی سے کہا۔

"دلاور خان! میں نے اپنی یہ ٹانگ اپنے وطن کی نذر کر دی۔" دلاور خان کچھ لمحے خاموشی سے کرنل کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیا فائدہ سر کیا فائدہ۔"

"سزا ختم ہو گئی تمہاری۔"

"پتا نہیں سر! کتنے دن کے لیے یہ سزا ختم ہوئی ہے۔ کیا ہوا ہے کچھ نہیں معلوم سر! لیکن سر آپ، آپ یہاں کیا کر رہے تھے۔"

"دلاور خان! میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ستائیس تاریخ کو ساڑھے پانچ بجے تمہیں جیل سے رہا کر دیا جائے گا بہرحال آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں سر! اور کیا کیا کریں گے آپ میرے لیے سر۔ میری یہ زندگی آپ ہی کی بچائی ہوئی ہے۔ ورنہ اب تک میری ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہوتیں۔ پتا نہیں سر! یہ لوگ مجھے قبر میں بھی دفن کرتے یا پھر کہیں کسی گندے نالے میں پھینک دیتے۔ آپ نے میری سزائے موت کو قید میں بدلوایا سر! یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ یقین کریں سر! میرا بیان آج بھی وہی ہے جو میں نے عدالت میں دیا تھا۔"

"کرسی عدالت میں بیٹھے ہوئے جج نے گواہوں اور ثبوتوں کی بنیاد پر تمہارے لیے سزا کا اعلان کیا تھا۔ لیکن میں تمہارے بیان کو سچ سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے پہلے اپنے طور پر سخت مدافعت کی اور جب اپنی ان کاوشوں میں ناکام ہو گیا تو پھر فوجی پیمانے پر اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے میں نے تمہاری اس سزائے موت کو سزائے قید میں تبدیل کرایا۔"

"مگر آپ مجھ سے نہیں ملے سر! مجھے تو یہ تمام تفصیلات معلوم ہو گئی تھیں۔ لیکن جیل کے حکام میرے لیے سزائے موت ہی چاہتے تھے اور میرے وہ دشمن بھی جنہوں نے مجھے اس جال میں پھنسایا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی۔ کس کس کی خوشامد نہیں کی ایک بار مجھے اس نیک فرشتے سے ملوا دو۔ جس کا نام کرنل رحیم شاہ ہے۔ میں اس سے دل کی کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کرنل صاحب! نہیں ہو سکا۔"

"تمہارے وہ دشمن ملکی نہیں غیر ملکی لوگ تھے۔ ان کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا اور جب میں نے ان پر کمند ڈالی تو وہ کم بخت فرار ہو گئے۔ میں انہیں نہیں پکڑ سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں کرنل صاحب! جنہوں نے نہ جانے کس لالچ میں میرے خلاف گواہی دی تھی۔ خیر! میرے سامنے ابھی بھی دنیا پڑی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کرنل صاحب! جس دن میں گرفتار ہوا اس دن میں نے کسی کے سامنے ایک قسم کھائی تھی۔''

''نہیں دلاور خان مجھے معلوم ہے۔ تم نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ قدرت نے تمہیں بیٹی کا باپ بنا دیا ہے۔ اور جب قدرت کسی کو بیٹی دیتی ہے تو گویا وہ اس پر مہربان ہوتی ہے۔ وہ اسے برائیوں کے راستے سے ہٹانا چاہتی ہے اور باور کراتی ہے کہ وہ معاشرے کا ایک ذمے دار شخص ہے۔ ایک بیٹی کا باپ ہے۔ اسے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا اور تم نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ آج کے بعد تم برائیوں کے راستے چھوڑ دو گے۔ یہی بات کہنا چاہتے ہو نا تم.....'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور دلاور خان کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کا سیلاب بہ نکلا۔

''کیسے معلوم ہوئی آپ کو یہ بات۔ کیسے معلوم ہوئی مجھے بتایئے۔۔''

''آؤ میرے ساتھ آؤ۔ آؤ میرے ساتھ تم نے پہلے بھی ایک بار مجھ پر اعتماد کیا تھا دلاور خان! آؤ آج بھی ایک بار مجھ پر اعتماد کرو۔ آجاؤ۔'' دلاور خان روتا ہوا کرنل کی جیپ تک پہنچا تھا اور اس کے بعد کرنل نے صوفی کو ایک پتا بتایا تھا اور صوفی اس پتے پر چل پڑا تھا۔ دلاور خان بدستور رو رہا تھا۔ روتے روتے اس نے کہا۔

''بڑے شریف گھرانے سے صاحب جی تعلق تھا اس کا۔ بڑے شریف گھرانے سے تعلق تھا۔ بہت غریب تھے وہ لوگ بس ایک بار اس کے غیرت مند باپ نے ہمیں گالی دے دی۔ ہم سے کہا کہ حرامی کے پلے دوبارہ اگر تو نے میری بیٹی کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو تیری ساری بدمعاشی خاک میں ملا دوں گا۔ صاحب جی! کبھی نہیں سنی تھی ہم نے اتنی بڑی گالی جو ہماری ماں تک پہنچ جائے۔ ماں باپ تو بچپن ہی میں مر چکے تھے ہمارے بس صاحب جی کھوپڑی گھوم گئی۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے جمیلہ کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اچھی لگی تھی ہمیں بس وہ اور ہم ہمدردی سے اس سے بات چیت کر لیتے تھے۔ پر بابا جی بالکل غلط سمجھے۔ گالی دے ڈالی ہمیں بس اٹھا لائے ہم جمیلہ کو۔ ڈال دیا اپنی ایک کچھار میں۔ بابا جی سر پٹخ کر مر گئے پولیس تھانہ سب کچھ کیا انہوں نے پھر بدنامی کے ڈر سے دونوں میاں بیوی نے زہر کھا لیا بڑا دکھ ہوا تھا جی ہمیں ان کی موت سے جمیلہ کو ہم نے نہیں بتایا۔ بس پھر ہم نے اس سے نکاح کر لیا۔ کبھی اس نے ہماری طرف محبت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد ہم سے اور نفرت کرنے لگی۔ پھر تقدیر نے ہمیں بیٹی دی تھی۔ اور اس کے بعد جمیلہ نے ہم سے سمجھوتہ کر لیا۔ کہنے لگی دلاور! بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔ خدا کے غضب سے ڈر اور صاحب جی بس اس دن ڈر گئے۔ اور جو ڈر گیا سو مر گیا۔ ہم بھی مر گئے صاحب جی! قسم کھائی تھی اس کے سامنے کہ ٹھیک ہے جمیلہ اب غلط کام نہیں کریں گے بس صاحب جی! غلط کام نہ کرنے پر پکڑے گئے۔ قتل کا الزام لگا۔ جو جھگڑا ہوا تھا آپ کے علم میں ہے۔ وطن دشمن قرار دے دیے گئے۔ صاحب جی قدرت نے آپ سے ملایا۔ معاملہ آپ سے متعلق تھا اور اللہ نے آپ کو نیک دل دیا تھا۔ ورنہ کون کسی کی آگ میں جلتا ہے پر ان لوگوں نے بڑا برا سلوک کیا ہمارے ساتھ۔ ہزاروں بار ہم نے جعفر سے کہا کہ بھائی! ہماری بیوی کو ہم سے ملا دو کوئی بھی نہیں ہے ہمارے سوا اس کا دنیا میں۔ میری بچی کی شکل مجھے دکھا دو لیکن سات

سال ہو گئے صاحب جی! انہوں نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آپ خود سوچو جی! جسے اپنی بیوی اور بچی کا کچھ پتا نہ ہو۔ جس نے شرافت کے راستوں کی جانب قدم اٹھایا ہو اور اسے موت کی سزا ملی ہو۔ پھر تقدیر نے اسے زندگی دے دی ہو۔ پھر تقدیر نے اسے زندگی دے دی ہو۔ اور اس کے بعد رہائی بھی مل گئی ہو۔ تو صاحب جی اس کا اندر اس سے کیا کہے گا۔ آپ خود میرے کو بتا دو۔ آپ خود میرے کو بتا دو۔''

''بس صوفی صاحب وہ بائیں ہاتھ لے کر سامنے والی عمارت کے سامنے روک دیجیے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے کسی کانسٹریکشن کمپنی نے یہ گھر بنائے تھے۔ دو کمروں پر مشتمل یہ سستے گھر اوسط درجے کی آمدنی والے لوگوں کے لیے تھے۔ گھر نمبر چھبیس کے سامنے کرنل رحیم شاہ نے جیپ رکوائی اور بولے۔

''آؤ دلاور۔''

''صاحب جی۔''

''آجاؤ یار۔ آؤ۔'' کرنل نے بیساکھی ٹکا کر نیچے اترتے ہوئے کہا اور دلاور نے انہیں سہارا دیا۔ صوفی خاموشی سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ دلاور خان کرنل رحیم شاہ کو سہارا دے کر گھر کے دروازے تک پہنچا۔ کرنل نے گھنٹی بجائی تو صوفی نے ایک عورت کی جھلک دیکھی اور اس کے بعد دلاور خان گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اور کرنل واپس پلٹ کر جیپ میں آ بیٹھا۔

''تھوڑی دیر انتظار کریں گے صوفی صاحب! یہ واپس آئے گا۔''

''کہانی تو ہم نے سن لی تھی درویشوں کے کرم سے پھر اندر کون تھا۔''

''اس کی بیوی اور بچی یار! وہ بے گناہ تھا جس الزام میں اسے پھنسایا گیا تھا۔ اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا۔ اتفاق کی بات یہ کہ معاملہ فوجی عدالت میں آ گیا تھا۔ میرے علم میں آیا تو میں نے ذرا سی چھان بین کر ڈالی اور میں نے اسے سزائے موت سے بچا لیا جرم تو اس نے بہر حال کیا تھا تھوڑا بہت۔ لیکن جو الزام اس کی موت کا باعث بن رہا تھا وہ اس پر ثابت نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ کہہ کر میں نے اسے کلیئر کر دیا تھا۔ چنانچہ اسے صرف سزا بھگتنی پڑی اور اس دوران میں اس کی بیوی اور بچی کو لے آیا چونکہ مجھے پوری تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ یہاں رہتی ہے۔ ابھی وہ تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔ میرا شکریہ ادا کرے گا۔ بس اس کے بعد چلیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ کوئی بیس منٹ کے بعد دلاور باہر واپس آیا اور روتا ہوا کرنل کے اکلوتے پیر سے لپٹ گیا۔

''کیا کروں جی۔ کیا کروں۔ مجھے بتاؤ کیا کروں آپ کے لیے کیسے آپ کے احسان کا صلہ دوں۔''

''دیکھو دلاور! دنیا کا کوئی بھی کام بے مقصد اور بے لوث نہیں ہوتا۔ میں تم سے کھل کر ایک بات کہوں میں نے یہ سب کچھ جو کیا ہے۔ اپنی ایک غرض سے کیا ہے۔ میرا تم سے ایک کام ہے۔ دس دن کا ٹائم دیتا ہوں تمہیں دس دن کے بعد یہیں آ کر تم سے ملوں گا اور تمہیں اپنا کام بتا دوں گا۔ جمیلہ کے پاس رقم ہے۔ میں اسے دے چکا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ عملی فون نمبر رکھ لو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت پیش آئے یا تمہیں کوئی الجھن پیش آئے تو مجھے فون کر کے بتا دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہاں سے جانا نہیں کہیں تم میرے مقروض ہو اور مجھے تم سے اپنا قرض وصول کرنا ہے۔"

"قبرستان بھی نہیں جائیں گے صاحب! آپ کی اجازت کے بغیر۔ ہم برے لوگوں میں ایک ہی بات اچھی ہوتی ہے۔ پیار کرتے ہیں کسی سے تو بس جان سے زیادہ کرتے ہیں۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ صاحب آپ کے حکم کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔"

"چلیے صوفی صاحب۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور صوفی نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کرنل مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہماری گرین فورس کا پہلا ممبر۔"

♥ ..... ♥ ..... ♥

لڑکے اور لڑکیوں کا پورا غول تھا۔ کچھ ملازم اور وہ درمیانی سی عمر کی عورت غالباً ملازمہ تھی۔ بہت عمدہ اور بڑی کوسٹر میں وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ پیچھے ایک مرسڈیز لگی ہوئی تھی۔ اور پھر فوراً ہی کام شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھے خاصے علاقے میں رنگین آنچل اور رنگین لباس پھیل گئے ایک بڑی سی خیمہ گاہ بنائی گئی تھی۔ سارے کے سارے اس کام میں مصروف تھے۔ ملازموں کا ہاتھ لڑکے اور لڑکیاں بھی بٹا رہے تھے۔ پھر ایک لڑکے نے کہا۔

"چلیے بھئی رمضان خان صاحب! یہ کام تو ہو گیا باقی کام ہم کر لیتے ہیں آپ جلدی سے چائے کا انتظام کریں۔" ملازم نے گردن خم کر کے کہا۔

"ابھی لیجیے چھوٹے سرکار! چلو بھئی چلو تم دوسرے کام دیکھو میں چائے بنا لیتا ہوں۔ رمضان خان نے دوسرے ملازموں سے کہا۔ اور پھر عورت کی طرف رخ کر کے بولے۔

"شیرہ جلدی سے چائے کے برتن نکالو۔" جس عورت کو شیرہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے بری سی نگاہیں رمضان پر ڈالیں۔ لیکن رمضان کان دبا کر نکل گیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں مسکرانے لگے۔

"کون سا شیرہ جلیبی کا شیرہ یا گلاب جامن کا شیرہ۔" ایک لڑکے نے فقرہ کسا۔

"میرا خیال ہے ہم شیرہ گلاب جامن کا شیرہ نہیں ہیں بلکہ جلیبی کا شیرہ ہیں اور جلیبی بڑی ٹیڑھی چیز ہوتی ہے۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔ ملازمہ سامان میں چائے کے برتن تلاش کرنے لگی۔ ادھر رمضان گیس سلنڈر جلانے لگا تھا۔ پھر اس نے چائے کے لیے ایک بڑے سے دیگچے میں پانی رکھ دیا۔ دوسرے ملازم دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اور بھاگ بھاگ کر ایک عارضی کچن تیار کر رہے تھے۔ تمام سامان موجود تھا۔ پانی کے برتن، مرغیوں کے چھابے، مسالے کے ڈبے، لیکن اچانک ہی ملازمہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رمضان کے پاس پہنچ گئی۔

"رمضان۔" وہ بولی۔

"میری عید۔" رمضان چچا نے عاشقانہ لہجے میں کہا۔

"محرم ہو گئے سمجھے۔ ہوشیار ہو جاؤ محرم ہو گئے۔"

"وہ تو بقر عید کے بعد آتے ہیں۔ ابھی تو بکرے کٹیں گے اس کے بعد محرم کی بات کرو۔"

"رمضان جی! محرم آ گئے ہیں کہہ رہی ہوں آپ سے۔"

"کیا بات کر رہی ہو؟"

"ایسی ہی ایک بات کہنے والی ہوں میں آپ سے کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"ارے واہ۔ کیا نکاح کر رہی ہو مجھ سے۔" رمضان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "نکاح تو ابھی یہ سب مل کر پڑھائیں گے ہمارا۔" شیرہ جسے کہا گیا تھا اس نے کہا۔

"شیرہ! یہ تو باراتی ہیں سارے باراتی مل کر تھوڑی نکاح پڑھاتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک سے بات کر لیتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں۔ غوری صاحب کی خوشامد کرتے ہیں نیک اور دین دار آدمی ہیں۔"

"میں نے کہا نا چپک لو اچھی طرح جو کچھ میں بتانے والی ہوں سنو گے تو دم ہی نکل جائے گا۔"

"ارے تو کیا پہلے سے شادی شدہ ہے۔" رمضان نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"چائے کی پتی کے ڈبے وہیں رہ گئے ہیں کافی کے ڈبے بھی اسی ٹوکری میں تھے سمجھے۔" ملازمہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ اور رمضان کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔

"کک..... کیا..... بک..... بک رہی ہے ایسا کیسے ہو گیا۔"

"بس جب تقدیر خراب ہوتی ہے تو ایسا ہی کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ بڑی محبت کرتے ہو نا مجھ سے بولو کرتے ہو۔"

"وہ تو کرتا ہوں مگر....."

"اب سنبھالو، سوچو کیا ہو گا۔"

"سہرے کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائیں گے اور کیا ہو گا۔ مروا دیا تو نے بے نکاحی۔" رمضان خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"بس اتنی ہی محبت جتائی ہے ہمیشہ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی رمضان! کاہے کو مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔"

"ارے وہ سب بعد کی باتیں ہیں شیرہ! عدنان میاں چائے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کافی ہی آ جاتی تو بات بن جاتی۔ ہائے ساری خوشیاں ہی مٹی میں مل گئیں اور اب یہ کھولتا ہوا پانی ہمیں اپنے منہ پر ڈالنا پڑے گا۔"

"اب بتاؤ میں کیا کروں۔ میں تو بڑی ڈر رہی ہوں۔" ملازمہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا پریشانی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ رمضان نے اسے دیکھا اور پھر سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"پوری دنیا کی تاریخ میں عورت نے مرد کو ہمیشہ گدھا بنائے رکھا ہے۔ شیرہ! بھلا ہم آپ کے لیے گدھے کیوں نہیں بنیں گے۔ آپ پر کوئی آنچ آئی تو ہماری اس زندگی کا کیا فائدہ۔"

"خدا کے لیے رمضان اس وقت بچا لو کسی طرح ورنہ صاعقہ بی بی تو مجھے کچا چبا ڈالیں گے۔"

"دانت توڑ دیں گے ایسا کرنے والے کے۔ سمجھی کیا ہوا اپنے رمضان کو۔" رمضان نے اکڑ کر کہا ملازمہ کا نام عجیب و غریب تھا یا پھر اس نے کسی خاص وجہ سے اپنا یہ نام رکھا تھا۔ سارے لوگ اسے ہم شیرہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہتے تھے۔ سوائے رمضان کے۔ رمضان اسے جب بھی مخاطب کرتا تھا شیرہ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ چنانچہ یہ سب کی ہم شیرہ رمضان کی شیرہ تھی۔ بہر حال اچانک ہی رمضان کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اور اس نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ ''ابے او..... ہے ہے..... ابے او.....'' رمضان خان کا غل غپاڑہ سب کو ان کی جانب متوجہ کرنے کا باعث بن گیا تھا اور رمضان ایک طرف دوڑ گیا۔ وہ زمین سے پتھر اٹھا اٹھا کر فضا میں اچھال رہا تھا۔ اور ہم شیرہ حیران پریشان سی کھڑی اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ رمضان خان کا غل غپاڑہ سب نے سن لیا۔ وہ تیزی سے ایک جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک بارو وہ نیچے گرے اٹھے اور پھر ایک پتھر اٹھا کر فضا میں اچھال دیا اور اس کے بعد دور تک دوڑے چلے گئے۔ سارے لوگ بھاگ کر ادھر آ گئے تھے۔

''کیا ہوا ہم شیرہ..... کیا ہوا۔'' لڑکے لڑکیاں سوال کرنے لگے اور ہم شیرہ کو گھیرے میں لے کر کھڑے ہو گئے۔

''پپ..... پتا نہیں۔ اچانک ہی پاگل ہو گیا بے چارہ۔'' ہم شیرہ نے عجیب و غریب لہجے میں کہا۔

کچھ لڑکے رمضان خان کو پکڑنے دوڑ پڑے تھے اور پھر وہ جب رمضان خان کے پاس پہنچے تو رمضان خان غصے سے کانپ رہا تھا۔

''نکل گیا سالا، نکل گیا۔ وہ بندر تھا۔ میں کہتا ہوں ضرور کسی کا تربیت یافتہ تھا چور ڈاکو کی اولاد۔''

''کیا ہوا رمضان خان آپ کو۔ خیریت تو ہے۔''

''میاں! کیا بتائیں چائے کے بنڈل لے گیا۔ کافی کے بنڈل بھی اسی شاپر میں تھے پتا نہیں بندر کہاں سے آ گیا تھا۔ میاں مصیبت آ گئی۔ پتا نہیں کون تھا کم بخت!'' رمضان خان نے بری طرح ہانپتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں کیا بک رہے ہو یار! کیا ہوا ذرا اپنے حواس درست کر کے بتاؤ۔'' عدنان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''چائے بنا رہا تھا میاں! پتا نہیں کہاں سے نکل آیا کم بخت کالے رنگ کا تھا اور چھوٹے قد کا تھیلی پر جھپٹا مارا اور ایسا ہوا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہٹ..... تیری..... ابے کہاں چھپ گیا۔''

''کک..... کیا بکواس کر رہا ہے یہ۔'' صاعقہ نے کچھ نہ سمجھ کر غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بی بی ہماری ہی نسل کا تھا، ہماری قدیم نسل کا ہم تو ہیں ہی چور کی اولاد، ساری زندگی چوری چکاری کر کے گزاری ہے۔''

''میرے بھائی آخر کون تھا۔ کچھ نام تو بتاؤ۔'' فیصل نے عاجز آ کر کہا۔

''کمال ہے میاں! کمال ہے اتنی سی بات نہیں سمجھ رہے۔ بندر تھا ایک کالے رنگ کا چائے بنا رہے تھے ہم۔ تھیلا نکال کر رکھا چائے اور کافی کا۔ پیکٹوں کی تھیلی اٹھا کر بھاگ گیا۔ ہائے افسوس نہ چائے رہی نہ کافی۔'' رمضان نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''بندر تھا۔'' صفیہ بولی۔

''بی بی! میرا خیال ہے کتنی بار نام لے چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ بندر دنیا کے کسی بھی خطے میں

ہو بندر ہی کہلاتا ہے۔''

''ہم نے تو نہیں دیکھا، نظر بھی نہیں آیا بس آپ ہی دوڑتے ہوئے نظر آئے۔''

''تو پھر کیا کریں ہمارے برے اعمال ہوں گے۔ اب یہ بتایئے کہ چائے کا پانی کھول گیا ہے اس میں کیا ڈالوں۔'' رمضان نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

''چائے کے سارے بنڈل گئے۔'' شاہد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''کافی کے پیکٹ بھی اسی میں تھے میاں جی! پلاسٹک کا شاپر تھا نکال کر رکھی کم بخت چھپنا مار کر لے اڑا۔ خدا غارت کرے ویسے بھی میاں بہت برا زمانہ آ گیا ہے۔ بندروں کو بیئر پیتے دیکھا ہے۔ شراب پیتے دیکھا ہے۔ ہر طرح کی عیاشیاں کرتے دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ فلموں میں تو بندر گاڑی بھی چلایا کرتے ہیں۔ حالانکہ بس بے وقوف بنانے والی بات ہے ان کے پیر نیچے کیسے پہنچتے ہوں گے۔ چلو وہ تو فلم والوں کی بے وقوفی ہے۔ مگر یہ بندر..... ہائے بندر..... ارے بندر۔''

''اس وقت تو تم بندروں جیسی حرکتیں کر رہے ہو یہ بتاؤ اب ہم کیا پئیں گے۔ چائے یا کافی کے بغیر تو یہ سمجھ لو کہ ساری پکنک بھنڈ ہو جائے گی۔''

''آپ ہمارا خون پی لیجیے سرکار! اب کیا کریں بتایئے تھیلی نکال کر رکھی تھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ..... توبہ توبہ آپ کے سامنے گالیاں بکنے کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایسی ایسی گالیاں ایجاد کریں کہ ادب کی تاریخ ہی بدل جائے پانی تیار ہے کھول رہا ہے۔ دودھ شکر وغیرہ سب موجود ہے۔ اب بتایئے پانی میں کیا ڈالوں۔''

''ہائے افسوس یہ تو بڑا برا ہوا۔ اس وقت تو چائے پینے کو سخت دل چاہ رہا ہے۔'' ایک اور لڑکی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''میں کہتی ہوں رمضان! تم نے اتنی بے پروائی سے کیوں کام لیا۔'' صاعقہ جھلا کر بولی۔

''جی بے پروائی سے کام لیا۔ بی بی جی سامان رکھا ہوا ہے سارا سامان رکھا ہوا ہے بتایئے اس سلسلے میں کہاں سے بے پروائی برتی گئی۔ اب اچانک کوئی افتاد پڑ جائے تو ہم کیا کریں۔'' رمضان نے کہا۔

''مر گئے یار! یہ تو بہت برا ہوا۔ ارے باقی چیزوں کی بھی حفاظت کرو کہیں اور بندر نہ حملہ آور ہو جائیں۔'' ایک اور لڑکے نے کہا اور پھر وہ بولا۔

''مگر یہ کم بخت گیا کہاں تک ہو گا۔ آؤ یار تلاش کریں ظاہر ہے کافی اور چائے لے کر غائب تو نہیں ہو جائے گا۔ کہیں نہ کہیں تھیلا پھینک دے گا۔''

''بالکل ٹھیک سوچا آپ نے جواد میاں! چلیے دیکھیں تلاش کریں۔''

''یہاں بھی رک جائیں چند افراد، اگر یہاں حملہ کر دیا اس نے اور کسی کو اٹھا کر ہی لے گیا تو بھلا ہم بے چارے کیا کریں گے۔'' ایک اور لڑکی بولی۔ بہر حال اس کے بعد لڑکے چاروں طرف پھیل گئے۔ رمضان خود بھی بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور ہم شیرہ ایک طرف کھڑی محبت بھری نگاہوں سے رمضان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"رمضان تو تو واقعی بڑے کام کا بندہ ہے۔ تجھ سے زیادہ عقل مند تو یہ لوگ بھی نہیں۔ پتلون قمیض پہنتا تو سچ مچ ان سب سے اچھا لگتا۔ تیرے قربان جاؤں اس وقت جس طرح تو نے مجھے بچایا ہے۔ میں تیرا احسان نہیں بھولوں گی۔ بہرحال بندر کی تلاش میں دور دور تک کے علاقے کو چھان مارا گیا۔ لیکن بندر ہوتا تو ملتا۔ کہانی بھی ایسی گھڑی گئی تھی کہ اس پر شک کرنا بے کار ہی تھا۔ لڑکے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ عدنان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یار! چائے کے بغیر تو ساری پکنک کا مزہ ہی خراب ہو جائے گا۔"

"صبر کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے آؤ بیٹھیں۔ تھوڑی دیر تک اور تعزیتی اجلاس ہو جائے۔ چائے کی موت پر۔"

"یہ پانی اتار دوں سرکار۔" رمضان نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اتار کر اسے اپنے سر پر ڈال لیجیے۔" صاعقہ ناک چڑھا کر بولی۔

"ناگہانی حادثہ تھا بی بی! کیسے ٹالا جا سکتا تھا۔"

"بکواس کم کرو۔ بہت زیادہ منطقی بننے کی کوشش مت کیا کرو۔ اس قابل ہو کہ گولی مار دی جائے۔" بہرحال لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ تو ہم شیرہ رمضان کے قریب پہنچ گئی۔

"اور کوئی خدمت شیرہ! آپ نے دیکھ لیا کہ ہم سے زیادہ وفادار ساتھی آپ کو زندگی بھر نہیں ملے گا۔"

"واقعی تم نے کمال کیا ہے رمضان! اس عمر میں تمہاری یہ حرکتیں ہیں تو جوانی میں تو آفت ڈھائی ہو گی۔" ہم شیرہ نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیے شیرہ خاتون! کیوں قیامت یاد دلاتی ہیں۔ اگر جوانی میں ایک آدھ بھی آفت ڈھا لیتے تو آج پتا نہیں کتنے بچوں کے باپ ہوتے۔ خیر اب بھی کون سا وقت گزرا ہے۔ اب آپ سے لوگائے بیٹھے ہیں۔ دیکھیں آپ ہمارے لیے کیا فیصلہ کرتی ہیں۔"

"توبہ توبہ بس یہی برائی ہوتی ہے آپ مردوں میں ایک ذرا سا احسان کیا کر دیا کہ فوراً ہی صلہ مانگنے بیٹھ گئے۔ چلیں پانی دیگچہ نیچے اتاریں۔"

"ہاں۔ اس وقت تو صورت حال واقعی سنگین ہے۔ لیکن خیال رکھیے گا جو لہجہ آپ نے اختیار کر لیا ہے۔ وہ قائم رہنا چاہیے۔" ہم شیرہ کہتے ہوئے ایک طرف چلی گئی تھی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس گروپ کی ساری پکنک خراب ہو گئی تھی۔ اچھے خاصے گھروں کے بچے تھے اور ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ویسے جس طبقے سے ان کا تعلق تھا۔ وہ عام طبقہ نہیں ہوتا ان کے درمیان سب سے گہرا رشتہ دولت کا ہی ہوتا ہے اور اس طرح کے لوگوں کو اپنی سطح کے لوگوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مشترکہ طریقے سے یہ تفریح منائی جا رہی تھی اور یہ طے کیا گیا تھا کہ کسی بھی جگہ کو اپنی مرکز نگاہ بنائیں گے۔ پھر انہی میں سے ایک نے اس علاقے کی تجویز پیش کر دی تھی اور وہ یہاں پہنچ گئے تھے یہ جگہ سب کو پسند آئی تھی۔ سرسبز و شاداب قدرتی حسن سے بھرپور چنانچہ وہ اس طرف آ نکلے تھے۔ اس طرح کی پکنک وغیرہ میں تفریحات ہلے گلے کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہ تفریحات جاری ہو گئیں۔ چائے کا تو مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ چنانچہ ملازم کھانا وغیرہ تیار

کرنے لگے اور پھر یہ طے کیا گیا کہ باقاعدہ دسترخوان نہیں لگایا جائے گا ہر شخص اپنے اپنے طور پر کھانے پینے میں مصروف ہو گا۔ چنانچہ یہ بے ترتیبی بھی سبھی کو پسند آئی۔ لیکن ابھی وہ کھانے سے فراغت حاصل کر ہی چکے تھے کہ انہوں نے دور سے ایک انتہائی قیمتی لینڈ کروزر کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ گاڑیوں کے بارے میں بھلا ان سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔ یہ شاندار لینڈ کروزر تقریباً چالیس پینتالیس لاکھ کی مالیت کی تھی اور اس قیمتی لینڈ کروزر میں آنے والے بھی یقیناً معمولی لوگ نہیں ہوں گے۔ لینڈ کروزر کا رخ انہی کی جانب تھا اور یہاں ان ناہموار سطح پر اتنی قیمتی گاڑی کو اتنی بے دردی سے چلانے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہو گا۔ تھوڑی دیر کے بعد لینڈ کروزر ان کے قریب پہنچ کر رک گئی اور اس کے بعد اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے جو کوئی بھی اترا اسے دیکھ کر وہ لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کوئی چوپایا سیدھا کھڑا ہو گیا ہو۔ اس کے جسم پر ڈارک گرین کلر کا سوٹ تھا۔ ٹانگیں پتلی پتلی، پیٹ آگے کو نکلا ہوا اور ہاتھ ٹخنوں سے تھوڑے ہی سے اونچے تھے۔ پیشانی آگے کو ابھری ہوئی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے اندر اندر وہ کسی بڑی نسل کا بندر معلوم ہوتا تھا اور بالکل اسی کے سے انداز میں اس کی چال بھی تھی۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھا تو لڑکے اور لڑکیاں بے اختیار آگے بڑھے اور ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔

"یار! کمال ہے یہ تو بڑی زبردست شخصیت ہے۔"

"گاڑی دیکھ رہے ہو اس کی۔"

"چھوڑو ابھی اس پر کوئی تبصرہ نہ کرو قریب آ چکا ہے وہ۔"

سب اسے دیکھتے رہے بدشکل آدمی ان کے قریب پہنچ گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم لوگ مجھ پر کیا کیا تبصرے کر رہے ہو۔ ایک ایک لفظ مجھ سے پوچھ سکتے ہو چونکہ بدقسمتی سے میری قوت سماعت بہت زیادہ تیز ہے اور میں ہلکی سی سرگوشی بھی سن لیتا ہوں۔ دیکھو کیسی عجیب بات ہے قدرت کچھ لوگوں کو کچھ چیزوں سے نہیں نوازتی اور کچھ کو ضرورت سے زیادہ دیتی ہے۔ وہ لوگ جو کسی کی باتیں نہیں سنتے کس قدر فائدہ میں رہتے ہیں کسی کے توہین آمیز الفاظ بھی انہیں پتا نہیں چلتے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی ہے خیر! مسکرا تو میں بھی رہا ہوں چونکہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں ہوں۔ وہی میرے بارے میں کہا جا رہا ہو گا۔"

"لیکن سر! معافی چاہتے ہیں ہم۔ آپ کون ہیں۔" وہ لوگ کچھ خجل سے ہو گئے تھے۔

"ہاں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر شخص اپنی ملاقات میں پہلی بار کرتا ہے اور اس سوال کا جواب دینے والے عموماً یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ذات کا کوئی ایسا معیار قائم کریں جو دوسروں کو مرعوب کر دے۔ میں کچھ بھی ہوں، صفر ہوں صفر، زیرو مکمل طور پر زیرو اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے زیرو کہہ سکتے ہو۔ عزت دینا چاہتے ہو تو انکل زیرو کہہ سکتے ہو۔"

"اتنا بے تکا زیرو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" پیچھے سے کسی لڑکے نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے احساس ہے۔ واقعی تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بدصورت ہوں۔ بدہیئت ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن کیا کیا جائے فلسفہ زندگی عجیب ہے۔ بلکہ انسانی فلسفہ عجیب ہے۔ شکل و صورت کا تعین انسان کی نگاہ کرتی ہے۔ ہم نے چیزوں کی بدنمائی اور خوب صورتی کو اپنی سمجھ کے مطابق نام دیے ہیں۔ درجے دیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے تم خوش شکلوں کے درمیان میں ایک بدشکل آدمی ہوں اور واقعی اس قابل نہیں ہوں کہ زیرو تک کہا سکوں۔ بہرحال میں تم میں سے کسی کی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ میری ذات اگر تمہیں مسکرانے کا موقع دے رہی ہے تو میں خوش ہوں اور میری دعا ہے کہ تم ہنستے رہو۔" وہ سب ایک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔ بے ڈھنگے شخص نے پھر کہا۔

"میں نے یہاں سے تھوڑے فاصلے پر اپنے لیے ایک قیام گاہ بنائی ہے۔ تنہائی کی یہ زندگی مجھے بے حد پسند ہے لیکن کبھی کبھی مجھے انسانوں کی طلب بھی محسوس ہوتی ہے۔ دور سے تم لوگوں کو ہنستے بولتے دیکھا تو سوچا تم سے تھوڑا سا ذہنی سکون حاصل کروں۔ تمہیں کچھ دعائیں دوں اور میری دعائیں ہیں کہ خداوند عالم تمہاری زندگیوں میں اتنی ہی خوشیاں دے کہ تم ہمیشہ یونہی مسکراتے رہو۔" اس کا لہجہ اتنا نرم اتنا شفیق تھا کہ وہ لوگ واقعی کٹ کر رہ گئے۔ شاہد نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سوری انکل! واقعی غلطی ہوگئی ہم نے واقعی آپ سے بدتمیزی کی ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو تم لوگوں کو دیکھ کر بے پناہ خوش ہوں۔ جوانی بہت حسین ہوتی ہے۔ بس ملنے چلا آیا تم سے۔ تمہیں دیکھا دل کو خوشی ہوئی۔ جیتے رہو اور اجازت دو۔" وہ واپسی کے لیے مڑا۔ لیکن وہ لوگ جلدی سے آگے بڑھے۔ عدنان نے کہا۔

"سنیے انکل! تھوڑی دیر ہمارے ساتھ گزاریے ہمیں خوشی ہوگی۔"

"کیا واقعی۔" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں واقعی! ہم نے آپ کے ساتھ جو بدتمیزی کی ہے۔ ہم اس کے لیے شرمندہ ہیں آپ جتنے اچھے بزرگ ہیں۔ ہمیں معاف کر دیجیے گا۔"

"واہ۔ پہلی بات تو یہ کہ تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی کسی کو دیکھ کر دماغ میں جو تاثر ابھرتا ہے انسان اس کے بارے میں وہی کہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تم یہ محسوس کرتے ہو تو چلو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اب ایسا کرو میں تمہیں چائے پلاتا ہوں آ جاؤ۔" چائے کا نام سن کر سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔

"چائے...... چائے۔" ان کے منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکلیں۔ پھر عدنان نے کہا۔

"انکل آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"نہیں ہوگی تم لوگ میری چائے کی دعوت قبول کر لو گے تو مجھے بے پناہ مسرت ہوگی۔"

"انکل! آپ یہاں اس ویرانے میں رہتے ہیں۔"

"ہاں۔ میرے جیسے بدشکل انسانوں کو دنیا کی آغوش میں کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے ان کے ہر وقت کے مذاق سے بچنے کے لیے یہ ویرانیاں اپنالی ہیں آ جاؤ میرے بچو! آ جاؤ۔ آؤ۔" اور پھر وہ سب اس شخص کی رہنمائی میں چل پڑے۔ عدنان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یارو! مجھے ایک بات بتاؤ۔ کہیں یہ بندروں کا ٹریز تو نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہماری چائے ہمیں ہی پلا رہا ہو۔"

"یار! کیوں گدھا پن کر رہے ہو۔ کیسا نفیس انسان ہے اور اس نے کہا ہے کہ وہ ہلکی سی سرگوشی بھی سن لیا کرتا ہے لیکن اس وقت وہ شاید ان کی طرف متوجہ نہیں تھا یا پھر اپنا مہمان بنانے کے بعد اس نے اخلاقیات برتنا شروع کر دی تھیں۔ بہرحال وہ اس کے ساتھ چلتے رہے اور پھر ایک بڑے ٹیلے کے عقب میں پہنچے تو انہوں نے واقعی ایک عجیب و غریب گھر دیکھا۔ یہ گھر اس ٹیلے کو کھود کر بنایا گیا تھا اور اس کے بعد اس مکان کی زیادہ تر تعمیر اس ٹیلے کے اندر ہی تھی۔ کچھ حصہ بیرونی طور پر نظر آ رہا تھا اور وہ سب اس انوکھی جگہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"انکل! کیا آپ یہیں ویرانے میں زندگی گزارتے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے آپ کی ضروریات زندگی یہاں پوری ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں ہو جاتی ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے بیٹے! انسان اپنی زندگی کو جو شکل چاہے دے سکتا ہے۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ زمانہ قدیم کا انسان جنگلوں، درختوں، پتھروں، پہاڑوں میں رہتا تھا۔ زندہ تو تھا نا وہ بھی اس وقت اسے اپنی ضروریات سے واقفیت نہیں تھی۔ اب بے شک وہ اپنی ضروریات سے واقف ہو گیا ہے۔ لیکن زندگی وہی کی وہی ہے۔ اگر وہ چاہے تو کہیں بھی کسی بھی طرح اپنے آپ کو سنبھال سکتا ہے۔"

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں میرا مطلب ہے کیا مشغلہ ہے آپ کا۔" سفیر نے پوچھا۔

"مشغلے ترک کر کے ہی تو یہاں آباد ہوں بیٹے! ورنہ اگر کوئی مشغلہ اپناتا تو اپنی آبادیوں میں رہنا پڑتا۔"

"واقعی آپ تو بہت عجیب انسان ہیں۔" پھر انہوں نے اس مکان کو دیکھا اور سب کے سب ششدر رہ گئے۔ پہاڑ کے اس ٹیلے کو اندر سے نہ جانے کس طرح کھوکھلا کیا گیا ہوگا۔ بظاہر تو یہ ہاتھوں کا ہی کارنامہ لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس شخص نے اپنی پسند کی یہ جگہ منتخب کر کے اسے بہت سے لوگوں سے اس شکل میں تعمیر کروایا ہو۔ لیکن کمال کی جگہ تھی۔ ایک بہت ہی خوب صورت ہال میں انہیں بیٹھنے کے لیے کہا گیا اور پھر زیرو نے کہا۔

"میں تمہارے لیے چائے تیار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا۔ سفیان کہنے لگا۔

"یار! مجھے تو یہ کوئی جیتا جاگتا انسان معلوم نہیں ہوتا۔"

"کیوں ڈرا رہے ہو۔ سفیان! تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ تمہیں پتا ہے ہمارے ساتھ لڑکیاں بھی ہیں۔" عدنان نے کہا۔

"لڑکے لڑکیوں کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"اس کی باتیں سنی تم نے۔ بہت زیادہ قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے بھی کچھ خدشہ ہی محسوس ہو رہا ہے۔" ایک لڑکی بولی۔

"واقعی کہیں کوئی بدروح کا چکر نہ ہو ایسے ویرانے میں بدروحوں کے علاوہ اور کون رہ سکتا ہے۔"

"جی بالکل نہیں۔ آپ مزید بدتمیزیاں کر رہی ہیں خاتون! بدروحیں اتنی خوش خلق اور نرم مزاج نہیں معلوم ہوتیں۔ وہ شخص بڑا عجیب وغریب ہے۔ صفر بتایا ہے اس نے اپنا نام کیا یہ تعجب خیز نہیں ہے۔"

"یہ خود اس کا رکھا ہوا نام ہے اس کا نام کچھ اور ہوگا۔ ویسے میں ایک بات بتاؤں تم لوگوں کو، ایسے لوگ جینیئس ہوتے ہیں۔" زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عجیب الخلقت شخص ایک بڑی سی ٹرے لے کر ہلتا ہوا اندر آ گیا۔

"کک..... کیا یہ چائے آپ نے خود ہی بنائی ہے۔"

"کیوں اچھی ہوگی۔ پسند آئے گی تمہیں ذرا اس کی خوشبو کو محسوس کرو۔" انکل سفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چائے کی خوشبو واقعی بہت لذیذ تھی۔"

"لیکن آپ بالکل تنہا ہوتے ہیں۔"

"ہاں ملازم وغیرہ کو لانے کا مطلب یہ تھا کہ تنہائی ختم ہو جائے۔ پھر ان ویرانوں میں رہنے سے کیا فائدہ میں اپنے سارے کام خود ہی کرتا ہوں۔"

"ارے واقعی ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ ورنہ کم از کم اتنے لوگوں کی چائے بنانے میں تو ہم آپ کی مدد کرتے۔"

"میری محبت کو اس طرح پامال نہ کرو۔ چلو چائے پیو۔" سب نے اپنی اپنی چائے کی پیالیاں اٹھائی تھیں اور واقعی کمال کی چائے تھی۔ انکل زیرو کے چہرے پر بے پناہ خوشی نظر آ رہی تھی۔ وہ سب چائے پیتے رہے لیکن رفتہ رفتہ انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا ان کے دماغ میں کچھ لہریں سی گزر رہی تھیں۔ ایک عجیب سی کھچاوٹ انہیں محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک دم سے چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر سفیان نے کہہ ہی دیا۔

"انکل چائے بہت اچھی تھی۔ لیکن اسے پینے کے بعد کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے ہماری۔ ہم اسے بے ہوشی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نہ جانے کیسا محسوس ہو رہا ہے۔"

"ہاں بیٹے! یہ احساس میری ایک کاوش کا نتیجہ ہے۔"

"کاوش!"

"ہاں۔ ایک کاوش جو میں نے تمہاری چائے میں ڈال دی ہے۔ ایک ایسی دوا جو میں نے زندگی بھر کی محنت کے بعد تیار کی ہے۔"

"دوا..... دوا۔"

"دوا نہیں۔ تم اسے میرا ایک تجربہ کہہ سکتے ہو۔ ایک ایسا تجربہ جو بے مثال ہے اور جس کے لیے میں نے دنیا ترک کر دی ہے۔ میں کوئی سائنس داں نہیں ہوں۔ بس بچپن سے دیوانگی سوار تھی میرے اندر۔

میں زندگی میں بہت سے نشیب وفراز سے گزر چکا ہوں۔ یوں سمجھ لو زندگی گزارنے کے لیے مجھے بڑے عجیب ماحول سے گزرنا پڑا ہے۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں کہ دنیا نے میرا مقام ہی چھین لیا تھا مجھ سے۔ ارے بابا میں زندہ تھا جان دار تھا۔ جینا چاہتا تھا۔ اپنی اس شخصیت کی تشکیل میں میرا اپنا تو کوئی ہاتھ نہ تھا۔ قدرت کے معاملات میں بلاوجہ دخل اندازی کی جاتی ہے۔ لوگ نہیں سوچتے کہ کسی کی دل آزاری کر کے انہیں کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں نے سب کو معاف کر دیا اور اپنی ذات میں محدود ہو گیا۔ میں بس یوں سمجھ لو کہ ایک پاگل سائنس دان ہوں میں سمجھتا ہوں کہ زمانہ جدید میں انسان جن راستوں پر چل رہا ہے وہ راستے تباہی کے راستے ہیں۔ میرا تجربہ اس دور کے لیے ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ انسان اتنا برا نہیں تھا ایک دوسرے سے محبت بھی کرتا تھا۔ لیکن موجودہ دور تو یوں لگتا ہے کہ محبت قتل کر دی گئی ہے۔ اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی برائی کا شکار ہے۔ ہر ایک کا انداز مختلف ہے۔ لیکن میں بتاؤں فطری طور پر انسان معصوم ہے۔ نیک ہے، اچھا ہے اور اس کے اندر برائی نہیں۔ نیکی اور شرافت ہے۔ حقیقتیں اور سچائیاں خلوص دل سے قبول کر لینی چاہئیں ایک دوسرے کی محبت دلوں میں بے دار ہونی چاہیے۔ اس طرح جنگی ہتھیاروں میں بھی کمی ہو گی۔ جنگوں میں بھی کمی ہو گی۔ دوسرے جرائم بھی آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گے۔ ویسے تو کوئی انسان نیکیوں کی طرف سفر نہیں کر رہا۔ میں نے بس سمجھ لو کہ اس نظریے پر کام کیا ہے۔ میری اپنی اس ایجاد میں کچھ ایسی خوبیاں شامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا برائیوں سے پاک ہو جائے۔" وہ ہوش میں تھے۔ ایک ایک لفظ کو سمجھ رہے تھے۔ بس تھوڑا سا اعصابی کھچاؤ تھا ان کے اندر ان کے دماغ میں۔ انکل زیرو کی ایک ایک بات جمتی جا رہی تھی اور وہ اس کے لیے اپنے دل میں بڑا احترام محسوس کر رہے تھے۔ سفیر نے کہا۔

"اگر آپ واقعی کوئی ایسا کام کر رہے ہیں انکل زیرو! تو وہ قابل تعریف ہے۔"

"بے شک۔" دوسروں نے بھی تائید کی۔

"میں تم سے بالکل صاف الفاظ میں یہ بات کہہ چکا ہوں میرے بچو! میرے اس تجربے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ تمہیں فائدہ ہی رہے گا۔ میں تم لوگوں سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا انکل بتائیے۔"

"بس یوں سمجھ لو جب تم تھوڑی دیر کے بعد اپنی اپنی جگہ پہنچ جاؤ گے تو تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو میری خواہش ہوگی۔ بیٹے! ان میں کوئی برائی نہیں ہے۔ مگر یوں سمجھ لو کہ میں اپنے اس تجربے کی تکمیل چاہتا ہوں۔"

"ہم دل وجان سے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں انکل زیرو! سب نے یہ یک وقت جواب دیا ان کے اندر ایک مشینی کیفیت بے دار ہو گئی تھی۔

"ہوں۔ میرا انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔" پھر زیرو اپنے ہال سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہیں کچھ خاص قسم کے پیکٹ تھے اس نے ایک ایک پیکٹ ان سب کو تقسیم کر دیا اور بولا۔

"ان میں سے ہر پیکٹ میں کچھ انجکشن ہیں تم اپنے اپنے طور پر یہ انجکشن مختلف افراد پر استعمال کر ڈالو گے طریقۂ استعمال کوئی الجھا ہوا نہیں ہے ایک انجکشن کی دوا ایک شخص کے لیے کافی ہوگی۔ کیا سمجھے۔ بس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ تمہارا کام ہے۔"

"بہت بہتر انکل۔" ان سب نے اپنے اپنے پیکٹ اپنی جیب میں رکھ لیے ان کے دل عقیدت و احترام سے بھرے ہوئے تھے۔ پتا نہیں یہ شخص انہیں کیا نظر آ رہا تھا۔

"اس کے علاوہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔"

"آپ کا بے حد شکریہ۔ کیا اب آپ کی اجازت ہے ہم چلیں۔"

"ہاں۔ میں نے تمہارا بہت وقت ضائع کیا ہے۔ آؤ میں تمہیں تمہاری منزل تک چھوڑ آؤں۔"

اس کے بعد انکل زیرو خود ان کے ساتھ اس جگہ تک آیا تھا جہاں ملازم وغیرہ موجود تھے۔ وہ اپنی لینڈ کروزر وہیں چھوڑ گیا تھا اور پیدل وہاں تک گیا تھا۔ جب وہ اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر واپس چلا گیا تو وہ سب عجیب سے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ان سب پر ایک پراسراری سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر ان میں سے ایک لڑکے نے جس کا نام سفیر تھا عدنان کی جانب رخ کر کے کہا۔

"عدنان! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ہے خیریت۔"

"سنو۔ تمہیں راضیہ یاد ہے۔" سفیر نے کہا اور عدنان چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

"راضیہ کو تمہارے وہ تمام خطوط میں نے ہی دیے تھے جن کی وجہ سے وہ ملک چھوڑ کر باہر چلی گئی تھی۔"

"کیا؟" عدنان حیرت سے اچھل پڑا تھا۔

"ہاں۔ مجھے بڑی شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے میرا ضمیر داغ دار ہے۔ میں تمہیں دوست کہتا ہوں لیکن دوستی کا میں نے یہ حشر کیا۔" سفیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عدنان بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تم نے جو کچھ بھی کیا میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ ہر شخص کسی نہ کسی برائی کا شکار ہے۔ میں خود بھی کوئی نیک انسان نہیں ہوں۔ کیا بتاؤں میں تم لوگوں کو ابھی تھوڑے عرصہ قبل کی بات ہے کہ میں نے....."

عدنان اپنے ایک مسئلے کے بارے میں بتانے لگا اور تمام لوگ حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ لیکن یہ کیفیت اس کی نہیں تھی۔ وہ سب اپنی اپنی ذات کے وہ سچ بول رہے تھے جو انہوں نے اپنی زندگی سے زیادہ چھپا کر رکھے تھے اور اب وہ ان کا انکشاف کر رہے تھے۔ ناقابل بیان انکشاف بہت سے ان میں ایسے تھے جو دوسرے کے لیے دل میں کینہ رکھتے تھے اور کسی نہ کسی لالچ سے ایک دوسرے کی محبت قائم رکھے ہوئے تھے لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی کسی کی بات کا برا نہیں مان رہا تھا۔ بہر حال اس کے بعد بقیہ دن سنجیدہ سا گزارا اور جب شام کے سائے جھکنے لگے تو سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب چل پڑے۔ ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہو کر۔ ایک عجیب و غریب انداز میں اور یقینی طور پر یہ کیفیت اسی حیران کن شخصیت کے تجربے کا نتیجہ تھی جو انہیں پہاڑوں میں ملی تھی۔

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ کو صوفی اور صوفی کو کرنل رحیم شاہ اس طرح سوٹ کر گئے تھے کہ دونوں لازم و ملزم ہو گئے۔ دونوں کے نظریات ملتے تھے۔ کرنل رحیم شاہ وطن کی محبت سے سرشار تھا اور ایک جانباز فوجی ہونے کی حیثیت سے اس بات پر افسردہ تھا کہ وہ جو وطن دشمنوں کو بھرپور طریقے سے جواب دے سکتا تھا وہ معذور ہو کر رہ گیا تھا۔

"لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ یہ احساس پلتا رہتا تھا صوفی صاحب کہ اگر خداوند عالم مجھے موقع دے تو میں جس طرح بھی بن پڑے اپنے وطن کی خدمت کروں۔ آپ یقین کیجیے میری نگاہیں کسی ایسے محب وطن کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھیں جو میرے ہی انداز فکر کا ہم حال ہو اور قدرت نے کیا ملایا مجھے آپ کو۔ یہ بھی میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ پہلے آپ میرے ذہن میں نہیں آئے تھے ورنہ میں آپ کو کہیں نہ کہیں تلاش کر لیتا اسے کہتے ہیں قدرت کی رہنمائی۔ اگر میں اس مزار پر نہ جاتا تو میری ان ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کبھی نہ ہوتی۔"

"ہم بھی آپ کے حکم سے پیچھے نہیں ہیں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا۔

جب تک صوفی کرنل رحیم شاہ کی اس دیہی کوٹھی میں رہا۔ جو سردار پور میں واقع تھی تو وہاں رہنے والے لڑکے لڑکیوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ کرنل رحیم شاہ نے وہاں تقریباً اپنا پورا خاندان ہی آباد کر لیا تھا۔ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں عمر رسیدہ اشخاص کرنل رحیم شاہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ لیکن کرنل کی فطرت کچھ اس طرح کی تھی۔ وہ دوسروں کی خوشی سے خوش رہتا تھا۔ کوٹھی میں رہنے والے بہت سے لوگ کرنل کی اس فطرت سے فائدہ اٹھاتے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو کرنل کی شخصیت سے محبت کرتے تھے اور یہ سچ تھا کہ اس پرآشوب دور میں بھی کرنل محبتوں سے محروم نہیں تھا۔ خاص طور سے گھر کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس سے بہت متاثر تھے۔ پہلی بات تو کرنل کی حب الوطنی تھی۔ وطن کے نام پر کرنل کی آنکھوں میں محبت کا نور ابھر آتا تھا اور یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کرنل وطن سے کتنی محبت کرتا ہے۔ نوجوان نسل اگر وطن کی محبت سے سرشار نہ ہو تو یہ ملکوں کی بدنصیبی ہوتی ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اس ملک کو نوجوانوں کا پیار حاصل تھا اور نوجوان رشتوں ناتوں کے جھگڑوں سے بہت دور ہٹ کر وطن کی محبت سے سرشار افواج سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ کرنل کے گھر میں بھی ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں موجود تھے۔ جن پر کرنل کو مکمل اعتماد تھا۔ البتہ یہ ذہنی طور پر اس قدر پختہ نہیں تھے کہ کرنل ان سے اپنا کوئی مقصد براری کرتا۔ حالانکہ ان میں سے چند لڑکے اس کے ذہن میں ضرور تھے۔ جو تعلیم یافتہ بھی تھے اور قابل اعتماد بھی لیکن بس کرنل تنہا ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی شخصیت اسے مل جائے۔ جسے اپنا دست راست بنا کر وہ کام کا آغاز کر سکے اور پھر اسے صوفی نظر آ گیا تھا۔ جو اپنی مثال آپ تھا۔ البتہ لڑکے لڑکیاں اسے دیکھ کر بڑی حیرت کا شکار ہوئے تھے۔ قدوس نے رابعہ سے کہا تھا۔

"یار رابعہ! یہ چچا میاں کو کیا ہو گیا۔ کیا چیز پکڑ لائے ہیں وہ۔ یوں لگتا ہے جیسے فرشتوں کے پاس انسانوں کو بناتے بناتے کچھ میٹریل بچ گئی ہو تو انہوں نے ادھر ادھر سے سب کچھ جوڑ جاڑ کر ایک آدمی بنا دیا ہو۔ لمڈھینک بے تکا کم بخت کا منہ تو اگال دان بنا رہتا ہے۔ کتنے پان کھاتا ہے وہ اور حیرت کی بات یہ ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ چچا جان نے اسے خود پان مہیا کیے ہیں۔ دادی اماں سے پاندانی رشتہ قائم ہوگیا ہے اس کا۔" پاندانی رشتے پر رابعہ ہنس پڑی۔

"بس تمہیں تو لفاظی چاہیے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں واقعی۔"

"باقی لوگوں کا بھی یہی حال ہے سارے کے سارے حیرانی کا اظہار کر رہے ہیں۔"

"یار! پھر ایک کام کیوں نہ کریں۔ چچا جان نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں نظر انداز تو نہیں کیا ہے۔ پوچھ ڈالتے ہیں کہ بھائی یہ پیر صاحب کہاں سے پکڑے۔ چچا جان کے مرشد ہیں یا کوئی اور چکر ہے۔" لڑکے لڑکیوں نے پورا گروپ بنا کر ایک شام کرنل رحیم شاہ کو گھیر ہی لیا۔ "واہ، واہ، واہ واہ تم سب کے چہروں سے پتا چل رہا ہے کہ کوئی تجسس ذہن میں لے کر آئے ہو۔"

"بالکل ٹھیک چچا جان! یہ صوفی صاحب کون ہیں۔"

"تعجب ہے تم نے اتنی دیر میں ان کے بارے میں کیوں پوچھا۔"

"بس ہمت کر رہے تھے سوچ رہے تھے کہ آپ کا ان سے کوئی جذباتی رشتہ نہ ہو اور ہمارے کسی سوال پر آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"نہیں خیر اب ایسی بات نہیں ہے۔ تمہارے کسی سوال پر میں تم سے ناراض کہاں ہوتا ہوں۔"

"تو پھر بتایئے نا۔ کیا یہ آپ کے پیر بھائی ہیں۔ پیر ہیں یا آپ کے مرید ہیں کیا ہیں۔"

"نہ یہ پیر بھائی ہیں، نہ پیر ہیں اور نہ میرے مرید ہیں۔ میں تم لوگوں کو ان کے بارے میں بتاؤں گا۔ تو تم یقین نہیں کرو گے۔"

"نہیں چچا جان! آپ کی بات پر کیوں نہیں یقین کریں گے۔ کبھی ہمارے اور آپ کے درمیان جھوٹ کا رشتہ رہا ہے۔"

"نہیں میرے بچو! میں نے کوشش یہی کی ہے کہ تمہارا دوست رہوں اور تمہیں اپنے آپ سے دور نہ ہونے دوں۔ تم ہی نے تو میری زندگی قائم رکھی ہوئی ہے۔"

"چچا جان! ہم کبھی آپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیں گے۔"

"صوفی کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ یہ محکمہ سراغ رسانی میں بھی رہ چکے ہیں اور پولیس کے مختلف محکموں میں کام کرتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات میں تمہیں یہ بتاؤں کہ کتنی ہی بار انہوں نے اپنی اعلا ذہانت سے کام لے کر کچھ ایسے فوجی مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ جن میں اگر ان کی شمولیت نہ ہوتی تو دشمن ہمیں بدترین نقصان پہنچا سکتا تھا۔ صوفی صاحب نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے۔ یقین کرو دوسرے پاؤں تک دماغ ہے۔ مجسم دماغ، وہ سر سے پاؤں تک مشین ہے۔ وہ انتہائی طاقت ور انسان ہے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر اور جب وہ اپنی ذہانت کے گل کھلاتا ہے تو تم یقین نہیں کرو گے کہ لگتا ہے ہزار دماغ اس کے ذہن میں بیٹھے سوچ رہے ہوں۔ یہ ہے صوفی چونکہ اپنی مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اس لیے اعلا پولیس افسران اور اعلا حکام اسے برداشت نہیں کر پاتے۔ پیری، فقیری کا قائل ہے۔ بزرگوں سے رہنمائی مانگتا ہے۔ بہر

حال اعلا افسران اسے معطل کرتے رہے ہیں کہ ایسے مسئلے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس نے استعفیٰ دے دیا اور بس مجھے مل گیا۔ میں اسے ساتھ لے آیا۔ اسے میں اپنے ساتھ شامل کر کے اپنے اس مقصد کی تکمیل کروں گا۔ جس کے لیے میں نے تم سے ایک، دو بار کہا بھی ہے۔"

"آپ نے تو اتنی تعریفیں کر دی ہیں اس شخص کی کہ ہم حیران رہ گئے ہیں۔"

"تم یقین کرو کہ اتنا بے مثال ہے وہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"مگر ماموں میاں آپ نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے۔"

"کیا؟"

"آپ کہتے ہیں وہ سر سے پاؤں تک دماغ ہے۔"

"یہ میں ذہانت کی اعلا ترین مثال کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

"آپ کہتے ہیں کہ وہ سر سے پاؤں تک ایک طاقت ور مشین ہے۔ کیا جسمانی طور پر بھی۔" یہ سوال ایک ایسے نوجوان نے کیا تھا جو بڑا طاقت ور تھا۔ بے پناہ ورزش کرتا تھا۔ اس نے اپنا ایک باقاعدہ اکھاڑہ بنا رکھا تھا اس کوٹھی میں۔ اس کا نام اعجاز تھا لیکن اسے کوئی سینڈو کہتا تھا کوئی ہرکولس ویسے بھی بہت خوب صورت بدن کا مالک تھا۔

"ہاں۔ میں جانتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ وہ ایک انتہائی طاقت ور مشینی قسم کا انسان ہے۔"

"دیکھنے میں تو وہ معاف کیجئے گا ماموں میاں! ایکسرے نظر آتا ہے۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں اس کے وجود میں۔"

"بیٹے! گوشت میں طاقت بے شک ہوتی ہے لیکن اصل طاقت ہڈیوں میں ہی ہوتی ہے کشتی لڑو گے اس سے۔"

"ارے نہیں ماموں میاں! آپ کی کسی پسندیدہ شخصیت کو توڑنا پھوڑنا میرے لیے ایک انتہائی شرم ناک عمل ہوگا۔" جواب میں کرنل ہنس پڑا تھا اس نے کہا۔

"ویسے بھی میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میری کوئی پسندیدہ شخصیت میرے بھانجے کو توڑ پھوڑ دے۔" اعجاز کو یہ چیلنج بہت برا لگا تھا۔ تاہم، معاملہ کرنل کا تھا کہنے لگا۔

"یہی تو دکھ کی بات ہے۔ ماموں میاں کہ آج تک آپ نے کبھی اعجاز کا امتحان نہیں لیا۔"

"کیسا امتحان بیٹے۔"

"ماموں میاں! بس آپ کا کھا رہا ہوں بے شک۔ لیکن دل میں یہ خواہش ہے کہ کبھی آپ کو یہ بتا سکوں کہ آپ کی عنایت نے آپ کے لیے ایسا ایک محافظ تیار کر دیا ہے۔ ماموں میاں ایک درخواست کروں آپ سے۔"

"ہاں۔"

"تجربہ کرا دیجیے مجھے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہڈیوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔"

"ارے بیٹا صوفی ایک پروقار شخصیت ہے۔ جو کچھ ظاہری طور پر تم اسے دیکھتے ہو وہ نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پھر بھی ماموں میاں! میری آرزو ہے یہ۔''

''ہاں ماموں میاں کیا ہرج ہے۔ ہم بھی تائید کرتے ہیں اس بات کی۔'' دوسرے لڑکے لڑکیوں نے اتنا شور مچایا کہ کرنل رحیم شاہ نے ہنستے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔

''اچھا بھئی اچھا میں پوری پوری کوشش کروں گا کہ تم لوگوں کی تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔'' پھر کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

''بھئی صوفی صاحب! میرے گھر میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دیکھ رہے ہیں آپ۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے، درویش ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے۔ یہ پھلیں پھولیں۔''

''بہت شکریہ۔ مجھے ان سب سے دلی محبت، دلی لگاؤ ہے۔''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں، ایسی پھلواریاں تو انسان کو زندگی دیتی ہیں۔''

''بڑا اچھا جملہ کہا آپ نے صوفی صاحب! آپ کے سلسلے میں یہ متجسس ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ صوفی صاحب کیا چیز ہیں۔ ان میں ایک لڑکا ہے۔ اعجاز نام ہے اس کا۔ ماشاءاللہ بڑا اچھا بدن بنایا ہوا ہے اس نے۔ ورزش کرتا ہے کشتی لڑنے کا شوقین ہے۔ مم...... میں نے کہیں غلطی سے کہہ دیا کہ صوفی صاحب بہت طاقتور آدمی ہیں۔ بچے پیچھے لگ گیا کہ میرا ان کا مقابلہ کرا دیا جائے۔''

''دو...... درویش رحم کریں۔ جج...... جناب! ہم تو اس کے اہل نہیں ہیں۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں صوفی صاحب! بس ایسے ہی میرا دل چاہتا ہے۔''

''آپ کا دل چاہتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہی سمجھ لیجیے کہ درویشوں کی دعاؤں سے میرا دل چاہتا ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں آپ سے۔''

''تو پھر کل صبح ویسے یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کل شام کو ہم دارالحکومت روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے و[illegible]نام لیا ہے۔''

''بہت بہتر۔''

''تو میں کہہ دوں ان سے۔''

''ہم نے عرض کیا نا۔ آپ ہمیں [illegible] چاہتے ہیں تو پیٹ لیں گے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ویسے آ[illegible] اطمینان رکھیں اگر وہ آپ پر بھاری پڑے تو آپ فوراً ہی مجھے بتا دیں یہ مقابلہ روک دیا جائے گا۔''

''دو...... درویش کرم کریں گے [illegible]فی نے کپکپاتی آواز میں کہا لڑکے لڑکیوں میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ فوراً ہی کرنل رحیم شاہ سے [illegible] کیا گیا۔

''کیا ہوا کیا صوفی صاحب نے ہمارے سیٹھ کا چیلنج [illegible]ل کر لیا۔''

''وہ تم لوگوں کی ذہنی پہنچ سے بہت آ[illegible] صرف میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔''

''آپ اطمینان رکھیے میں اسے بڑے پیار سے ماروں گا۔ ویسے چچا جان ایک بات ہے جب دو افراد اکھاڑے میں اتر آتے ہیں تو پھر تھوڑی دیر کے لیے ان کی دوستی ختم ہو جاتی ہے اور صرف اپنی عزت کا سوال رہ جاتا ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اعجاز سے بہت متاثر تھا۔ اعجاز نے بہترین بدن بنایا ہوا تھا اور ویسے بھی بے پناہ مواقع ایسے آئے تھے جب اعجاز کی طاقت کا خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا۔ کم از کم اس بارے میں کرنل رحیم شاہ کو کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی کہ صوفی کی جسمانی قوت کا کیا حال ہے۔ جہاں تک ذہنی قوت کا تعلق تھا تو اس کا تو کرنل رحیم شاہ کو تجزیہ اور تجربہ ہو چکا تھا۔ غرض یہ کہ دوسرا دن آ گیا اور صبح کو تمام لڑکے اور لڑکیاں تیار ہو کر اکھاڑے میں پہنچ گئے۔ کرنل رحیم شاہ خود بھی پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ صوفی سے ساڑھے چھ بجے پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تمام لڑکے لڑکیاں اور خود کرنل رحیم شاہ سوا چھ بجے ہی وہاں جمع ہو گئے۔ صوفی کا انتظار کیا جانے لگا۔ وقت سست روی سے گزر رہا تھا۔ فیصل نے کہا۔

''چچا جان! ذرا ملازم کو بھیج کر معلوم کرا لیجیے۔ صوفی صاحب گھر چھوڑ کر تو نہیں بھاگ گئے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اعجاز کو دیکھ لیا ہو۔''

''بدتمیزی کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی۔ خیال رکھا جائے۔'' کرنل رحیم شاہ نے فوجی انداز میں کہا اور جب اس انداز میں کوئی بات کہی جاتی تھی تو ان کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک فوجی بول رہا ہوتا تھا۔ جس کے لہجے کا ایک وزن ہوتا ہے۔ ساڑھے سات بجنے میں تین سیکنڈ باقی تھے کہ صوفی آتا ہوا نظر آیا لیکن اسے دیکھ کر سب کے قہقہے نکل گئے تھے۔ ڈھیلے پائنچوں والا پاجامہ اوپر سے شیروانی۔ پان کھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ راضیہ ہنس کر بولی۔

''آپ نے صوفی صاحب کو بتایا نہیں تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ چچا جان!'' کرنل رحیم شاہ خود حیران نگاہوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ صوفی کشتی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس کا ارادہ شاید بدل گیا تھا قریب پہنچا تو لڑکے لڑکیوں کے قہقہے فضا میں بلند ہو گئے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''صوفی صاحب آپ کے پاس کوئی ایسا لباس نہیں جسے پہن کر کشتی لڑی جا سکے۔''

''یہ ایک مکمل لباس ہے جناب! درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا اور لڑکے لڑکیاں پھر ہنس پڑے۔

''یعنی آپ شیروانی پہن کر لڑیں گے۔''

''کک...... کیا ہرج ہے کوئی پریشانی کی بات ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ صوفی صاحب! پہلے کشتی لڑی ہے کبھی آپ نے۔''

''نہیں حضور والا۔ کشتی تو بے شک کبھی نہیں لڑی ہے ہم نے مگر دیکھیے نا اب اتنی بے شرمی تو مناسب نہیں ہے۔ یہ بچے بچیاں ہمارے گرد جمع ہیں اور ہم تو بہ توبہ تصور بھی نہیں کر سکتے ایسے کسی احمقانہ عمل کا۔ ہمیں ایسا ہی رہنے دیجیے آپ اور پھر ایک بات بتائیں آپ کو یہ تو بس تعمیل حکم ہے۔ آپ کے ارشاد کی تکمیل ورنہ ان بچوں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتے ہم اگر جذباتی ہو گئے تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ اس کشتی کے بعد آپ ہمیں اپنی کوٹھی پر رکھنے پر آمادہ نہیں ہوں گے اور سارے رابطے توڑ لیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیوں؟'' کرنل نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم ان کے پورے بدن کی ہڈیاں توڑ چکے ہوں گے۔ مناسب تو نہیں لگے گا نا بس ایک آدھ ہاتھ رسید کر دیں گے انہیں شیروانی پہنے پہنے درویشوں کی دعاؤں سے ان کی طبیعت سیر ہو جائے گی۔'' صوفی کے الفاظ پھر قہقہہ آور تھے۔ لیکن اعجاز کو یہ الفاظ بہت برے لگے تھے اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اس نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور جب کوئی اپنے مدمقابل کے لیے ایسے الفاظ کہہ دیتا ہے تو پھر رعایت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔''

''آیئے عزیزی آیئے۔ ہمارے لیے تردد نہ کیجیے گا درویشوں کی دعاؤں سے جلدی کیجیے ہم نے صرف آپ کی خوشی پوری کرنے کے لیے ابھی تک پان نہیں کھایا ہے۔'' صوفی نے کہا اور جوتے اتار کر اکھاڑے میں اتر گیا۔ کرنل رحیم شاہ ارے ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ لڑکیاں لڑکے قہقہے لگا رہے تھے اس وقت دو مدمقابل تھے۔ جو بڑے عجیب و غریب نظر آ رہے تھے۔ رحیم شاہ عجیب سے انداز میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بنائے ہوئے بہترین صحت مند جسم کا مالک جس کے بدن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی اور دوسرا ایک عجیب و غریب خلائی مخلوق شیروانی اور ڈھیلے پائجامے میں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اور ڈھیلا پائجامہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بہرحال صوفی نے اعجاز کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے آیئے حملہ فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' اور اعجاز نے بھڑک کر صوفی سے لپٹ جانے کی کوشش کی صوفی نے اپنے بدن کو لچکایا اعجاز کی پتلی اور چیتے جیسی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور پھر اسے اٹھا کر اپنے اوپر سے دوسری جانب اچھال دیا۔ چونکہ یہ مدافعت غیر متوقع تھی۔ چنانچہ اعجاز اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑا لیکن اس نے اٹھنے میں پھرتی دکھائی تھی اور پھر پلٹ کر اس نے صوفی کے پیروں پر دولتی مارنے کی کوشش کی۔ لیکن صوفی اچھل کر اس کے سر ہانے پہنچ گیا۔ اعجاز نے الٹی قلابازی کھائی اور ہاتھوں کو زمین پر ٹکا کر ایک بار پھر صوفی کے سینے پر دولتی جھاڑنا چاہی لیکن صوفی بڑے اطمینان سے کوئی ایک فٹ ادھر ہٹ گیا تھا کہ جیسے کوئی مشین چلتے چلتے اچانک رک گئی ہو۔ فضا میں ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کرنل رحیم شاہ کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھر آئی تھی۔ اعجاز شدید غصے کے عالم میں پھر کھڑا ہو گیا۔ وہی بات ہوئی تھی۔ جوش جذبات میں، جذبات پر قابو نہیں پا سکا تھا ایک بار پھر صوفی سے لپٹنے کی کوشش کی لیکن اس بار صوفی نے اس کے پیروں میں ٹنگڑی ماری اور وہ دھپ سے زمین پر جا گرا صوفی نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے سے پکڑے اور اس کے بعد اس کی کمر پر بیٹھ گیا۔

''کوڑا جمالی شاہی، پیچھے دیکھو مار کھائی..... کوڑا جمالی شاہی، پیچھے دیکھو مار کھائی۔'' صوفی گنگنانے لگا اور ایک دم پھر قہقہوں کی مشین اسٹارٹ ہو گئی لیکن صرف ایک لمحے کے لیے وہ دیکھ رہے تھے کہ صوفی سے کوئی چار گنا نظر آنے والا اعجاز اکھاڑے کی مٹی میں پاؤں جما کر صوفی کو خود پر سے اکھاڑنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن صوفی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیے تھے اور بدستور کوڑا جمال شاہی کی گردان کیے جا رہا تھا۔ وقتاً ہی کرنل رحیم شاہ کے حلق سے بھی قہقہہ آزاد ہو گیا۔ لیکن وہ بھی بس ایک لمحے کے لیے اور اس کے بعد اس نے کہا

''صوفی صاحب! چھوڑ دیجیے اس نامعقول کو۔''

''جو حکم جناب عالی!'' صوفی پیچھے ہٹ گیا لیکن اعجاز اب اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ جیسے ہی اسے صوفی کے بدن سے آزادی ملی۔ اس نے پھرتی سے بل کھا کر صوفی کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پر اپنی بھرپور قوت آزمانے لگا۔ لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ صوفی ستون کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور اس کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں ہے آپ ہمارے بچے ہو پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم تمہیں کچھ کہہ تو نہیں رہے۔'' اعجاز اپنی تمام تر کوششیں کر کے ہار گیا لیکن صوفی کو ایک انچ زمین سے نہیں ہلا سکا تھا۔ وقتاً ہی کرنل رحیم شاہ خود اکھاڑے میں اتر آیا اور ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اعجاز کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''اعجاز بس پاؤں چھوڑ دو اور خبردار! اس کے بعد ایک انچ بھی ہلے۔ خبردار! جو میں کہہ رہا ہوں وہ بات سمجھ آ رہی ہے تمہارے۔'' اعجاز کو ہوش آ گیا تھا۔ کرنل اس وقت اپنے فوجی لہجے میں ہی بولا تھا اور اس فوجی لہجے کے بارے میں گھر کا ایک ایک فرد جانتا تھا۔ اول تو کرنل رحیم شاہ کسی کو ایسا حکم نہیں دیتا تھا۔ جو اس کے لیے ناقابل قبول ہو۔ لیکن جب حکم دیتا تھا اور اس کی تعمیل نہیں ہوتی تھی۔ تو وہ فوراً ہی حکم عدولی کرنے والے کو دشمن کا سپاہی سمجھ لیتا تھا اور دشمن کے سپاہی کو صرف گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ بات سبھی کرنل کے بارے میں جانتے تھے۔ لیکن وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ جب وہ حکم دے رہا ہے تو اب کوئی کاوش بالکل بے مقصد ہے۔ اعجاز پیچھے ہٹا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کرنل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاباش! یہ تجربہ ہے اعجاز بیٹے تمہاری زندگی کا کبھی کسی کو دیکھ کر قہقہہ نہ لگاؤ اور کبھی کسی کے بارے میں غلط تسلی نہ کر لو۔ جب تک کہ وہ تمہارے تجربے میں نہ آ جائے۔ تم کیا سمجھتے ہو صوفی صاحب کو میں اپنے ساتھ مذاق میں لے کر آیا ہوں۔''

''بچے ہیں حضور یہ ہمارے اگر آپ کہیں تو ہم زمین پر لیٹ جائیں۔ بس شیروانی خراب ہو جائے گی۔ دوسری نہیں ہے ہمارے پاس درویشوں کے کرم سے۔'' ایک بار پھر ہنسی کھنکی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''بس ہم لوگ جا رہے ہیں تم لوگ کھیلتے رہو۔'' اور اس کے بعد صوفی نے جوتے پہنے مٹی میں لتھڑے ہوئے پاؤں بڑے آرام سے جوتوں میں ڈال کر وہ کرنل رحیم شاہ کے ساتھ چل پڑا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر کرنل نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ لڑکے لڑکیاں اعجاز سے باتیں کر رہے تھے۔ رحیم شاہ نے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی صوفی صاحب! آپ اس وقت بھی اپنی فارم میں ہیں۔''

''صرف فارم میں ہیں جناب! اور فارم میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ یونیفارم ہمیں راس نہیں آتی۔'' صوفی نے کہا اور کرنل ہنس پڑا اور بولا۔

''لیکن اب آپ کہ بہت ساری ذمے داریوں سے نبرد آزما ہونا ہوگا۔ ویسے میں آپ کو بتا چکا ہوں صوفی صاحب کو میری پشت تنہا نہیں ہے۔ اعلا حکام فوجی افسران پولیس کے بڑے بڑے لوگ ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پشت پناہی کریں گے جب میں اپنا موقف فوجی پیمانے پر سامنے لے کر آؤں گا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا۔ کچھ ایسے افراد میرے علم میں ہیں جو وطن سے مخلص ہیں اور وطن کے مفاد کے لیے ہر طرح کی آسانیاں دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال اس وقت بھی ہے۔ بس اب ہم یہاں زیادہ وقت نہیں ضائع کریں گے بلکہ ہمیں چلنا ہے۔ دارالحکومت میں کچھ تیاریاں کرنا ہوں گی۔ وہاں جا کر ہمیں تمام انتظامات کرنے ہیں اور اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرنا ہے۔" صوفی نے گردن جھکا دی تھی۔ بس اس کے بعد وہ کرنل رحیم شاہ کے ساتھ دارالحکومت آ گیا تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کرنل اس قدر اخراجات کرنے کے موڈ میں ہوگا ایک شان دار عمارت خریدی گئی جسے ہیڈ کوارٹر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد اسی عمارت سے ملحق ایک اور عمارت خریدی گئی۔ جس کے بارے میں یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ اس میں وہ تمام افراد رہائش اختیار کریں گے۔ جو اس سلسلے میں کام کریں گے۔ ان میں پہلا شخص دلاور تھا جسے اس شان دار عمارت میں جس میں چوبیس کمرے تھے۔ ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی بیوی اور اس کا بچہ بھی وہیں آ گئے تھے اور کرنل کے تجویز کردہ نام گرین فورس کے پہلے فرد کو یہاں مقیم کرنے کی خوشی میں ایک باقاعدہ تقریب کا انتظام کیا گیا تھا جس میں صرف تین افراد شریک تھے۔ صوفی، کرنل رحیم شاہ اور خود دلاور، کرنل رحیم نے دلاور کو مبارک باد دی تھی اور کہا تھا کہ گرین فورس کا نام تجویز کیا گیا ہے اور وہ گرین فورس کا پہلا ممبر ہے۔ دلاور نے گردن خم کر دی تھی اور کہا تھا۔

"جناب عالی! بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کا غلام زندگی بھر آپ کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے گا۔"

"بات اتنی ہی نہیں ہے دلاور! تمہیں باقاعدہ تربیت دی جائے گی۔"

"جی۔ آپ مطمئن رہیں۔"

"اور اب صوفی صاحب! ہمیں اپنی فورس کے مزید ممبران کو تلاش کرنا ہے۔ ویسے میں خاص طور سے آپ سے اپنے خاندان کے دو لڑکوں کی سفارش کروں گا اور یہ لڑکے آپ یقین کریں کہ میرے اور آپ کے معیار پر بھرپور طریقے سے پورے اتریں گے۔"

"ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔"

"پڑھے لکھے ہیں اور میری تعلیمات سے متاثر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام عادل ہے اور دوسرا فیضان ہے۔ فیضان کمپیوٹر انجینئر ہے۔ عادل ڈاکٹر ہے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ایک اسپتال میں جاب کر رہا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے۔ یہ دونوں ہمارے لیے بہترین ثابت ہوں گے آپ انہیں اپنی پسند کے مطابق تربیت دے لیں یہ ملک میں اور باہر کے ممالک میں جا کر آپ کے احکامات کی تعمیل کریں گے۔" صوفی نے کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"ہاں۔ ہم لوگ محدود نہیں رہیں گے صوفی صاحب! ہمیں بہت ہی اعلا پیمانے پر کام کرنا ہوگا۔ کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو کوئی "را" بنا لیتا ہے کوئی "موساد" بنا لیتا ہے، کوئی "کے جی بی" اور کوئی "سی آئی اے" کے نام سے دنیا بھر کے ملکوں میں فساد برپا کرتا رہتا ہے۔ ہماری گرین فورس ہر اس دشمن کے خلاف کام کرے گی۔ جو انسانیت کا دشمن ہوگا۔ صوفی صاحب! میں نہیں جانتا کہ آپ نے دوران ملازمت کس کس طرح

کام کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب گرین فورس انٹرنیشنل ہوگی اور آپ دیکھ لیجیے ایک وقت وہ آئے گا جب لوگ گرین فورس کے بارے میں میرا مطلب ہے دنیا کے ان تمام بڑے بڑے ممالک کے لوگ جو دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ گرین فورس کے نام پر لرز جایا کریں گے۔"

"درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے لقمہ دیا اور کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"بڑا فیض ہوتا ہے درویشوں کا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"بس یہی چیز ہمیں آپ کی غلامی قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جو شخص فیضان بزرگان کا قائل ہوتا ہے۔ بزرگوں کا فیض اسے ضرور حاصل ہوتا ہے۔"

"انشاءاللہ۔" اور پھر گرین فورس کے نئے ممبران کی تلاش شروع ہو گئی۔ ایک دن کرنل رحیم شاہ اور صوفی ایک سنسان سے راستے سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے تھوڑے فاصلے پر کچھ ہنگامہ آرائی دیکھی اور گاڑی کی رفتار سست کر لی وہ دیکھ رہے تھے کہ چار افراد جو ایک پرانی فورڈ ویگن سے نیچے اترے تھے۔ ایک لڑکی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ لڑکی بھکارن تھی اور پتا نہیں کیوں اس سنسان راستے سے گزر رہی تھی۔ نوجوان بھکارن کو دیکھ کر شاید ان بدمعاش عناصر کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسے اٹھا کر ویگن میں ڈالنا چاہتے تھے لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد انہیں مزہ آ گیا۔ لڑکی مارشل آرٹ کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ان چاروں کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ پہلے تو انہوں نے لڑکی کو اٹھا کر ویگن میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اب اس کے بعد خود ویگن تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہاں سے دوڑ لگا دیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ جونہی کوئی زمین سے اٹھتا لڑکی کی بھرپور لات اس کے منہ سر گردن یا سینے پر پڑتی اور وہ قلابازی کھا جاتا۔ دیکھنے میں تو بھکارن لڑکی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا یہ رنگ بڑا سنسنی خیز تھا۔ صوفی کے منہ سے نکلا۔

"درویش رحم کریں۔"

"صوفی صاحب! معمولی بات نہیں ہے او ہو دیکھیے۔ وہ چاروں لمبے ہو گئے ہیں۔"

"ہاں درویشوں کی مہربانی ہے۔ دفعتاً انہوں نے لڑکی کو اسٹیشن ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد ایک لمحے کے اندر اندر اسٹیشن ویگن اسٹارٹ ہوئی اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ صوفی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ کرنل نے کہا۔

"چلو اس کا پیچھا کرو۔" کرنل سنجیدہ لہجے میں بولا اور صوفی نے گاڑی ویگن کے پیچھے لگا دی۔

"ماں سے بھی یہی پوچھے گا حرامی۔" لڑکی بولی۔

"گالی مت بک..... گالی مت بک۔ ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ بھیک مانگنے کو بھی دھندا کہہ سکتے ہیں۔"

"باپ ہے تو میرا۔" لڑکی بولی۔

"نہیں..... کیوں!"

"اپنی گاڑی چلا..... پیسے لے چکا ہے۔ فالتو بک بک مت کرو۔"

"بڑی تیکھی ہے بھئی۔" ڈرائیور اس سے زیادہ گالیاں نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس نے خاموشی ہی اختیار کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی مطلوبہ جگہ پہنچی تو لڑکی نیچے اتری اور پھر اس نے بل کی رقم ڈرائیور کو دی اور پانچ روپے زیادہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ڈرائیور نے گاڑی گیئر میں ڈال کر کہا۔ ''تجھ جیسی بھکارن کو تو ویسے ہی سو پچاس روپے دیتے ہوئے کسی کا دل نہیں دکھتا ہوگا۔''

بھکارن نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ ڈرائیور نے گالیوں سے بچنے کے لیے جلدی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔

صوفی نے بھی گاڑی روک دی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''کچی آبادی ہے صوفی صاحب۔ گاڑی نہیں جا سکتی آپ ذرا اس کے پیچھے چلے جایئے۔''

''آپ کو ہمارا سلسلہ نسب معلوم ہے محترم و معظم۔''

''جی.....!'' کرنل نے حیرت سے کہا۔

''قبلہ واعلا شاہ نسیب دلدلی ولد سید جلال الحسیب اختر انی جنت مکانی کی تیسری پیڑھی کے چشم و چراغ ہیں درویشوں کی دعا سے۔''

''تو پھر.....''

''ہم سے ایسے کام کرا رہے ہیں آپ.....''

''کیسے کام۔''

''اس نوجوان بھکارن سے آپ کو دلچسپی ہوگی ہمیں نہیں ہے اور پھر چاہتے کیا ہیں آپ درویشوں کے کرم سے۔''

''اما کیا کھسک گئے ہو صوفی۔''

''جی قطعی نہیں۔ نجیب الطرفین ہیں بہ فضل کریم۔ ایسے کام سرانجام نہیں دیں گے۔''

''وہ نکل جائے گی صوفی صاحب۔''

''ہم نے تو بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔''

''یار بے وقوفی مت کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' کرنل پریشانی سے بولا۔

''آخر اس کے بارے میں کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ۔''

''میں اس کے اندر گرین فورس کی ایک رکن کو دیکھ رہا ہوں۔''

''ایں.....'' صوفی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''نکال دیا نا آپ نے اسے، اوجھل ہو گئی نگاہوں سے ویسے صوفی صاحب حیرت ہے واقعی مجھے شدید حیرت ہے۔ اچھی خاصی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں آپ۔ لیکن وہ کون سے لمحات ہوتے ہیں۔ جب حماقت آپ کے معدے میں اتر جاتی ہے۔''

''مم..... معافی چاہتے ہیں جناب قبلہ درویشوں کی دعاؤں سے ہم خود شدید حیران تھے۔ آپ کے بارے میں ایسی بری بات سوچتے ہوئے۔''

''تو آپ کا کیا خیال تھا مجھے اس نوجوان بھکارن کے ساتھ عیاشی کرنا تھی۔''

''تت..... توبہ..... توبہ..... توبہ درویشوں کی دعاؤں سے ویسے پیر جھانجھن بخاری نے ایک مثال کہی تھی۔''

''لعنت ہے آپ پر ایک بات ذہن نشین کر لیجئے۔ آپ ہی کو اس کا کھوج نکالنا ہے ورنہ میرے آپ کے اختلافات شدید ہو جائیں گے میں جو کچھ کرتا پھر رہا ہوں وہ میری بساط سے آگے کی چیز ہے میں نے تو مکمل طور پر یہ سوچا تھا کہ آپ جیسے شخص کو مکمل ذمے داریاں سونپ دوں گا۔ لیکن کیا ہی احمقانہ بات سوچی آپ نے میرے بارے میں۔''

''دو..... درویش رحم کریں۔''

''درویش تو خیر رحم کریں گے ہی۔ مگر مجھے یہ بتایئے کہ میں کیا کروں ارے آپ نے دیکھا نہیں ایک بھکارن لڑکی نے کس طرح ان غنڈوں کی پٹائی کی ظاہر ہے اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہی پوشیدہ ہوں گی۔ ہم اسے اپنی تحویل میں لے کر اگر اس کی ان صلاحیتوں کو جلا دیں تو کیا کریں فورس کے لیے ایک شاندار ممبر پیدا نہیں ہو جائیں گی۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''جایئے پتا لگایئے وہ کہاں رہتی ہے۔''

''جج..... جی۔'' صوفی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک وہ گلی گلی چکراتا رہا۔ کچی آبادیوں میں بس کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیچ در بیچ راستے اب ظاہر ہے کسی سے یہ پوچھنا تو مناسب نہیں تھا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ عزت بچا کر واپس گاڑی تک پہنچ گئے۔

''نہیں پتا چل سکا جناب عالی! جوان لڑکی تھی کسی سے کچھ کہتے تو ان محلوں میں غیرت مند کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے کپڑے تک اتار لیتے۔''

''نہیں صوفی صاحب! یہ آپ نے اس وقت غلط کاری کی ہے۔''

''صحیح کاری کر رہے تھے درویشوں کے کرم سے، ہر مال دس روپے آسانی سے بک جاتا ہے۔ عیش سے شام کو مصاحبین کے درمیان بیٹھ کر شعر و شاعری ہوا کرتی تھی۔''

''اچھا اچھا بیٹھیے آپ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر۔ پتا تو خیر چل ہی جائے گا۔ کل منہ اندھیرے یہاں آ جائیں گے۔ اگر اس کا گھر اسی علاقے میں ہے تو بھیک مانگنے کے لیے نکلے گی تو سہی۔''

''بہ خدا نہایت موزوں عمل رہے گا۔''

''گاڑی اسٹارٹ کیجئے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور صوفی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

♥.....♥.....♥

صائمہ جیلانی فوزی کی بہت اچھی دوست تھی اس کے والد ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ صائمہ اور فوزی ساتھ ساتھ ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور اکثر دونوں ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ فوزی کو جب وہ ہدایت ملی تو فوزی حیران رہ گئی۔ اور یہ ہدایت بھی بڑے عجیب و غریب انداز میں ملی تھی۔ اچانک ہی فوزی کو بیٹھے بیٹھے ان لمحات کا خیال آیا تھا جب وہ پکنک پر گئے تھے اور وہاں انکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیرو سے ملاقات ہوئی تھی اور پھر انکل زیرو کی آواز اسے اپنے دماغ میں سنائی دی۔

"فوزی ہے تمہارا نام۔"

"ہاں۔" فوزی نے بے آواز کہا۔

"اور صائمہ جیلانی تمہاری دوست ہے۔ احتشام جیلانی کی بیٹی۔"

"ہاں وہ میری دوست ہے۔"

"احتشام جیلانی بھی تم سے محبت کرتے ہوں گے۔"

"جی۔"

"فوزی! میں نے جو انجکشن تمہیں دیا ہے۔ ان میں سے ایک انجکشن تمہیں احتشام جیلانی کو دینا ہوگا۔ یہ کام تمہیں نہایت ہوشیاری سے کرنا ہے۔ ہر پہلو کو سامنے رکھنا ہے اور کہیں بھی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ فوزی! اس کام کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا عضو عضو اس حکم کی تکمیل کے لیے تیار ہو۔ پھر وہ صائمہ جیلانی کی کوٹھی پہنچ گئی۔

ساڑھے پانچ بجے احتشام جیلانی اپنے معمولات سے فراغت حاصل کر کے آجایا کرتے تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ باپ بیٹی بہت سے ملازموں کے ساتھ اس عالی شان کوٹھی میں رہا کرتے تھے احتشام جیلانی نے دونوں کو دیکھا تو محبت سے گردن ہلا کر بولے۔ "ارے فوزی بیٹی آئی ہے۔ بیٹا خیریت تو ہے۔"

"جی انکل! آپ کی دعائیں ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ کچھ دفتری کام کرنے ہیں۔ تم لوگ اپنی مصروفیات میں رہو۔" احتشام جیلانی اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فوزی نے موقع غنیمت دیکھا۔ تیاریاں تو کر کے آئی تھی۔ احتشام جیلانی کی پشت پر پہنچ گئی۔ یہ کوٹھی اس کی دیکھی بھالی تھی۔ احتشام جیلانی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے فائلیں پھیلائے مصروف تھے۔ گراؤنڈ فلور پر اس خواب گاہ کے پچھلے حصے میں خاصی جگہ موجود تھی۔ احتشام جیلانی کھلی ہوا میں بیٹھنے کے عادی تھے۔ لیکن سوئی کی تیز چبھن نے انہیں ایک لمحے کے لیے بدحواس کر دیا۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھے لیکن انجکشن لگانے والا ہاتھ غائب ہو چکا تھا۔ پھرتی سے اٹھ کر انہوں نے کھڑکی کے ساتھ ہی بنی راہداری میں جھانکا جو دو چار سیڑھیاں نیچے اتر کر ختم ہو جاتی تھی۔ جو کوئی بھی تھا اسی راہداری میں گیا تھا۔ احتشام جیلانی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ دروازے سے باہر جا کر چھان بین کرتے ایک عجیب سی کیفیت ان پر طاری ہوگئی اور چند ہی لمحوں کے اندر اس سحر میں گرفتار ہو کر وہ کرسی پر واپس بیٹھ گئے تھے۔ بہت عجیب سی ہلچل تھی ان کے دماغ میں۔ دوسرے دن انہیں ایک قومی جلسے میں شریک ہونا تھا۔ انجکشن کی چبھن تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا ذہن بھی کسی ٹرانس میں تھا۔ اور ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کوئی عمل ہوا ہے۔ جس میٹنگ میں یا جس جلسے میں انہیں شریک ہونا تھا۔ اس میں کئی ملکوں کے مندوبین مدعو تھے جو ایک خاص مقصد ایک خاص مشن پر آئے ہوئے تھے۔ احتشام جیلانی دوسرے دن شام کو دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ تقریب میں ملک کی پالیسی سے متعلق متعلقہ حکام کو بہت سی ایسی اہم باتیں غیر ملکی مندوبین کے سامنے بیان کرنی تھیں۔ جو ملک کی پالیسی کا

ایک حصہ تھیں۔ مقررین مندوبین کے سامنے اپنا موقف بیان کرنے لگے۔ پھر احتشام جیلانی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ان کی آواز ابھری۔

"تمام غیر ملکی معززین سے معذرت کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہمارے پروٹوکول سیکرٹری نے ہماری جس پالیسی کا تذکرہ کیا وہ ایک جعلی پالیسی ہے۔ ہماری اصل پالیسی اس سے بالکل مختلف ہے اور میں آپ کو اس کی تفصیل بتاتا ہوں اور اس کے بعد احتشام جیلانی نے ملکی راز کھولنے شروع کر دیے۔ وہ راز جو ملکوں کی امانت ہوتے ہیں اور امانت داروں کو زندگی کی قیمت پر انہیں چھپانا ہوتا ہے وہاں موجود تمام افراد ششدر رہ گئے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان غیر ملکی مندوبین کے سامنے احتشام جیلانی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بہت سے سوالات احتشام جیلانی سے کیے گئے اور وہ اپنے ملک کی خفیہ پالیسیوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ میٹنگ کے مقامی شرکا سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ بہر حال میٹنگ برخاست ہوگئی اور اس دوران متعلقہ حکام نے سکیورٹی حکام اور اعلا عہدے داروں کو احتشام جیلانی کے بارے میں رپورٹ دے دی تھی۔ ہائر ملٹری انٹیلی جنس کے افراد ان کی گرفتاری کے لیے موجود تھے۔ احتشام جیلانی کو گرفتار کر لیا گیا اور اعلا حکام کی ہدایت پر انہیں انتہائی سخت روی کے ساتھ ملٹری جیل پہنچا دیا گیا۔

دوسرا واقعہ وزیر دفاع کی ایک میٹنگ میں پیش آیا۔ جب وزارت دفاع کے فرسٹ سیکرٹری نے ملکی راز کھولنا شروع کر دیے۔ بے شک یہاں اس میٹنگ میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا تعلق وزارت دفاع سے ہی تھا لیکن فرسٹ سیکرٹری نے جس انداز میں وہ تمام خفیہ راز کھولنا شروع کر دیے تھے وہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔

تیسرا واقعہ سب سے زیادہ سنگین اور حیرت ناک تھا۔ کسی ایک نجی تقریب میں ملک کا مایہ ناز سائنسدان شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اخباری نمائندوں نے اسے گھیر لیا اور اس سے اس کی کاوشوں کے بارے میں سوالات کرنے لگے اس سائنسدان نے ایسے فارمولوں کے بارے میں انکشافات شروع کر دیے جو انتہائی صیغہ راز میں رکھے گئے تھے اور ان کے افشا کرنے کا جرم نا قابل معافی تھا اور اس پر سزائے موت بھی دی جا سکتی تھی۔ اخبارات میں بڑھا چڑھا کر ملک کی سائنسی تیاریوں کی یہ رپورٹیں شائع کیں اور حکومت ہل کر رہ گئی۔ ایسے پانچ واقعات ہوئے تھے۔ جن میں ملک کے انتہائی مقتدر اور پر اعتماد افراد نے اپنے منصب کی ذمے داریوں اور تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ملک کے رازوں کے بارے میں انکشافات کر دیے تھے وزارت داخلہ، وزارت خارجہ وزارت دفاع کے لیے انتہائی خوف ناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ صدر مملکت اور وزیر اعظم نے ہنگامی بنیادوں پر یہ کارروائی محفوظ رکھنے کے لیے ہدایت جاری کی اور فوراً ہی ایسے تمام افراد کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ جو ملکی امور میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس اور آرمی سیکورٹی ان کے گرد پھیلا دی گئی۔ ان پانچوں افراد کی ذہنی حالت بہ ظاہر ٹھیک تھی اور جب انہیں یہ بتایا گیا یا ان سے یہ پوچھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ لہٰذا فوراً ہی کسی ایسے عمل کا شبہ ظاہر کیا گیا۔ جو دشمن کی جانب سے کیا گیا ہو۔ اور آہستہ آہستہ یہ بات منظر عام پر آتی چلی گئی کہ ان لوگوں کو خفیہ طریقے سے انجکشن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگائے گئے تھے اور اس کے بعد انہیں یوں لگا تھا جیسے ان کے ذہن کسی پراسرار طاقت کے زیر اثر آ گئے ہوں۔ بہر حال انہیں انتہائی سخت پہرے میں رکھ لیا گیا تھا۔ اور سیکورٹی کے اعلا ترین دماغ اس سلسلے میں کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی جو ڈیفنس منسٹر شاہ میر خان کی سربراہی میں کام کرنے لگی۔ اور ایک طرح سے ہنگامی بنیادوں پر ایسے ایجنٹوں کی تلاش شروع ہو گئی جو ملک میں آ کر اس انداز میں خفیہ کارروائی کر رہے ہوں۔ اس کارروائی کی تشہیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ اس طرح ملک میں شدید ہیجان پیدا ہو جانے کے امکانات تھے۔ لیکن حکومت صحیح معنوں میں ہل کر رہ گئی تھی۔ اور تقریباً تمام ہی قوتیں اور ایجنسیاں ایسے ایجنٹوں کی تلاش میں لگ گئی تھیں جو ملک میں داخل ہو کر یہ تمام کارروائی کر رہے تھے۔ جن لوگوں نے اس شبہے کا اظہار کیا تھا۔ کہ انہیں انجکشن کے ذریعے کسی طرح ٹرانس میں لیا گیا ہے۔ ان کا جسمانی معائنہ بھی کیا گیا تھا اور انجکشن کے وہ نشانات تلاش کر لیے گئے تھے۔ ان کے خون کے ٹیسٹ وغیرہ بھی ہو رہے تھے۔ غرض ہر وہ کارروائی کی جا رہی تھی۔ جس سے ان حقیقتوں کا انکشاف ہو سکے۔

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ ظاہر ہے ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس کی اپنی اہمیت اور حیثیت بے شک مسلم تھی اور ایک اعلا شخصیت ہونے کے باعث سرکاری حلقوں میں بھی بڑی مقبولیت رکھتا تھا۔ خود اس کے اپنے خاندان کے کئی ایسے اہم افراد بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر تھے۔ جن سے اس کی رشتے داری ہی نہیں بلکہ گہری دوستی بھی تھی۔ چونکہ وہ خود انتہائی اعلا کارکردگی کا مالک اور نمایاں حیثیت والا شخص رہا تھا۔ وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا اور اس کے دل میں ایک ہی خیال تھا کہ مادر وطن کے لیے اس وقت تک اپنی خدمات انجام دیتا رہے جب تک سانس میں سانس ہے۔ ایک ٹانگ ضائع ہونے کے بعد اس کا دل بجھ گیا تھا لیکن جب سے اسے صوفی ملا تھا۔ اس کے دل میں نئی امنگیں بیدار ہو گئی تھیں۔ کچھ اسی طرح متاثر تھا وہ صوفی سے اور ایک فوجی کرنل ہی جانتا ہے کہ کون شخص کس حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے صوفی نے جو خدمات سرانجام دیں تھیں۔ انہیں کرنل رحیم شاہ بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ صوفی کے بارے میں وہ مسلسل اس تجسس کا شکار رہتا تھا کہ صوفی کی اصلیت کیا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین انتہائی پھرتیلا، انتہائی طاقت ور اور انتہائی اعلا کارکردگی کا مالک تھا۔ لیکن پتا نہیں اس نے اپنے اوپر یہ ایک حماقت آمیز سادگی کیوں طاری کر رکھی تھی۔ پیر پرستی، پانوں کا استعمال، اپنی ذات سے لاپروائی کا یقینی طور پر کوئی پس منظر بھی ہو گا۔ لیکن یہ پس منظر کبھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اور شاید خود صوفی نے بھی اپنے ماضی کو بھلا دیا تھا۔ کیونکہ کتنے ہی لوگوں نے اس کی قربت حاصل کر کے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں ناکام رہے۔ اس کی اپنی پسندیدہ جگہ وہی بے ہنگا گھروندا تھا جو ایک پسماندہ محلے کی ایک گلی میں واقع تھا۔ حالانکہ کرنل رحیم شاہ نے دارالحکومت ہی میں ایک شان دار عمارت خرید لی تھی اور اسے ہر طرح سے جدید سہولتوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ فی الحال دلاور اور اس کی فیملی وہاں مقیم تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور افراد جنہیں کرنل رحیم شاہ نے وہاں فروکش کر دیا تھا اور ایک طرح سے وہ اس جگہ کو ایک مضبوط قلعہ بنا رہا تھا۔ لیکن صوفی کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنے اس گھروندے میں پہنچ جاتا جو ممن خان کے ہوٹل کے برابر تھا اور اس وقت یوں لگتا جیسے صوفی میں نئی زندگی بیدار

ہو گئی ہو۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سے ایک بار پوچھا بھی تھا۔

"صوفی صاحب! آخر وہاں ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے آپ اتنے دیوانے رہتے ہیں۔"

"حضورِ من! جناب عالی انسان کی اصل ہی اس کا سب کچھ ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی اصل سے دور ہٹ جاتے ہیں آپ یوں سمجھ لیجیے نہ تیتر رہتے ہیں اور نہ بٹیر، درویشوں کی دعاؤں سے وہاں مجھے اپنے دل و دماغ کے تمام دریچے کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ لوگ سادگی کا پیکر ہیں اور ہر کام پورے خلوص سے کرتے ہیں۔" کرنل رحیم شاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔

♥.....♥.....♥

نام شازیہ تھا باپ ریلوے ورک شاپ میں فورمین تھا۔ ایک چھوٹی بہن اور ایک ماں تھی باپ کے دل میں بڑے بڑے منصوبے تھے بیٹی کے لیے، وہ اسے اچھی تعلیم دلا کر کسی اچھے گھرانے میں بھیج دینا چاہتا تھا اکثر کہتا تھا۔

"بیٹا! اب ہم اتنے غریب بھی نہیں ہیں کہ تجھے کسی اچھے گھرانے کے معیار کے مطابق جہیز نہ دے سکیں تو ہے اور نازیہ ہے۔ نازیہ کو تو ابھی بہت لمبا عرصہ چاہیے۔ تیری تعلیم مکمل ہو جائے تو بس پھر تیرے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بابا جان! پڑھ لکھ کر بھی وہی روٹیاں پکائی جائیں۔"

"ارے تو پھر اور کیا کرے گی۔"

"نوکری کروں گی نوکری۔ لاکھوں کما کر دوں گی آپ کو ساری زندگی آپ ایک گھر کے لیے ترستے رہے ہیں نا۔ میں بنا کر دوں گی آپ کو گھر۔"

"ارے تیری ایسی تیسی تو گھر بنائے گی اور میں تجھے بنانے دوں گا۔ ارے بیٹا ایک باپ کے لیے اس سے بڑی گالی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ بیٹی کی کمائی کھائے۔ بیٹی کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔"

"واہ۔ یہ کیا بات ہوئی آپ کا خون نہیں ہوں میں۔"

"دیکھ بیٹا! ہمیں اب کون سی کوٹھیوں کی ضرورت ہے۔ یہ سرکاری گھر کافی ہے ہماری زندگی کے لیے تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ نازیہ اس قابل ہو گی تو اللہ اس کا بھی ٹھکانا کر دے گا اور بس ہم دونوں میاں بیوی کا تو حج ہو جائے گا۔ کیوں بھئی رشیدہ۔" اور وہ سب ہنسنے لگے تھے۔ لیکن شازیہ کے دل میں یہی تھا کہ اور تعلیم حاصل کر لے اور پھر باپ کا بازو بن جائے باقی تمام چیزوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وقت اپنی کہانی خود تحریر کرتا ہے۔ انسان کے اپنے ذہن میں کچھ بھی ہو وقت سے بھلا کون جھگڑا کر سکتا ہے۔ رحمان علی ورکشاپ میں حادثے کا شکار ہو گیا۔ آدھا دھڑ کٹ گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ وہ زندہ تھا۔ جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اسپتال والوں کے لیے بھی یہ ایک انوکھی کہانی تھی۔ بہر حال تقریباً ڈیڑھ سال تک جیا اور اس کے بعد دنیا چھوڑ گیا لیکن اس ڈیڑھ سال میں جو کچھ گھر میں جمع تھا وہ سب بڑی تیزی سے ختم ہو گیا تھا۔ رحمان علی گھر والوں سے کہا کرتا تھا۔

"بابا! آدھا تو رہ گیا ہوں میں، کسی کام کا نہ کاج کا، کیا کرو گے تم لوگ میرا؟ باقی آدھے کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے دو۔ اس دنیا میں میرا کیا مقام ہوگا سوائے اس کے کہ تم لوگوں کے کندھوں پر بوجھ بنا رہوں۔ بے وقوف ہو تم لوگ۔" جواب میں سب رونے لگتے تھے تو وہ خاموش ہو جاتا تھا۔

"ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ جو دل چاہے کرو خرچ کرو اس آدھے باپ پر اور آدھے شوہر پر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ کہے دیتا ہوں تم سے۔" پھر یہ آدھا انسان اس دنیا سے چلا گیا اور اس کے بعد گھر میں فاقے اور مفلسی رہ گئی۔ رحمان علی ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ پیسہ تو بہت بڑی ضرورت ہے اس دور کی۔ ساری محبتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب گھر کے حالات خراب ہوتے ہیں لیکن یہاں محبتیں خاک میں نہ ملیں۔ شازیہ نے باہر کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ باپ نے جو کچھ دیا تھا اب وہ باپ کے گھر کو لوٹانا چاہتی تھی۔ بہت کچھ یاد آتا تھا اسے۔ رحمان علی کہتا۔ "بیٹا! میں تجھے تعلیم اس لیے نہیں دلا رہا کہ تیری کمائی کھاؤں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ جس گھر میں تو جائے۔ وہاں تیرا ایک باعزت مقام ہو اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔" لیکن وقت نے رحمان علی کے الفاظ کی تردید کی تھی۔ اور کہا تھا کہ بیٹا! اصل فیصلے کرنے والا تو میں ہوں تو کون ہوتا ہے۔ بہرحال شازیہ در در ماری ماری بھٹکتی پھری۔ لیکن اب اسے دنیا کا ایک اور نیا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ دنیا اتنی عجیب ہے اس سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا۔ کئی جگہ اس نے ملازمت کی کوشش کی۔ جہاں کوئی نیک اور شریف انسان ہوا کرتا تھا۔ وہاں ملازمت نہیں ہوا کرتی تھی اور جہاں ملازمت ہوتی تھی وہاں آنکھوں میں کچھ اور ہی چمک پائی جاتی تھی۔

"یہ آپ کے سرٹیفکیٹ ہیں۔"

"جی۔ میں نے بی اے کیا ہے۔"

"صرف۔"

"جی۔"

"کوئی تجربہ۔"

"جی نہیں پہلی ملازمت کے لیے نکلی ہوں۔"

"تب تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"نہیں جناب! جو کام مجھے بتایا جائے گا میں اسے بہ خوبی سرانجام دے لوں گی۔"

"کیا واقعی۔"

"جی بالکل۔"

"آگے آیئے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔ "میری گردن میں دونوں ہاتھ ڈالیے۔"

"جی!"

"جی۔ آپ نے کہا تھا کہ جو کام آپ کو بتایا جائے گا وہ آپ کر لیں گی۔"

"میں تھوڑی سی ترمیم کر سکتی ہوں اس میں۔"

"ترمیم۔"

"جی ہاں۔ آپ نے گردن میں دونوں ہاتھ ڈالنے کے لیے کہا ہے نا۔"

"جی بالکل۔"

"اگر میں یہ دونوں ہاتھ آپ کے حلق پر ڈال دوں۔" اس نے آگے بڑھ کر گردن پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور اسے ہدایت دینے والے صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"آپ انسان ہیں یا جانور۔"

"بہت خطرناک جانور ہیں۔ خاؤں۔" اس نے حلق پھاڑ کر منہ آگے کیا اور اس کے بعد دانت پیستے ہوئے وہاں سے باہر نکل آئی۔

لیکن بات ایک جگہ ہی کی تو نہیں تھی۔ دوسری، تیسری اور چوتھی جگہ وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہی۔ نوکری تلاش کرتی رہی۔ پتا نہیں کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب تو بات بالکل کھل کر سامنے آ گئی ہے کہا جاتا ہے۔

"بی بی نوکری تمہاری مرضی کے مطابق ملے گی۔ لیکن صرف نوکری ہی نہیں دوست بننا پڑے گا تمہیں ہمارا۔" پھر ایک جگہ اس نے ایک صاحب کی پٹائی کر دی۔ میز پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی اٹھا کر مار دی۔ بری طرح دھکے دے کر نکالا گیا تھا اور جب گھر کے بدترین حالات سے دل برداشتہ ہو کر آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آنے لگی تھی۔ تو بالکل اتفاقیہ طور پر اس کی نگاہ سامنے پڑی اور وہاں اس نے ایک بھکارن کو دیکھا۔ جوان لڑکی تھی۔ بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"دے دے بی بی! کچھ اللہ کے نام پر، اللہ تجھے حج کرائے۔ دل کی ساری مرادیں پوری ہوں۔"

"کتنے پیسے لے گی۔" اس نے پوچھا۔

"کیا۔"

"میرے دل کی مراد پوری کرنے کے کتنے پیسے لے گی۔"

"مخول مت کر بی بی۔ جو دینا ہو دے دے۔"

"یار! تو میری دوست کیوں نہیں بن جاتی۔" شازیہ نے کہا اور بھکارن اسے دیکھنے لگی۔

"مذاق کر رہی ہے شرم نہیں آتی تجھے مذاق کرتے ہوئے۔"

"نام کیا ہے تیرا۔"

"حمیدہ۔"

"حمیدہ تیری قسم! میں تجھ سے مذاق نہیں کر رہی۔ تیری دوست بننا چاہتی ہوں میں۔"

"نئی بات ہے میرے لیے۔ تم جیسے صاف ستھرے کپڑے پہننے والے لوگ بھلا ہم جیسے لوگوں کے دوست کہاں بن سکتے ہیں۔" حمیدہ کے لہجے میں بھی عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔

"کیا مطلب۔"

"ارے بابا دوستی تو برابر کے لوگوں سے کی جاتی ہے۔ میرے میلے کچیلے کپڑے نہیں دیکھ رہیں اپنے آپ کو دیکھو اور مجھے دیکھو۔"

"اور اگر میں تجھ سے یہ کہوں حمیدہ کہ میرے پاس صرف یہی اجلے کپڑے ہیں باقی تیرے جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میلے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ تو اس بات کا یقین کرے گی۔" حمیدہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔ نوکری تلاش کرتی پھر رہی ہوں جگہ جگہ۔ نہیں مل رہی آنکھیں سینکنے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ کہانیاں سنانے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ عجیب تجربہ ہو رہا ہے زندگی کا۔ لیکن وہ نہیں ملتے جو ہمدردی اور محبت سے سر پر ہاتھ رکھیں۔"

"کبھی نہیں ملیں گے چاہے انہیں تلاش کرتے کرتے تیری زندگی گزر جائے اور پھر کہیں نہ کہیں چوٹ کھا جائے گی۔"

"تو کیا کروں حمیدہ۔"

"برا تو نہیں مانے گی میری بات کا، نام کیا ہے تیرا۔"

"شازیہ۔"

"جو میں کر رہی ہوں وہ کر۔"

"بھیک مانگوں۔"

"ہاں تو کیا سمجھتی ہے میں بھی میٹرک پاس ہوں۔ میرا بھی ایک ماضی تھا۔ مگر سب کچھ بھول گئی ہوں میں۔ زبان ٹیڑھی کر لی ہے بازاری زبان بنالی ہے۔ بھتا دینا پڑتا ہے ٹھیکیدار کو اور باقی سب خیریت ہے۔"

"ٹھیکیدار۔"

"ہاں۔"

"یہ کون ہے۔"

"کیا سمجھتی ہے تو ہر جگہ آج کل ٹھیکے چل رہے ہیں۔ ہر جگہ...... ہر جگہ ہم لوگوں کے بھی ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ میرا ٹھیکیدار بے چارہ بڑا معصوم سا آدمی ہے مطلب یہ کہ برا نہیں ہے خود بھی چھ بیٹیوں کا باپ ہے۔ ٹھیکا خریدا جاتا ہے۔ اس نے یہ ٹھیکا خریدا ہے اس علاقے میں بھیک مانگ سکتی ہوں میں دوسرے علاقے میں نہیں جا سکتی۔ کیونکہ ادھر کا ٹھیکے دار الگ ہے۔"

"بڑی عجیب کہانی سنائی ہے تو نے۔"

"دنیا میں ایسی ایسی ہزاروں عجیب کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔"

"ہوں۔ حمیدہ! واقعی تو نے میرے ذہن میں ایک نئی سوچ بیدار کر دی ہے۔ اچھا یہ بتا کیا تو مجھے تربیت دے گی۔"

"آج ہی سے۔ ایک منٹ رک جا۔" یہ کہہ کر حمیدہ نے اوڑھنی سے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں گننے لگی۔

"تین سو چھتیس ہیں۔ سو روپے ٹھیکیدار کو دینے پڑیں گے۔ دو سو چھتیس پھر بھی بچ جائیں گے چل آج کا کام پورا۔ چلے گی میرے ساتھ، اور شازیہ حمیدہ کے ساتھ اس کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ کچے علاقے میں،

بٹھایا اور خود باہر نکل آئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کھانے پینے کی بے شمار اشیاء لے کر اندر داخل ہو گئی۔

"چل کھا تو نئی دوست بنی ہے میری۔" اور پھر جب اس نے ایک گندے سے پیالے میں شازیہ کو چائے پیش کی تو شازیہ نے عجیب سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"دیکھ رہی ہوں تیری ایک ایک حرکت دیکھ رہی ہوں۔ اس سے بھی زیادہ گندے پیالوں میں تجھے چائے پینا پڑے گی۔ ہماری تربیت اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر واقعی یہ کام کرنا ہے تو عادت ڈال۔"

"مگر یار حمیدہ! ایک بات تو بتاؤ۔ اپنے حلیے کا کیا کروں گی۔"

"بتاؤں تجھے۔ پھر رک جا ایک پانچ منٹ۔" حمیدہ نے کہا اور اس کے بعد پھر باہر نکل گئی۔ شازیہ وہاں بیٹھی ہوئی ان عجیب و غریب حالات پر غور کرتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اچھی خاصی شکل و صورت کی لڑکی عمدہ لباس میں اندر داخل ہوئی اور شازیہ واقعی سے ایک لمحے کے لیے نہ پہچان سکی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اس نے اس کے نقوش پر غور کیا تو بڑی طرح اچھل پڑی۔ یہ حمیدہ ہی تھی۔

"بول کیا کہتی ہے۔"

"اے باپ رے باپ یہ تو نے اپنے چہرے پر کون سی نقاب چڑھائی۔"

"نقاب تو پہلے تھی میرے چہرے پر یہ تو میرا اصل چہرہ ہے۔"

"میرے خدا۔ تو تو اچھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے حمیدہ۔"

"بھول کر بھی یہ بات مت کہنا یہ خوبصورتی جو ہوتی ہے نا۔ بڑی عجیب چیز ہوتی ہے کسی دھن راج کے پاس ہو تو وہ مہاراج بن جاتا ہے۔ اور ہم جیسی لڑکیوں کے پاس ہو تو یہ سمجھ لو کہ ہماری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ہر شخص ہمیں کوٹھے تک لے جانا پسند کرتا ہے۔ کوٹھے تک لے جانا چاہتا ہے۔ سمجھیں۔ زمین پر ہمارے لیے جگہ نہیں ہوتی ذرا بلندیوں پر پہنچنا پڑتا ہے ہمیں۔"

"حمیدہ واقعی مجھے بڑا تعجب ہو رہا ہے۔ تجھ پہ۔ کیا تیرے جیسی اور بھی ان سڑکوں پہ بکھری نظر آتی ہیں۔"

"میں نے کہا نا دُنیا کی کہانیاں بڑی عجیب ہیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔" شازیہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگی۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

"کچھ عرصے ٹریننگ لے لے مجھ سے۔ دوست بننا پڑے گا ٹھیکیدار سے بات کرا دوں گی تیری۔"

حمیدہ نے اسے جاتے ہوئے کچھ رقم بھی دی اور شازیہ بری طرح الجھ گئی رات بھر الجھتی رہی۔ ایک پل نیند نہیں آئی تھی اسے۔ لیکن صبح کو اس نے آخری فیصلہ یہی کیا تھا کہ جب دنیا اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو کیا کیا جائے۔ عزت گنوانے سے بہتر تو یہ ہے کہ اس طرح زندگی گزاری جائے۔ حمیدہ نے اسے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں اس نے کہا۔

"نظر باز ان حالات میں بھی نہیں چھوڑتے اور اسے بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔" بہر حال حمیدہ سے اس کی خوب گہری دوستی ہو گئی۔ یہاں فقیروں کے ڈیرے میں کوئی اہم بات نہیں تھی۔ کہ کچھ بن کر آؤ اور کچھ بن کر جاؤ۔ کسی نے توجہ بھی نہیں دی تھی اور حمیدہ نے شازیہ کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر چہرے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اس نے ٹیلی ویژن اور وی سی آر کھول کر دے دیا۔

"ارے۔ یہاں تم نے یہ سب کچھ بھی رکھا ہوا ہے۔"

"یہاں کیا نہیں ہے شازیہ! بہت کچھ ہے یہاں مگر میں اس سے ایک خاص کام کرتی ہوں۔"

"کیا۔" شازیہ نے سوال کیا اور حمیدہ نے وی سی آر پر ایک فلم لگا دی۔ یہ جوڈو کراٹے سے متعلق تھی۔ اور اس میں باقاعدہ جوڈو کراٹے کے فن کے متعلق معلومات دی گئی تھیں۔

"یہ بھی ضروری ہے۔"

"کیا مطلب۔ یہ ہو..... یا..... یا..... ہی..... ہے..... کر کے ہاتھ اور لات چلانا اور سامنے موجود ایک درجن افراد کی پٹائی کر دینا۔ اس سے فن گداگری کا کیا تعلق۔"

"کتنی عمر ہے تمہاری۔"

"عمر جتنی بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ ابھی تمہیں زندگی کے پندرہ سے لے کر بیس سال تک بڑے محتاط گزارنے ہیں سڑکوں پر کوئی بھی شکل بنا کر گھومو تمہارا نوجوان ہونا سب سے سنگین بات ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے تمہارا۔ جو کہیں بھی کسی سنسان جگہ تم پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"ارے باپ رے کیوں ڈرا رہی ہو۔"

"ڈرا نہیں رہی ہوں۔ شازیہ! دوست بن گئی ہو تو زندگی کے سارے تجربات تمہیں دے رہی ہوں۔ میرے ساتھ جوڈو کراٹے سیکھ میں تو اچھا خاصا سیکھ چکی ہوں۔"

"ان فلموں سے۔"

"ہاں ہاں یہ فلمیں۔" بہت کچھ دیتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ کسی بھی سنسان جگہ جا کر دونوں باقاعدہ فلموں کے ایکشن کے مطابق مشق کیا کرتی تھیں۔ حمیدہ اس سے زیادہ تیز تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد حمیدہ نے اعتراف کیا کہ شازیہ طاقت ور بھی ہے اور ہر کام کو جلدی پک کر لینے کی ماسٹر۔ اچھا خاصا کام آ گیا تھا اور پھر پہلی بار شازیہ کو حمیدہ کی بات کا تجربہ ہوا۔ بالکل اتفاقیہ طور پر چھٹی کے دن وہ ایک سنسان سڑک پر جا نکلی تھی ایک گاڑی آ کر رکی۔ پہلے تھوڑی سی آگے چلی گئی تھی لیکن شازیہ کو دیکھ کر ریورس ہوئی اور اس کے پاس آ کر رک گئی۔

"ہیلو....." ایک نوجوان لڑکے نے کھڑکی سے سر نکال لیا۔ اور وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آجا۔ بیٹھ جا پیچھے سیر کروائیں تجھے۔"

"کہاں لے جاؤ گے بھیا!" شازیہ نے مسخرے پن سے کہا۔

"بکواس مت کر بہت زیادہ تیز بن رہی ہے چل جاوید اٹھا لے اسے۔" لڑکے نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا اور وہ دونوں نیچے اتر گئے۔ تب پہلی بار شازیہ کو یہ اندازہ ہوا کہ حمیدہ سے اچھا استاد اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تین چار ہی ہاتھوں اور لاتوں نے ان زنانہ نوجوانوں کو زمین چٹا دی اور اس کے بعد وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ پھر تو کئی ایسے واقعات پیش آئے دو تین افراد کی وہ آسانی سے پٹائی کر لیا کرتی

تھی اور اس طرح اب اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس دن بھی وہ ایک سنسان سڑک پر ہی جا رہی تھی کہ ایک قیمتی کار آ کر اس کے قریب رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لمڈھینگ بیٹھا ہوا تھا۔ دبلا پتلا پچکا ہوا چہرہ۔ چھوٹی سی ڈاڑھی، منہ اگال دان سے بنا ہوا اگر کھولتا تو یقینی طور پر سرخ رنگ کا لاوا بہہ نکلتا۔ چنانچہ منہ بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ برابر کی سیٹ پر ایک اچھی خاصی پروقار شخصیت نظر آ رہی تھی۔ شازیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"دے دو بابا اللہ کے نام پر۔"

"بات سنو..... بہت کچھ مل جائے گا تمہیں۔ ہمیں تھوڑا سا وقت دو گی۔" شرم نہیں آتی بیٹی کے برابر کی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص نیچے اتر گیا تھا۔

"دیکھو..... بے وقوف لڑکی میں....."

"ہاں ہاں۔ ماموں ہو نا تم میرے۔ جاؤ بابا جاؤ۔" لیکن اسی وقت دبلے پتلے اونٹ نما آدمی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ شازیہ نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک کھلا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رسید کیا۔ اور اس کی ٹانگوں میں سوئپ مارنے کی کوشش کی۔ جواب میں اس شخص نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور اس کو مروڑ کر اسے بغل میں دبا لیا۔ پھر کنپٹیوں پر ہاتھ ڈالا اور شازیہ کو یوں لگا جیسے اس کا سر کسی آہنی شکنجے میں جکڑا گیا ہو۔ اس شخص نے اس کی گردن پر کچھ اس طرح کا ہاتھ ڈالا کہ شازیہ کو ایک لمحے کے لیے چکر سا آیا اور اس کے بعد اس کے حواس گم ہو گئے۔ تب لمڈھینگ نے اسے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈالا اور دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ چند گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"ویسے میں آپ کو بتاؤں صوفی صاحب! یہ باقاعدہ اغوا کا کیس ہے اگر کسی نے ہمیں یہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا تو آسانی سے پولیس اسٹیشن میں جا کر اطلاع دے دے گا اور ہم اس کے اغوا کے الزام میں پکڑے جائیں گے۔" صوفی نے پہلے دروازہ کھول کر منہ میں بھرا ہوا سرخ طوفان زمین کی نذر کیا اس کے بعد دروازہ بند کر کے بولا۔

"جناب عالی! آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے کیس تو یہ اغوا کا ہی ہے۔"

"اور اگر یہ لڑکی ہمارے ساتھ تعاون پر تیار نہ ہوئی اور اس نے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ درج کرا دی تو۔"

"نمٹیں گے اللہ مالک ہے۔ ویسے واقعی بہت تیز لڑکی ہے۔"

"مگر صوفی صاحب! آپ نے اپنا ریکارڈ نہیں توڑا۔"

"اپنی چیزیں کون توڑتا ہے جناب!" صوفی نے معصومیت سے کہا۔

"واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ آپ نے بڑی آسانی سے اسے قابو میں کر لیا۔"

"غیر شادی شدہ ہوں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"شادی شدہ ہوتا تو ان خاتون پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا درویشوں کی دعا سے۔ لیکن ناتجربے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاری بعض اوقات انسان کی زندگی کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔"

"یار خدا کی قسم فلاسفر بھی ہو۔ ایسا ایسا فلسفہ ٹھوکتے ہو کہ طبیعت ہری ہو جاتی ہے۔"

"آداب عرض کرتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"بہرحال یہ ایک بڑا اور مشکل مرحلہ ہے۔ طے ہو جائے تو اچھی بات ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد کار اس عمارت میں داخل ہو گئی تھی جو ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور اسے گرین ہاؤس کا نام دے دیا گیا تھا۔ دلاور فوراً آیا اور اس نے دروازہ کھولا۔ اندر بے ہوش بھکارن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"دلاور اٹھاؤ اسے اور اندر لے چلو۔" دلاور نے لڑکی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے ایک ایسے اندرونی کمرے میں پہنچا دیا گیا جو خاص طریقے سے بنایا گیا تھا۔ اور اس کا سارا نظام جدید ترین کمپیوٹر سسٹم تھا۔ لڑکی کو بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ دونوں اس کے آس پاس موجود تھے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"صوفی صاحب کتنی دیر بعد ہوش میں آ جائے گی یہ۔"

"اصولی طور پر اسے ہوش میں آ جانا چاہئے جناب! میں تو گاڑی میں ہی محتاط تھا کیونکہ جن رگوں پر میں نے دباؤ ڈالا تھا درویشوں کی دعاؤں سے وہ بس تھوڑی دیر کے لیے حواس معطل کر دیتی ہیں باقی سب خیریت ہے۔" صوفی کے یہ جملے ختم ہوئے تھے کہ لڑکی کی آنکھیں کھلنے لگیں اور چند لمحات کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ جیسے ہی ہوش میں آئی اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور خونی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔

"ہم دونوں..... تم دونوں ایک بات سنو شازیہ ہے میرا نام۔ قتل کر دو گے مجھے لیکن عزت نہیں لٹنے دوں گی۔ بہت شریف باپ کی بیٹی ہوں۔"

"بیٹا! تم تمہیں تمہاری عزت لوٹنے کے لیے نہیں لائے۔ تم ہمیں محبت کا کوئی بھی نام دے کر ہمیں قبول کر سکتی ہو تم سے کچھ کام ہے ہمیں۔" کرنل رحیم شاہ نے نرم لہجے میں کہا۔ اور لڑکی کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ وہ بولی۔

"کوئی نئی چال چلنا چاہتے ہو۔ مگر اطمینان رکھو اب تم لوگوں کا بہت اچھا تجربہ ہو چکا ہے مجھے۔"

"تمہارے تجربے میں کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں ہم اگر تم قبول کرو۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور لڑکی اسے چونک کر دیکھنے لگی۔

"چھوٹی باجی! ہم تمہیں ذرا بھی پریشان نہیں کریں گے وعدہ ہے۔"

"کیوں ان مقدس جملوں کو بدنام کرتے ہو۔"

"دیکھو..... پہلے ہماری بات سن لو۔ اس کے بعد جو بھی فیصلہ چاہو کر لینا۔ بہتر ہے کہ بدزبانی نہ کرو۔ تاکہ بعد میں تمہیں خود شرمندگی نہ ہو۔"

"سناؤ۔" اور کرنل رحیم شاہ اسے اپنے موقف اور اپنے مقصد کے بارے میں بتانے لگے۔ شازیہ غور سے یہ سب کچھ سنتی رہی تھی۔

♥.....♥.....♥

ترین فورس کے ارکان کی تعداد پانچ ہو چکی تھی۔ نمبر ایک دلاور، نمبر دو شازیہ، دو کرنل رحیم شاہ کے بھتیجے، عادل اور فیضان تھے۔ جنہیں رازدار بنا لیا گیا تھا۔ پانچواں غلام قادر تھا۔ والدین کا تعلق مکران سے تھا۔ لیکن دارالحکومت میں آباد تھا۔

اور بڑی خوبیوں کا مالک کسی زمانے میں سنیما کے سامنے لائن لگایا کرتا تھا۔ مارتے خان کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن کبھی کبھی پٹتے خان بھی بن جاتا تھا اور یہ بھی سوفی صد صوفی کی دریافت تھی۔ غلام قادر اچھے خاصے تن و توش کا آدمی تھا۔ ذہین اور باعمل بھی تھا۔ لیکن بس تعلیم وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکا تھا۔ اور جب صوفی اور کرنل رحیم شاہ نے اس سے بھرپور تعاون کیا تو ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور اس نے باقاعدہ حلف برداری کی کہ ان لوگوں کا وفادار رہے گا اور بدن کا رونگٹا رونگٹا کاٹ دیا جائے۔ وطن کے مفاد کے خلاف کبھی کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ اس نے کہا۔

"مالک کا شکر ہے کہ اپن جاہل آدمی ہے تعلیم یافتہ لوگ جو ہوتا ہے نا وہ اللہ کے نام میں بھی گنجائش نکال لیتا ہے۔ اپن نے اگر پیدا کرنے والے کا قسم کھایا بس آپ سمجھ لو کہ وہ ہماری زندگی کا مقصد بن گیا۔ بات خلاص۔" چنانچہ یہ پانچ ممبر ہو چکے تھے۔ اور کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا تھا۔

"ایک دو افراد اور ڈھنگ کے مل جائیں تو کورم پورا ہو جائے گا۔ اور اب اس کے بعد باقاعدہ کام کا آغاز کیا جائے گا مختلف قسم کی خبریں ہوا کرتی ہیں۔ خبروں کو دینا بھی اخبارات کی ذمے داری ہوتی ہے لیکن بہرحال بہت ہی اہم خبروں کو اتنا مختصر کر دیا جاتا ہے کہ ان کی اہمیت میں کمی ہو جائے اور صحافتی ذمے داریاں بھی پوری ہو جائیں ایسے کام بڑے مشکل ہوتے ہیں چنانچہ دونوں باتوں کا خیال رکھا گیا تھا وہ یہ کہ ان خبروں سے سنسنی نہ پھیلنے پائے اور عوامی حلقے اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں نیز یہ کہ اپوزیشن کے اعتراضات اور دوسرے لوگوں کی عدم واقفیت کا جواب دیا جا سکے چنانچہ کل ان پانچویں اہم ترین افراد کی سچ بولنے والی کاروائیوں کی جنہیں ملکی معاملات کے لیے بدترین لمحے قرار دیا گیا تھی۔ گول مول سے الفاظ میں اخبارات میں جگہ دی گئی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ کی نگاہیں بہت گہری تھیں۔ اخبار کی ان مختصر خبروں کو پڑھ کر وہ شدید حیرت کا شکار ہو گئے۔ اور اس کے بعد فوراً ہی صوفی سے رابطہ قائم کیا گیا جو چھٹی لے کر اپنے ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے کرنل رحیم شاہ نے اسے فوراً گرین ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں صوفی اپنی مشہور زمانہ موٹر سائیکل پر گرین ہاؤس پہنچ گیا کرنل رحیم شاہ برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے پرتپاک انداز میں صوفی کا خیر مقدم کیا۔

"کہیے صوفی صاحب! آپ کے اہل خانہ بہ خیریت ہیں۔"

"درویشوں کی دعا سے سب خیریت ہے۔ ویسے میرے اہل خانہ میں ایک عدد طوطا ایک بکری اور پانچ مرغیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ممن خان کے ہوٹل پر نیاز علی کام کرتا ہے۔ وہی میری غیر موجودگی میں میرے اہل خانہ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا اور کرنل رحیم ہنسنے لگے پھر بولے۔

"آیئے تشریف رکھیے اصل میں ہم لوگ ابھی تک اپنی لائن آف ایکشن نہیں بنا سکے۔ بے شک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرین فورس میں جو ممبر شامل ہیں۔ ان کی تربیت کی جارہی ہے اور انہیں اس قابل بنایا جارہا ہے کہ آگے چل کر وہ ملکی مفادات کے لیے کام کریں۔ لیکن ہمیں اپنے لیے جگہ بنانے کے لیے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ کچھ اخبارات ہیں۔ میں نے ایک خبر پڑھی اور میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ ذرا اٹھا کر دیکھوں کہ پچھلے کچھ دنوں کے اخبارات کیا کہہ رہے ہیں۔ ولاور سے پرانے اخبارات مختلف جگہوں سے منگوائے اور آپ دیکھیے میں نے یہ مارکنگ کی ہے۔" صوفی نے وہ چھوٹی سی خبر پڑھی جو حاشیے میں تھی۔ لکھا تھا۔

"حیرت انگیز طور پر ملک کے ماہر ترین سائنس دان نے ایسے سائنسی رازوں کا انکشاف کر دیا۔ جو حکومت کی پالیسی کے مطابق انتہائی خفیہ اہم حیثیت کے حامل تھے۔"

پوری خبر میں تفصیل تھی اور سائنس دان مکمل طور پر ایک ذمے دار آدمی ہے لیکن بس کسی پراسرار عمل کے ذریعے وہ جذباتی ہو گئے اور انہوں نے انتہائی قیمتی راز منظر عام پر پیش کر دیے۔ کرنل رحیم نے کہا۔

"یہ تو خیر ایک خبر تھی یہ دیکھو یہ کون کون سے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ وزارت دفاع کے فرسٹ سیکرٹری نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ابھی تک اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق یہ پانچ لوگ ہیں جنہوں نے ملکی راز افشا کر دیے ہیں۔ یہ پانچوں زیر حراست ہیں۔ لیکن تم اندازہ لگاؤ صوفی کہ کتنی سنگین اور خوف ناک بات ہے۔ ایک اشارہ جگہ جگہ دیا جارہا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کسی پراسرار عمل کے شکار ہو گئے۔ ورنہ ان کا ماضی بے داغ ہے اور بھول کر بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے صوفی کی پیشانی شکن آلود تھی۔ اس نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بات واقعی سنسنی خیز ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"ان خبروں کو صرف ضرورتاً شائع کیا گیا ہے ورنہ ان کے پس منظر میں تو بہت کچھ ہوگا۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بہت کچھ کے بارے میں ہمیں کیسے معلوم ہوگا۔ میں یہی تمام باتیں سوچ رہا تھا اور میں نے آپ سے مشورہ کرنے کے لیے مسٹر صوفی اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے سنبھال رکھا ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ شاہ میر خان میرے قریبی عزیز ہیں اور میرے ان کے درمیان دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ وزارت دفاع کے اس ذمے دار شخص کو اپنی خدمات پیش کر دوں اور ویسے بھی میں اس سوچ میں تھا کہ کسی اتنے ہی اہم محکمے سے ہمارا رابطہ ہونا چاہیے تاکہ ہم آگے اپنا کام کر سکیں۔"

"درست فرمایا آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ میں شاہ میر خاں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان دنوں چونکہ ملکی حالات ایک خاص سنسنی کا شکار ہو گئے تھے جس کا انکشاف بھی کھل کر نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ایک مخصوص عمل کے تحت ساری مشینری حرکت میں تھی۔ شاہ میر خان سے یہ مشکل تمام رابطہ قائم ہو سکا تھا۔

"میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں شاہ میر۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"اصل میں ہم لوگ ایک انوکھی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں اور میں ہر لمحے مصروف ہوں لیکن رات کو ساڑھے دس بجے کے بعد تم آجانا اور پہلے فون کر لینا۔"

"نہیں۔ میں آتو ساڑھے دس بجے کے بعد ہی جاؤں گا لیکن فون کر کے نہیں آؤں گا تمہیں

ساڑھے دس بجے کے بعد میرا انتظار کرنا ہوگا۔ تم یہ سمجھ لو کہ جس مشکل میں تم پھنسے ہوئے ہو اسی سلسلے میں میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں خدا حافظ!" پھر ساڑھے دس بجے کرنل رحیم شاہ شاہ میر خان کی کوٹھی پر پہنچ گیا تھا۔ گارڈ کو خصوصی طور پر اس کے بارے میں ہدایت کر دی گئی تھی۔ شاہ میر خاں کے چہرے پر تھکن اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ ویسے تو خیر مجھے تم سے ملاقات کرنا ہی تھی ظاہر بات ہے میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے لیکن تم نے کچھ الفاظ کہہ کر مجھے ایک عجیب سی ذہنی الجھن میں گرفتار کر دیا۔ اور تمہارا موبائل بھی مجھے بند ہی ملا۔"

"جان بوجھ کر ایسا کیا تھا میں نے کہ تم کہیں کوئی بہانہ نہ کر دو مجھے۔" یار ایسی بات نہیں ہے بہانہ بھلا اور وہ بھی تم سے چلو خیر بیٹھو۔"

"جس مشکل میں تم گرفتار ہو شاہ میر خاں وہ یقیناً ان پانچ افراد سے متعلق ہے۔ جنہوں نے ملکی راز افشا کیے ہیں۔"

"اوہو۔ تمہیں کیسے معلوم۔"

"جانتے ہو میرا تعلق کہاں رہا ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس سے، جو خبریں دے کر خانہ پری کی گئی ہے، عام لوگوں کے لیے بے شک انہیں بے اثر بنا دیا گیا ہے۔ لیکن میرے لیے بھی بے اثر ہو سکتی ہیں وہ۔"

"خدا کی قسم! جو کچھ ہوا اس سے پوری حکومت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ چلو خیر سرکاری عہدے داران اپنے عہدوں کے لیے تو خیر پریشان ہیں ہی لیکن تم یہ دیکھو کہ ان عوامل سے شدید خطرہ محسوس کیا جارہا ہے جن کی بدولت یہ سب کچھ ہوا۔"

"میں تم سے یہی سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میر خان اور میں زیادہ وقت نہیں لوں گا تمہارا۔"

"ساڑھے گیارہ بجے مجھے پھر جانا ہے اور ایک میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔"

"جانتا ہوں۔ جانتا ہوں کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں نے اس سلسلے میں نئے سرے سے کچھ کارروائیوں کا آغاز کیا ہے۔ تمہاری حکومت نے تو مجھے معذور سمجھ کر میری چھٹی کر دی تھی۔ لیکن میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اپنے کام پورے کرتا رہوں۔ جو ایک محب وطن فوجی کی ذمے داری ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں باقاعدہ کام شروع کر دیا کچھ افراد میرے ساتھی ہیں مجھے ذرا تفصیل بتا دو اس سارے مسئلے کی تاکہ میں آگے کام شروع کر سکوں۔" اور شاہ میر خان نے وہ تمام واقعات پوری تفصیل سے بتا دیے۔ جن کی تفصیل اخبارات کی خبروں میں موجود نہیں تھی۔ اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ کچھ انجکشن ایسے ہیں جو ان لوگوں کے معاملات میں مشترک پائے گئے ہیں۔ یہی بتایا کہ اس سلسلے میں ایجنسیاں حرکت میں آگئیں ہیں اور شدت کے ساتھ تحقیقات ہو رہی ہے۔

"میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں شاہ میر خان، اپنے طریقے سے میں اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اگر کسی مسئلے پر مجھے پولیس یا آرمی کی یا صدر کی ضرورت پیش آگئی تو کیا تم میری مدد کرو گے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو کرنل رحیم شاہ! دو ہی باتیں ہیں اول تو تم خود ایک ذمہ دار فوجی رہے ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب یہ الگ بات ہے تمہیں کیا دی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم میرے لیے انتہائی معتمد آدمی ہو۔ میرے لیے نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں حکومت کا کوئی بھی شخص جس کا تعلق خاص طور سے ملٹری سے ہوگا۔ کرنل رحیم شاہ کا شاندار ماضی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔ کہ وہ ایک خالص محب وطن شخصیت ہے۔" کرنل رحیم شاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"تم تیاریاں کرو اور جاؤ۔ مجھے بس انہی الفاظ کی ضرورت تھی۔"

"اور سنو۔ رحیم شاہ! یہ میرا خاص موبائل نمبر رکھ لو۔ جو صرف چند لوگوں کے علم میں ہے اور جو ہر لمحے موجود ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔" کرنل رحیم شاہ مطمئن انداز میں وہاں سے واپس لوٹا تھا اور اس کے بعد صوفی کے ساتھ اس کی میٹنگ ہوئی۔ اور اس نے صوفی سے کہا۔

"بس صوفی صاحب! آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ہمارا مرحلہ ہے۔"

"میں نے پیر دمڑی شاہ کے مزار پر جا کر منت مانگ لی ہے۔ اور مجھے وہاں سے اشارے موصول ہو رہے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے مجھ سے مدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

"دمڑی شاہ۔"

"جی حضور۔ ایک ریگستانی علاقے میں چھوٹا سا مزار ہے ان کا۔ کم لوگ جاتے ہیں اس طرف لیکن حق اللہ میں کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔"

"صوفی صاحب! میں بزرگوں سے اتنی ہی عقیدت رکھتا ہوں جتنی آپ لیکن براہ کرم یہاں آپ تھوڑا سا پریکٹیکل ہو جایئے۔"

"پوری زندگی گزر گئی جناب والا، درویشوں کے کرم سے انہی درویشوں کی دعاؤں نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ حق اللہ۔ حق اللہ۔ حق اللہ" صوفی نعرے لگانے لگا۔

"پھر آپ اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل بنایئے۔"

"رہنمائی ہوگی۔ رہنمائی ہوگی۔" صوفی پر اس وقت وجد طاری تھا کرنل رحیم شاہ پر تشویش طور پر خاموش ہو گیا۔

♥.....♥.....♥

ممن خان نے دو نئی بھینسیں خریدی تھیں۔ اور باقاعدہ ایک تقریب کر ڈالی تھی۔ آج شام کو اس کے ہوٹل پر دوستوں کی محفل جمنے والی تھی۔ صوفی کے ڈیرے پر خود آیا تھا۔

"اما صوفی صاحب! کہیں بھاگ جانے کی تیاریوں لگے ہو کیا۔"

"نہیں آیئے۔ ممن خان صاحب درویشوں کی دعا سے کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا۔"

"پھر یہ کپڑوں پر استری کیوں ہو رہی ہے۔" ممن خان نے سامنے زمین پر بچھی ہوئی چادر پر پتلون کو دیکھا اور ساتھ ہی پیتل کے اس برتن کو جسے پتلون پر رگڑ رگڑ کر استری کی جا رہی تھی۔ صوفی اپنا کام ایسے ہی چلا لیا کرتا تھا!

"ارے وہ کچھ نہیں بس آج کل ذرا خان صاحب کی طرف سے صاف ستھرے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

"لگ رہا ہے بہت دن سے بلکہ عزیزی بتا رہا تھا کہ اب ٹھیلا پل پر نہیں لگتا۔ کہیں جگہ بدل ہے کیا۔"

"وہ بس عارضی طور پر بند کر لیا ہے۔"

"ایں اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔ جبھی تو ہم کہہ رہے تھے کہ آج کل ہر مال دس روپے کی گردان کم ہی ہو رہی ہے۔ کیا بات ہے کیا کاروبار مندا پڑ گیا تھا۔"

"نہیں ممن خان صاحب! کرم فرما جینے نہیں دیتے۔ ہماری زندگی کا مقصد تو صرف دو روٹی ہے درویشوں کی دعاؤں سے ہمیں مل جائے اور ہمارے ذریعے کچھ ضرورت مندوں کو مل جائے بس اور کیا درکار ہوتا ہے۔"

"تو کیا پھر محکمہ پولیس میں گھس گئے۔"

"نہیں اپنا ہی کام شروع کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیا مطلب؟ کیا بیچ رہے ہو آج کل۔"

"نہیں بیچ تو کچھ نہیں رہے۔ کچھ غیر سرکاری کام ہی ہیں۔ ایک پرائیویٹ ادارے سے منسلک ہو گئے ہیں۔"

"اچھا خیر چھوڑو۔ دو نئی بھینسیں خریدی ہیں نا۔ شام کو پبلک کو بلا لیا ہے۔ ذرا بریانی کی دیگ پکائی ہے۔ کچھ بیٹھا کر لیں گے شام کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے گا۔"

"مبارک باد پیشگی وصول کیجیے۔"

"اماں کہیں اڑ مت جائیو تمہارا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"نہیں۔ ممن خان! آپ سے منحرف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سائے سے محروم ہو جائے۔"

"اللہ جیتا رکھے۔ تم جیسا پڑوسی بھی تو ہو کوئی۔ اور پڑوسی کیا اب تو میاں بھئی رشتے دار بھی تم ہو۔ خاندان والے بھی تم۔ اچھا چلتا ہوں ذرا دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ بریانی بھی ٹھیک پکوانی ہے ورنہ یہ بات تو تم جانتے ہو صوفی میاں! کہ میرے ہاں بریانی کھانے والے معمولی لوگ نہیں۔ صحیح معنوں میں بریانی کی تاریخ ہم ہی سے منسلک ہے۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے ان کھانے والوں کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ بریانی ہوتی کیا چیز ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ہم حاضر ہو جائیں گے۔" شام کو بڑے اہتمام کے ساتھ صوفی ممن خان کے ہوٹل کے بیچ پر موجود تھا۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ تمام ہی شناسا موجود تھے۔ صوفی نے خاص طور سے کرنل رحیم شاہ کو فون کر کے کہا تھا کہ آج کی شام دوستوں کے نام ہے۔ کسی مسئلے میں نہیں الجھے گا۔ رحیم شاہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی بہر حال اس وقت خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ بریانی کی خوشبو چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی۔ اور صوفی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو بتا رہا تھا۔

"میاں! یہ شہنشاہوں نے بھی بڑی آخری جوت رکھتی تھی درویشوں کی دعاؤں سے عیش و عشرت، عیاشی، کھانا پینا ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ اب یہ بریانی ہی دیکھ لو دلی اور لکھنو کی چلتی تھی لکھنو والوں کو تم جانو کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نخروں کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ بڑی نفاست سے ہر چیز بنتی تھی۔ ادھر موتیا بنا یعنی موتیا پلاؤ۔ جس میں ایک ایک بوٹی کو صفائی کر کے ڈالا گیا۔ چاول کی سفیدی پر نشان نہ آنے پائے۔ تیار ہو گیا موتیا اور پہنچا دلی والوں کے پاس تو دلی والوں نے سارے مسالے اکٹھے کیے سالن پکایا اور چاولوں میں ڈال کر بریانی بنا لی۔ مرچوں کا بناؤ وہی دلی والا سی کرو اور کھاتے جاؤ۔ اس طرح سے وہاں، دو پیازہ پکا کیا بات ہے دو پیازے کی۔ بوٹی پر اگر چھچھڑے کا نشان نظر آ گیا۔ تو دیگیں تباہ کر دی گئیں۔ دلی والوں کو پتا چلا تو پکا دی گئی تمہاری۔ اور وہ مسالے ڈالے گئے کہ رہے نام درویشوں کا۔" صوفی نے کہا اسی وقت ایک گٹھے ہوئے بدن کا تو جوان آدمی ہوٹل کے دروازے پر نظر آیا۔ یہ شاہی تھا اسی محلے کا رہنے والا سب کا دوست لیکن اس کی چمچماتی ہوئی موٹر سائیکل اور قیمتی لباس صوفی کے لیے خاص طور سے حیرانی کا باعث تھا چونکہ بہت دن بعد اس نے شاہی کو دیکھا تھا۔

"درویش رحم کریں! یہ اپنا شاہی تو بڑا چمک رہا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"ہاں۔ آج کل اس کی اڑ کے لگ رہی ہے۔ وہ موٹر سائیکل نہیں دیکھی چمچماتی ہوئی یا ہا ایک سو بیس۔"

"ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں۔" شاہی اندر آ گیا۔ ایک ایک سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ صوفی کی طرف بڑھا۔

"انسپکٹر صاحب! کیسے حال ہیں آپ کے۔"

"درویشوں کی دعائیں ہیں بس، لیکن تم نے ہمیں انسپکٹر کہنا نہیں چھوڑا۔"

"انسپکٹر تو تم شکل سے ہی لگتے ہو ڈیوٹی پر ہو یا نہ ہو۔"

"پھر سوچ لو۔ پولیس کا کام تو تفتیش کرنا ہے۔ تمہارے بارے میں تفتیش شروع کر دی تو مشکل میں نہ پڑ جاؤ درویشوں کی دعاؤں سے۔" جواب میں سب لوگ ہنسنے لگے۔ شاہی کے سامنے بریانی پیش کی گئی۔ لیکن صوفی کو بہر حال حیرت تھی۔ اپنی رگ تجسس کو نہ دبا سکا۔ کہنے لگا۔

"اور شاہی! تم نے وقت نہیں دیا مجھے بہت دن کے بعد ملاقات کر رہا ہوں تم سے درویشوں کے کرم سے۔"

"اماں! وقت ہے تمہارے لیے جب بھی کہو جان حاضر ہے۔" شاہی نے کہا۔

"یہاں سے فارغ ہو کر گھر چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ممن خان کے ہوٹل سے لے کر صوفی شاہی کو لے کر سیدھا اپنی رہائش گاہ پہنچا تھا۔ شاہی مسکرا کر اس کا گھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

"یار! صوفی صاحب زمین جنبد نہ جنبد اپنے صوفی صاحب! یہ گھر ہمیشہ ایک ہی شکل میں نظر آتا ہے۔ یار! کچھ بدلو اسے۔"

"شاہی تم ہمارے یار ہو نا درویشوں کے کرم سے۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

"کچھ عرصے پہلے تم راج گیری کیا کرتے تھے۔ گھر بناتے تھے مستری تھے۔"

"تھے کیا اب بھی ہوں۔"

"مگر اس وقت تمہارے یہ ٹھاٹ باٹ نہیں تھے۔"

"بس اللہ کا کرم ہے صوفی میاں! مالک جب دینا چاہتا ہے تو کہیں سے بھی دے دیتا ہے۔"

"یہی تم سے معلوم کرنا چاہتا تھا میں دیکھو..... میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے درویشوں کی دعاؤں سے اس دور میں دوست پیدا کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس وقت ہے جب انسان تمام اخلاقیات اور شرافت اپنے اوپر سے جھاڑ کر بے لباس ہو جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور مشکل اس وقت ہے جب وہ اپنی تمام تر شرافتیں اور انسانیت کے ساتھ عزت اور دیانت داری سے روٹی کمانا چاہے۔ مجھے معاف کرنا شاہی! تمہارا حلیہ بدل گیا ہے۔ یہ قیمتی لباس اور یہ موٹر سائیکل میرے دوست نہ ہوتے تو میں تمہاری طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ بس یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کسی ایسے دھندے میں تو نہیں پڑ گئے جو دو نمبر ہو اور بعد میں تمہارے لیے مشکل بن جائے۔"

"نہیں میاں بھائی صوفی! میرے ماں باپ بھی اچھے نیک لوگ تھے اور انہوں نے مجھے عزت کی روٹی اور حلال کی روزی کما کر کھلائی۔ میں اتنا برا بھی نہیں ہوں کہ دو نمبر کے دھندوں میں پڑ جاتا رہا جہاں تک سوال میری حالت بدلنے کا ہے تو مولا کریم عزت دے بابا صفر کو جس نے بہت کچھ دیا ہے مجھے۔"

صوفی چونک کر بولا۔

کیا نام لیا تم نے؟" جواب میں شاہی ہنسنے لگا پھر بولا۔

"بابا صفر!"

"واہ۔ یہ کون صاحب ہیں۔"

"میاں بڑے پہنچے ہوئے ہیں چلو تمہارے بھی وارے نیارے کرا دوں گا۔"

"کوئی بزرگ ہیں کیا۔"

"ایسے ویسے۔ پکے اللہ والے ہیں وہ جو کہتے ہیں نا کہ تارک الدنیا، تارک الدنیا۔ ہاں دنیا کو ترک کیا ہوا ہے۔ کیا شان ہے مزار و ریافت ہو رہے ہیں کہیں سے حکم دے کر چلے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لمبی کہانی ہے۔"

"اماں قسم ہے تمہیں! ذرا سناؤ تو سہی مجھے۔" صوفی نے پانوں کی ڈبیا اور چھالی تمباکو کا بٹوہ سامنے رکھتے ہوئے دانت نکال کر کہا۔ پھر ایک پان شاہی کو پیش کیا گیا اور دوسری گلوری صوفی نے خود اپنی جیب میں رکھ لی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

"واہ..... کیا اچھا نام ہے بابا صفر! مگر یہ کون ہیں اور کہاں سے مل گئے تمہیں۔" صوفی نے پوری دلچسپی کے ساتھ پوچھا اور شاہی نے آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"زیادہ دن پرانی بات نہیں ہے۔ یہاں سے جونا پوری جا رہا تھا۔ بس میں بیٹھ کر جونا پوری کے لیے وہ بسیں چلتی کیا ہیں چل لیتی ہیں۔ جہاں تک ان کی ہمت ہوتی ہے۔ راستے میں بس خراب ہو گئی اور ڈرائیور نے مسافروں سے کہا کہ وہ اتر جائیں کوئی دوسری بس آئی تو اس میں بٹھا دیا جائے گا۔ میں بھی اتر گیا۔ جونا پوری کے لیے بسیں دو دو تین گھنٹے کے بعد آتی ہیں۔ سارے مسافر پریشان ہو گئے تھے۔ ڈرائیور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ یہی بس ٹھیک ہو جائے۔ سب ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے میں بھی سڑک سے نیچے اتر کر آگے بڑھ گیا اور ایک جگہ ایسی ٹھنڈی اور سایہ دار نظر آئی کہ میں نے سوچا کہ چلو تھوڑی دیر آرام ہی کرلوں۔ درخت کے نیچے ڈیرا لگا دیا میں نے۔ سر کے نیچے اینٹ رکھی اور بھاء میاں سو گئے۔ بس وہ کہتے ہیں نا کہ تقدیر کو جب دینا ہوتا ہے تو ایسے ہی دیتی ہے گہری نیند آ گئی۔ کسی نے دیکھا نہیں کہ میں سو گیا۔ وہی بس ٹھیک ہوئی اور چلی گئی وہاں سے..... اور میں سوتا پڑا رہ گیا۔ اپنی نیند تو مشہور ہے گدھے گھوڑے سب بیچ دیتے ہیں۔ تو بس سوتے رہے اور صوفی میاں وہیں رات ہوگئی۔ نہ جانے کون سا ٹائم تھا جو آنکھ کھلی ہر طرف گھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قسم اللہ کی ہوا ہی کھسک گئی۔ جب گزرے ہوئے واقعات یاد آئے تو جان ہی نکل گئی۔ وہ علاقہ تو کالی کھتی کا علاقہ ہے۔ کالی کھتی پتا ہے نا آپ کو۔ جہاں پہلے اینٹوں کے بھٹے ہوا کرتے تھے۔ بعد میں نہ جانے کیوں وہاں سے بھٹے ختم ہو گئے۔ بہرحال ہم گرتے پڑتے سڑک پر آ گئے۔ مگر بے سود، بھلا اس وقت یہاں سے کسی بس کے گزرنے کا کیا سوال تھا۔ جان ہی نکل گئی ہم نے سوچا کہ چلو شاہی آخری دن آ گیا ہے زندگی کا۔ بس مولا کی یاد میں بیٹھ گئے کہ مولا بچالے اس رات کو، صبح ہی صبح چل پڑیں گے جو ہوگا دیکھا جائے میاں کوئی گھنٹہ گزرا تھا کہ دور سے روشنی نظر آئی۔ اب ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ویرانے میں کس نے موم بتی جلا دی ہے۔ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہئے پھر ہمت کی اور چل پڑے اس طرف وہاں جا کر دیکھا تو ایک عجیب سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ایک گھر جیسا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ گھر یہاں کس نے بنا لیا ہے۔ پھر وہیں ہماری ملاقات ان بزرگ سے ہوئی سائے کو دیکھ کر ہی جان نکل گئی تھی۔ پر بڑی ہمدردی سے انہوں نے کہا۔

"بیٹا ڈرتے نہیں ہیں۔ انسان کو تو اللہ پاک نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے اور اشرف کو کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے۔" ہمیں ایک دم یاد آ گیا کہ ہمارے تایا کا نام اشرف تھا۔ ہم نے کہا۔

'ڈر کون رہا ہے۔ اگر ڈر رہے ہوتے تو ادھر آتے کائے کو۔" بزرگ نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

"چائے پیو گے۔" ہم نے کہا۔

"میاں سبحان اللہ۔ چائے مل گئی تو سمجھ لو زندگی مل گئی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے صوفی صاحب ممن بھائی سے دوستی چائے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مگر اس ٹائم ممن بھائی چائے میں پوستے ڈالتے تھے بعد میں لوگوں کے کہنے سننے پر انہوں نے یہ دھندا ترک کر دیا۔ بلکہ آپ ہی نے تو انہیں منع کیا تھا اور روکا تھا۔ چائے میں ڈوڈے ڈالنے کو۔"

"درویشوں کی دعا سے۔" صوفی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر میاں ماننے والا ہو تو ایسا ہو دوستی نبھا دی ممن خان نے۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔"

"ہاں تو ہم بات کر رہے تھے ان بزرگ کی۔ چائے پلائی اور کیا چائے پلائی۔ بس مزہ آ گیا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" پھر ہم نے ان سے پوچھا کہ۔ "چچا میاں آپ کا نام کیا ہے؟" دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے پھر بولے۔

"ناموں سے کیا ہوتا ہے بیٹا! انسان کا عمل ہی نام بن جاتا ہے۔ میں تو ابھی صفر ہوں۔" ہم نے کہا۔

"اماں ابا تھے تمہارے؟ بولے کائے کو نہیں تھے۔" ہم نے کہا۔

"انہوں نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟" کہنے لگے۔

"رکھا ہوگا کچھ ہم بھول گئے۔ اب تو ہم اپنے آپ کو صفر کہتے ہیں۔ یعنی ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"چچا میاں صفر کا وزن جانتے ہو کتنا ہوتا ہے۔ ہزاروں کے حساب سے بڑھتا ہے الف پر لگا دو دس بن جاتا ہے، دس سو بن جاتا سو ہزار، صفر تو بڑی بھاری چیز ہوتی ہے۔" ہنسنے لگے بولے کہ۔ "آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو" پھر کہنے لگے کہ۔ "ہمیں حکم دے کر یہاں بھیجا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ایک باکرامت ہستی یہاں کی زمین میں اکیلی سو رہی ہے اس کا ساتھ دو۔" ہم نے کہا۔ "چچا میاں کائے کو ڈرا رہے ہو۔ کس کی بات کر رہے ہو آخر۔ تو زمین کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ۔ "دیکھو وہ دیکھو اور صوفی صاحب ہم نے جو دیکھا قسم اللہ کی کیا بتائیں آپ کو۔ جس طرف انہوں نے اشارہ کیا وہاں سپاٹ زمین سے اچانک ہی روشنیاں پھوٹ پڑیں اور ایسی روشنی کہ بس دیکھنے والے دیکھیں۔ اس روشنی میں ہمیں ایک قبر نظر آئی۔ قبر تو خیر جیسی تھی مگر چادر اس پر ہری پڑی ہوئی تھی اور کیا ہری ہری روشنی بکھر گئی ہر طرف ہم تو آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ ساری جان سے لرز گئے تھے ہم بڑی مشکل سے ہم نے کہا کہ چچا میاں کیا بزرگ ہستی کی کرامت ہے ہمیں حکم ملا ہے کہ یہاں ان کا مزار بنایا جائے۔ تم جو کوئی بھی ہو یہ بتاؤ۔ بزرگوں سے کوئی دلچسپی ہے، ہم نے کہا کہ۔ "کیا بات کرتے ہو چچا میاں بزرگ تو ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں انہی کے سائے میں تو پل بڑھ رہے ہیں کہنے لگے۔" یہاں مزار بنا دو۔ تمہیں اس کا صلہ ملے گا۔" ہم نے کہا کہ ہر چیز صلے کے لیے تو نہیں ہوتی۔ ہم دل وجان سے تیار ہیں اور آپ تو یہ بات جانتے ہو صوفی صاحب کہ اپنے نہ کوئی آگے ہے اور نہ پیچھے تو ہم نے کہا کہ صبح سے کام شروع کر دیں گے۔ مگر وہ صفر بابا جو ہے نا بندہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سارا سامان ہمیں نکال کر دیا کدال پھاوڑا اور بس رات گزرنے کے بعد صبح کو ہم نے کام شروع کر دیا ویسے بھی اپنا تو کام یہی ہے تم جانتے ہو۔ ساری نشان دہی کرنے کے بعد ہم نے سب سے پہلے وہاں مٹی ڈال کر قبر بنا دی۔ پھول بھی چچا میاں نے خود ہی لا کر دیے تھے اور کہاں سے لا کر دیے تھے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ بس جناب ادھر کام شروع کر دیا۔ صفر بابا کا کہنا ہے کہ وہاں کوئی باقاعدہ مزار نہیں تعمیر کرنا۔ ایسی بزرگ، ہستیوں کو عمارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس وہ چاہتے ہیں کہ گنے چنے لوگ وہاں آتے رہیں اور ان بزرگ کے لیے فاتحہ خوانی کرتے رہیں۔ خود بابا صفر مجاور بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اب ہم کو ان کے بہت سے کام کرنے ہیں۔ بڑے کام باقی ہیں۔ انہوں نے ہماری بہتری کے لیے دعائیں بھی کیں اور کیا بزرگ ہستی ہیں میاں گھر میں بیٹھ کر پیسے ملنا شروع ہو گئے۔ کبھی کہیں سے کوئی رقم آتی تھی کبھی کہیں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"حق اللہ۔ حق اللہ۔ درویشوں کا ظہور اسی انداز میں ہوتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ یار ہم بھی چلیں گے تمہارے ساتھ۔"

"جب مرضی آئے چلو اپنی تو جاگیر ہے وہ جگہ۔"

"قبر وغیرہ کا کام پورا ہو گیا۔"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو کام کر رہے ہیں۔ ہم، پکی چار دیواری بنانے کے لیے کہا ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ چچا میاں سے مطلب یہ کہ صفر بابا سے اور کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر کام کر دیں گے۔"

"بھئی۔ میں بھی چلوں گا اس نیک کام میں تو حصہ لینا درویشوں کی مہربانی ہوتی ہے۔ ویسے یہ موٹر سائیکل وغیرہ بھی۔"

"ہاں نا۔ بولا نا بس کہیں نہ کہیں سے رقم مل جاتی ہے اسی سے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کبھی نیکے کے نیچے کبھی دیوار کے طاق سے کبھی راستے میں پڑی مل جاتی ہے۔ بس جو مانگیں اللہ پاک دے دیتا ہے، کل چلو ہمارے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے چلیں گے ساتھ ساتھ، ایسے موقع بھلا چھوڑنے کے لیے ہوتے ہی ہیں۔" صوفی بہت کچھ سوچتا رہا تھا۔ دوسرے دن یہ بات طے پائی تھی کہ صبح ہی چلیں گے۔ دوسری صبح شاہی اپنی موٹر سائیکل پر پہنچ گیا۔ صوفی اپنی موٹر سائیکل کو جگہ جگہ سے تیل دے رہا تھا۔

"ممن خان سے حلوہ پوری کے لیے کہہ کر آیا ہوں ابھی فخرو لے کر آ رہا ہوگا۔ ناشتا کرتے ہی نکل چلیں گے۔ یہ اپنی پھٹ پھٹیا کیوں صاف کر رہے ہو؟"

"دونوں گاڑیاں لے کر چلیں گے۔"

"اماں معاف کرو بھائی ایک دفعہ یاد ہے ہم لوگ گئے تھے اس پر چار میل تک مجھے دھکا لگانا پڑا تھا تمہاری اس پھٹ پھٹیا کو میری گاڑی پر چلو برانڈ نیو ہے۔ ذرا اس کی چال مستانی دیکھنا۔" صوفی نے شرمندگی سے گردن ہلا دی تھی۔

ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے صوفی نے اپنا قومی لباس پہنا۔ یعنی شیروانی اور ڈھیلا پائجامہ، بہت کچھ کمایا تھا اور بہت کچھ کماتا رہتا تھا۔ لیکن پتا نہیں یہ اس کی فطرت کا کون سا رنگ تھا اور ایسا کیوں تھا کہ ہمیشہ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ موٹر سائیکل آنی جانی چیز ہے۔ کئی بار بکی تھی اور خریدنے والے ہاتھ جوڑ کر واپس کر گئے تھے اور اپنی رقم واپس کر گئے تھے اور صوفی صاحب! اس موٹر سائیکل کو چلانا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ صوفی دماغ کا ٹھنڈا آدمی تھا بس ایک بار غصے میں کسی سے کہا تھا کہ میاں موٹر سائیکل چلانا تو سیکھ لو پہلے۔ یہ ایسی موٹر سائیکل ہے کہ موت کے کنویں میں بھی چلاؤ گے تو کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ لینے والے نے کہا تھا کہ حضرت اس کا سڑکوں پر چلانا ہی موت کے کنویں میں چلانے کے مترادف ہے۔ جان کھونے کے لیے اس سے اچھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس وقت صوفی صاحب شاہی کی موٹر بائیک پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور شاہی انہیں صفر بابا کے بارے میں تفصیل بتاتا جا رہا تھا۔

"خود بہ خود غائب ہو جاتے ہیں سارا سارا دن پتا نہیں چلتا لیکن جب ان کی قیام گاہ میں داخل ہو

تو پتا چلا کہ تسبیح کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب کہ پہلے پوری قیام گاہ کا جائزہ لینے کے باوجود کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔"

"درویش رحم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا جانے کس بھیس میں بادامل جائے بھگوان۔" کبیر داس نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستے بھر عقیدت کی باتیں ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ کالی کھتی کا علاقہ آ گیا اور شاہی نے موٹر سائیکل پکی سڑک سے کچے راستے پر اتار دی۔ تھوڑا سا کچا فاصلہ طے کر کے وہ اس جگہ تک پہنچ گئے۔ جہاں ایک عظیم الشان قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر پر تازہ تازہ پھول پڑے ہوئے تھے جو بہرحال شاہی نے نہیں ڈالے تھے۔ قبر کے گرد ایک چوکور احاطہ کوئی دو فٹ کا اونچا کھڑا ہو چکا تھا۔ ایک طرف تعمیراتی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ پہاڑ کے نزدیک ہی وہ عجیب و غریب جگہ تھی۔ جو نہ جانے کس زمانے میں کس مقصد کے تحت تعمیر کی گئی ہوگی۔ لیکن اب وہاں کافی بڑی جگہ بنی ہوئی تھی۔ صوفی گہری نگاہوں سے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ دور دور تک کوئی انسان کا وجود موجود نہیں تھا۔ صوفی نے کہا۔

"وہ بزرگ میرا مطلب ہے صفر بابا کہاں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے اندر ہوں اور ہو سکتا ہے موجود نہ ہوں۔"

"ہوں۔ ہم اندر جا سکتے۔"

"جا سکتے ہیں۔ صفر بابا کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے۔ کافی دن سے ان کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں بس سمجھ لو۔ میں ان کا خاص آدمی ہوں۔ ایک بار تو ہنس کر کہنے لگے کہ شاہی یہ مزار مکمل ہو جائے تو تم ہی اس کے مجاور بن جانا تم سے بہتر آدمی مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اور اس نے کہا۔

"تو پھر چلو ہم کام شروع کر دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔" شاہی نے کہا۔

"تمہارے کپڑے یہاں موجود ہیں۔"

"ہاں موجود ہیں۔" میں نے بتایا نا تمہیں کہ بڑا کام کرتا ہوں یہاں، اس کا صلہ پایا ہے میں نے دیکھ لو۔" شاہی کپڑے بدلنے کے لیے اندر عمارت میں چلا گیا اور صوفی عقیدت بھری نگاہوں سے اس قبر کو دیکھنے لگا۔ بہرحال کوئی پہنچے ہوئے ہی بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاہی اندر سے باہر آیا لیکن وہ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ باہر نکلا تو صوفی نے اس کے ساتھ لمبی، چوڑی جسامت کے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا بہترین صحت کا مالک تھا اور خاصا پر رعب نظر آتا تھا۔ صوفی بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے بزرگ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چوم لیے۔

"حضور من، جناب والا ایک عقیدت مند کی حیثیت سے اپنے صوفی کو قبول کیجیے۔"

"حق اللہ۔ حق اللہ۔" جواب میں اس بوڑھے کے منہ سے بھی حق اللہ کی آواز سنائی دی پھر بوڑھے نے کہا۔

"شاہی نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا ہے صوفی صاحب! کہنے لگا بڑے اچھے آدمی ہیں اور مزار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تعمیر میں اپنی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے عزیزی! کہ ہم بھی بہت دور سے آئے ہیں۔ بس بشارت ہوئی تھی ہمیں کہ یہاں ایک صاحب کرامت دفن ہیں لیکن ان کی ابھی کوئی باقاعدہ قبر نہیں بنائی ہے۔ ہم یہاں پہنچ گئے۔ پھر ہمارے ہی دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ان کے فیض سے دوسروں کو بھی فیض یاب کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس مزار کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں صوفی صاحب کہ بزرگ خود اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں یہ بچہ یہاں آ گیا اور اس نے ہماری بڑی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ مزار تعمیر ہو جائے آپ لوگوں کی ذمے داری یہی ہے کہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کو یہاں لائیں مگر ذرا محدود تعداد میں۔ ہم نہیں چاہتے کہ بہت بڑا میلا یہاں لگ جائے۔ اصل میں ہماری خواہش ہے کہ صاحب علم ہی یہاں آئیں۔ کیونکہ غیر تعلیم یافتہ لوگ مزار کی حرمت کا خیال نہیں کرتے ہیں آپ کو اس کا خیال رکھنا ہے۔"

"آپ مکمل اطمینان فرمایئے آپ کا خادم حاضر ہے۔" صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ لوگ اپنا کام سرانجام دیں۔ ہم ذرا کسی کام سے جا رہے ہیں۔" اور پھر بزرگ وہاں سے چل پڑے۔ صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"واہ..... لگتا ہے کوئی شخصیت ہے۔"

"ایسی ویسی۔ صوفی صاحب کچھ دن یہاں کام کریں اور ان کی کرامات دیکھیں۔" وہ دونوں بزرگ کو جاتے دیکھتے رہے پھر اچانک ہی کافی فاصلے پر نظر آنے والی سڑک پر ایک لینڈ کروزر آ کر رکی اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سڑک سے نیچے اترنے لگی۔ صوفی نے چونک کر لینڈ کروزر کو دیکھا۔ وہ کافی قریب آ گئی اتنی کہ اس کا نمبر وغیرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر اس سے ایک آدمی نیچے اترا اور اس نے بڑے احترام سے لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھولا اور بابا صاحب اس میں بیٹھ گئے۔ لینڈ کروزر واپس سڑک کی جانب چل پڑی تھی۔

"ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو انہیں لے جاتے ہیں۔"

"ہاں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ بابا صاحب کے عقیدت مندوں کی کوئی کمی نہیں۔" شاہی نے عقیدت سے پر لہجے میں کہا۔ اور صوفی حق اللہ۔ حق اللہ کہتے ہوئے واپس پلٹ گیا۔ اس کے بعد دونوں احاطے پر کام کرتے رہے۔ کوئی دو یا ڈھائی بجے کے قریب شاہی نے انگڑائی لے کر کہا۔

"صوفی صاحب میں تو تھک گیا۔ کیا خیال ہے تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ ٹھہریں پہلے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ صوفی ہاتھ وغیرہ دھو کر بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہی کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر باہر آ گیا تو صوفی نے کہا۔

"اس کا بھی انتظام ہے۔ یہاں۔"

"صوفی صاحب! یہاں کیا نہیں ہے۔ بس بزرگوں کی قربت اختیار کر لو۔ جو مانگو گے سو پاؤ گے۔"

"اس میں شک ہے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا۔ پھر کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہی نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں ادھر سو جاتا ہوں۔ آپ بھی تھوڑی دیر آرام کر لو۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے۔ لیٹیں گے اس کے بعد پھر تھوڑا سا کام کریں گے۔ یہاں آنے اور جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں گے یہاں سے

چلے جائیں گے۔ بابا صفر کے آنے جانے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ ہم سوچتے ہی رہیں گے اور بابا صفر اندر سے نمودار ہو جائیں گے۔" صوفی نے گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں میں نیم غنودگی کی سی کیفیت آ گئی تھی۔ پھر دفعتاً ہی اس کا ذہن جاگا۔ لیکن اس کی دہری کیفیات والا ذہن تھا۔ ایک عقیدت مند کی حیثیت سے وہ بالکل ہی گاؤدی ہو جاتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو جاتی تھیں مگر جب اس کے اندر کا وہ متجسس شخص جاگتا تھا تو وہ شخص بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے دیتا تھا۔ بالکل نادانستگی میں جیسے وہ کسی کے زیر اثر ہو۔ یہ بھی ایک دلچسپ ہی بات تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے صوفی سے یہ سوال کیا تھا۔ "صوفی صاحب آپ یہ بتایئے ویسے تو آپ بڑے پیر پرست ہیں۔ یہ پیری مریدی کے چکر میں رہتے ہیں لیکن جب آپ کارکردگی دکھانا چاہتے ہیں تو نہ جانے کسی کی روح حلول کر جاتی ہے کہ آپ آتش بن جاتے ہیں۔ یہ قصہ کیا ہے؟"

"درویشوں کا کرم ہے یہ بھی میرا خیال ہے ایسے لمحات میں کسی جاسوس بزرگ کی روح میرے اندر سرائیت کر جاتی ہے۔"

"جاسوس بزرگ۔"

"تو اور کیا یہ جاسوسی واسوسی کا سلسلہ تم لوگ کیا سمجھتے ہو۔ کیا یہ تازہ ترین چیز ہے۔ زمانہ قدیم میں نہ جانے کتنے کتنے بڑے اسلامی جاسوس ہوا کرتے تھے۔"

"اسلامی جاسوس۔" سوال کرنے والا ہنس پڑا۔

"ہنس رہے ہو بے وقوفو! یہ شعبہ بالکل الگ ہے معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے بس یوں سمجھ لو کہ ہمارے اندر ایسی ہی کوئی روح حلول کر جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے ہم سے اپنا تعارف نہیں کرایا درویشوں کی دعاؤں سے۔" اس وقت بھی صوفی کا ذہن اسی انداز میں جاگا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ بابا صفر یہاں جو مزار تعمیر کر رہے ہیں اس کا مقصد کیا ہے۔ کس طرح کے لوگوں کو یہ یہاں بلانا چاہتے ہیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ ذرا غور تو کیا جائے۔ اول تو دو باتیں ہوتی ہیں ڈھونگی بھی کمائی کے لیے اس طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ بے شمار اس قسم کے لوگ ہیں جن کے بارے میں اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آتا رہتا ہے۔ جو اس انداز میں کمائی کرتے ہیں۔ یہ ذرا سوچنے والی بات تھی وہ لینڈ کروزر کس طرف سے آئی اور کہاں چلی گئی۔ ایک تارک الدنیا بابا صاحب کا بھلا باہر کی دنیا سے کیا تعلق ہے۔ یہ ساری باتیں تو سوچنے کے قابل تھیں۔ بہرحال صوفی سوچتا رہا اور پھر اس کے دل میں تجسس شدت اختیار کر گیا۔ ذرا سا معلوم تو کرنا چاہئے۔ اور اس کے لیے اس نے اندر کی کھوج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہی مزے کی نیند سو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے اس کی نیند کو گہرا کر دیا تھا۔ صوفی اندر داخل ہو گیا بڑی اجاڑ سی عمارت تھی نہ جانے کس زمانے کی تعمیر کی ہوئی۔ قدیم دیواریں اور اس طرح کی دوسری چیزیں سونے کے لیے کمرا جہاں معمولی بستر بچھا ہوا تھا۔ پتھر کی ایک الماری جس پر کپڑے کا پردہ ڈال دیا گیا تھا الماری میں معمولی قسم کے برتن وغیرہ کھانے پینے کی کافی اشیاء وہاں موجود تھیں۔ یہ تمام چیزیں قابل توجہ تھیں۔ صوفی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے خود ہی زمین پر بچھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا بستر تھوڑا سا اٹھایا تو اسے ایک ایسی جگہ نظر آئی۔ جہاں ایک چوکور سا خانہ بنا ہوا تھا۔ صوفی کو یہ جگہ بڑی عجیب محسوس ہوئی اس نے خانے میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹٹولا۔ تو اسے لوہے کا ایک کڑا نظر آیا۔ اس نے اس کڑے کو اٹھا کر دیکھنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے کڑا کھینچا۔ بائیں سمت دیوار میں کچھ سرسراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد ایک دروازہ سا کھل گیا۔ صوفی اچھل پڑا۔ یہ دروازہ بہت عجیب تھا۔ سامنے کے حصے پر ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کا ڈیزائن پینٹ کیا گیا تھا اور کچھ اس طرح وہ دوسری دیوار سے ہم آہنگ تھا کہ دیکھنے والے کو ذرا بھی اندازہ نہ ہو سکے کہ وہ اصل اینٹیں نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک فینسی دروازہ تھا۔ صوفی اش اش کر نے لگا کس خوب صورتی سے ٹوٹی اینٹیں پینٹ کی گئی تھیں کہ ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہو سکے۔ لیکن ان کے پیچھے نظر آنے والا دروازہ صوفی کی حسیں تیز ہو گئیں اور اس کے بعد وہ دعائیں پڑھتا ہوا اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ انتہائی حیرت ناک جگہ تھی۔ دروازے کے دوسری جانب چھ سڑھیاں نیچے تک گئی تھیں اور اس کے بعد ایک قدیم سرنگ نظر آ رہی تھی جو بالکل صاف و شفاف تھی اور نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی۔ ابتدائی حصے میں ایک کمرے جیسی جگہ بنی ہوئی تھی۔ جہاں کچھ الماریاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ بس تاریکی سے عادی ہو جانے والی آنکھیں ہلکے ہلکے ہیولے دیکھ سکتی تھیں۔ صوفی الماری کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے الماری کھولنے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے الماری لاک نہیں تھی۔ الماری کے اندر چھوٹے چھوٹے پیکٹ چنے ہوئے تھے۔ صوفی نے ان میں سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس نیم تاریک ماحول میں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن پیکٹوں کی تعداد اتنی تھی اور کچھ اس طرح بے ترتیب تھی کہ اگر ایک آدھ پیکٹ غائب کر لیا جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ صوفی کچھ لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ وہاں سے نکل آیا۔ گویا اس وقت جو حس جاگی تھی اس نے واقعی کام کر دکھایا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد پھرتی سے وہ اس جگہ سے باہر نکل آیا۔ قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ ابھی وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ کر پیکٹ کھول کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پیکٹ میں انجکشنوں کے وائیل بڑی ترتیب سے چنے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیسے انجکشن ہیں۔ ویسے سب کی نوعیت ایک ہی جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ صوفی کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ان میں سے ایک دو وائیل نکال لے اور اپنے لباس میں چھپا لے لیکن اگر پیکٹ میں سے کچھ وائیل کم دیکھے گئے تو ہو سکتا ہے صفر بابا کو شبہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے پیکٹ ہی سنبھال کر اپنے لباس میں چھپا لیا۔ لیکن اب صورت حال بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ شاہی نے جس طرح عقیدت سے ان کی کرامات کا تذکرہ کیا تھا۔ صوفی جیسا پیرپرست یہ سوچ کر پوری عقیدت کے ساتھ ادھر آ گیا تھا کہ یقیناً کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہوں گے۔ لیکن یہ بزرگ تو کچھ زیادہ ہی آگے پہنچے ہوئے تھے۔ انجکشنوں کی موجودگی بڑی تعجب خیز تھی یہاں ان بزرگی کے کاموں میں انجکشنوں کا کیا دخل اور اب اس دخل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ باہر آ گیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ شاہی پر ایک نگاہ ڈال کر کہ وہ سو رہا ہے۔ واپس اندر چلا گیا۔ یہ سرنگ اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ خاصی طویل ہے۔ کہاں تک گئی ہے اس بارے میں کوئی آخری بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بہرطور وہ اوپر اوپر سے جائزہ لیتا رہا اور پھر باہر نکل آیا اور کام

میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہی جاگ گیا تھا اس نے کہا۔

"کہیے صوفی صاحب! سوئے تھوڑی بہت دیر۔"

"نہیں عزیزم! نیند کہاں آتی ہے درویشوں کے کرم سے بس ایسے ہی لیٹے رہے۔"

"یہاں کچھ روحانی سکون ملتا ہے۔"

"درویش رحم کریں روحانی اور جسمانی دونوں سکون یہاں موجود ہیں۔"

"میں نے کہا تھا نا مرشد کی کیا بات ہے۔" شاہی نے عقیدت سے کہا۔ پھر شام جھکنے لگی تو شاہی بولا۔

"آیئے صوفی صاحب چلتے ہیں۔ آج کا دن یادگار دن ہے۔ آپ نے بھی بابا صفر کی زیارت کر لی۔ آتے جاتے رہیں۔"

"ہاں۔ حاضری دیا کروں گا۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥.....♥.....♥

اعلا پیمانے پر تحقیقات ہو رہی تھیں۔ وہ تمام بڑے بڑے لوگ خود اپنی کیفیت پر حیران تھے اور انٹیلی جنس کے خصوصی اہلکاران سے مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے۔ بہت دور دور تک چھان بین ہو رہی تھی۔ لیکن ایک بات مشترک تھی یہ پانچوں افراد جن کے ذریعے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ ماضی کے بہترین لوگوں میں سے تھے اور ان کی ذات پر ایک بھی دھبا موجود نہیں تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی ملک کے خلاف کبھی کوئی ایسا عمل نہیں کیا تھا۔ ان میں سے چند ایک کے بزرگ بھی دو پشتوں سے ملک کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے آئے تھے اور ان میں کچھ شہدا بھی تھے۔ گویا ان کی ذات پر تو ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ سب انتہائی حد تک قابل اعتماد لوگ تھے۔ چنانچہ کچھ وقت کی تحقیق کے بعد ان سب کو ان سے سرزد ہونے والی غلطی سے بری الذمہ قرار دیا گیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انجکشنوں کے وہ نشان جوان کے جسموں پر پائے گئے تھے۔ یقیناً بہت ہی سنگین خطرات کی نشان دہی کر رہے تھے۔ خون کی رپورٹ بھی معتدل تھی گویا جو عمل ان پر ہوتا تھا اس کے بعد وہ نارمل بھی ہو جاتے تھے۔ جس وقت انہیں انجکشن لگنے کا احساس ہوا تھا۔ اس پر بھی غور کر کے چند افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن وہ صحیح لوگ نہیں تھے اور بعد میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ انجکشن لگانے میں ان کا ہاتھ نہیں ہے۔ صوفی بہرطور اپنے طور پر بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا اور اس کے ذہن میں وہ خفیہ سرنگ بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اس نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت کو سامنے رکھ کر وہ نقشہ نویسی کرنے لگا اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ اگر یہ سرنگ کہیں دور تک بنائی گئی ہے تو کہاں تک جا سکتی ہے۔ یہ معلومات اس کے لیے انتہائی ضروری تھیں اور وہ اس کی مکمل تحقیقات میں مصروف تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے اپنے طور پر ابھی تک جو کچھ کیا تھا۔ وہ تو محض ابتداء تھی۔ اپنی منصوبہ بندی کا آغاز اس نے ابھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ آہستہ آہستہ ہی اپنے آپ کو مستحکم کر کے کام کرنا چاہتا تھا۔ ادھر شاہ میر خان نے بے شک کرنل رحیم شاہ کو اس بارے میں کچھ تفصیلات بتا دی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ایک ایسے شخص کو جو اپنے عہدے سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ تھوڑی سی معذوری کی شکل میں تھا۔ بہت زیادہ فعال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ دوبارہ اس سلسلے میں کوئی خاص رابطہ قائم نہیں ہو سکا لیکن نہ جانے کیوں کرنل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحیم شاہ کے دل کو ایک آس سی لگی ہوئی تھی کہ شاید اس بارے میں کوئی پیش قدمی ہو سکے۔ صوفی سے اس کا رابطہ مسلسل رہا تھا ابھی تک وہ دارالحکومت میں ہی تھے۔ کرنل رحیم شاہ صرف دو دن کے لیے اپنے گھر گیا تھا۔ اور پھر واپس دارالحکومت آ گیا تھا۔ پھر اس نے صوفی کو طلب کر لیا۔

"صوفی صاحب! فی الحال ہماری ٹیم یعنی گرین فورس ان ہی پانچ افراد پر مشتمل ہے۔ ایسا کرتے ہیں کچھ دن کے لیے گرین فورس میں باقی ممبروں کو بھرتی کرنے کا سلسلہ ترک کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کام کا آغاز کرتے ہیں۔"

"کس سلسلے میں۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ ملک کے پانچ اہم ترین افراد جن کا ماضی بے داغ ہے اور جو ملک کے اہم ترین ستونوں میں تصور کیے جاتے ہیں۔ ناداستہ طور پر ایسے انکشافات کا باعث بنے ہیں۔ جو انھیں موت کی قیمت پر بھی نہیں کرنا چاہئے تھا اور اعلا ترین حکام اس بات پر مکمل طور پر اتفاق کر چکے ہیں کہ یہ کسی انوکھے طریقہ کار کے پیش نگاہ ہوا ہے۔ ان کے جسموں پر انجکشنوں کے نشانات پائے گئے ہیں جن کے بارے میں وہ نہیں بتا سکتے کہ کب اور کس طرح ان کے لگائے گئے تھے۔ سب کا یہی بیان ہے کہ اچانک ہی انھیں اپنے جسم کے مختلف حصوں پر چبھن کا احساس ہوا تھا اور اس کے بعد وہ اس احساس کو بھول گئے تھے۔ گویا یہ انجکشن اس طرح ان کے جسموں کو لگائے گئے تھے کہ انھیں انجکشن لگانے والے کا پتہ نہ چلے اور ان کا کام ہو جائے۔ صوفی کے ذہن میں پھر ایک جھماکا ہوا انجکشنوں کا وہ پیکٹ ابھی تک اس کے پاس تھا اور اس وقت کرنل رحیم شاہ کے اس انکشاف پر صوفی کے ذہن کے بہت سے دریچے کھل گئے تھے۔ جب وہ بے اختیار ہو جاتا۔ تو سامنے والے ماحول کو بھول جاتا تھا۔ حالانکہ وہ کرنل رحیم شاہ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ لیکن پس اس کی اپنی فطرت تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے گھومنے لگا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلنے لگی۔ حق اللہ..... حق اللہ..... حق اللہ۔ کرنل رحیم شاہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔ صوفی کی اصل شخصیت سے اسے اچھی طرح واقفیت تھی اور پھر خود بھی ذرا پیر پرست قسم کا آدمی تھا۔ چنانچہ خود بھی خاموشی سے صوفی کے سامنے بیٹھ گیا۔ صوفی دیر تک وجد کی سی کیفیت میں رہا اور کرنل رحیم شاہ عقیدت مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر صوفی نے آنکھیں کھولیں۔ تو وہ انگارہ ہو رہی تھیں اور ان میں عجیب سی کیفیت تیر رہی تھی۔ کرنل رحیم شاہ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"صوفی صاحب خیریت۔ اچانک ہی آپ پر کیفیت طاری ہو گئی۔"

"دو..... درویش رحم کریں ہم سے کوئی گستاخی تو نہیں ہوئی صاحب۔" صوفی نے کہا۔

"صوفی صاحب! میں بے شک ایک فوجی آدمی ہوں اور جب انسان کا مزاج فوجی بن جاتا ہے تو وہ کوئی بھی ایسی چیز برداشت نہیں کر سکتا جو ڈسپلن کے خلاف ہو۔ لیکن مجھے یہ احساس ہے کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہے کہ آپ ذرا مختلف قسم کے انسان ہے۔ ویسے میں جو انکشافات آپ پر کر رہا تھا اس کے بعد وجد کی اس کیفیت کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔" صوفی نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر انجکشنوں کا وہ پیکٹ نکال لیا۔ کرنل رحیم شاہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ صوفی نے پیکٹ کھولا اور پیکٹ

میں رکھے ہوئے انجکشن وائل رحیم شاہ کے سامنے کر دیے۔

"یہ..... یہ تو انجکشن ہیں۔"

"جی..... درویشوں کی دعاؤں سے آپ سے ایک درخواست ہے اصل میں ابھی میرے وسائل تو اتنے نہیں ہیں کہ بہت سے امور میں تنہا سرانجام دے سکوں۔ محکمہ سراغ رسانی کے کچھ اعلا افسران مسلسل میری تاک میں رہتے ہیں۔ میں انہیں برداشت نہیں ہوتا۔ بہرحال میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ان انجکشنوں میں موجود دوا کی رپورٹ چاہتا ہوں یہ کیا ہے اور اس سے کیا کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔"

"مگر صوفی صاحب۔"

"حق اللہ۔" صوفی کی آواز ابھری۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ یہ۔"

"درویش رحم کریں۔ حق اللہ حق اللہ۔" صوفی نے زور زور سے ضربیں لگانے لگا۔ کرنل رحیم شاہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا اور اس کے بعد بولا۔

"ٹھیک ہے اس کی لیبارٹری رپورٹ آپ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مل جائے گی یا اس سے بھی کچھ پہلے۔"

"اجازت عطا فرمایئے۔ بس کچھ ایسی ہی کیفیت ہو گئی ہے۔" صوفی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کرنل رحیم شاہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے انجکشنوں کا پیکٹ اٹھا لیا۔ سادہ ڈبا تھا اور اس کے اندر باقاعدہ انجکشنوں کے رکھنے کی جگہیں بنی ہوئی تھیں کرنل رحیم شاہ تھوڑی دیر تک انہیں دیکھتا رہا اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ابھی باقاعدہ شاہ میر خان کے حوالے سے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر تقدیر یاوری کر جائے اور کوئی ایسا کارنامہ سرانجام ہو جائے۔ جس سے شاہ میر خان کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے تو آگے کے کام آسان ہو جائیں گے۔ بہرحال اس کے لیے اس کو کافی تگ و دو کرنا تھی ادھر صوفی اب ذرا مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ وہ لینڈ کروزر اس کو یاد تھی جو بابا صفر کو وہاں سے لے کر گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا اور آخر کار اسے یہ پتا چلانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ لینڈ کروزر شہر کے ایک متمول شخص احسان غزنوی کی ہے۔ احسان غزنوی کی نگرانی کرنا صوفی کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لینڈ کروزر میں اسے وہ نوجوان بھی نظر آ گیا۔ جسے اس نے بے شک دور سے دیکھا تھا۔ لیکن اس کی گہری نگاہوں نے اسے ایک لمحے کے اندر پہچان لیا اور بس صوفی کی کھٹارا موٹر سائیکل اس لینڈ کروزر کا تعاقب کرنے لگی۔ پھر لینڈ کروزر کو اس نے ایک ایسی جگہ روکا۔ جہاں سنسان جگہ تھی۔ لینڈ کروزر ڈرائیو کرنے والا حیرت سے صوفی کی موٹر سائیکل کو دیکھنے لگا۔ ایسی کھٹارا موٹر سائیکلیں بھی چلتی ہیں اس نے دل میں سوچا مگر یہ اونٹ کی نسل کا فرد چاہتا کیا ہے۔

"سلام عرض کرتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اب سلام بھی درویشوں کی دعاؤں سے عرض کیے جانے لگے۔" نوجوان نے کہا۔

"درویش رحم کریں مجھ پر بھی اور آپ پر بھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آمین ثم آمین۔ آپ پر زیادہ رحم کریں چونکہ جس طرح آپ نے اپنی ڈیکوٹا اس لینڈ کروزر کے سامنے روکی ہے اگر میں فل بریک نہ لگاتا تو اس کے ساتھ آپ کا جو حشر ہوتا وہ آپ کے علم میں ہے۔''

''اسم شریف پوچھ سکتا ہوں۔''

''شاہد۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

''شاہد صاحب یہ موٹر سائیکل آپ کو ناپسند ہے نا، میں اسے اس جگہ کھڑی کیے دیتا ہوں۔ آپ کی لینڈ کروزر میں مجھے تھوڑا سا سفر کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیے ایک مسئلہ ہے۔'' صوفی نے رازدارانہ انداز میں شاہد سے کہا۔ شاہد اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ایسا عمل ہو جائے گا۔ اچانک ہی صوفی کے دونوں ہاتھ پھیلے اور پھر خاصی قوت سے شاہد کے چہرے پر پڑے ہتھیلیاں کنپٹیوں پر پڑیں اور شاہد کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ خود جوان اور تندرست آدمی تھا ایک لمحے کے اندر سمجھنے کی کوشش کی لیکن دونوں طرف سے ہتھیلیوں کا کنپٹیوں پر دباؤ کچھ ایسا عجیب تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس کے حواس کی لہر اس کا ساتھ چھوڑنے لگی صوفی نے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا تھا اور اس کے بعد اس نے اس کی لینڈ کروزر میں اس لٹا دیا اور خود موٹر سائیکل کی جانب بڑھ گیا۔

''عزیزہ! ویسے تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اصل میں بدصورت بیویوں اور کھٹارا موٹر سائیکلوں کا یہی فائدہ ہے کہ ان کے گم ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ تم کچھ وقت یہاں قیام کرو۔ ہم بہت جلد تمہارا وصال حاصل کرلیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' یہ کہہ کر صوفی لینڈ کروزر میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ لینڈ کروزر کا رخ گرین ہاؤس کی طرف ہی تھا۔ گرین ہاؤس میں آنے والا یہ پہلا شکار تھا۔ گرین ہاؤس کے ممبروں نے اس کا استقبال کیا۔ شازیہ اس وقت موجود نہیں تھی۔ دلاور وغیرہ یہاں موجود تھے۔ شاہد کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ صوفی نے دلاور سے کہا۔

''دلاور! یہ لینڈ کروزر لے جاؤ اور اسے یہاں سے کافی فاصلے پر کسی ایسی جگہ کھڑی کر آؤ جہاں سے اس بات کا شبہ نہ ہو سکے کہ اس کا تعلق کسی طرح یہاں سے رہا ہے۔ اسٹیئرنگ پر سے ہاتھوں کے نشانات صاف کر دینا۔''

''جی صوفی صاحب۔'' دلاور نے صوفی سے لینڈ کروزر کی چابی لیتے ہوئے کہا۔ صوفی اسے یہ ہدایات دے کر کمرے میں آ گیا جہاں شاہد حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس حسین عمارت اور خاص طور سے اس عظیم و شان کمرے کو دیکھ کر وہ شدید حیران تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ اگر آپ مجھے لوٹنا چاہتے تھے تو وہیں سے میرے پاس جو کچھ تھا لے لیتے۔ آپ کی شخصیت مجھے بڑی عجیب سی لگ رہی ہے۔''

''عزیزی نجیب الطرفین ہیں۔ کبھی کسی کا دس روپے کا نوٹ نہیں مارا درویشوں کی دعا سے آپ ہم پر لوٹ مار کا شبہ نہ کیجئے گا۔ ہمیں آپ سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنی ہیں۔''

''اور اس کے لیے آپ نے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ جب کہ آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے بھی نہیں معلوم ہوتا۔ سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کرائیے ہم سے، آپ کون ہیں؟''

''خادم کو صوفی کہتے ہیں۔ درویشوں کی دعا سے۔ آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔ بس ایک ذرا سی معلومات فراہم فرما دیجئے گا۔ بڑی عنایت ہوگی۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ جس انداز میں مجھے جہاں سے لائے ہیں اس کے بعد میں آپ سے کوئی تعاون نہیں کروں گا۔''

''ہم باذات خود تشدد نہیں کرتے کسی پر لیکن وہ شخص ہے جسے آپ نے باہر دیکھا ہے۔ بڑا درندہ صفت ہے اور انسان کو ایذہ پہنچانے کا ماہر درویشوں کی دعاؤں سے آپ کی اتنی مرمت کرے گا وہ کہ پھر آپ طویل عرصے تک یہاں سے جانا پسند نہ کریں گے۔ چونکہ آپ کی ڈیزائن میں کافی تبدیلی پیدا ہو چکی ہوگی۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ۔ میں کہتا ہوں آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔''

''میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا کہ کچھ تھوڑی سی معلومات درکار ہیں بس وہ ہمیں فراہم کر دیجئے۔ یوں سمجھ لیں کہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ شاہد سوچتا رہا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص جو سامنے موجود ہے۔ یہ ظاہر تو ایک مریل سانپ نظر آ رہا ہے جو کینچلی میں لپٹا ہوا ہو۔ لیکن اس کی آواز خاصی خوفناک ہے۔ کیا معلوم کرنا چاہتا ہے پتہ تو چلے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے اور کیا اس کے بعد مجھے آپ کے چنگل سے رہائی حاصل ہو جائے گی۔''

''ایک ایک کر کے سوال کیجئے۔ آپ نے پہلا سوال یہ کیا ہے درویشوں کے کرم سے کہ ہم کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ سے۔''

''یہ درویشوں کو آپ درمیان میں کیوں لے آتے ہیں۔''

''درویش اول، درمیان اور آخر اور ہر جگہ موجود ہے۔ انہی کے روحانی فیض سے اس کائنات کا بھرم قائم ہے۔ چنانچہ آپ ان پر کوئی اعتراض نہ فرمائیے گا۔ ہم آپ سے کالی کھتی کے بارے پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''کیا؟''

''جی ہاں۔'' کالی کھتی کا وہ علاقہ جہاں آپ بابا صفر سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔'' صوفی نے کہا اور شاہد عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''بابا صفر یعنی انکل زیرو۔''

''اچھا..... آپ انھیں انگریزی میں جانتے ہیں چلیے یوں ہی سہی۔ تو میں آپ سے یہ معلوم کر رہا تھا کہ ان سے آپ کا کیا تعلق ہے۔''

''جانتے ہیں آپ انھیں۔ ایک عظیم انسان ہیں وہ۔ اتنے عظیم کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''انہی کی عظمت نے ہمیں آپ کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آپ کا ان سے کیا رابطہ ہیں اور کس طرح سے ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں بھی ان کے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں وہاں مزار شریف تعمیر ہو رہا ہے اور اس کی تعمیر میں اب میں نمایاں طریقے سے حصہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتایئے۔"

"عجیب احمق آدمی ہو۔ اس کے لیے یہ سنسنی خیز طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی مجھے وہیں بتا دیتے تو میں سارا مسئلہ اسی جگہ حل کر دیتا اور اپنے گھر روانہ ہو جاتا یہ بتاؤ۔ یہاں آئے ہوئے مجھے کتنی دیر گزری ہے۔"

"حضور! آپ کچھ بے تکلفی فرما رہے ہیں درویشوں کے کرم سے ایسے نہ کیجئے گا۔ ہم سے ہمارے ہی بارے میں پوچھنے بیٹھ گئے۔ اگر مفاہمت ہوئی تو یہ بھی بتا دیں گے آپ کو لیکن فی الحال آپ ہماری رہنمائی فرمایئے۔"

"تم جس طرح مجھے یہاں لائے ہو میں تم سے تعاون نہیں کروں گا۔ یہاں سے مجھے باعزت طریقے سے باہر لے چلو۔ میری لینڈ کروزر میرے حوالے کرو اس کے بعد میں تمہیں انکل زیرو کے بارے میں بتاؤ گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا جناب درویشوں کی دعا سے ہم بحالت مجبوری آپ سے دوسرا انداز اختیار کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر صوفی نے بیل دبائی جس سے باہر اطلاع ہو جاتی تھی۔ دلاور اپنا کام کر کے واپس آ چکا تھا۔ کمرے میں داخل ہو گیا۔ صوفی نے اس سے کہا۔

"یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ہم ان سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں لیکن یہ جارحیت پر آمادہ ہیں۔ درویشوں کے کرم سے آپ ذرا ان سے مفاہمت کرانے کی کوشش کریں۔ دلاور نے بات کو سمجھنے کے بعد شاہد کی طرف دیکھا اور بولا۔

"نام کیا ہے بچے تیرا۔"

"تم لوگ شاید ایسے نہیں مانو گے کیا سمجھا ہے یہ تم نے مجھے۔" شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ دلاور کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور شاہد اپنی جگہ سے تین فٹ دور جا گرا۔ دلاور نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اور بولا

"یہ پہلا تھپڑ ہے اس کے بعد تمہارے جبڑے پر گھونسا پڑے گا۔ پھر میں تمہیں تمہارے بال پکڑ کر اٹھاؤں گا اور زمین پر دے ماروں گا۔ اس کے بعد دو تین ٹھوکریں یہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں ہم تمہارا سر گنجا کر دیں گے۔ تیسرے مرحلے میں تمہیں سگریٹوں سے داغا جائے گا۔ اب بتاؤ کیا تمہیں پہلے مرحلے میں داخل کر دیا جائے۔"

"تم..... تم..... سوچ لو میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔" شاہد نے کہا اور دلاور کا دوسرا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا شاہد کا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ دلاور نے اس کا گریبان پکڑا اور بولا۔

"یہ اضافی تھپڑ ہے۔ اس کے بعد....."

"ٹھہرو..... ٹھہرو رک جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم جرائم پیشہ لوگ ہو اس لیے تم اس طرح کی حرکتیں کر رہے ہو اور یہ شخص جھوٹ بولتا ہے یہ انکل زیرو کا معتقد نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی چکر چلانا چاہتا ہے وہاں۔ کیا معلوم کرنا چاہتے ہو تم انکل زیرو کے بارے میں۔"

"یہی..... جناب من کہ آپ کی ان سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا اور شاہد ہونٹوں سے ٹپکنے والا خون صاف کرنے لگا۔ اب اس بات کا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے صحیح بات نہ بتائی۔ تو یہ لوگ جو کوئی بھی ہیں۔ اس پر بدترین تشدد کریں گے۔ چنانچہ اس نے شروع سے اب تک کی کہانی سنا دی۔ اس نے کہا۔

"ہمارے ذہنوں پر کچھ اس طرح کا اثر یہ ہوا کہ ہم انکل زیرو کی کوئی بات ٹال نہیں سکے ہم سے ان کا مسلسل رابطہ ہے۔ ہم ان کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کیا کرتے ہیں۔ اکثر میں کالی کھتی جاتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ شہر آ جاتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ ہمارے مرشد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ باقی جو لوگ ہیں ان کی تفصیل بتاؤ" صوفی نے سوال کیا اور اس کے بعد وہ سارے نام نوٹ کر لیے گئے، جو شاہد نے بتائے تھے۔ عدنان، فوزی، مینا وغیرہ یہ سب کے سب انکل زیرو کے لیے مصروف عمل تھے۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق سارے کام سرانجام دے رہے تھے۔ صوفی نے بڑے احترام سے شاہد کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

"عزیز من کچھ دن ہمارے مہمان رہو۔ بہت جلد ہم تمہیں باعزت طریقے سے یہاں سے روانہ کر دیں گے۔"

"ہم..... مہمان۔"

"ہاں..... مجبوری ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے ہم تمہیں آزاد نہیں کر سکتے اور سنو..... یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ کچھ جگہ خطرات ہیں جن سے تمہیں آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ باقی اس کے باوجود اگر کوشش کرنا چاہتے ہو۔ تو تمہاری مرضی ویسے تمہارے یہاں آنے کا علم کسی کو نہیں ہے۔ اگر رحلت فرما گئے تو خاموشی سے تدفین کر دیں گے، کسی کو اطلاع بھی نہیں دیں گے۔ خدا حافظ۔" صوفی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا شاہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

♥.....♥.....♥

صرف عادل اور فیضان نہیں تھے۔ باقی ساری گرین فورس اس وقت گرین ہاؤس کے ڈرائنگ ہال میں جمع تھی۔ غلام قادر ایک طرف سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ دلاور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو گود میں لیے آہستہ آہستہ اس کا سر سہلا رہا تھا۔ اور بیٹا اس کے سینے سے لگا سو رہا تھا۔ شازیہ اپنے ناخن نیل کٹر کی ریتی سے گھس رہی تھی۔ صوفی، صوفے پر دونوں پاؤں سمیٹے بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اچانک ہی شازیہ نے کہا۔

"چھوٹے بابا! آپ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔ دیکھنے میں آپ کوئی فقیر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا کردار اس سے بالکل مختلف ہے۔ ویسے چھوٹے بابا ایک بات کہوں آپ سے۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے۔" صوفی کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلی پان کی پیک حلق تک بھری ہوئی تھی۔ ایک ذرا سی غلطی ہو جاتی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینہ گلنار ہو جاتا۔ شازیہ نے کہا۔

"اگر آپ فقیروں والا گیٹ اپ کر لیں تو دعوے سے کہتی ہوں کہ کوئی پہنچے ہوئے فقیر لگیں گے گیروا کفنی بغل میں کمنڈل دیکھنے کی چیز لگیں گے آپ۔ اگر کبھی کسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کو کسی فقیر کا کردار کرنا پڑے تو گیٹ اپ مجھ سے کرائیے گا۔" غلام قادر منہ پھاڑ کر ہنس پڑا۔ دلاور خاموشی سے ایک ڈیکوریشن پیس کو دیکھتا رہا۔ شازیہ نے کہا۔

"حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں ابھی تک بڑی کشمکش کا شکار ہوں اور اس بات پر حیران ہوں کہ بڑے بابا نے آخر ہم سب کو کیوں جمع کر لیا ہے۔ انہیں ہم سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں ابھی تک ہمیں کوئی تفصیل نہیں معلوم ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ جتنی بڑی بڑی تنخواہیں ہم لوگوں کو دی جا رہی ہیں اس حساب سے کام تو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔" صوفی کو بہ حالت مجبوری اپنے حلق کے سرمائے کو اگال دان میں منتقل کرنا پڑا اور سرخ سیلاب اس کے منہ سے نکل کر اگال دان میں منتقل ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے کتھے چونے والے دانت صاف کیے اور آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو..... کوئی بھی بلا وجہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتا درویشوں کے کرم سے ہر بات کے پس منظر میں کوئی سبب ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو جب متحرک ہونا ہوگا۔ متحرک کر دیا جائے گا کام تو تم اپنا کر ہی رہے ہو۔ اب جیسے گرین ہاؤس کا مہمان شاہد ہے جب تک صورت حال ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو جاتی تمہیں اس مہمان کی مکمل حفاظت کرنا ہے۔"

"تو آپ بے فکر رہیں چھوٹے بابا! آپ کی خواہش کے مطابق یہ سب کچھ ہوگا۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے ہم سے۔"

"درویشوں کی دعائیں ہیں۔" صوفی نے جواب دیا پھر بولا۔

"ویسے شازیہ! تم لوگ مجھے اپنا موقف بتاؤ۔ زندگی تمہارے نزدیک کیا چیز ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ بھی بتائیں گے چھوٹے بابا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"تو بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ زندگی ایک سڑک ہے جس پر لاتعداد بھکاری جھولی پھیلائے گردش کر رہے ہیں۔ اپنی اپنی خاموش صدائیں لگاتے ہوئے کسی کو عشق کی بھیک درکار ہے۔ کسی کو حسن کی، کسی کو دولت کی، کسی کو صحت کی۔ سب بھکاری صدائیں لگاتے پھر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی اور کیا ہے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ ہم پہلی صدا اس وقت لگاتے ہیں جب اس کائنات میں پہلا سانس لیتے ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ جب اس کائنات میں پہلی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد صدائیں ہماری زندگی بن جاتی ہیں۔ اپنی ہر ضرورت۔ ماں سے دودھ مانگنے کے لیے روتے ہیں اور اس کے بعد اس سے آگے کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے چھوٹے بابا کہ میں نے تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کے حصول کے لیے کوششیں کیں۔ مجھے زندگی اور ماں باپ کی زندگی کے لیے ملازمت چاہیے تھی۔ میں نے صدا لگائی اور اس صدا کے جواب میں

کسی اور کی صدا سنائی دی۔ وہ میرے بدن کی بھیک چاہتا تھا۔ بس چھوٹے بابا زندگی اسی کا نام ہے میں سمجھتی ہوں کہ میں نے جو پیشہ اختیار کیا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا اور میرے جیسے بہت سے لوگ اس کائنات کی سڑک پر ضرورت کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔"

"آگے بولو۔"

"نہیں بس۔ میں نہیں جانتی کہ آگے مجھے کتنی صدائیں لگانی ہوں گی۔ آپ سے دنیا سے اور اس کے بعد وقت سے ماحول سے۔"

"غلام قادر! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو تمہارے خیال میں زندگی کیا چیز ہے۔"

"اڑے ماں قسم! چھوٹے بابا صاحب! میرے کو معلوم ہے زندگی کسی بھی سینما ہال کے باہر لگی ہوئی لائن ہے۔ جس میں ہر شخص ٹکٹ لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اڑے بابا لین سے تھوڑا ادھر ہوا ہماری لکڑی پڑی اس کی کمر پر اور وہ لین میں آ کر سیدھا ہو گیا۔ عام طور سے لوگ لین سے باہر جانے کا کوشش مانگتا ہے۔ پر غلام قادر کو لین سیدھی کرنے کی تنخواہ ہی ملتی تھی۔ ابھی سب ٹھیک ہے۔"

"تو تمہارا خیال ہے زندگی سینما ہال کے باہر لگی ہوئی ٹکٹ گھر کے سامنے کی لائن ہے۔"

"بالکل فٹ ایسا ہی بات ہے چھوٹے بابا صاحب۔"

"دلاور تم کیا کہتے ہو۔"

"میں نے زندگی کا بہت کم تجزیہ کیا ہے۔ زندگی گھر ہے بچے ہیں وہیں سے آغاز ہوتا ہے اور وہیں پر انجام ہوتا ہے۔"

"بہت اچھے اس کا مطلب ہے کہ گرین فورس کی پوری ٹیم فلاسفروں کی ٹیم ہے۔"

"ابھی آپ بولا چھوٹے بابا صاحب! کہ آپ بھی ہمارے کو بتائے گا کہ زندگی کیا ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ زندگی درویشوں کی دعا ہے اور بس۔" صوفی نے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

شازیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور فون کے پاس پہنچ گئی ریسیور اس نے کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو۔"

"رحیم شاہ۔"

"یس باس۔"

"صوفی صاحب کہاں ہیں۔"

"یہیں ہیں بلاؤں۔"

"ہاں۔" شازیہ نے صوفی کو اشارہ کیا تو صوفی نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور اس نے کہا۔

"جناب من، حکم عالی۔"

"منہ صاف ہے۔"

"درویشوں کی دعا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"صوفی صاحب! آپ کو ایک پتا بتا رہا ہوں۔ یہاں پہنچ جایئے۔"

"حکم دیجیے۔"

"سابرینہ کمرا نمبر دو سو آٹھ۔"

"وہاں پہنچ کر کیا کروں؟"

"مجھے سے ملاقات اور سینے کار میں آیئے گا۔ موٹر سائیکل پر نہیں۔ آپ کی موٹر سائیکل تو میرا خیال ہے اب پورے شہر میں مشہور ہو چکی ہے۔"

"ناچیز کس قابل ہے۔ بس دعائیں ہیں درویشوں کی۔"

"تشریف لے آیئے۔" کرنل رحیم شاہ کی آواز سنائی دی۔

"حاضر ہو رہا ہوں۔" دوسری طرف سے فون بند ہونے کے بعد صوفی نے ریسیور رکھ دیا اور غلام قادر سے بولا۔

"غلام قادر صاحب! ذرا گاڑی نکال دیجیے میں لباس تبدیل کر لوں۔" غلام قادر اٹھ کر باہر نکل گیا اور صوفی اپنے کمرے میں آ گیا۔ کرنل رحیم شاہ نے اسے تھوڑے سے آداب سکھا دیے تھے۔ حالانکہ بہت سی باتوں پر اس نے تنقید کی تھی اور کرنل رحیم شاہ پر اعتراض کیا تھا۔ مثلاً لباس کا معاملہ۔

"حضور من! شیروانی ہمارا قومی لباس ہے۔ اور یہ ڈھیلے پائنچوں والا پائجامہ بہ خدا زمانہ قدیم میں شرافت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔"

"آپ نے خود ہی میری بات کی وضاحت کر دی صوفی صاحب! زمانہ قدیم میں یہ بے شک شرافت کا نشان سمجھا جاتا تھا آج بھی ہم اسے شرافت ہی کا نشان سمجھتے ہیں۔ لیکن شرافت صاحب نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ وہ اب چست پتلون اور قمیض میں نظر آتے ہیں۔"

"حضور والا! یہ شرافت صاحب ان کے صاحبزادے ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"دیکھیں صوفی صاحب! وقت خود اپنی ثقافت ہوتا ہے۔ اس دور کے رواج اس کی ثقافت کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ اور پھر ہم لوگ جس شعبے سے منسلک ہیں اس میں ذرا چست و چالاک رہنا پڑتا ہے۔"

"بہ خدا آپ یقین فرمایئے۔ شیروانی اور پائجامے کی افادیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ زمانہ جدید کے سورما چست پتلونیں اور جیکٹ وغیرہ پہن کر اپنے آپ کو بہت اسمارٹ سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کی نگاہوں میں شیروانی اور پائجامے والا آ جائے۔ تو وہ یہی سوچیں گے کہ اس بے چارے میں کیا رکھا ہوگا۔ اگر لڑائی بھڑائی کا موقع بھی آ جائے تو وہ یہ سوچ کر اس پر حملہ کریں گے کہ دو ہاتھ مار کر لمبا کر دیں گے اسے درویشوں کی دعاؤں سے۔ لیکن جناب عالی! پھر مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اور جہاں تک چستی اور چالاکی کا مسئلہ ہے تو آپ یقین فرمایئے۔ صرف امتحان کے لیے ہم آپ سے عرض کر رہے ہیں کہ چار چست و چالاک آدمیوں کو آپ ہمارے اوپر چھوڑ دیجیے۔ ہم انہیں شیروانی میں لپیٹ کر پائجامے سے گرہ باندھ دیں گے۔"

"آپ واقعی اس طرح کر سکتے ہیں صوفی صاحب! آپ کی اس بات کو میں چیلنج نہیں کروں گا بہر

حال آپ کی مرضی ہے۔"

"نہیں قبلہ! ہم آپ کے احکامات کی پابندی کریں گے۔ کسی اہم مسئلے میں اگر ضرورت پیش آئی تو آپ کی پسند کا لباس ہی ہمارا لباس ہوگا۔ عام حالات میں اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں ہماری اوقات میں رہنے دیں۔"

"مجھے اعتراض نہیں صوفی صاحب! میرے اور آپ کے درمیان ظاہر ہے۔ کوئی ایسا رابطہ تو نہیں ہے۔ مجھے صرف آپ کا تعاون حاصل ہے۔ اور یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔"

"شکر گزار ہیں آپ کے۔" اور اس کے بعد کرنل رحیم شاہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ البتہ موٹر سائیکل وغیرہ کے بارے میں وہ کبھی کبھی صوفی کو ہدایت دے دیا کرتا تھا چنانچہ اس وقت بھی اس نے خاص طور سے کار میں آنے کے لیے کہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی کی کار اس ہوٹل کی جانب جا رہی تھی جس کا حوالہ کرنل رحیم شاہ نے دیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ مطلوبہ کمرے میں اس کا منتظر ملا۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ بری طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ صوفی اندر داخل ہوا تو کرنل رحیم شاہ نے مضطربانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خدا کی قسم صوفی صاحب! میری تقدیر بڑی اچھی ہے اور میں تو اسے بزرگوں کا فیض ہی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے اس طرح مل گئے۔"

"ہمیں شرم آ رہی ہے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا۔

"آپ براہ کرام بیٹھ جایئے۔ آپ کی ذہنی وسعتوں کا مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا آپ درحقیقت صوفی صاحب سمندر کی مانند ہیں۔ صوفی صاحب میں کیا کہوں شدت جوش سے دیوانہ ہو رہا ہوں میں۔"

"جناب من! ہم سے کیا قصور ہوا ہے۔ بس یہ فرما دیجیے درویشوں کے کرم سے۔" جواب میں کرنل رحیم شاہ نے قہقہہ لگایا تھا۔ صوفی پھر بولا۔

"صوفی جی، مم..... مم، ہمارا مطلب ہے کہ....."

"صوفی صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ کم از کم اتنا تو مجھے بتا دیجیے کہ وہ انجکشن آپ کو کہاں سے دستیاب ہوئے تھے۔"

"آہا..... تو کیا انجکشنوں کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"جی۔ ان کی لیبارٹری رپورٹ مل گئی ہے اور چونکہ ملٹری کے حوالے سے ان انجکشنوں کے سیال پر تحقیق کی گئی تھی۔ چنانچہ کوئی سقم باقی نہ رہا۔"

"رپورٹ کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہ انجکشن کچھ ایسی دواؤں کا مجموعہ ہے۔ جو انسان کو ذہنی طور پر ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سے سچائیاں ابلتی ہیں۔ وہ دنیا سے بے پناہ مخلص ہو جاتا ہے۔ اور اس کا دل چاہتا ہے کہ ایک لفظ بھی جھوٹ نہ بولے۔ چاہے اس سے نفع ہو یا نقصان۔ یعنی یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ وہ انجکشن جسے بھی لگا دیے جائیں۔ وہ اسی طرح سارے راز اگل دے گا۔ یہ راز اسی طرح منظر عام پر لائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے۔ وہ شاید ان لوگوں کا کوئی ٹیکنیکل منصوبہ تھا۔ لیکن اگر وہ چاہتے تو انفرادی طور پر بھی کسی اہم موضوع کے بارے میں مطلوبہ افراد سے معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں صوفی صاحب! کہ انفرادی طور پر انہوں نے یہ عمل اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان بڑے بڑے لوگوں کا سچ اور قومی پالیسیوں کو ان کے ذریعے منظر عام پر لا کر پوری حکومت کو بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے بعد بھی کچھ اور مفادات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔ صوفی صاحب! میں نے شاہ میر خان صاحب کے تعاون سے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور شاہ میر خان صاحب اس وقت شدت جوش سے دیوانے ہو رہے ہیں۔ اور مسلسل مجھ سے یہ سوال کیے جا رہے ہیں کہ یہ انجکشن میں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟''

صوفی کھو گیا تھا۔ اور اس عالم میں ہاتھ سیدھا شیروانی کی جیب میں پہنچتا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پان کی طلب شدت سے ہو رہی تھی لیکن کرنل رحیم شاہ کا خاص طور سے خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے آنکھیں میچ کر گردن جھٹکی اور پھر اس کے منہ سے ایک نعرہ مستانہ نکلا۔

''حق اللہ جناب من! میں نے پیر دمڑی شاہ کے بارے میں عرض کیا تھا۔ جب بھی رہنمائی کرتے ہیں اسی طرح سے کرتے ہیں۔''

''آپ کو خدا کا واسطہ صوفی صاحب!'' کرنل رحیم شاہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور صوفی چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ..... کہ آپ کو یہ سب کہاں سے معلوم ہوا اور یہ انجکشن کہاں سے دستیاب ہوئے۔''

''وہی عرض کرنے جا رہے تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہمارا کام تقریباً ختم ہے۔ اب آپ کے ذاتی کام کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ذاتی کام یہ ہے کہ آپ شاہ میر خان صاحب کو ساتھ لے کر کالی کتھی پر چھاپا ماریں۔''

''کالی کتھی۔''

''جی ایک مخصوص علاقہ ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں اس علاقے کے بارے میں مگر وہاں۔''

''وہاں بھی ایک مزار ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجیے۔ کہ وہ مزار ابھی زیر تعمیر ہے۔ لیکن اصل میں وہ مزار نہیں ہے۔ وہاں دشمن کے ایجنٹوں نے اپنا مرکز بنایا ہوا ہے۔ آپ کو ہم پوری سچویشن بتا کر نقشہ بنائے دیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ باقاعدہ آرمی ریڈ کیا جائے۔ اور وہاں سے ان لوگوں کو گرفتار کیا جائے خاص طور سے وہاں ایک شخص بابا صفر کے نام سے ہے۔ بابا صفر کو سب سے پہلے قابو میں کیا جائے۔ وہ باقی چیزوں کی نشان دہی کر سکے گا۔ پھر صوفی نے ایک کاغذ پر کالی کتھی کے اس علاقے کا نقشہ بنایا اور نقشہ بنا کر کرنل رحیم شاہ کو پیش کر دیا۔ کرنل رحیم شاہ ساری تفصیلات سمجھتا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے کہا تھا۔

''کیا آپ اس سلسلے میں۔''

''معذرت چاہتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ آپ اسے صرف گرین فورس کا کارنامہ ہی قرار دیں کسی بھی چیز کو ہم انفرادی طور پر اپنے آپ سے منسوب نہیں کرنا چاہتے۔''

''اتنے بڑے ہیں آپ صوفی صاحب! کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔'' کرنل رحیم شاہ سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ بہرحال یہ سارا معاملہ مکمل طور پر سمجھنے کے بعد کرنل رحیم شاہ صوفی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صوفی اپنی کار میں بیٹھ کر گرین ہاؤس چل پڑا۔ اور کرنل رحیم شاہ فوری طور پر شاہ میر خان صاحب سے ملاقات کے انتظامات کرنے لگا۔

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ کی اپنی شخصیت بھی معمولی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی سرکردگی میں ایک پورا فوجی یونٹ کالی کتھی میں پھیل گیا۔ صوفی نے ایک ایک لائن بنا کر دے دی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے بڑی احتیاط اور ذہانت کے ساتھ۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے کالی کتھی کے اس علاقے پر ریڈ کیا۔ اور سوئے ہوئے بابا صفر کو گرفتار کر لیا اس کے بعد اس سرنگ کا جائزہ لیا گیا۔ سرنگ بہت طویل تھی۔ اور ان علاقوں سے گزرتی ہوئی ایک ایسے ویران پہاڑی علاقے میں جا نکلتی تھی۔ جس کے دوسری طرف تھوڑا فاصلہ طے کر کے دشمن ملک کی سرحد تھی۔ سرنگ بہ ظاہر زیر تعمیر ہی لگتی تھی۔ اور ہو سکتا ہے اسے زیادہ وسعت دے کر برابر کے ملک میں آنے جانے کا راستہ بنایا جانے والا ہو۔ بہت سی ایسی چیزیں وہاں سے دستیاب ہوئی تھیں۔ جو قابل اعتراض تھیں بہرحال وہاں پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا گیا۔ انجکشن بھی دستیاب ہوئے تھے اس کے علاوہ ایسی ریکارڈنگ مشین بھی جس کے ذریعے پیغامات مختلف جگہوں پر ارسال کیے جا سکتے تھے سب سے بڑا کام بابا صفر کی گرفتاری کا تھا۔ اس کا نام اٹھا کر گریٹ نیشور تھا۔ اور یہ را کا ایجنٹ تھا۔ ایجنٹ کیا بلکہ ایک انتہائی اہم عہدے دار..... اس کے ذریعے چوہیں اور ایسے ناموں کا انکشاف ہوا۔ جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ تو بڑے بااختیار لوگ تھے۔ یہ سب بابا صفر کی زیر نگرانی کام کر رہے تھے۔ اور بابا صفر یعنی اٹھا کر گریٹ نیشور کا کام یہی تھا کہ ابتدا میں ان انجکشنوں کے ذریعے وہ ایسے لوگوں کو قابو میں کرے جو اہم ترین ملکی راز اسے پہنچاتے رہیں اور اس سلسلے میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی ان کے پاس نسب ترسیل کا ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا رابطہ براہ راست نہیں تھا بلکہ سب مشینی رابطہ تھا۔ سرنگ اگر مکمل ہو جاتی۔ تو کام ہو سکتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی موثر منصوبہ بندی نہیں ہو سکی تھی۔ کیونکہ جہاں سرنگ کا دوسرا سرا تھا۔ وہاں کے بعد سے سخت چٹانی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اور ان چٹانوں کو بھاری مشینوں کے بغیر کاٹنا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی جتنی لمبی سرنگ بنا لی گئی تھی وہی ایک حیرت ناک عمل تھا یہ تمام انکشافات اخبارات تک نہیں پہنچنے دیے گئے تھے۔ خفیہ طور پر ان تمام لوگوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔

کرنل رحیم شاہ اور صوفی اپنی ذمے داریاں پوری کر کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ صوفی کو تو خیر ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ نام و نمود کے تصور سے بھی گھبراتا تھا۔ خود کرنل رحیم شاہ بھی ایک پریکٹیکل آدمی تھا۔ اور اسے یہ غرض نہیں ہوتی تھی کہ وہ نام و نمود حاصل کرے لیکن تمام تر کارروائیوں کے مکمل ہونے کے بعد شاہ میر خان صاحب کی رپورٹ پر ملٹری ہائی کمان کے ہیڈ کوارٹر میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس میں گنے چنے لوگ تھے۔ اور خود کمانڈر ان چیف اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ شاہ میر خان کی طرف سے کرنل رحیم شاہ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ کرنل رحیم شاہ اپنی بیساکھی کے ذریعے جب وہاں پہنچا تو تمام افسران نے ان کا استقبال کیا۔

کرنل رحیم شاہ نے سیلوٹ کیا اور کمانڈر ان چیف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور پھر سامنے بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو دیکھ کر بولے۔

''بات اصل میں اتنی ہے کہ کچھ لوگ قدرتی طور پر ملک وملت کی بقا کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھیج دیا ہے بس وہ وقت گزرتا ہے جب ان کی پرورش ہو۔ اور وہ ایک مکمل شخصیت اختیار کر جائیں۔ اور اس کے بعد سے اس وقت تک کے لیے ان کی خدمات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ وہ واپس اس معبود حقیقی کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ ہم میں سے تقریباً تمام نہیں تو بہت سے افراد اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض پورے کرتے ہیں۔ اور پھر ایک عمر ہونے تک ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ذہنی طور پر کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتے اور ان میں ایک نام کرنل رحیم شاہ کا ہے۔ میں انہی کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ انہیں آسمانوں سے صرف ملک و ملت کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے اور وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ قانونی حیثیت کے تحت، انکی ایک ٹانگ ضائع ہونے کے بعد انہیں فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ لیکن آپ میں سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس کے لیے کرنل رحیم شاہ نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ حکومت نے قانون کے تحت انہیں ریٹائر کر دیا لیکن انہوں نے اس ریٹائرمنٹ کو قبول نہیں کیا اور اپنا فرض سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ موجودہ آپریشن جس میں ہم نے ٹھاکر گیا نیشور کو پکڑا ہے کا ایک ایک نقطہ کرنل رحیم شاہ نے ترتیب دیا اور ان کی قیادت میں ہم نے ایک خوفناک را کے ایجنٹ کو گرفتار کیا۔ جس نے صحیح معنوں میں ملک کی بنیادیں ہلانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن جس ملک میں کرنل رحیم شاہ جیسے لوگ موجود ہوں۔ وہاں بیرونی عمل کام نہیں کرنے پاتا۔ اور ہر اس آنکھ کو نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا جاتا ہے جو ملک کے بارے میں برے انداز میں سوچ رہی ہو۔ دیکھ رہی ہو۔ کرنل رحیم شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میں انہیں سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا اور اس کے لیے میں انہیں شاہ میر خان صاحب کے ہاتھوں ایک اعزاز پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

سونے کا ایک میڈل جس کے درمیان میں ایک خوب صورت ہیرا جگمگا رہا تھا۔ کمانڈر ان چیف نے رحیم شاہ کو پہنایا لیکن رحیم شاہ کے اندر ایک خجالت تھی۔ ایک شرمندگی کا سا احساس تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے تکا چہرہ ناچ رہا تھا جس نے اصلی کارنامہ چٹکیاں بجاتے سرانجام دیا تھا اور خود پس پردہ تھا۔ لیکن جب کرنل رحیم شاہ جذبات میں ڈوبا ہوا گرین ہاؤس پہنچا تو صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔

''دلاور! صوفی صاحب کہاں گئے ہیں۔''

''وہ جناب عالی جس شخص کو انہوں نے قید کیا تھا اسے لے کر گئے ہوئے ہیں۔'' دلاور نے جواب دیا تھا۔ قصور شاہد کا بھی نہیں تھا۔ وہ بے چارہ صرف ٹھاکر گیا نیشور کا شکار ہوا تھا احسان غزنوی جو اس خاندان کے سربراہ تھے۔ شاہد کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ اور اس گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

شاہد کتنے ہی دن سے گم تھا۔ صاعقہ، عدنان، فوزی، مینا یہ سب کے سب بڑے پریشان تھے۔ ہر طرح کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔ رمضان اور ہمشیرہ بھی ساکت تھے کہ اچانک شاہد ایک عجیب وغریب شخص کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور سب دنگ رہ گئے۔ صوفی نے احسان غزنوی صاحب کو پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ آدمی درحقیقت پڑوسی ملک کا ایک خطرناک ایجنٹ تھا اور ان انجکشنوں کے ذریعے ملکی راز حاصل کر رہا تھا۔ یہ تمام بچے اس کا شکار ہوئے تھے۔ آپ کو تفصیل بتائے دے رہا ہوں۔ کسی اور کو نہیں بتایئے گا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''مگر جناب! آپ کون ہیں کیا آپ کا تعلق ملٹری سے ہے۔''

''جی نہیں۔ دنیا سے ترک تعلق کر چکے ہیں۔ بس یونہی۔ پیروں فقیروں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ ہماری مدد کرتے ہیں درویشوں کے کرم سے چلتے ہیں خدا حافظ۔''

صوفی نے کہا اور اپنے مخصوص انداز میں گردن لچکاتا ہوا وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔

♥.....♥.....♥

ادھر کرنل رحیم شاہ بری طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ بہت دن کے بعد اپنے گھر گیا تھا۔ ورنہ اب اس کا زیادہ تر وقت دارالحکومت میں ہی گزرنے لگا تھا۔ اس وقت وہ سارے گھر والوں کے گھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ہی وہ میڈل رکھا ہوا تھا۔ جو اسے اس نئے کارنامے پر ملا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے سارے اہل خاندان اس کے قریب تھے اور وہ انہیں بتا رہا تھا۔

''معذور ہونے کے بعد آپ لوگ یقین کریں۔ کئی بار میں نے خودکشی کے بارے میں سوچا دشمن کو نقصان پہنچانا میرا ایمان ہے۔ بے شک انسان اپنی ذمے داری پوری کر لیتا ہے۔ اور ذمے داری پوری کرنے کے بعد وہ کسی گوشہ عافیت میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن میں نے روز اول ہی یہ سوچا تھا کہ صرف اپنا فرض پورا نہیں کروں گا۔ نوکری ایک الگ چیز ہے۔ مٹی کی پکار الگ، آپ لوگ یقین کریں۔ میرے وطن کے در و دیوار سرزمین کی سرحدیں میرے ملک کے چپے چپے کی زمین جیسے مجھے اپنا لخت جگر سمجھتی ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کا خون جگر میری رگوں میں دوڑتا ہو۔ بڑا پیار کرتا ہوں میں اس سے اور میرا دل چاہتا ہے کہ وطن کی زمین پر نثار ہو جاؤں۔ لیکن ٹانگ سے معذور ہونے کے بعد جب سرکاری طور پر مجھے رخصت دے دی گئی تو میرے دل کی دنیا ویران ہو گئی۔ بہت کچھ سوچتا تھا میں اس بارے میں، لیکن بے بسی محسوس کرتا تھا اور پھر میں تو صرف اور صرف یہی کہتا ہوں کہ قدرت کو میرے حال زار پر ترس آ گیا۔

ایک ایسا کردار ایک ایسا وجود میرے سامنے آیا۔ جس کے بارے میں میں نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن قربان جاؤں ان پیروں فقیروں کے۔ زمین سنبھال رکھی ہے انہوں نے، ہر ایک کی مشکل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی دعائیں پوری کر دیتا ہے۔ مجھے بالکل اتفاقیہ طور پر ایک بزرگ کے مزار پر صوفی مل گیا۔ ارے کیا چیز ہے یہ خدا جانے کیا چیز ہے مجھے تو وہ کوئی سائنسی عجوبہ ہی لگتا ہے یوں لگتا ہے جیسے کسی سائنس داں نے ایک روبوٹ بنایا ہو اور اسے کسی طرح اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائنس داں سے رہائی ہو گئی ہو۔ روبوٹ سے میرا مطلب ہے وہ روبوٹ مجھے مل گیا۔ ویسے حقیقت یہی ہے کہ اسے اس کائنات کے عظیم سائنس داں نے بنایا ہے۔ اس سائنس داں نے جس نے یہ ساری کائنات بنائی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ۔

صوفی ایک انوکھی وبا پھیلی ہے۔ ڈیفنس منسٹر کے بارے میں تو تم لوگوں کو پتا ہی ہے کہ میرے دوست ہیں۔ بڑی تشویش سے کہنے لگے کہ کرنل رحیم شاہ! جو کچھ ہوا ہے اس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں نے صوفی کو بتایا اور وہ بولا کہ وہ پیر ومڑی شاہ کے مزار پر جا رہا ہے۔ اور مسئلے کا حل تلاش کرے گا اور پھر اس نے منٹوں میں وہ حل میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس وقت جب مجھے یہ اعزاز پیش کیا جا رہا تھا اور فوجی ہیڈ کوارٹر میں یہ جملے ادا کیے جا رہے تھے کہ کچھ لوگ کسی قسم کی معذوری قبول نہیں کرتے تو یقین کرو میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں صوفی کے وجود میں سما جاؤں۔ صوفی بن جاؤں میں اور انہیں بتاؤں کہ یہ سب کچھ میں تنہا نہیں کیا ہے۔ میرا ایک ہم زاد ہے جو میرے اندر ہے۔ میں تم لوگوں کو یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں اس کا احترام کرنا ہے جب بھی وہ کبھی یہاں آئے۔"

"لیکن انکل وہ رہتے کہاں ہیں۔"

"بس ایک جملہ سنا ہو گا ان کے منہ سے، یہ ہو رہا ہے درویشوں کے کرم سے، وہ ہو رہا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ پتا نہیں بے چارے کا ماضی کیا ہے۔ بڑے ناقدرے لوگ ہیں۔ انسپکٹر کی حیثیت سے محکمہ پولیس میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ لیکن اپنی مخصوص فطرت کا مالک ہے۔ اسے معطل کر دیا گیا اور اس کے بعد برخاست۔ پتا ہے کیا کر رہا تھا پچھلے دنوں میں وہ؟" کرنل رحیم شاہ نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔ بچے منتظر تھے۔ کرنل رحشم شاہ نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔

"ایک پل پر ہر مال دس روپے کا ٹھیلا لگاتا تھا" ہنسی کی دبی دبی آوازیں ابھریں اور کرنل رحیم شاہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"ہنس رہے ہو تم بیٹے! ہنس رہے ہو تم۔ کاش! انسان کی عظمت سمجھ لی جاتی۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس کے پس منظر میں کیا ہے۔ انسان ہر حالت میں انسان ہی ہوتا ہے بیٹا! آج تم اس عالی شان کوٹھی میں اپنے شاندار بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں زندگی گزار رہے ہو۔ لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے ملک کے دو فی صد انسان بھی یہ زندگی نہیں گزارتے جو تم گزار رہے ہو۔ خیر! کیا فائدہ جب تم کسی انسان کی عظمت پر اس طرح ہنس سکتے ہو تو تم اس انسان کی قدر کیا کر سکتے ہو۔ چھوڑو..... چھوڑو ان باتوں کو۔" سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کرنل رحیم شاہ ناراض ہو گیا ہے۔ پھر کرنل ان کے درمیان نہیں رکا تھا اور سب افسوس کرتے رہے تھے۔ عادل نے کہا۔

"یار تم تایا ابو کو جانتے نہیں ہو کہ کس طرح کے انسان ہیں وہ، تم بھی اس وطن کے باشندے ہو۔"

"سوری یار! عادل پتا نہیں کیوں نکل گئی تھی۔" ہنسنے والے نے کہا۔

"اچھا عادل ایک بات بتاؤ انکل نے تمہاری ڈیوٹی بھی تو ان کے ساتھ ہی لگائی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن ابھی تک ہم نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا ہے۔ جب کہ اب واقعی یہ آرزو پیدا ہو گئی ہے

کہ ہم بھی کچھ ایسا کر کے دکھائیں کہ نکل تایا ابو ہماری بھی تعریف کریں۔" وہ سب گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

ممن خان کے ہوٹل میں حسب معمول رونق لگی ہوئی تھی۔ چائے کی سڑپیاں چل رہی تھیں ویٹر ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ رجو کو آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لیکن صوفی بھلا کسی سے کیسے نہ متعارف ہوتا اس وقت وہ چائے کی پرچ ہاتھ میں رکھے اور پوری کی پوری پیالی پرچ میں انڈیلے ہوئے۔ اس میں پھونکیں مار رہا تھا۔ چائے کی پرچ اس کی انگلیوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ چائے کی سڑپے بھرنا شروع کر دیے۔ سڑپ سڑپ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت رحمت خان صوفی کے پاس آ بیٹھا۔

"اماں صوفی صاحب! یہ شاہی سے کیا پھڈا چل گیا ہے۔"

"پھڈا ہمارا" صوفی نے حیرانی سے کہا۔

"ارے آپ کو معلوم ہی نہیں ہے۔"

"نہیں بھائی نہیں۔ مگر تم بتا رہے ہو۔ تو کچھ شبہ ہو رہا ہے درویشوں کے کرم سے شاہی ہے کہاں۔"

"باہر تھڑے پر بیٹھا ہوا ہے۔ اندر آیا تھا تمہیں دیکھ کر باہر نکل گیا۔"

"لیجئے ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے اماں ذرا دیکھیں۔ مگر کیا ہوا۔ یعنی ایک ایسی بات جس کا ہمیں پتا ہی نہیں ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا اچھا چلو اس سے کہیں گے۔" اتنی دیر میں دو اور شناسا آ گئے۔ تو رحمت خان نے کہا۔

"لیجئے قمن بھائی، بھائی صوفی کو پتا ہی نہیں ہے کہ شاہی سے ان کا کوئی پھڈا ہو گیا ہے۔"

"اماں درویشوں کی قسم ہمارے تو فرشتوں کو بھی یہ پتا نہیں تھا۔ آؤ ذرا دیکھیں تو سہی۔ چکر کیا ہے۔" صوفی نے پرچ میں بچی ہوئی چائے معدے میں انڈیلی اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑا۔ اس وقت وہ خالی شلوار اور شلوکے میں ملبوس تھا اور شلوکے کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے جو کچھ نظر آ رہا ہو گا وہ دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتا ہو گا۔ ویسے ہی کسی اونٹ کی تخلیق ہو رہی ہو گی۔ کہ برابر سے ایک انسانی روح گزر گئی اور اونٹ کی باڈی اس کے ساتھ لپٹی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نتیجے میں صوفی صاحب وجود میں آئے۔

باہر ہوٹل کے تھڑے پر شاہی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اور بیڑی پی رہا تھا۔ جب یہ لوگ اس کی طرف بڑھے۔ تو وہ ایک دم سے بے چین سا ہو گیا۔ صوفی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"شاہی۔ اماں کیا سن رہے ہیں ہم، تم ہم سے ناراض ہو۔" شاہی نے منہ بنایا اور تھڑے سے نیچے کود گیا پھر وہ آگے بڑھا تو صوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا۔

"دیکھو میاں! بات اصل میں یہ ہے چھوڑیں گے نہیں تمہیں۔ ہم سے زیادہ طاقت ور ہو تو بازو چھڑا کر چلے جاؤ۔ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہم سے بازو چھڑا لیا تو دوبارہ زندگی بھر تمہاری طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھیں گے۔ چاہے یہ محلہ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔"

"اماں رہنے دیں صوفی صاحب! وہ جو کہتے ہیں نا بغل میں چھری اور آگے پیچھے کیا ہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور ہم کیا کہتے ہیں یہ بھی سن لیجئے وہ شعر ہے نا کسی کا۔

کہ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

''بھائی شاہی! کم از کم بتا تو دو ہمیں درویشوں کی دعاؤں سے کہ ہوا کیا ہے۔''

''پوچھ رہے ہو کہ ہوا کیا ہے؟ اماں صوفی صاحب! کسی کے پیٹ پر اس طرح لات مار دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ وہاں چاچا صفر کے ہاں کام کر رہے تھے ہم۔ گئے تھے مریدی کرنے اور ان بے چاروں کا دھڑن تختہ کر دیا۔ سب کچھ کھدوا کر پھکوا دیا گیا ہے ادھر ہماری اچھی خاصی روزی لگ گئی تھی۔ اپنی روزی کے چکر میں تم نے ہماری روزی مروا دی۔''

''تو یہ بات ناگوار گزری ہے تمہیں۔''

''تو یار! کسی سے اس کا رزق چھین لو اور وہ برا بھی نہیں مانے۔''

''دیکھو بھائی! ہم بتا بئے دے رہے ہیں سب کو یہ تو آپ کو پتا ہے کہ پولیس میں نوکری کی ہے اور یہ بھی آپ کو پتا ہے کہ دنیا میں ہمارا اپنے وطن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور جس کا وطن ہو اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ ہم تو کبھی اپنے آپ کو اکیلا نہیں سمجھتے۔ اس وقت جتنے لوگ بھی ہمارے پاس ہیں درویشوں کی دعاؤں سے ان میں ذرا وہ شخص اپنا ہاتھ اٹھا دے۔ جو کہتا ہے کہ اسے وطن کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس کی اپنی جیبیں بھر جائیں باقی سب جہنم میں جائے۔ ذرا اٹھاؤ ہاتھ درویشوں کی دعاؤں سے۔ کوئی ہاتھ اوپر نہیں اٹھا تھا یہاں تک کہ شاہی کا ہاتھ بھی نیچے ہی تھا۔

سب صوفی کو دیکھ رہے تھے۔

''میاں شاہی وہ غیر ملکی جاسوس تھا۔ اس نے وہاں اپنا اڈا بنا رکھا تھا اور ایک سرنگ بھی بنا رکھی تھی۔ اب اس سرنگ کی چھت توڑ دی گئی ہے۔ اور وہ ایک نالے کی سی شکل میں نظر آتی ہے وہ اس سرنگ کو سرحد پار لے جانا چاہتے تھے۔ تاکہ سرحد پار سے جاسوسوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ میاں پتا ہے تمہیں کیسے دشمن کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ وہ تو اللہ نے تمہاری بچت کر رکھی ہے درویشوں کی دعاؤں سے ورنہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ بس شاہی ہمیں وہاں لے گئے تھے۔ کچھ دیر وہاں وقت گزرا اور اللہ نے ہماری رہنمائی کر دی۔ درویشوں کی دعاؤں سے وہاں وہ سرنگ دریافت کر لی۔ اور ساتھ ہی کچھ ایسی چیزیں بھی جو جاسوسی کے کام آ رہی تھیں۔ بس پھر کچھ اعلا افسران سے مل کر پکڑوا دیا ان سسروں کو اب آپ بتائیے شاہی میاں! ہم تو کہتے ہیں کہ آپ کی جان بچالی۔ اللہ نے درویشوں کے کرم سے۔ ورنہ آپ نے بھی وہاں تعمیر تو شروع کر دی تھی۔ وہاں کام کرتے اور دشمنوں کے آلہ کار بن جاتے۔ بہر حال جاسوسوں کو پکڑے تو جانا تھا۔ آپ بھی ان کے ساتھ پکڑے جاتے اور ملک دشمن قرار دے دیے جاتے پھر اس کے بعد آپ کو بھی سزائے موت ہی ملتی۔ یہ تھوڑے سے پیسے تو مل جاتے مگر انہیں خرچ کون کرتا۔ آپ تو لٹک جاتے سولی پر درویشوں کی دعاؤں سے۔'' شاہی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ باقی تمام لوگوں کے منہ بھی کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ رحمت خان نے کہا۔

''اماں تمہیں قسم ہے صوفی صاحب! سچ کہہ رہے ہو یہ سب کچھ۔''

''سو تو ہے۔'' شاہی جلدی سے آگے بڑھا اس نے جلدی سے جھک کر صوفی کے پاؤں پکڑ لیے اور

صوفی بھد کنے لگا۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا کر رہے ہو۔ دیکھو تمہیں اللہ کی قسم، دیکھو ہماری بات سنو ایسا نہ کرو۔ تمہیں...... تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' صوفی کو پیروں میں بہت گدگدی ہوتی تھی۔ بہ مشکل تمام اس نے شاہی سے اپنے پیر چھڑوائے اور بولا۔

''بس تو ناراضگی ختم۔ چلو آؤ اندر بیٹھ کر چائے پئیں گے۔''

♥...... ♥...... ♥

کرنل رحیم شاہ کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ صوفی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ گھر واپس آ گیا تھا۔ دارالحکومت میں اس کے گرین ہاؤس میں باقاعدہ آبادی ہو گئی تھی۔ ولاور اپنے اہل خاندان کے ساتھ اور غلام قادر ویسے ہی وہاں رہتا تھا اس کے علاوہ کچھ خاص قسم کے ملازم بھی رہتے تھے۔ جو گرین ہاؤس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ شازیہ کا اپنے گھر آنا جانا تھا۔ اتنی بڑی تنخواہ لگا دی گئی تھی اس کی کسی اور معاملے کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ کچھ دن پہلے سڑکوں پر بھیک مانگنے والی گریجویٹ بھکارن اب ایک پروقار شخصیت کی مالک نظر آتی تھی۔ خوش بختی یہ تھی کہ اس نے کبھی کسی کو اپنے بارے میں نہیں جتایا تھا اور خاموشی کے اپنا کام کرتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے اہل خاندان کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ چنانچہ بات بن گئی تھی۔ فی الحال گرین فورس کو یہیں روک دیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل رحیم شاہ نے ان ناتجربے کار لوگوں کو اپنی فورس میں شامل کر کے ایک تجربہ کیا تھا۔ حالانکہ اس طرح کے کاموں میں مکمل طور پر تجربے کار لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بس کرنل رحیم شاہ کی ذاتی کوشش تھی کہ اس نے یہ سب کچھ کر ڈالا تھا۔ بلکہ صوفی سے اس بارے میں بات چیت ہوئی تھی تو صوفی نے بھی اس کے خیال کی حمایت کی تھی۔

''حضور من! انسان تو یکساں ہی ہوتے ہیں کسی کو بھی روز اول سے کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ وقت خود سب سے بڑی تربیت کر دیتا ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں آپ کا یہ قدم غیر مناسب نہیں ہے۔ اور پھر دیکھتے ہیں آگے چل کر، اگر ہمیں ہماری تمام ضروریات پوری ہونے کی امید نہ ہوئی تو انداز بدل دیں گے۔ یہ لوگ تو ویسے بھی معصوم سے لوگ ہیں اور انہیں اپنے ساتھ شامل کرنا بڑی خوش آئند بات ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب! ان لوگوں کی ایک باقاعدہ تربیت بھی ہونی چاہیے اور اس کا بندوبست آپ ہی کو کرنا ہوگا۔''

''حضور والا کی ہدایت کے مطابق جیسا حکم ہوا کریں گے۔'' بہر حال وہ لوگ غیر مطمئن نہیں تھے کرنل رحیم شاہ تو صوفی کی پہلی ہی کوشش سے بڑا مطمئن ہو گیا تھا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سردار پور ایک طرح سے دارالحکومت کا نواحی علاقہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا محل وقوع بہت ہی خوب صورت تھا۔ دارالحکومت کے مشرقی حصے کا علاقہ پہاڑی علاقہ کہا جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ آخر کار سرحد سے جا ملتا تھا۔

چنانچہ بعض چھوٹے چھوٹے علاقوں میں ایسے پوائنٹ بھی تھے۔ جہاں خاص طور سے نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ کرنل رحیم شاہ ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کے لیے سردار پور آ گیا تھا۔ صوفی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو تو خیر ویسے بھی آزادی تھی۔ چنانچہ ممن خان کا ہوٹل آباد تھا اور صوفی کی ہنگامہ آرائیاں عروج پر۔ قوالی کی محفلیں، عرس، بزرگوں کے نام تلاش کیے جاتے اور گلی ممن خان میں باقاعدہ شامیانے لگ جاتے اور کسی نہ کسی بزرگ کا عرس شروع ہو جاتا۔ ایک بار پھر فراغت حاصل ہو گئی تھی اور کرنل رحیم شاہ اپنی دولت اپنے مقاصد پر لٹا رہا تھا۔ لیکن بات یہیں تک محدود نہ رہی۔ شاہ میر خان صاحب نے کرنل رحیم شاہ کو طلب کر لیا۔

"کرنل صاحب! آپ نے جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ آپ کے خیال میں آپ اپنا فرض پورا کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم مطمئن نہیں ہوئے۔"

"سمجھا نہیں میرے دوست۔" کرنل رحیم شاہ نے حسب عادت بے تکلفی سے کہا۔

"ایک بار پھر سرکاری محکمے میں آپ کی انٹری ہو گئی ہے۔ اور یہ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ کرنل رحیم شاہ جیسے باعمل آدمی کو معطل نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اور ان کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ ترتیب دیا جائے گا۔"

"نہیں مجھے یہ منظور نہیں ہے کیونکہ اس طرح مجھ پر بندشیں عائد ہو جائیں گی اور بہرحال میں سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ ایک بار پھر اپنے ذہن پر کوئی بوجھ لینا پسند نہیں کروں گا۔ پھر مجھے وہی سب کچھ کرنا پڑے گا جو حکومت کی ضرورت ہو گی۔"

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ رحیم شاہ صاحب۔" شاہ میر صاحب نے پوچھا۔

"بس چونکہ میں ایک شعبے سے متعلق رہا ہوں جو ملک دشمنوں کے خلاف سرحدوں کی حفاظت کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی میں ہر طرح کی سازشوں کے سامنے سینہ سپر رہا ہوں۔ اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ ملک کے اندر اور باہر ملک کے خلاف جو کچھ بھی ہو اور جہاں تک میرے علم آ جائے۔ میں اس کے لیے کام کروں۔"

"تو ہمارا مقصد بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔"

"نہیں جناب! میں اب آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں ایک بات کا آپ سے وعدہ کرتا ہوں جو کچھ بھی کروں گا ملکی قانون کے دائرے میں رہ کروں گا۔ کہیں حد سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جس طرح اس وقت ایک غیر ملکی جاسوس پکڑنے کے سلسلے میں حکومت کی مدد کی ضرورت پیش آئی ہے۔ آئندہ بھی اگر پیش آئی تو یہ مدد مانگوں گا۔ مکمل ثبوت اور ذمے داری کے ساتھ۔"

"تو پھر ایک اور ترکیب ہو سکتی ہے۔" شاہ صاحب نے کہا اور کرنل رحیم شاہ سوالیہ نگاہوں سے شاہ میر کو دیکھنے لگا۔

"وہ یہ کہ کسی خاص محکمے کو آپ سے منسلک کر دیا جائے میرا مطلب ہے اس محکمے کو یا اس ایجنسی کو خصوصی ہدایت کر دی جائے کہ آپ کی طلبی پر ایک دم ایکشن میں آ جائے اور آپ کی ضرورت کے مطابق مدد کرے اس طرح یہ نہیں ہو گا کہ کسی بھی مسئلے میں آپ کو فورس فراہم نہ ہو سکے۔" کرنل رحیم شاہ کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں شاہ میر! تم میرے لیے ہر آسانی پیدا کرنا چاہتے ہو۔"

"کیوں نہ پیدا کروں، معذور ہو کر ڈیوٹی سے ہٹ جانے کے باوجود تم آج بھی اس طرح ملک و ملت کے لیے مضطرب ہو۔ کون قدر نہ کرے گا اس بات کی۔"

"ٹھیک ہے تم کسی ایجنسی کو میرے لیے مخصوص کر دو۔ مگر اس شکل میں کہ وہ اپنا کام جس طرح کرتی ہے کرتی رہے۔ اگر مجھے بھی ضرورت پیش آئے۔ تو میری مدد کر دی جائے۔"

"اس کے علاوہ ایک فنڈ ہم تمہارے مشن کے لیے جاری کیے دیتے ہیں۔ تم جس طرح بھی چاہو مکمل طور پر صاحب اختیار ہو کر وہ فنڈ خرچ کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا کی ہر چیز عطا کر دی ہے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اپنے پاس سے صرف اتنا خرچ کرو۔ جتنا ضروری ہو باقی سب سرکاری حساب میں جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے یہ بات مجھے منظور ہے۔ کیونکہ میں واقعی اس سلسلے میں کچھ اخراجات کر رہا ہوں اور یقیناً مجھے اس طرح کے فنڈ کی ضرورت پڑے گی۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ یہ فنڈ میں ان سے حاصل کروں جن کے خلاف کام کرتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ذرا غیر معیاری عمل رہے گا۔"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" کرنل رحیم شاہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

کوہ ساروں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے سادہ سادہ زندگی گزارنے والے محنت کش جن کے کارنامے سن کر اور دیکھ کر یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔ ناقابل عبور پہاڑی راستے جن کے بارے میں یہ سوچ کر خوف آئے کہ ان ہولناک ڈھلانوں میں انسان تو انسان جانور بھی قدم رکھتے ہوئے وحشت زدہ ہو جاتے ہوں گے۔ لیکن انہیں ڈھلانوں میں اور انہی ناقابل عبور راستوں پر چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جانے والے وزنی وزنی ساز و سامان کے ساتھ ان راستوں کو عبور کرنے والے کبھی کبھی تو انسان لگتے نہیں ہیں۔ لگتا ہے کوئی آسیبی مخلوق ہے۔ جو یہاں انسانوں کی مانند زندگی گزار رہی ہے۔

اس کے بعد موسموں کی سختی۔ برف باری ہو جائے تو برف کے انبار لگ جائیں۔ لیکن انسان ان میں بھی نمودار ہوتے ہیں۔ ان ہی برف زاروں میں ایک اچھی خاصی وسیع و عریض آبادی سنگینہ بھی ہے۔ سنگینہ بڑی مہذب بستی ہے زیادہ تر مکانات پتھر اور چونے کے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں لکڑیوں کے مکانات بھی نظر آتے ہیں۔ اور کہیں مکانات کی شکل میں بجوبے جیسے کسی ایسی چٹان پر جس کے نیچے کوئی خلا ہو۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر جس میں ضروریات زندگی بالکل اسی طرح جیسے عام جگہوں پر دیکھنے والے کا تو سانس بند ہو جائے۔ لیکن اس میں رہنے والے مکمل اور بھرپور سانسیں لیتے ہیں۔ سنگینہ میں ایسے عظیم الشان حویلیاں اور احاطے بھی ہیں جو زمانہ قدیم میں نہ جانے کب سے سربلند چلے آئے ہیں اور انہی میں حکیم جاہ کی حویلی بھی ہے۔

یہ حویلی حکیم جاہ نے نہیں بنوائی تھی۔ نہ جانے اس حویلی کی تاریخ کیا تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مختلف ناموں سے منسوب ہوتی رہی پتھریلی دیواروں میں گھری ہوئی یہ خوب صورت حویلی باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ دنیا کی کون سی چیز ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ اسی حویلی میں خانم فردوسیہ رہتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خانم فردوسیہ حکیم جاہ کی بیوہ، جس کی صرف ایک بیٹی ہے، حکیم جاہ کچھ عرصے قبل ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا اور اس کے بعد خانم فردوسیہ یہاں کی مکمل مالک اور مختار تھی۔ اپنی نوجوان بیٹی اراشیہ کے ساتھ وہ یہاں حکمرانوں کی زندگی گزار رہی تھی۔ بہت ہی متین فطرت کی مالک اس کی بیٹی کی شکل وصورت میں نظر آ جاتی تھی۔ بلند و بالا قد و قامت نے دونوں ماں بیٹیوں کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے اراشیہ بہت ہی شوخ و شنگ تھی لیکن باپ کی موت کے بعد نہ جانے کیوں اس پر ایک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ اور یہ خوف خانم فردوسیہ کے شبہے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ خانم فردوسیہ بری طرح بے کل رہتی تھی اور اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری رہتی تھی۔ نہ جانے وہ کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر اس رات جب ہلکی برف باری ہو رہی تھی اور ماحول پر ایک خوش گوار کیفیت مسلط تھی۔ خانم فردوسیہ آتش دان کے پاس بیٹھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اراشیہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ فردوسیہ نے چونک کر بیٹی کی صورت دیکھی اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اراشیہ نے ایک کرسی گھسیٹی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان دنوں آپ بہت زیادہ الجھی ہوئی ہیں خانم!" اراشیہ نے ماں سے کہا۔

"ہاں بالکل ٹھیک سوچ رہی ہو تم اصل میں مجھے وقت کا انتظار تھا اور وقت میرا خیال ہے آ گیا ہے۔ ہمیں ایک ناٹک کرنا ہے اور تم اس ناٹک میں اہم کردار ادا کر رہی ہو۔"

"ناٹک..... کیسا ناٹک اور کیوں؟" اراشیہ نے سوال کیا۔

خانم فردوسیہ کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار پھیل گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہی پھر بولی۔

"دیکھو اراشیہ..... میں سمجھتی ہوں کہ تم انتہائی ذہین بچی ہو۔ ہر طرح کی صورت حال سے واقف تمہیں کسی بات سے بے خبر رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ تمہارے علاوہ اور ہے بھی کون۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم اگر چاہیں تو یہاں سے کسی بھی شہری آبادی میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ ہماری اپنی دنیا الگ ہو جائے گی۔ میں تمہیں ایک جدید زندگی دے سکتی ہوں وہیں پر ہم زندگی کے بقیہ دن گزار لیں گے۔ خدا کا دیا ہمارے پاس اتنا کچھ ہے کہ ہم برسوں گزار سکتے ہیں اور ہمیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ لیکن....." اتنا کہہ کر خانم فردوسیہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بالکل خاموش رہی اور اس کے بعد اس نے اراشیہ سے پوچھا۔

"اراشیہ ہمارا وطن بہت وسیع ہے۔ بہت خوبصورت ہے اس کی آبادیاں جدید ترین ہیں ہمارے سمندر ہیں سب کچھ ہے ہمارے پاس کیا تم وہاں جا کر زندگی گزارنا پسند کرو گی۔ میں آج اس سلسلے میں تمہارا جواب چاہتی ہوں۔"

"آپ نے ایک بات لیکن پر آ کر چھوڑ دی تھی۔ لیکن سے آگے کہیں خانم۔" اراشیہ نے کہا اور خانم کی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم ایک ذہین بچی ہو۔ لیکن کے بعد کی منزل یہ ہے کہ جب ہم یہاں سے ان پہاڑوں اور چٹانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر جائیں گے تو یہ ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہ جائیں گی۔ کیوں کہ انہی سے ہماری مٹی ملی ہے۔ اور انہی سے ہمارا خمیر اٹھا ہے۔ انہی وادیوں میں ہم نے جینے مرنے کی قسم کھائی ہے۔ انہی وادیوں میں ہمارے خاندان کی روحیں بھٹکتی پھرتی ہیں انہی وادیوں میں ہماری خوشی اور غم بکھرے ہوئے

ہیں۔ اپنی روح کو چھوڑنا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ اپنی روح سے علیحدگی بہت دکھ بھرا عمل ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے مادر مہربان! اب مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں رہی ہے آپ نے خود مجھ سے پوچھے گئے سوال کا جواب میری زبان میں دے دیا ہے کیونکہ میں آپ کی بیٹی ہوں اور جو سوچ آپ کی ہے وہی میری ہو سکتی ہے۔"

"ہاں ہم ان وادیوں کو نہیں چھوڑیں گے لیکن ان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی نہیں ہونے دیں گے دیکھو اراشیہ میں تم سے پہلے بھی اس خدشے کا کتنی بار اظہار کر چکی ہوں کہ یہ بات میرے دل میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ کہ حکیم جاہ اپنی موت نہیں مرے۔ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں سارا شبہ بابر جاہ پر جاتا ہے۔ بابر جاہ، حکیم جاہ کا چھوٹا بھائی بے شک ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ سوتیلا ہے اور یہ بات اسی حویلی میں ہمارے علم میں آئی ہے۔ خیانت اس کے چہرے سے جھلکتی ہے۔ بے شک وہ ہمارے لیے ابھی تک کوئی خطرہ نہیں بنا۔ لیکن یہ طے ہے کہ یہاں وہ ملک دشمنوں کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہا ہے اور ملک کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ اراشیہ ان پہاڑی چٹانوں اور پہاڑی دیواروں کا ہم میں سے ہر شخص پر قرض ہے۔ ہمیں وطن کا سرحدی محافظ کہا جاتا ہے۔ تو کیا ہم اپنے فرض سے اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے رہیں۔ اراشیہ! مجھے یہ سب بے ایمانی لگتی ہے اور میں بے ایمان نہیں ہوں۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ چچا جان ملک کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔"

"خدا کرے ایسا نہ ہو۔ لیکن جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ ایسا ہی ہے اور مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ وہ سب کچھ۔"

"تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں خانم!"

"بہت عرصے پہلے کی بات ہے کہ ایک بار ایک سرحدی مسئلے میں ہماری ملاقات کرنل رحیم شاہ سے ہوئی تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ حکیم جاہ کے ساتھ مل کر اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ تب حکیم جاہ سے بڑی دوستی ہو گئی اس کی اور اکثر جب وہ سنگینہ آتا تھا تو ہمارے پاس ٹھہرتا تھا ایک بار اس نے ہم لوگوں کو بھی اپنی بستی سردار پور میں مدعو کیا تھا۔ خود بھی صاحب حیثیت اور جاگیردار آدمی ہے فوجی زندگی اس کا شوق تھا۔ اور اس شوق کی تکمیل اس نے اس طرح کی کہ بے مثال ہو گیا اس کے علاوہ زخمی ہوا اور اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔ حکیم جاہ اس سے بہت متاثر تھا۔ بڑی اچھی دوستی رہی ہماری۔ اس کے عزم بے مثال تھے۔ بہرحال فوج سے ریٹائر ہو گیا وہ لیکن اس کے تعلقات بے پناہ ہیں اور وہ ہماری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ ایک بار حکیم جاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس جیسے لوگ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ تم دیکھ لینا وہ منظر عام پر آئے گا کسی اور شکل میں اب تو یہ میں نہیں جانتی کہ اس کا موجودہ حال کیا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے پاس جاؤں اور اس کو صورت حال سے آگاہ کروں۔ ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔"

"تو پھر.....؟"

"تو پھر یہ میری روح! بابر جاہ کبھی نہیں چاہے گا کہ میں ایسا کوئی عمل کروں۔ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا ہو کہ بابر جاہ خاص طور سے ہماری ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے اور وہ ہمیں کہیں بھی تنہا نہیں جانے دے گا۔ وہ نہ صرف ہمارا راستہ روکے گا بلکہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیں ختم کرنے کی کوشش بھی کرے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خیر یہ اتنا آسان تو نہیں ہوگا خانم! اراشیہ نے خوف زدہ ہونے کے بجائے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹا! لیکن پھر بھی اس وقت تک تو ہمیں پس منظر میں رہنا ہوگا جب تک کہ حقیقتیں خود اپنا تھوڑا بہت انکشاف نہ کر دیں۔" تھوڑی دیر کے لیے ماحول پر خاموشی مسلط ہوگئی۔ پھر اراشیہ نے کہا۔

"آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے خانم!"

"منصوبہ ہی سمجھ لو اسے۔ میں کھلم کھلا تم سے یہ بات کہوں گی کہ میں سردار پور جانا چاہتی ہوں رحیم شاہ سے ملنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے ایک ڈراما کرنا پڑے گا۔"

"ہاں۔ میں اس ڈرامے کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"تم تھوڑی سی بیماری تھوڑے سے اضمحلال کا اظہار کرو اور بعد میں یہ کہو کہ تم ماحول سے اکتا گئی ہو۔ ہم سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے برفانی علاقوں میں نکلیں گے۔" اور خانم اراشیہ کو اپنے منصوبے کی تفصیل بتانے لگی۔ اراشیہ نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ تو اچھا منصوبہ ہے۔ میں اس کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔"

"پھر آغاز کرو آج ہی سے۔" اور اراشیہ نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

لڑکے لڑکیوں کو بہت لطف آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے بارے میں اتنا علم تو نہیں تھا کہ وہ پیر پرست ہے۔ خود بھی شاید کسی بزرگ کا مرید تھا۔ اکثر کبھی کبھی مزارات پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو بار لڑکے لڑکیوں نے بھی اس کے ساتھ مزارات کے عرس وغیرہ میں شرکت کی تھی۔ لیکن سردار پور کی اس حویلی میں یہ محفل سماع پہلی بار منعقد ہو رہی تھی۔ اور صوفی اس میں پیش پیش تھا۔ نہ صرف وہ خود اس کے انتظامات میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ بلکہ خصوصی طور پر من خان، شاہی، مولوی عبدالجبار، ہدایت علی جیسے تمام افراد بھی انتظامیہ کمیٹی میں شامل تھے۔ سردار پور کی آبادی کے معززین کو مدعو کیا گیا تھا۔

کوٹھی کے ایک حصے میں باورچی لنگر کے لیے دیگیں پکا رہے تھے۔ اور ماحول اس طرح بدل گیا تھا کہ ہر دیکھنے والے کو لطف آئے۔ حویلی کے مکین پہلی بار ایک نئی کیفیت سے روشناس ہو رہے تھے شام جھکنے لگی۔ جگہ جگہ دریاں اور شامیانے بچھا دیے گئے۔ فرشی نشست تھی۔ ایک وسیع و عریض اسٹیج بنایا گیا تھا۔ برقی قمقموں سے کوٹھی جگمگا رہی تھی۔ مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مغرب کے بعد فاتحہ خوانی شروع ہوئی۔ بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ صوفی کی سج دھج قابل دید تھی۔ دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ بھاگ بھاگ کر ہر کام کر رہا تھا۔ نئی شیروانی اور پائجامہ اور اس پر دوپلی ٹوپی بہار دے رہی تھی۔ نازی نے فیضان کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم نے ہدہد دیکھا ہے۔"

"وڈیوڈ پیکر۔"

"ویسے تو اس کے کئی نام ہیں۔ اسے نیل کنٹھ بھی کہا جاتا ہے۔ وڈی وڈ پیکر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہدہد بڑا صحیح نام ہے اور ایک خاص شکل کی نشان دہی کرتا ہے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو۔" فیضان نے کہا۔

"اس شخص کو دیکھ کر ہدہد کا تصور ذہن میں نہیں ابھرتا۔" نازی نے صوفی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور فیضان نے بہ مشکل ہنسی روکی پھر مصنوعی غصے میں بولا۔

"وہ میرا باس ہے سمجھیں۔ میرے سامنے اس کی شان میں گستاخی نہ کیا کرو۔" نازی ہنس پڑی اور پھر بولی۔

"ذرا اکڑوں بیٹھو۔"

"کیا مطلب؟"

"جیسے وہ بیٹھا ہے اس طرح بیٹھو۔" نازی نے اشارہ کیا اور فیضان ہنسی نہ روک سکا۔

"نازی باز آ جاؤ۔"

"خدا کی قسم ہوشیار کر رہی ہوں تمہیں۔ تھوڑے دن اس کی صحبت میں رہے نا تو خود بھی ہدہد بن جاؤ گے۔"

"یار! مگر ایک بات کہوں۔"

"ہاں بولو۔"

"تمہیں تایا میاں بے وقوف لگتے ہیں۔"

"نہیں بے وقوف نہیں ہیں۔ لیکن بس نہ جانے کیوں وہ اس سے اتنے متاثر ہو گئے ہیں۔"

"اس دن نہیں دیکھا تھا۔ جب اس نے اکھاڑے میں۔"

"بس بس وہ تذکرہ مت کیا کرو۔ بڑی شرم آتی ہے ہمیں۔ کسی کو جانوروں کی طرح کھلایا پلایا جائے۔ اور نتیجہ یہ نکلے۔"

"جی نہیں وہ دیواریں توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن بس ہر اونٹ کے سامنے پہاڑ ہوتا ہے۔"

"تم اس سے بہت متاثر ہو گئے ہو۔"

"بھئی سچی بات یہ ہے کہ اس کے بارے میں جو تفصیلات سنی ہیں وہ تو کچھ ایسی ہی ہیں کہ اس سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ صوفی ان تمام باتوں سے بے نیاز قوالی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لنگر ہوا اور لڑکے لڑکیاں عجیب سے انداز میں دیکھنے لگے۔ کھانے پینے والے بڑی نیاز مندی اور عقیدت سے لنگر کھا رہے تھے کسی اور لڑکی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"توبہ توبہ کھانا بھی اسی بے قدری سے کھایا جاتا ہے۔"

"یار! اگر برا نہ مانو تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہی بے ترتیبی اور بے قدری انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ہم نے اپنے آپ پر لاکھوں خول چڑھا لیے ہیں۔ اور اس خول کے اندر بیمار ہو گئے ہیں۔ کیا تم اپنے آپ کو تندرست سمجھتی ہو۔"

"جاؤ جاؤ خود بھی شریک ہو جاؤ انہی میں۔" طنز کرنے والی بولی۔ سننے والا عادل تھا۔ دونوں بھائی اب کرنل رحیم شاہ اور صوفی کے افکار و خیالات کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔ پھر محفل سماع کا آغاز ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکے لڑکیوں نے منہ میں کپڑے دبا رکھے تھے۔ قوال بھی بے مثال ہوتے ہیں۔ وزن ساڑھے تین سو پونڈ تھوڑا بہت کم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پان کی دھڑی ہونٹوں پر جمی ہوئی۔ آنکھوں میں سرمہ، گالوں پر شنگرف جو سوفی صدی مصنوعی، چمک دمک والے لباس اور اس کے بعد تھل تھلاتے ہوئے جسموں کے ساتھ حلق سے نکلنے والی مدھم آواز نازی پھر بولی۔

"ذرا دیکھو، دیکھو یہ ہاتھی بھی میاؤں میاؤں کر سکتا ہے۔ لگ رہا ہے آواز گلے میں پھنس گئی ہے۔"

"نہ پھنسے تو کیا کرے اتنی موٹی گردن سے کوئی چیز باہر نکل سکتی ہے آسانی کے ساتھ۔ لگتا ہے تربوز میں ہوا بھر دی گئی ہے۔" نہ جانے کیسے کیسے جملے کہے جاتے رہے۔ قوال اپنی دانست میں قیامت ڈھا رہے تھے محفل میں بہت سوں کو وجد آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ تو خیر سنجیدہ آدمی تھا۔ لیکن صوفی پر کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ خلا میں گردش کر رہے تھے۔

اور اس وقت واقعی ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا کہ اگر لڑکے لڑکیوں کو گھر سے نکال دیے جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک ایک منہ دبا کر باہر بھاگتا تھا اور ہنسی سے فراغت حاصل کر کے واپس آ جاتا تھا۔ بہرحال اسی طرح یہ محفل سماع جاری رہی اور رات کو پانچ ساڑھے پانچ بجے تک ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ پھر دعا ہوئی قوالوں نے دعا پڑھی۔ صوفی پر مسلسل وجد طاری رہا تھا۔ اور وہ حق اللہ حق اللہ کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اس طرح یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔ لیکن لڑکے لڑکیوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے اور دوسرے دن انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"تایا میاں! یہ محفل سماع صرف ایک دن کی ہوتی ہے کیا؟"

"نہیں عزیزی! ہم اسے تین دن، سات دن، گیارہ دن جاری رکھ سکتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" کرنل رحیم شاہ کی بجائے صوفی نے جواب دیا۔

"تو صوفی صاحب! پھر اس کا دورانیہ بڑھایئے۔"

"ایسا کرتے ہیں پیر گلگلے شاہ کا عرس شریف آ رہا ہے۔ ستائیس تاریخ ہوتی ہے ہر سال ستمبر کی۔ آنے والی ہے، سہ روزہ پروگرام ترتیب دے لیتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ویسے آپ لوگوں کو تو زحمت ہوتی ہوگی۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے بالکل نہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔

"اماں تمہیں قسم سے تو پھر ہو جائے عرس مبارک کا پروگرام۔" کرنل رحیم شاہ بچوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ یہ سارے کے سارے شرارت میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بچو! اگر واقعی تم لوگ بھی اس میں دلچسپی لو تو میں انکار نہیں کروں گا۔ یہ یاد رکھنا۔ اور اس کے بعد سارے انتظامات میں حصہ لینا پڑے گا تمہیں۔"

"ہم دل و جان سے حاضر ہیں چچا میاں۔"

"صوفی صاحب جیسے انسان کا ہاتھ اگر کسی کو حاصل ہو جائے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کیا کہتے ہیں صوفی صاحب!"

"سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو درویشوں کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔"

صوفی نے خشوع و خضوع کے ساتھ کہا۔

♥……♥……♥

بابر جاہ اندر داخل ہو گیا۔ بلند و بالا قد و قامت کا مالک، لمبے چوڑے جسم کا ایک انتہائی کرخت چہرے والا آدمی تھا۔ لیکن بھاوج کے سامنے ہمیشہ گردن خم کیے رہتا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ خود خانم جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی کوئی معمولی خاندان نہیں تھا۔ بہت بڑے لوگ تھے اور بہت بڑے وسائل رکھتے تھے۔ خانم کو اگر کوئی نقصان پہنچ جاتا یا کوئی اور ایسی ویسی بات ہو جاتی تو سنگینہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا سکتی تھی۔ یہ بات بابر جاہ بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اراشیہ ایک خوب صورت کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ بابر جاہ کی آمد کی اطلاع پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تو بابر جاہ محبت بھرے انداز میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ خانم کچھ فاصلے پر ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس نے بھی ایک خوب صورت شال اوڑھ رکھی تھی۔

"کیا بات ہے ہماری بیٹی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" بابر جاہ نے نرم لہجے میں اراشیہ سے کہا۔

"میں بے زار ہو گئی ہوں چچا جان۔ بیزار ہو گئی ہوں میں، اگر میں یہاں سے باہر نہ نکلی تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔"

"کیوں باہر نہیں نکلے گی میری بیٹی! تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں دارالحکومت بھیج دیتا ہوں۔ سارا انتظام کیے دیتا ہوں وہاں۔ شہر کی پُر رونق زندگی میں تمہارا دل بہل جائے گا۔ ساحل سمندر پر سیر و سیاحت کرنا اور زندگی کو حسین بنا لینا جس کو چاہو تمہارے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

"نہیں جانا مجھے دارالحکومت، نہیں جانا ساحل سمندر پر میں پہاڑوں کی بیٹی ہوں، میں برف کی بیٹی ہوں۔ میں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے جاؤں گی۔" بابر جاہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"موسم بہت اچھا نہیں بیٹا! برف باری کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ اور سفید لومڑیاں......"

"نہیں نہیں نہیں، بس مما! آپ انتظام کرائیں۔ آپ چچا جان سے کہیں کہ مجھے لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے جانے دیں۔" اراشیہ نے کہا اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ بابر جاہ بوکھلا گیا تھا۔ خانم سنجیدہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"بابر جاہ! ذرا کسی کو میرے پاس بھیج دو۔ دلاور کو بھیج دو۔ وہ شکار کا سارا انتظام کرے گا۔" خانم کا لہجہ حتمی تھا۔ جسے بابر جاہ نے محسوس کر کے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے دلاور کی کیا ضرورت ہے۔ میں انتظام کیے دیتا ہوں۔ بس ذرا احتیاط کے پیش نگاہ۔"

"نہیں ہم لوگ بزدل جو ہے نہیں ہیں احتیاط کر لیں گے۔" خانم نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے انتظام کر دیا جائے گا۔" بابر جاہ نے کہا اور پھر آراشیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"بس بیٹا! اور کچھ بتاؤ۔"

"نہیں چچا جان! آپ بس شکار کا انتظام کر دیجیے۔" اراشیہ نے بہترین اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا بیٹا! ہو جائے گا۔ دوپہر کے بعد آپ لوگ شکار کے لیے جا سکتی ہیں میں ابھی سارے انتظامات کیے دیتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ ذرا بابا ظہوری کو بھیج دیں۔ میں انہیں کچھ ہدایت دینا چاہتی ہوں۔" خانم نے کہا اور بابر جاہ کچھ جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔

خانم کا چہرہ بدستور سنجیدہ تھا۔ اراشیہ نے بھی کسی ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ اور اس کے بعد اراشیہ نے کہا۔

"ہم اپنی بڑی جیپ میں ہی چلیں گے۔" خانم نے گردن ہلا دی تھی۔ تین جیپیں سفر کے لیے تیار تھیں۔ ایک جیپ کے ساتھ ٹرالر بندھا ہوا تھا۔ ٹرالر میں کھانے پینے کا مکمل سامان خیمے اور دوسری ضروریات کی چیزیں بار کر لی گئی تھیں۔ اس میں چار شکاری موجود تھے۔ دوسری جیپ میں بھی دو شکاری موجود تھے۔ حالانکہ بابر جاہ نے تیسری جیپ کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا۔

"بھابی خانم! یہ دوسری جیپ آپ کے خادموں کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بقیہ لوگ بھی اس میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ تیسری جیپ کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں ہے بس میں چاہتی ہوں کہ ذرا تحفظ بھی رہے بچی کے ساتھ۔" خانم نے کہا۔

"لیکن بھابی خانم!"

"کیوں کیا بات ہے۔ بابر جاہ! کیا تمہیں اخراجات زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بابا ظہوری! آپ اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لیے۔" خانم نے بوڑھے ڈرائیور سے کہا۔

"ایک لمحے کے لیے بابر جاہ کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر وہ فوراً نارمل ہو گیا۔

"بابا صاحب! بے شک آپ ایک تجربے کار ڈرائیور ہیں۔ لیکن ذرا احتیاط رکھیے گا۔ برفباری کا موسم ہے اور پھر برفانی لومڑیاں ہی نہیں۔ کبھی کبھی بھیڑیوں کے غول بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔" جواب میں بوڑھا ظہوری مسکرا دیا اور بولا۔

"شاہ جی! ہماری زندگی کا تو ایک ایک لمحہ انہی برف زاروں میں گزرا ہے۔ زمین کے ہر کوہان سے واقفیت ہے ہماری آپ ہم سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں مدبروں کا ایک گروہ ہے پورا۔ جائیے۔" بابر جاہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اور اس کے بعد بابا ظہوری نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ ذرا تند مزاج آدمی تھا۔ تھوڑا سا آگے بڑھ کر بولا۔

"یہ کل کا لونڈا! نہ جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم احتیاط رکھیں۔ پٹی باندھ دو ہماری آنکھوں پر موٹی سی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دو۔ پھر جہاں جانا ہے بتا دو۔ اور اس کے بعد تماشا دیکھو۔" یہ اراشیہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی پھر بولی۔

"تماشا تو دوسرے دیکھیں گے نا ظہوری بابا! جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھلا تماشا دیکھنے کے قابل کہاں ہوں گے۔"

"شریر کہیں کی۔" بوڑھے ظہوری نے مسکراتے ہوئے کہا اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ باقی دونوں جیپیں ٹرالر سمیت اس جیپ کے پیچھے آ رہی تھیں۔ سنگینہ کی سرحد سے نکلنے کے بعد برفانی راستے شروع ہو گئے اونچے نیچے پہاڑی راستے۔ جن پر چیڑ کے بلند و بالا درخت بہار دے رہے تھے۔ جوں جوں جیپیں آگے بڑھتی جا

رہی تھیں۔ موسم خراب ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے غول تیر رہے تھے اور ایک خنک اور خوش گوار سی فضا آہستہ آہستہ مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ کافی دن کے بعد اراشیہ کو یہ حسین ماحول ملا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

دوپہر کے ڈھائی بجے تک یہ سفر جاری رہا اور اب وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں چاروں طرف برف باری کا برادہ زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ اور پہاڑیوں کی شکلیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اونچے نیچے گول گول ٹیلے جو برف کے بہت بڑے بڑے گولے نظر آ رہے تھے۔ شاید اس علاقے میں زیادہ برف پڑی تھی کیونکہ سنگینہ میں اتنی برف باری نہیں ہوئی تھی۔ شکاری خانم کے سامنے باادب تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب بابا ظہوری نے گاڑی روک دی۔ اور دونوں جیپیں قریب آ کر رک گئیں۔

"ظاہر ہے ہمیں یہاں چٹانی سائبان نہیں ملیں گے یہیں پر یہ سفر ختم کرنا ہوگا۔ کھانے کی تیاریاں کریں۔"

"کیا حکم ہے خانم۔ کیوں نہ اس جگہ کیمپ لگا لیے جائیں۔"

"ہاں۔ کیا ہرج ہے۔ سفید لومڑیوں کا علاقہ تو شروع ہو چکا ہے۔ میں راستے میں بہت سی لومڑیاں دیکھ چکی ہوں۔"

"جی خانم!"

"تو پھر کیمپ لگا دو۔"

"اگر پہلے کھانے کی تیاریاں کر لی جائیں ماما تو زیادہ بہتر ہوگا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے بعد میں خیمہ زنی کر لی جائے گی۔" فوراً ہی ملازم کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اور کچھ دیر بعد ڈبا بند کھانا سپلائی کر دیا گیا۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کیمپ لگانے کا کاروبار شروع ہو گیا۔ سفید لومڑیاں رات ہی میں شکار کی جاتی ہیں۔

لیکن موسم ذرا تعاون نہیں کر رہا تھا۔ بادل بار بار آسمان کو ڈھک لیا کرتے تھے۔ ظہوری نے کہا۔

"اگر رات کو بھی یہی سب کچھ رہا تو پھر شکار مشکل ہو جائے گا۔ چونکہ آسمان پر جب چاند نکلتا ہے لومڑیاں باہر آتی ہیں۔ ورنہ وہ بھی کہیں کوؤں کھدروں میں جا کر چھپ جاتی ہیں۔" کسی نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ بڑے بڑے مضبوط خیمے لگ گئے۔ اور ان پر خاص قسم کی فوم بچھا دی گئی۔ برف کو ہموار کر دیا گیا تھا۔ اس فوم سے برف کی نمی اوپر تک نہیں آنے پاتی تھی۔ پوسٹر فوم تھی۔ جو برف کو پگھلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ یہ خاص قسم کے انتظامات برف باری کے موسم میں کر لیے جاتے تھے۔

بہر حال برف میں زندگی گزارنے والے اس سے بہت زیادہ متاثر بھی نہیں ہوتے تھے اراشیہ اپنے خیمے سے باہر نکل آئی اور باہر کے موسم سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ اس خواب ناک ماحول کا جائزہ لے رہی تھی اور نہ جانے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات آ رہے تھے۔ زندگی میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت کچھ نہیں دیکھا تھا۔ باپ کی غیر موجودگی نے دل کو ایک عجیب سی اداسی بخش دی تھی۔ ہنستے ہنستے رو پڑنے کو دل چاہتا تھا۔

بہت دیر تک وہ ان تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ خانم فردوسیہ محب وطن تھی اور وہ اسی کی اولاد تھی۔ حقیقتاً بڑی آسائشوں میں وقت گزر سکتا تھا۔ دنیا کے جھگڑوں سے دور زندگی کی تمام تر لطافتوں کے ساتھ لیکن وطن پرستی کے جذبے وجود پر حاوی تھے۔ وطن کو برے لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں دونوں ماں بیٹیاں، اور اسی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے تگ و دو کر رہی تھیں۔ مرحلے طے ہوتے رہے کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی گئی۔ موسم بہ دستور اپنے رنگ دکھا رہا تھا۔ بڑے شکاری نے پاس آ کر کہا۔

"معزز خانم! موسم تو بے حد خراب ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کی توجہ اس کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ کیا اس موسم میں لومڑیوں کے شکار کے لیے برف کے ویرانوں میں نکلنا مناسب ہوگا۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا موسم ہماری مرضی کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اگر تین دن تک یہی موسم رہا تو ہم شکار کھیلے بغیر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد فضول باتوں سے گریز کرو۔ ہاں۔ میں کسی کو اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ تم اگر چاہو تو یہاں آرام کر سکتے ہو۔ ہم لوگ اپنا شوق پورا کر لیں گے۔ تم جانتے ہو میں حکیم جاہ کی بیوی ہوں اور حکیم جاہ جس طرح آدمی کے تھے۔ اس کا بھی تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا۔"

"نہیں خانم! ہم اپنے لیے نہیں آپ کے لیے متفکر ہیں آپ اگر اس موسم میں بھی شکار کے لیے نکلنا چاہتی ہیں تو بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"مختصر تیاریاں کرو۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ہم کتنی دیر شکار کھیلیں گے پھر جب رات کا آغاز ہو گیا تو دو جیپیں چل پڑیں ایک میں خانم، اراشیہ، ظہوری کے ساتھ تھے دوسری میں چار شکاری موجود تھے۔ باقی کو وہیں کیمپ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیمپ کے ایک سرے پر تیز روشنیاں جلا دی گئی تھیں مخصوص طرح کی روشنیاں جو شدید دھند اور برف باری میں بھی دور سے نظر آ جائیں۔ اور اس کے بعد یہ دونوں جیپیں آگے پیچھے چل پڑیں۔ آگے کا موسم اور بھی خوفناک تھا۔ خوف ناک آوازوں کے ساتھ تیز ہوائیں چل پڑی تھیں۔

اور پھر رفتہ رفتہ برف کی دھند آسمان سے زمین پر اترنے لگی شکاریوں کے حوصلے پست ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن خانم ظہوری کو ہدایت دے رہی تھی۔

"ہمیں بائیں سمت اس طرح کٹنا ہے ظہوری کہ کسی کو احساس نہ ہو سکے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں خانم!" کوئی پینتیس منٹ تک دھند میں یہ سفر جاری رہا خانم نے اراشیہ سے کہا۔

"گولی چلاؤ۔" اراشیہ نے رائفل سنبھال کر لگاتار تین فائر کیے اور اس کے بعد خانم کی آواز ابھری۔

"ظہوری! بائیں طرف تمہیں تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر سڑک مل جائے گی۔" ظہوری نے فوراً جیپ کا رخ کاٹ دیا۔ اراشیہ نے ایک بار پھر فائرنگ کی اور یہ ظاہر کیا کہ جیپ سامنے کی سمت ہی جا رہی ہے۔ لیکن ظہوری نے فوراً ہی جیپ کا رخ تبدیل کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے جیپ کی لائٹیں بجھا دیں۔ گھپ اندھیرے میں جیپ آگے سفر کرنے لگی۔ صرف برف کی سفیدی چمک رہی تھی۔ ورنہ موسم شدید دھند کا شکار تھا۔ ظہوری حالانکہ خاصا عمر رسیدہ تھا۔ لیکن اس کی ڈرائیونگ بے مثال تھی۔ برف پر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جیپ کا یہ سفر جاری تھا۔ اور خانم ماحول پر نگاہیں جمائے ظہوری کو مسلسل ہدایت دے رہی تھی۔

یہاں تک کہ ظہوری نے جیپ کو سڑک پر چڑھا دیا اور اس کے بعد وہ طوفانی انداز اختیار کر گئی وہ انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر پہنچی تھی اور اتنی ہی تیز رفتاری سے اس نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا۔

روشنیاں اب بھی بجھی ہوئی تھیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے۔ بہتر موسم ملنے لگا۔

دھند کا وہ خوف ناک علاقہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سڑکوں پر بھی برف تھی۔ لینڈ سلائڈنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ظہوری اس قدر مشاق ڈرائیور تھا کہ اس کو لاکھوں میں ایک کہا جا سکتا تھا۔ یہ طوفانی سفر بڑا ہیجان خیز تھا۔ لیکن ظہوری کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ اور سفر بہ دستور جاری تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ مدھم مدھم روشنیاں نظر آنے لگیں اور خانم کے حلق سے ایک خوشی کی چیخ نکل گئی۔

"اراشیہ! ہم سردار پور پہنچ چکے ہیں کیوں بابا ظہوری!"

"ہاں خانم! ہم سردار پور میں داخل ہونے ہی والے ہیں۔" ظہوری نے رفتار مزید تیز کر دی اور پھر روشنیاں قریب آتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک حویلی پر جا کر رک گئے جو رات کے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کے چوکیدار نے دروازہ کھولا اور خانم کی جیپ حویلی کے اندر داخل ہو گئی۔

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ نے رات کے اس وقت بھی اپنے ڈرائنگ روم میں خانم فردوسیہ کا استقبال کیا تھا۔ خانم فردوسیہ نے کہا۔

"کرنل صاحب! میں جانتی ہوں کہ اس وقت مجھ سے زیادہ غیر مہذب انسان شاید ہی کوئی ہوگا۔ لیکن مجبوریاں انسان سے تہذیب کا ہر انداز چھین لیتی ہیں۔ اس وقت آنا میری اتنی ہی بڑی مجبوری تھی۔"

"حکیم جاہ کے میرے ساتھ جس طرح کے مراسم تھے بھابی! آپ کو اس کا علم ہے۔ اس کے بعد الفاظ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔" کرنل رحیم شاہ نے ماں بیٹی کے لیے کافی وغیرہ منگوائی۔ اور بولا۔

"اس طرح کے مہمان میرے لیے انتہائی خوش گوار ہوتے ہیں اور خدا کرے آپ جس مقصد کے لیے آئی ہیں۔ میں اس کی تکمیل کر سکوں۔ مجھے دلی مسرت ہوگی۔ براہ کرم کافی لیجیے اور بیٹے یہ کچھ فروٹ وغیرہ لیں۔" کرنل نے اراشیہ کی طرف رخ کر کے کہا۔

"شکریہ انکل! میں تو ان تعلقات اور رشتوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ جو آپ لوگوں کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ کتنی بڑائی ہے ان رشتوں میں۔" اراشیہ نے کہا اور کرنل ایک مغموم سانس لے کر مسکرانے لگا۔ کافی کا دور چلا خانم فردوسیہ نے کہا۔

"مجھے راتوں رات واپس جانا ہے۔ اس لیے میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گی۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ راتوں رات آپ سنگینہ جائیں گی۔"

"ہاں۔ جو تفصیل میں آپ کو بتاؤں گی اس کے بعد آپ کو اس پر حیرت نہ رہے گی۔ اصل میں کرنل رحیم شاہ صاحب! حکیم جاہ کی موت کے بعد ہم پر بے بسی کا دور شروع ہو گیا۔ جیسا کہ ہونا چاہئے گو میرا خاندان بھی خاصی وسعتوں کا حامل ہے۔ لیکن ہماری روایات ہیں کہ جب بیٹیاں ماں باپ کا گھر چھوڑ دیتی ہیں تو سسرال ان کی عبادت گاہ بن جاتی ہے اور عبادت گاہوں کا تقدس دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ میں چاہتی تو اپنا گھر چھوڑ سکتی تھی چونکہ میرا سر براہ میرے سر پر نہیں رہا تھا۔ مجھ پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔لیکن سنگینہ حکیم جاہ کی سلطنت تھی۔اور زندگی میں اسے چھوڑنے کا مطلب یہ تھا کہ حکیم جاہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ جو میں نے نہیں کیا۔سنگینہ میں ویسے تو اور بہت سے عوامل تھے لیکن آج میں کھلی زبان سے یہ بات کہہ سکتی ہوں۔ کہ ایک بہت ہی بری شخصیت حکیم جاہ کے چھوٹے بھائی بابر جاہ کی شکل میں وہاں موجود ہے۔ سسرال کی ایک ایک اینٹ سے محبت کے باوجود بابر جاہ کی شکل میں وہاں موجود ہے۔سسرال کی ایک ایک اینٹ سے محبت کے باوجود بابر جاہ میرے لیے قابل محبت نہیں ہے کیونکہ وہ میرے وطن کا دشمن ہے۔ کیونکہ اس کے روابط دشمنوں سے ہیں۔ وطن دشمنوں سے۔"

کرنل رحیم شاہ چونک پڑا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے سرحد پار کے دشمنوں۔"

"ہاں۔ ہماری سرحدیں جہاں جہاں دشمن ملک سے ملتی ہیں وہاں ہمیں کسی نہ کسی دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بس مزاج ہے اس دشمن کا جو امن سے نہیں رہنا چاہتا۔تو میں عرض کر رہی تھی کہ بابر جاہ کی مشکوک حرکتیں پہلے بھی حکیم جاہ کے لیے تشویش ناک تھیں اور انہوں نے کئی بار مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔اس وقت جب وہ پریشان رہا کرتے تھے۔آج میں یہ بات آپ کے سامنے کھلی زبان سے کہہ سکتی ہوں کہ یقیناً میرے شوہر کا حادثہ اتفاقیہ نہیں تھا۔انہیں قتل کیا گیا تھا۔کھلی زبان سے کوئی بات کہہ دینا دانش مندی نہیں سمجھی جاتی۔بغیر ثبوت کے صرف آپ کے سامنے یہ الفاظ دہرا رہی ہوں کہ میرے شوہر کے قتل میں بابر جاہ کا ہی ہاتھ ہے کیونکہ میرے شوہر اس وطن دشمن سرگرمیوں میں رکاوٹ بن رہے تھے۔حکیم جاہ کی موت کے بعد بابر جاہ نے ہاتھ پاؤں نکال لیے اور مزید کام شروع کر دیے میرے خلاف وہ بڑی سازش اس لیے نہیں کر سکا کہ بہرحال اسے میرے خاندان کا خوف تھا لیکن میں نے اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی ہے اور وہ بھی میری طرف سے محتاط رہتا ہے۔کرنل صاحب! میں اگر چاہتی تو شہری آبادیوں میں اپنی بیٹی کے لیے جگہ بنا سکتی تھی۔لیکن ایک محب وطن ہونے کی حیثیت سے میں اور میری بیٹی دونوں وطن کی بہتری اور بقا کے لیے اپنی زندگیاں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم سنگینہ نہیں چھوڑیں گے۔اور چھوڑیں گے بھی تو اس شکل میں کہ بابر جاہ کی وطن دشمنی کامیاب نہیں ہونے دیں گے اور اس کے خلاف کوئی بھرپور عمل کر کے ان سرحدوں کو محفوظ بنائیں گے۔اور اس کے لیے ہم اب باعمل ہو گئے ہیں۔خوش نصیبی سے مجھے حکیم جاہ کی کچھ باتیں یاد آ گئیں۔ جن میں انہوں نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وطن کو آپ جیسے لوگوں پر فخر ہے۔ناز ہے کیونکہ آپ اپنی زندگی وطن کے لیے وقف کر چکے ہیں۔حکیم جاہ نے آپ کے بار میں مجھے ساری تفصیل بتائی تھی۔ ویسے بھی میرے آپ سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ میں سردار پور کا رخ کروں اور آپ کو ساری صورت حال بتاؤں۔"

رحیم شاہ عقیدت بھری نگاہوں سے خانم فردوسیہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"خانم! آپ جیسی عورتیں اگر ملکوں کی تاریخ میں نہ ہوں۔تو سچی بات یہ ہے کہ ملکوں کی تاریخیں ادھوری رہ جائیں۔محب وطن عورتوں کو بہت بڑا درجہ حاصل ہوتا ہے۔کیونکہ وہ اپنے منصب اور اپنے معیار سے ہٹ کر عمل کرتی ہیں۔آپ بالکل بے فکر رہیں۔جو کچھ آپ نے مجھے بتایا ہے اس کے بعد اس بات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

کہ میں آنکھیں بند کیے رکھوں۔

میں فوراً ہی ایک ٹیم سنگینہ روانہ کرتا ہوں۔جو آپ سے رابطے میں رہے گی۔" کرنل رحیم شاہ نے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا اور اسے خانم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اسے آپ اپنے پاس رکھیے اراشیہ بیٹے! میں آپ کو اس کے استعمال کا طریقہ بتائے دیتا ہوں۔اس ٹرانسمیٹر پر ہماری ٹیم کے افراد آپ سے رابطہ رکھیں گے اور اطمینان رکھیے یہ ٹرانسمیٹر خاص طور پر بنوا کر منگوائے گئے ہیں ان کی فریکوئنسی کسی دوسرے ٹرانسمیٹر پر ٹریس آؤٹ نہیں کی جا سکتی۔اس کے استعمال کا طریقہ سیکھ لیجیے۔ خانم! آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ فوراً ہی کیوں واپس جانا چاہتی ہیں۔مجھے دارالحکومت سے اپنے ایک دست راست کو بلانا ہوگا۔وہی اپنی ٹیم کے ساتھ سنگینہ پہنچیں گے۔"

"میں آپ کو اپنے یہاں آنے کا طریقہ بتا دوں۔" خانم نے کہا اور پوری تفصیل کرنل کو بتا دی۔

"ہاں پھر تو آپ کا واپس جانا ضروری ہے۔"

"صبح سے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔" خانم نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس ٹرانسمیٹر پر میں بھی آپ سے رابطہ قائم رکھوں گا آیئے آپ کو واپس چھوڑ دوں۔ حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو سنگینہ تک اپنے ساتھ لیے جاؤں۔لیکن احتیاط کے پیش نگاہ....."

"نہیں ہم دونوں ماں بیٹیاں پوری طرح پر اعتماد ہیں۔ہمیں تو صرف اس بات کی خوشی ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے تھے۔اس کی تکمیل ہو گئی۔"

"ٹرانسمیٹر سنبھال کر رکھیے گا۔" کرنل نے کہا اور پھر وہ سردار پور کی آخری سرحدوں تک اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا اور سرحدوں سے باہر اس نے خانم فردوسیہ کو خدا حافظ کہا تھا۔خانم فردوسیہ بہت خوش تھی۔اراشیہ بھی مسرور نظر آ رہی تھی۔ظہوری محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔وہ ایک قابل اعتماد آدمی تھا اور اس سے ان لوگوں کو کوئی خدشہ نہیں تھا۔خانم نے ظہوری کو حکم دیا۔

"ظہوری! اب تم کسی تیر کی طرح سنگینہ کے نواحی علاقوں میں پہنچو ہمیں صبح کی روشنی وہیں پر ملنی چاہیے۔"

"آپ مطمئن رہیں خانم! آپ کا غلام پوری طرح مستعد ہے۔"

"خدا تمہیں ہمیشہ مستعد رکھے۔ہمارے لیے تو تم ایک نعمت ہو۔" خانم نے کہا۔اراشیہ کہنے لگی۔

"کرنل رحیم شاہ! ایک پاؤں سے معذور ہیں۔لیکن کس قدر مطمئن اور پر اعتماد نظر آتے ہیں۔یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"جس شخص کی تعریف کے پل حکیم جاہ باندھتے تھے۔وہ کوئی معمولی شخصیت تو نہیں ہو سکتی۔تمہیں اپنے بابا کے بارے میں معلوم ہے۔خود بھی محتاط آدمی تھے اور دوسروں کے معاملے میں مکمل طور پر محتاط رہا کرتے تھے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" اراشیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ظہوری آندھی اور طوفان کی رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا۔خاصا فاصلہ تھا۔لیکن ظہوری نے جو رفتار سڑک پر اختیار کی تھی۔اس کی وجہ سے انہوں نے یہ فاصلہ وقت سے بہت پہلے طے کر لیا۔ہاں جب وہ بڑی سڑک سے اس راستے پر اترے جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے انہیں برفانی علاقوں کا سفر طے کرنا تھا۔ تو جیپ کی رفتار خود بہ خود آہستہ ہوتی چلی گئی اور آگے انہیں موسم پہلے سے زیادہ خراب ملا۔ اراشیہ! بڑے دلچسپ انداز میں اس برفانی موسم کو دیکھ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں پہاڑی علاقوں میں رہنے کے باوجود اسے اس موسم سے اکتاہٹ نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ ایسی آبادیوں میں رہنے والے اس موسم کو ایک خراب موسم کہتے ہیں۔ وقت تیزی سے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ برف باری اور برف کی دھند کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔ روشنی اپنا معیار ختم نہیں کرتی۔ چنانچہ صبح کے مدھم مدھم اجالے برف کی چادر کو روشن کرنے لگے۔ اور جب روشنی پوری طرح پھیل گئی تو بابا ظہوری نے جیپ کو ایک ایسی جگہ آڑ میں روک دیا۔ جہاں برفباری سے تھوڑی سے حفاظت کی جاسکتی تھی۔ اور مزید روشنی پھیلی تو بابا ظہوری نے جیپ کے ہارن بجانا شروع کر دیے یہ ان شکاریوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو ان کے ساتھ آئے تھے۔ اور نتیجہ بہتر نکلا۔ یقینی طور پر شکاری بھی ساری رات انہیں تلاش کرتے رہے ہوں گے۔ کسی قدر بہتر موسم میں انہوں نے آخر کار خانم فردوسیہ کی جیپ کو تلاش کر لیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد باقی دونوں جیپیں انہیں اپنی طرف آتی نظر آئیں۔ اراشیہ نے کہا۔

"یہ دوسری جیپ بھی آ گئی۔ ہمارے ساتھ تو ایک ہی جیپ آئی تھی۔"

"ظاہر ہے وہ خوف ناک موسم میں ہمیں تلاش کرتے پھرے ہوں گے۔ ان کا خیال ہوگا کہ کہیں ہم بھیڑیوں کا شکار نہ بن گئے ہوں۔ ظہوری نے جواب دیا۔

"اب ہمیں اسی طرح کا اظہار کرنا ہے۔ جیسے ساری رات ہم نے سخت وحشت کے عالم میں گزاری ہے۔" پوری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے حلیے تو پہلے ہی خراب ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب شکاری ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے انہیں نڈھال پایا۔ میر شکری نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے خانم! آپ ہمیں زندہ سلامت مل گئیں۔ ہمیں افسوس ہے خراب موسم کی بنا پر۔ ہم بھٹک کر اس طرف نکل آئے خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تم نے ہمیں پالیا ایک بات بتاؤ۔ کیا ہم کسی بہت دور کے راستے پر آ گئے ہیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

"تب تو بابا ظہوری ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

"اب کیا حکم ہے خانم!"

"نہیں اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ یہ موسم شکار کے لیے مناسب نہیں ہے ہم واپس چلیں گے۔" خانم نے کہا۔

"یہی بہتر ہے خانم۔" میر شکاری بولا۔

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ کو ہر طرح کے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ ڈیفنس منسٹری سے ایک خفیہ اجازت نامہ جاری ہوا تھا۔ جو سرحدوں پر تعینات فورسز کے لیے تھا۔ اس اجازت نامے کے تحت اس خصوصی ایجنسی گرین فورس کو اختیارات دیے گئے تھے کہ وہ سرحد کے قریب قریب ہر طرح کی کارروائی کر سکتی ہے اور اس کو

ضرورت کے مطابق مکمل تعاون کیا جائے۔ اگر کہیں چیکنگ ہو جائے تو اس اجازت نامے کی رو سے کسی طرح کا کوئی عمل نہ کیا جائے۔ وہ جیپ جو کرنل رحیم شاہ نے ہی صوفی کو فراہم کی تھی اپنی مثال آپ تھی اور یہ حقیقت ہے۔ کہ بس یوں لگتا تھا جیسے یہ واحد جیپ بنائی گئی ہو۔ نہ جانے کون سے ملک کی بنائی ہوئی تھی۔ خاصی لمبی اور انتہائی بے تکی بس یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے آپس میں مل کر اس کی باڈی بنا ڈالی ہو۔ ضرورت سے زیادہ اونچی تھی اور نچلی تہ میں ڈبل خانہ تھا جو اندر سے ہی کھلتا تھا۔ جو ڈیش بورڈ کے پاس سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ورنہ اگر اس کا سپاٹ حصہ دیکھا جاتا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی ڈھکن کی طرح اٹھ بھی سکتا ہے۔ انتہائی مضبوط اور خاص طور سے برفانی علاقوں میں استعمال کیے جانے والے ٹائر۔ ایک حصے میں پرانی طرز کی جگہ جگہ سے سلائی کی ہوئی چھولداری جن کی تعداد کئی تھی۔ کھانے پینے کا سامان، فالتو پٹرول اور نہ جانے کیا کیا الم غلم صوفی کو تو خیر اس طرح کی چیزوں سے عشق تھا۔ اس کی مشہور زمانہ موٹر سائیکل ہی کیا کم تھی کہ جیپ اسے فراہم کی گئی تھی اور صوفی کی باچھیں کھل گئیں تھیں۔

"تمام تر تیاریوں کے بعد گرین فورس سنگینہ کی جانب چل پڑی تھی۔ یہ علاقے بے شک سرحدی علاقہ تھا۔ لیکن آبادیوں کے آس پاس کے تھوڑے بہت حصے ہی ریاستوں کی ملکیت قرار دیے گئے تھے۔ ورنہ باقی سب علاقے تو آزاد تھے۔ تاہم یہاں سرداروں کی مداخلت اکثر ہو جایا کرتی تھی۔ اور بعض جگہ فوجی جھڑپیں بھی ہو جاتی تھیں۔ صوفی کو ہر طرح کی اجازت دے دی گئی تھی۔ خانم فردوسیہ کے بارے میں کرنل رحیم شاہ نے اسے مکمل طور پر بتا دیا تھا۔ اور صوفی نے پرمسرت لہجے میں کہا تھا۔

"بہ خدا۔ ہمیں ایسی محب وطن خاتون کے لیے کچھ کر کے دلی مسرت ہو گی۔ آپ مطمئن رہیں جناب من! ہم ان کی بھرپور مدد کریں گے۔" گرین فورس کے تقریباً تمام ہی افراد اس مہم پر چل پڑے تھے۔ عادل اور فیضان کو ذرا نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ شازیہ کو ایک مخصوص حیثیت دی گئی تھی۔ اور ایک پوری کہانی ترتیب دے لی گئی تھی۔ جس کے تحت سوئٹزرلینڈ سے آنے والی یہ مقامی دوشیزہ وطن عزیز کی سیر کر رہی تھی۔ سیر و شکار اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بچپن سوئٹزرلینڈ میں گزارا تھا۔ جوان ہو کر کچھ عرصے کے لیے وطن آئی تھی اپنے دو سیکریٹریوں کے ساتھ جو عادل اور فیضان تھے۔ اور دو مقامی آدمی اس نے ساتھ لیے تھے جس میں ایک غلام قادر اور دوسرا دلاور تھا۔

یہ کہانی ان لوگوں کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔ جو اگر اتفاقیہ طور پر ان کا راستہ روکیں تو انہیں مطمئن کر دیا جائے۔ شازیہ ذہنی طور پر ایڈونچر پسند تھی۔ اگر نہ ہوتی تو جو زندگی اس نے گزاری تھی۔ وہ نہ گزار سکتی۔ چنانچہ یہ کام اس کی پسند کے مطابق تھا۔ اور وہ اس سے بہت خوش تھی۔ چنانچہ یہ سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گئے تھے۔ لیکن سب سے دلچسپ شخصیت صوفی ہی کی تھی۔ حیرت انگیز طور پر وہ چاق و چوبند اور خوش مزاج نظر آ رہا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے جینز اور جیکٹ پہننا قبول کر لیا تھا۔ اپنی اس تبدیلی کی وجہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتاتے ہوئے کہا۔

"اصل میں صرف سوچ کا فرق ہے بلاشک و شبہ مجھے انگریزوں کی تقلید بالکل ناپسند ہے اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ ذرا غور فرمایئے۔ ازار بند کی جگہ یہ چمڑے کی پٹی جس کے بارے میں درویش رحم کریں عجیب وغریب خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ اور اس کے بعد سامنے کے حصے کا کٹاؤ۔

"لیکن صوفی صاحب! آپ نے اس وقت یہ چست پتلون کیوں پہن لی۔"

"عزیزم! یہ کہنا چاہئے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہیں۔"

"ایجاد کی ماں۔"

"ہاں۔ مہذب والدائیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور ایک اجتماعی قہقہہ پڑا لیکن صوفی ان سے بے نیاز کہنے لگا۔

"آپ کو زمانہ قدیم کی برجس کے بارے میں پتا ہے۔"

"برجس، زمانہ جدید کے بارے میں یہاں نہیں پتا کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی۔"

"نہیں برادرم! یہی تو تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ تم نے انگریز شکاریوں کو برجس پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ رانوں کے پاس سے پھولی ہوئی پتلون اور پنڈلیوں پر چست۔"

"ارے ہاں ہاں۔ ہم نے فلموں میں ایسے ڈریس دیکھے ہیں۔ راجاؤں، مہاراجاؤں اور پرنس وغیرہ کے اردلی ایسے لباس پہنتے تھے۔"

"ناقص معلومات ہیں آپ کی درویشوں کی دعاؤں سے اردلی نہیں بلکہ راجے مہاراجاؤں کا شکاری لباس تھا یہ۔ تو ہم نے بھی آنکھیں بند کر کے یہی تمام سوچ کر قبول کر لیا۔"

"اور اوپری لباس کے بارے میں کیا خیال ہے یہ جیکٹ۔" ہماری شیروانی پھاڑ دی گئی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" شازیہ تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔ صوفی پر اطمینان انداز میں چاروں طرف بکھری ہوئی برف کی چادر کو دیکھ رہا تھا۔ فیضان ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دلاور اور غلام قادر اس کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلے حصے میں صوفی، شازیہ اور عادل موجود تھے اور یہ باتیں ہو رہی تھیں اچانک ہی فیضان ڈرائیونگ کرتے کرتے چونک کر بولا۔

"ارے صوفی صاحب! ایک مسئلہ تو رہ ہی گیا۔"

"کیا۔"

"آپ کو تازہ پان تو یہیں مل سکیں گے ان برف زاروں میں یا فرض کیجئے کسی آبادی میں پہنچ بھی گئے ہم تو اب وہاں آپ کی طرح تو صاحب ذوق لوگ موجود نہیں ہیں۔" جواب میں صوفی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"ایک بار پھر عرض کریں گے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ غلام قادر بتایئے ان حضرات کو۔"

"ارے ماں قسم! ان لوگوں نے گنگا کدھر کھایا ہوگا۔" غلام قادر نے کہا۔

"گنگا۔" عادل چونک کر بولا۔

"نی اور کیا؟ ابھی صوفی صاحب ان لوگوں کو گنگا دکھاؤ۔"

"یہ لوگ اس قدر صاحب ذوق نہیں ہیں ویسے تمہارے منہ سے آنے والی خوشبو بتا رہی ہے کہ تم نے بھی گنگا استعمال کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نی آپ سہی بولا باس! ہم بہت پہلے سے گنگا کھاتا چلا آیا ہے۔ اور ہم نے جس دکان سے آپ کے لیے گنگا منگوایا ہے۔ اڑے فنٹوش ہے فنٹوش سچ بولتا ہے آپ کو۔ صوفی صاحب! اس سالے کا گنگا پورے شہر میں مشہور ہے۔"

"مگر یہ گنگا ہے کیا چیز؟"

"وہ تمام لوازمات مرکب کر دیے جاتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور انہیں خمیرہ گل قند میں شمولیت دے کر ان کا قوام تیار کر لیا جاتا ہے مع چھالیا کے آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ کہ یہ گنگا کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ پان بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔"

"ذرا دکھایئے تو سہی۔"

"صرف دکھایا جا سکتا ہے کیونکہ آپ لوگ ناقدرے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور پھر اس نے ایک عجیب وغریب چیز ایک مخصوص قسم کی ڈبیا سے نکال کر دکھائی۔ کوئی معجون معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"چکھایئے نا تھوڑا سا۔" شازیہ بے تکلفی سے بولی۔

"شہزادی صاحبہ! آپ کے دانت خراب ہو جائیں گے درویشوں کی دعاؤں سے آپ سوئٹزرلینڈ سے آئی ہیں۔ آپ کے منہ سے تو بھیڑوں کی خوشبو آنی چاہئے۔ درویشوں کی کرم سے۔" شازیہ نے تھوڑا سا گنگا چکھ ہی لیا تھا۔ پھر تھوڑا تھوڑا سا سبھی کو چکھانا پڑا۔ کچھ نے تھو تھو کیا۔ لیکن غلام قادر اور دلاور نے بڑے شوق سے اسے کھا لیا تھا۔ شازیہ منہ سے سی سی کی آوازیں نکالتے ہوئے بولی۔

"جو کچھ بھی ہو کم از کم خوشبو بہت اعلا ہے۔ زبان جل گئی۔" یہ دلچسپ سفر سنگینہ کے ان ویران برف زاروں کی جانب تھا۔ جن کے بارے میں ایک سنگین رپورٹ تھی ان کے پاس۔

♥.....♥.....♥

برفانی علاقوں میں موسم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دھوپ تو خیر ان علاقوں میں کم ہی نکلتی تھی۔ سورج بے شک آسمان کا سفر طے کرتا ہے۔ لیکن بادلوں کے غلاف میں لپٹا ہوا اور پھر اگر برف باری کا موسم ہو تب تو کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ بابر جاہ جب سنگینہ سے باہر نکلا تھا تو چمک دار اور روشن دن پھیلا ہوا تھا۔ اس کے تین خاص ساتھی اس کے ساتھ تھے۔ جس علاقے میں اسے جانا تھا۔ وہاں بھی موسم شفاف ہی ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ اس علاقے میں پہنچا تو موسم ایک دم دھندلا گیا۔ اور ایسا لگا جیسے اچانک ہی طوفان آنے والا ہو۔ بابا زمان نے پریشانی سے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کی جانب دیکھا۔ جن کے درمیان ایک چھوٹا سا درہ دور سے نظر آتا تھا۔ اس درے کو برف کی دیوار ڈھک لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ دیوار بہت پتلی ہوتی تھی۔ اور ذرا سی کوشش سے توڑی جا سکتی تھی۔ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ فضائی جائزے سے اس درے کا پتا نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ اور زمینی راستہ اس قدر خطرناک تھا کہ اس طرف سرحدی چوکیاں بنانے کی کوشش کی گئی۔ سنگین حادثات ہوئے اور آخر کار اس جگہ کو مخدوش قرار دے دیا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ دور کی پہاڑیوں سے یہاں پر بھی نگاہ رکھی جائے گی۔ لیکن یہ علاقے عام طور سے دھند میں لپٹے رہتے تھے اور جب کبھی دھند صاف ہوتی تو دیکھنے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالکل ویران نظر آتے۔

یہ الگ بات تھی کہ یہاں دھند کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اور اس درے سے اپنا کام جاری رکھنے والے اپنا کام دھند کے موسم میں ہی کر لیا کرتے تھے۔ بابر جاہ یہاں پہنچا تو اسے خراب موسم کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے جیپ ایک برفانی ٹیلے کی آڑ میں روک دی اور دوربین سے درے کی اس دیوار کا جائزہ لیا جانے لگا۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شہزور! موسم تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ ایسا کرو رابطہ کر کے معلوم کرو کہ وہ لوگ چل پڑے ہیں یا نہیں۔"

"جی آغا!" شہزور نے کہا اور پھر ایک خاص قسم کا ٹرانسمیٹر نکال لیا۔ اور اس پر کوئی فریکوئنسی سیٹ کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک آواز ابھری۔ جو خاصی خراب تھی۔ زوردار کھڑکھڑاہٹیں گونج رہی تھیں۔

"ہاں کون ہے۔"

"زیرو..... زیرو ایٹ..... زیرو زیرو ایٹ..... زیرو زیرو ایٹ۔"

"زیرو نائین..... نائین نائین زیرو نائین..... نائین نائین زیرو نائین۔"

"کہاں ہو؟"

"مصیبت میں گرفتار ہیں درے میں اتنی گہری تاریکی ہے کہ سفر سخت مشکل ہو رہا ہے۔ ادھر کا موسم کیسا ہے۔"

"خراب۔"

"تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا درے میں ہی رک کر موسم کے بہتر ہونے کا انتظار کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس قدر خراب موسم میں سفر تو بے حد خطرناک ہوگا۔"

"میں ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں۔ انتظار کرو۔"

"ٹرانسمیٹر بند کر رہا ہوں دوبارہ کال کرنا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا گیا۔

بابر جاہ کا ساتھی اسے تفصیل بتانے لگا تو بابر جاہ نے کہا۔

"نہیں۔ اس سے کہو کہ جب کنارے تک آ گئے ہو تو مکمل کر ہی ڈالو۔ بعض اوقات موسم کئی کئی دنوں تک خراب رہتا ہے۔ اگر یہ خراب موسم جاری رہا تو کب تک انتظار کیا جا سکے گا اور پھر مجھے بھی واپس جانا ہے۔"

ٹرانسمیٹر دوبارہ آن کیا گیا۔ اور دوسری طرف سے کال موصول کرنے والے کو پیغام دیا گیا۔ تو اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو پوائنٹ پر میرا انتظار کرو۔" اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بابر جاہ کی نگاہیں دوربین سے درے کے دہانے پر موجود اس سفید دیوار کا جائزہ لینے لگیں۔ جو قدرتی طور پر بن جاتی تھی۔ موسم کی خراب کیفیت کا اسے بہ خوبی اندازہ تھا۔ اور واقعی ایسے موسم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنے دن تک چلے۔

کوئی ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا ان کی آنکھیں اس راستے کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں۔ بابر جاہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ اور دانت پیس رہا تھا۔

"یہ کتے! پتا نہیں کتنے فاصلے پر رہ گئے۔ کہیں درے میں مر ہی نہ گئے ہوں۔ کروڑوں روپے کا سامان ہے ان کے پاس۔"

"وہ دیکھیے آغا برف کی دیوار ٹوٹ رہی ہے۔" بابر جاہ کے ساتھی نے کہا۔

سفید دیوار برادے کی شکل میں گر رہی تھی اور اس کے بعد اس جگہ سے ایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ غالباً سفید تیز روشنی کوئی سگنل دیا گیا تھا۔ جواب میں ادھر سے ایک مخصوص ٹارچ نکالی گئی اور اس سے سبز روشنی ڈالی گئی۔ گرین سگنل مل گیا تھا۔ دوربین برف کی دھند میں اس جگہ کا جائزہ لے رہی تھی اور پھر کچھ لمحوں کے بعد خچروں کی ایک قطار نمودار ہونے لگی۔

ان خچروں پر خاص قسم کے کارٹن دونوں طرف لٹکے ہوئے تھے۔ خچروں کی تعداد نو کے قریب تھی اور ان کے ساتھ تقریباً پانچ آدمی پیدل سفر کر رہے تھے۔ ویسے تو برف کے یہ ویرانے بہت ہی ہول ناک تھے۔ گہری گہری کھائیاں اور خطرناک راستے لیکن ان راستوں پر سفر کرنے والے ان راستوں کے قدیم راہی معلوم ہوتے ہیں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جو ایک گہری کھائی پر بنی ہوئی تھی۔ پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اور اس پر یہ خچر بالکل سیدھ میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ چلنے والے ان کے دائیں یا بائیں نہیں بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر خچروں کے پیچھے تھے۔ دونوں طرف انتہائی گہری کھائیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ واقعی اس خراب موسم میں ان راستوں کا سفر کوئی آسان بات نہیں تھی۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ اسی انداز میں طے کیا گیا اور اس کے بعد اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں بابر جاہ اور اس کے ساتھی ان کا انتظار کر رہے تھے۔

آنے والے کرخت چہروں کے مالک! اور بڑے کھردرے لوگ تھے۔ سب سے آگے والے شخص نے کہا۔

"جب ہم اپنی جگہ سے چلے تھے تو موسم بالکل خوش گوار تھا۔ آپ کو اس طرف کے خراب موسم کی اطلاع دینی چاہئے تھی بابر جاہ صاحب! اس انتہائی خطرناک موسم میں یہ سفر کتنا دشوار گزار تھا۔ آپ کو اس کا اندازہ ہے۔ آپ تو کھائی کے اس طرف کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن ہم اور ہمارے خچر اس جگہ سے نیچے گر سکتے تھے۔ آپ نے ہماری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ بابر جاہ جو آگے والے خچر پر لدے ہوئے کارٹن پر کوئی انٹری دیکھ رہا تھا چونک کر اس کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے تو کیا یہاں آ کر تو نے ہم پر احسان کیا ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابر جاہ صاحب! آپ کو میرے بارے میں پتا ہے کہ میری کیا حیثیت ہے۔" بابر جاہ نے ایک دم ہولسٹر پر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور بولا۔

"یہ صرف کاروبار ہے۔ مجھے تیری حیثیت سے کیا لینا اور کاروبار اس طرح احسان جتا کر نہیں کیا جا سکتا۔ جو رقم تم لوگ مجھ سے وصول کرو گے۔ وہ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور بس۔"

"آپ کی اس بداخلاقی کی رپورٹ میں متعلقہ افراد کو ضرور کروں گا۔" اس شخص نے ناخوش گوار لہجے میں کہا اور اسی وقت بابر جاہ کا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ اور وہ گرتے گرتے بچا۔ باقی لوگ سنگین نگاہوں سے اس صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ بابر جاہ کے تینوں ساتھی مستعد تھے۔ اور اس طرح تیار تھے کہ اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری طرف سے ذرا بھی کوئی مداخلت کی جائے تو فوراً ہی جنگ کا آغاز کر دیں۔ تھپڑ کھانے والے افراد نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لیکن سب کو ٹھنڈا پا کر وہ خود بھی نارمل ہو گیا۔ اور گہری گہری سانسیں لے کر منہ سے بہنے والا خون صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"مال اتارو۔"

"یہاں نہیں گدھے کے بچے اگر تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو تجھے....." ابھی بابر جاہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ۔ دفعتاً ایک خوف ناک آواز نے اسے چونکا کر دیا۔ وہ بھیڑیوں کی آوازیں تھیں۔ وہ اچانک ہی چیخنے لگے تھے۔ اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تعداد کافی ہے۔ بابر جاہ بھی ایک دم اچھل پڑا تھا۔ پھر دور سے انہوں نے ایک خوف ناک منظر دیکھا۔ وہ لاتعداد بھیڑیے تھے۔ جو اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور ان کے حلق سے خوں خوار آوازیں نکل رہی تھیں۔ سامان لدے ہوئے خچروں نے بدکنا شروع کر دیا۔ جو سامان لے کر آئے تھے۔ وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بابر جاہ برق رفتاری سے پیچھے ہٹ کر اپنی جیپ کی طرف دوڑا اور اس کے تینوں ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ بھیڑیے اسی طرف آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خچروں کے قریب پہنچ گئے۔ ایک طرف خچر سامان سمیت بھاگنے لگے۔ اور دوسرے وہ جوان کے ساتھ آئے تھے۔ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپنے لگے۔ انتہائی خوف ناک منظر تھا۔ بھوکے سفید بھیڑیے۔ خچروں اور انسانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جب کہ بابر جاہ نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے ایک طرف موڑ دی تھی۔ وہ ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر دوڑ پڑا تھا۔ بہت سے خچر پلٹ کر ادھر سے ادھر بھاگے تو سامان سمیت کھائی میں جا گرے۔ بہت سے خچروں کو بھیڑیوں نے ہلاک کر دیا اور سامان کے کارٹن زمین پر بکھر گئے۔ وہ لوگ جو خچروں کے ساتھ آئے تھے فائرنگ بھی نہیں کر سکے۔ بابر جاہ نے جیپ ایک ایسے برفانی ٹیلے کی آڑ میں روک دی جہاں وہ بھیڑیوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ لوگ جیپ سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے لمبی لمبی رائفلیں نکال لی تھیں۔ جو مقامی طور پر ہی بنی ہوئی تھیں۔ انہیں لے کر وہ برفانی ٹیلوں پر چڑھ گئے اور بہت دور کا ہول ناک جائزہ لینے لگے۔

سفید برف پر خون کی دھاریں بہ گئی تھیں۔ خچر دم توڑ رہے تھے اور خوں خوار بھیڑیے انہیں اس طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ جیسے ان سے ازلی دشمنی ہو۔

♥.....♥.....♥

انسانوں اور درندوں کے درمیان ایک بھیانک کشمکش ہو رہی تھی۔ بے چارے خچر درمیان میں پس رہے تھے۔ بھیڑیوں نے انہیں بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ سفید برف پر خون کے دھارے جگہ جگہ بہ رہے تھے اور ایک عجیب سی منظر کشی ہو گئی تھی۔ بابر جاہ اور اس کے ساتھی دم بہ خود موجود تھے عارضی طور پر تو محفوظ جگہ کہی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر کہیں بھیڑیوں کا رخ اس طرف ہو گیا تو پھر یہ رائفلیں بھی زیادہ ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ ویسے بھیڑیوں کے اتنے بڑے غول کبھی کبھی ہی نظر آتے ہیں آن کی آن میں انہوں نے درے سے آنے والوں کا صفایا کر دیا۔ بہت سے خچر بھاگ گئے تھے کچھ زخمی تھے اور کچھ ہلاک ہو چکے تھے۔ سامان جگہ جگہ بکھرا ہوا تھا۔ اچانک ہی بابر جاہ کی رائفل نے گولیاں اگلنا شروع کر دیں۔ اور اس کے ساتھی چونک پڑے۔

بابر جاہ بھیڑیوں کو نشانہ نہیں بنا رہا تھا بلکہ اس نے بھاگنے والے خچروں کا نشانہ لے کر گولیاں چلائی تھیں پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ایک بھی خچر زندہ نہ واپس جانے پائے۔ بھیڑیوں سے زیادہ یہ ہمارے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ بابر جاہ کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن انہوں نے بابر جاہ کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور بھاگنے والے خچر بھی ڈھیر ہو گئے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ بھیڑیے گولیاں چلنے کی آوازوں کا اندازہ لگا کر اس طرف کا رخ نہ کر لیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اچانک ہی انہوں نے بائیں سمت اختیار کی اور اس کے بعد ہر ایک بھیڑیا اپنا کام چھوڑ کر بائیں سمت دوڑ پڑا۔ جیسے کسی بات کی نشان دہی کی گئی ہو۔ اور پھر آن کی آن میں آخری بھیڑیا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ برف کے اس وسیع و عریض علاقے میں جو خوفناک تباہی نظر آ رہی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی بابر جاہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے اپنے کسی خاص ساتھی کو آواز دی۔

"باز میر!"

"باز میر! میں سمجھتا ہوں اس وقت ہم جس مشکل میں گھر گئے ہیں۔ ایسی مشکل ہمیں اپنے سارے کیریئر کے دوران کبھی پیش نہیں آئی۔ اب فیصلہ کرو ہمیں کیا کرنا ہے۔ اگر کوئی فوجی ہیلی کاپٹر دن کی روشنی میں یہاں سے گشت کرتا ہوا گزر گیا۔ تو سمجھ لو یہ علاقہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہاں سکیورٹی سخت کر دی جائے گی اور اتنا شان دار علاقہ ہمیں دوبارہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ خچروں اور انسانوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا آسان کام نہیں ہو گا۔"

"خان جی ہمیں فوری طور پر ایس ٹو سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ایس ٹو کی ٹیم کو بلا کر سب سے پہلے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہو گا اور اس کے بعد یہ سامان پوائنٹ پر منتقل کرنا ہو گا جتنا بھی ہو سکے۔"

"اوہ۔ میرا دماغ اس قدر معطل ہو رہا ہے کہ میرے ذہن میں تدبیر نہیں آ سکی باز میر! میں تمہیں اسی لیے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں چلو یہ کام تم ہی کرو میں ان لوگوں کو اطلاع دیتا ہوں کہ یہاں کیا حادثہ ہو گیا ہے۔" باز میر نامی شخص ٹرانسمیٹر پر کسی کو کال کرنے لگا۔ اور ادھر بابر جاہ دوسرے ٹرانسمیٹر پر کسی ہارڈ رسک کو کال کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد بابر جاہ کا رابطہ ان سے ہو گیا۔ جن سے وہ رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

"ہارڈ رسک۔"

"ایک بری اطلاع ہے جناب۔"

"ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس حادثے پر ہم دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ اصل میں ہمارے پاس کچھ ایسے ذرائع تھے جن سے ہم آپ کو باخبر کر سکتے تھے مگر ہم دوسری سمت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کا ذمے دار ہم آپ کو قرار نہیں دے سکتے مسٹر بابر جاہ! آپ اس حادثے کے نشانات مٹانے کی جدد جہد کریں ہم خود آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ کو قرب و جوار کی پوزیشن بتاتے رہیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو اس خوف ناک تباہی کی اطلاع کیسے دوں۔ درحقیقت آپ جیسے قابل اعتماد دوستوں پر مجھے فخر ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہمیں بھی آپ کی دوستی ہر حال میں عزیز ہے۔ بابر صاحب۔ یہ نقصانات تو زندگی کا حصہ ہیں..... چلتے رہتے ہیں آپ ان کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ صورت حال قابو میں ہے اس ہنگامہ آرائی کی اطلاع سرحدی محافظ تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ اپنی پوزیشن پر ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم آپ کو کال کریں گے۔"

"شکریہ۔" بابر جاہ نے کہا اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ باز میر بھی اپنا کام کر کے واپس آ گیا تھا۔

"حالات ہموار ہوتے جا رہے ہیں جناب! ایس ٹو والے پہنچ رہے ہیں۔ میں نے انہیں تمام انتظامات کے لیے کہہ دیا ہے۔" بابر جاہ نے مسکرا کر گردن ہلا کر کہا۔

"حادثہ تو یہ بہت ہولناک تھا۔ لیکن تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ میں نے سرحد پار رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ لوگ بہت ایڈوانس ہیں۔ اس علاقے پر بھرپور نگاہ رکھے ہوئے تھے وہ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس تباہی کو دیکھ لیا ہے اور ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔"

"تھینکس گاڈ! اس کا مطلب ہے کہ برا وقت ٹل گیا۔"

"باقی کام ہو جائے اس کے بعد ہی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔" بابر جاہ نے کہا پھر دو بڑے ٹرک آتے ہوئے نظر آئے۔ برف کی سفیدی میں تاریک دھبے روشنیوں کے بغیر سفر کر رہے تھے۔ لیکن انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کوئی تیس افراد ان ٹرکوں سے اترے تھے۔ اور بابر جاہ انہیں ہدایات دیتا رہا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے تک انہوں نے انسانوں اور خچروں کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ گہری کھائیوں میں ان لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر پھینک دیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ سامان ٹرکوں پر بار کیا جانے لگا۔

بابر جاہ، باز میر اور دوسرے افراد جو بابر جاہ کے ساتھ تھے ایس ٹو والوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ ایس ٹو کے لوگ سفید وردیوں میں ملبوس تھے ان کی وردیاں ان کے جسموں کو ہر طرح کی سردی سے محفوظ رکھنے کا کام انجام دے رہی تھیں چنانچہ وہ اپنا کام انتہائی مستعدی سے کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سامان انہیں کہاں منتقل کرنا ہے۔ بابر جاہ اور باز میر بلند ٹیلوں پر چڑھ کر دور دور تک کا جائزہ لے رہے تھے۔ اور پھر سارا سامان ٹرکوں پر منتقل ہو گیا تو ٹرک وہاں سے واپس چل پڑے۔

ساری رات گزر گئی اس کام میں۔ صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ بابر جاہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"تم لوگوں پر موت کیوں طاری ہے؟ قہوہ بناؤ ہمیں بھی دو اور خود بھی پیو۔ ہر طرح کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ اور ہم اب صرف سفید لومڑیوں کے شکاری ہیں۔" بابر جاہ نے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھی اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔ گرم گرم قہوے کے گھونٹ ہر شخص کو فرحت بخش رہے تھے اور اب وہ چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ چنانچہ بابر جاہ نے کہا۔

"روانگی کی تیاریاں کرو۔" اور وہ لوگ اپنا سامان سمیٹنے لگے۔

ساری رات سخت مشقت میں گزری تھی لیکن کام چونکہ تسلی بخش طریقے سے ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ غیر مطمئن نہیں تھے۔ آخر کار اس ہولناک برفانی علاقے سے واپسی کا سفر شروع ہو گیا راستے میں باز میر نے کہا۔

"خان جی! اگر مناسب سمجھیں تو ایک نگاہ مال پر ڈالتے جائیں۔ سارا مال ہی منتشر ہو گیا ہے۔ ہم

ذرا یہ دیکھ لیں کہ ایس ٹو والوں نے مال کو تسلی بخش طور پر جمایا ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بابر جاہ نے باز میر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور گاڑیوں کے رخ موڑ دیئے گئے۔ پھر اونچے نیچے برفانی راستے طے کرتے ہوئے وہ ایک ایسے پہاڑی سلسلے تک پہنچے جو برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ بلند و بالا پہاڑی ٹیلوں کا یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا تھا۔ برف کی موٹی چادر نے اسے برفانی گلیشیئر بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن یہ لوگ جانتے تھے کہ راستے کدھر ہیں چنانچہ وہ ان غاروں کے دہانوں تک پہنچ گئے۔ جو برف میں چھپے ہوئے تھے۔ ان غاروں میں داخل ہونے کا راستہ بھی انہیں ہی معلوم تھا۔

چنانچہ جب وہ غاروں میں داخل ہوئے تو اس طرح کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جن سے یہ ظاہر ہو کہ ایس ٹو والے مال ادھر منتقل کر کے گئے ہیں برف گرتی تو یہ نشانات بھی چھپ جاتے۔ لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ غار میں اندر داخل ہو کر مصنوعی روشنی کرنے لگے اور کچھ دیر کے بعد عظیم الشان غاروں کا منظر نمایاں ہو گیا۔ پہاڑی ٹیلوں کے اندر ہی اندر ان غاروں میں سوراخ کر کے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یہ کام یقیناً انتہائی مشقت طلب تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اسمگلنگ کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ اور ان غاروں کو انتہائی محفوظ طریقے سے قابل استعمال بنایا گیا تھا۔ وہ اشیا جو تھوڑی دیر پہلے ان خچروں پر بار ہو کر ادھر سے آئی تھیں۔ ایک طرف سلیقے سے جمی ہوئی تھیں اور ان سے پچھلے دن کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

ایک دو کارٹن کھول کر اندر کے سامان کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس کے بعد کارٹن بند کر دیے گئے اور بابر جاہ نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے باز میر۔"

"جی خان جی ٹھیک لگ رہا ہے سب کچھ۔"

"وہاں کا جائزہ بھی ہم نے لے لیا ہے ادھر بھی سب خیریت ہی ہے۔"

"جی خان جی۔" اور اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے باہر نکل آئے۔ گاڑیاں چل پڑیں لیکن ابھی انہوں نے کوئی آٹھ سے دس منٹ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک ہی انہیں ایک بڑی پرانے طرز کی جیپ نظر آئی اور وہ چونک پڑے۔

"یہ کون ہیں؟" بابر جاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"پتا نہیں خان جی۔" باز میر نے آنکھوں پر دوربین لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے دوربین بابر جاہ کی طرف بڑھا دی۔ اور بابر جاہ اس جیپ کو فوکس کرنے لگا۔ پھر بولا۔

"پتا نہیں کون ہیں ممکن ہے شکاری ہوں۔"

"خان جی۔ ایک کام ہم آج تک نہیں کر سکے۔" باز میر بولا۔

"کیا؟"

"ان راستوں کو شکاریوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے۔"

"میں نے کئی بار کوشش کی ہے۔ وزارت سیاحت اس بات پر تیار نہیں ہوئی وہ اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب آپ دیکھیے یہ اس طرف بے دھڑک چلے آ رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ان غاروں تک آ جائیں گے۔ لیکن بات تو خطرناک ہے۔"

"آؤ دیکھتے ہیں کون ہے۔" اور گاڑیوں کا رخ اس جانب ہو گیا۔ پھر تھوڑا فاصلہ طے ہوا تھا کہ بڑی جیپ سے انہیں دیکھ لیا گیا اور جیپ رک گئی۔ باز میر اور بابر جاہ اس جیپ پر تبصرہ کر رہے تھے۔

"بڑی پرانی جیپ ہے۔ کمپنی نے شاید ابتدائی دنوں میں اس طرح کی جیپیں بنائی تھیں۔"

"ہاں خان جی! فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ اور ان برفانی علاقوں میں سفر کے لیے انتہائی موزوں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر یہ جیپ ہماری ہوئی۔"

"وہ کیسے۔"

"جہاں اتنے انسان گہرے کھڈ میں پڑے ہیں۔ وہاں کچھ اور سہی۔" بابر جاہ نے سفاکی سے کہا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ اس بڑی جیپ تک پہنچ گئے۔ بڑی جیپ میں کل چھ افراد سوار تھے۔ سارے کے سارے ہی اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن وہ حسین لڑکی جس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس برفانی علاقے میں وہ برف کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑا خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا اس نے۔ بابر جاہ حسن پرست آدمی تھا۔ اس نے مقامی زبان میں باز میر سے کہا۔

"باز میر یہ حور تو ہمارا دل چھین کر لے گئی۔"

"ہاں خان جی۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس نے آپ کے دماغ پر ٹھک ٹھک شروع کر دی ہو گی۔"

"انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا۔ خیال رکھا جائے۔" اور اس کے بعد بابر جاہ اپنی جیپ سے اتر آیا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔

"سس..... سلام علیکم درویشوں کی دعاؤں سے۔" سب سے آگے والے اونٹ کی طرح بے تکے آدمی نے کہا۔ بابر جاہ نے گردن ہلائی اور ان سب کی شکلیں دیکھتے ہوئے بولا۔

"نیچے اتر آؤ تم لوگ تعمیل کرو درویشوں کی دعاؤں سے لم ڈھینگ نے پھر کہا اور ایک ایک کر کے وہ سب نیچے اتر آئے۔ بابر جاہ مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ لوگ مقامی زبان سمجھتے ہیں۔"

"نہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔" لم ڈھینگ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے دانت، دانت نہیں بلکہ کھتے اور چونے کا جما ہوا ملغوبہ نظر آتے تھے۔ بابر جاہ نے نفرت سے ناک سکوڑی اور بولا۔

"کون ہو تم لوگ۔"

"لل..... لماڑی..... میرا مطلب ہے برف کی لومڑی کا..... برف نہیں..... اے تم آگے آ کر بتاؤ۔" اس شخص نے ایک نوجوان سے کہا اور نوجوان آگے بڑھ آیا۔

"شکاری ہیں جناب۔ برفانی لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے آئے ہیں۔"

"او ہو آپ بھی۔" بابر جاہ نے براہ راست لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور لڑکی کے ہونٹوں پر

ایک دل کش مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پہاڑوں کے بیٹے! میں نے تمہارا نام غلط تو نہیں لیا۔" بابر جاہ کو یہ انداز تخاطب بڑا اچھا لگا تھا اس نے کہا۔

"ہم پہاڑی لوگ ہیں آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گی میڈم۔"

"میرا نام رابعہ سونیکا ہے۔ میرے والدین مقامی لوگ ہی تھے۔ لیکن وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے دنیا کے تین مختلف ملکوں میں عمر گزاری ہے۔ والدین کی موت کے بعد اپنے وطن واپس آ گئی ہوں۔ دارالحکومت میں رہتی ہوں۔ ان علاقوں کے بارے میں سنا تھا کہ بہت حسین ترین علاقے ہیں اور بلاشبہ یہ مجھے سوئٹزرلینڈ سے زیادہ پسند آئے ہیں۔ یہاں کی بات ہی اور ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں فضاؤں میں اپنے وطن کی خوشبو رچی ہوئی ہے ہم لوگ یہاں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ یہ مسٹر صوفی ہیں ایک پرانے شکاری بہت تجربہ رکھتے ہیں اور یہ دو افراد ان کے معاون اور یہ دو میرے سیکریٹری ہیں۔" لڑکی نے سب کا تعارف کرایا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ بابر جاہ کی طرف بڑھا دیا اس کے چہرے پر ایک لگاوٹ بھری مسکراہٹ تھی۔ جو بابر جاہ کو بہت بھلی لگ رہی تھی سوچ کر تو یہ آیا تھا کہ ان شکاریوں کو موت کی نیند سلا دے گا۔ لیکن لڑکی نے ماحول ہی بدل دیا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مس سونیکا! ہم آپ کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ میرا نام بابر جاہ ہے اور میں ان علاقوں کا مالک ہوں۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ ویسے آپ لوگ نے کتنی برفانی لومڑیاں شکار کیں۔"

"کک..... کہاں شکار کیں۔ ہماری شکل دیکھ کر، بھبھ..... بھاگ جاتی ہیں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا۔ بابر جاہ کے کچھ ساتھی ہنس پڑے ان میں سے ایک نے دبی زبان سے کہا۔

"لگڑ بھگو سمجھتی ہوں گی آپ کو۔"

"پپ..... پتا نہیں لومڑیوں کی فطرت سے ہمیں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ شاید آپ کو ہو درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا اور وہ شخص شرمندہ سا ہو گیا۔ بابر جاہ ہنس پڑا تھا پھر بولا۔

"تو آپ میر شکاری ہیں۔"

"درویش آپ پر رحم کریں بڑی اچھی بات کہی آپ نے مناسب معاوضہ لے کر ہم مختلف قسم کے شکار کرایا کرتے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے ایک سو چالیس مچھلیاں پکڑ کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔"

"ایک سو چالیس مچھلیاں پکڑ کر۔"

"جی۔ مچھلیوں کا شکار کرا رہے تھے ہم کچھ لوگوں کو۔"

"ایک سو چالیس مچھلیاں کہاں سے پکڑیں آپ نے۔"

"ایک فش فارم کے ٹینک سے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا اور اس بار بابر جاہ بھی ہنس پڑا تھا۔

"آپ لوگ بہت دلچسپ لوگ ہیں ہم پہاڑی لوگوں کی ایک روایت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے علاقے میں آتا ہے۔ پہلے ہم اسے اپنا مہمان رکھتے ہیں۔ اور اگر ہماری میزبانی قبول نہ کی جائے تو ہم اپنے علاقوں میں آنے والوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ یہاں دو ہی لوگ داخل ہو سکتے ہیں ہمارے مہمان یا ہمارے دشمن اور دشمن کو ہم واپس نہیں جانے دیتے۔ آپ لوگوں کو ہمارا مہمان بننا ہوگا۔ ہم آپ کو سفید لومڑیوں کے ڈھیر میں ڈھک دیں گے۔"

"تت..... تب تو ہماری موت واقع ہو جائے گی درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں..... مطلب یہ کہ لومڑیوں کا شکار کر کے آپ کیا کریں گے۔"

"ظاہر ہے ہم ان کی کھالیں حاصل کریں گے۔"

"وہی میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں سفید لومڑیوں کی کھالوں کے انبار لگا دوں گا آپ کے گرد۔"

"اوہ مائی گاڈ..... اوہ مائی گاڈ..... مسٹر جابر باہ۔"

"نہیں بابر جاہ۔ آیئے..... ہمارے ساتھ آیئے۔ سنو تم میں سے ایک ان کے ساتھ ان کی جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ اور باقی اپنی گاڑی میں چلو..... میڈم! آپ میرے ساتھ آ جایئے۔"

بابر جاہ نے کہا اور سونیکا خوشی سے اس پر آمادہ ہو گئی۔ وہ بابر جاہ کے ساتھ جیپ میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ بابر جاہ اس تعاون پر بڑا خوش تھا۔ جیپیں آگے بڑھ گئیں۔ بابر جاہ نے کہا۔

"یہ علاقہ سنگینہ کا علاقہ کہلاتا ہے اور سنگینہ میری ریاست ہے میں اس کا حکمراں ہوں میرے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھابی اور اس کی بیٹی اراشیہ ہماری حویلی میں رہتی ہیں آپ کو ان لوگوں کے درمیان جا کر بڑی خوشی ہوگی۔ ویسے آپ کا نام بڑا خوب صورت ہے مس سونیکا۔"

"شکریہ..... میں نے اپنے وطن کے ان علاقوں کے بارے میں سنا تھا کہ یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ آپ بہت اچھے ہیں جابر باہ صاحب!"

"بابر جاہ۔" بابر جاہ نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

"جی جی وہی معافی چاہتی ہوں۔" رابعہ سونیکا نے کہا۔

"نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ مجھے اچھا لگتا ہے۔" بابر جاہ انہیں لے کر حویلی پہنچ گیا۔ برفانی ڈھلانوں کی گہرائیوں میں یہ وسیع و عریض احاطہ اور اس کے بعد اس احاطے کے اندر بنی ہوئی خوب صورت عمارت جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصے کو زنان خانہ کہا جاتا تھا۔ یہاں کی روایت کے مطابق زنان خانہ میں پردے کا اہتمام ہوا کرتا تھا لیکن خانم فردوسیہ نے یہ پردے داری ختم کر دی تھی۔ وہ آزاد فطرت کی مالک تھی اور اس سلسلے میں بابر جاہ اسے مجبور نہیں کر سکا تھا۔ ان لوگوں کو ایک بہترین قیام گاہ دی گئی۔ بابر جاہ نے جو کمرا رابعہ سونیکا کو دیا تھا۔ وہ اس کی خواب گاہ سے ملحق تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے بازمیر سے کہا۔

"اس لڑکی نے تو کچھ دیر کے اندر ہی اندر میرے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا ہے بازمیر۔"

"خان جی وہ واقعی برف کی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔"

"واہ..... کیا خوب صورت نام دیا ہے تم نے اسے۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رکھو ہم ان

پر بہت اچھا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔" بابر جاہ نے بازمیر کو ہدایت کی۔

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی خان جی۔" بازمیر گردن خم کر کے بولا۔

♥..... ♥..... ♥

اراشیہ نے اس عجیب و غریب انسان کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے سیدھا منہ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اراشیہ اسے دیکھ کر رک گئی۔ وہ شخص اس کے قریب پہنچ کر رک گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"خداوند عالم! تم پر رحمتوں کی بارش کرے درویشوں کی دعاؤں سے، اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تمہارا نام آراشیہ ہے۔" آراشیہ نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر بولی۔

"تم وہی ہو نا جو چچا جان کے مہمان ہو۔"

"ہم مہمان ضرور ہیں اس حویلی میں لیکن چچا جان۔"

"میں بابر جاہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم تو خیر دارالحکومت سے آئے ہیں درویشوں کے کرم سے لیکن رابعہ سونیکا سوئٹزرلینڈ سے آئی ہے اور یہاں ان برفانی علاقوں میں لومڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتی ہے۔"

"تو لومڑیاں ہمارے گھر میں گھسی ہوئی ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہو تم لوگ۔"

"درویش رحم کریں وہ صاحب! ہمیں زبردستی مہمان بنا کر لے آئے۔"

"ہوں..... مہمان۔" اتنی دیر میں خانم فردوسیہ بھی ادھر نکل آئیں۔

"کیا بات ہے آراشیہ!"

"مما! آپ دیکھیے اس طرح منہ اٹھائے چلے آئے ہیں اس طرف جیسے ساری حویلی چچا جان کی ملکیت ہو۔ یہ ان کے مہمان ہیں نا۔"

"نہیں بیٹا! حویلی کے احاطے میں ہر مہمان قابل احترام ہوتا ہے۔"

"پھول جھڑ رہے ہیں آپ کے منہ سے درویشوں کی دعاؤں سے، ویسے آپ ان کی والدہ ہیں۔"

"ہاں۔ آپ لوگ یہاں کب تک قیام کریں گے۔"

"جب آپ حکم دیں گے چلے جائیں گے۔"

"نہیں میرا یہ مقصد بالکل نہیں ہے۔ آپ آرام سے یہاں رہیں میں نے تو ایسے ہی آپ کا پروگرام پوچھا تھا۔"

"جی..... شکار کھیلنے کا ارادہ ہے ہمارا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ مجھے معصوم جانوروں پر گولی چلاتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"یہ آپ کے ہر جملے میں درویش کہاں سے آ جاتے ہیں۔"

"فیض ہے ان کا، بس کرم نوازی ہے خود بہ خود آ جاتے ہیں درویشوں کی دعا سے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آؤ آراشیہ! ہمیں کچھ کام کرنا ہے۔" خانم نے کہا اور اس کے بعد آراشیہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ آگے چلی گئی۔ لم ڈھینگ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس دوران وہ حویلی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا تھا۔ جب کہ رابعہ سونیکا نے پوری طرح بابر جاہ کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت باتیں کرتی تھی بابر جاہ سے کہ بابر جاہ اس کے پاس سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ ہر انسان کے اندر ایک اور شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی وحشی کتنا ہی دیوانہ کیوں نہ ہو۔ لیکن بعض اوقات چند الفاظ اسے مار دیتے ہیں۔ ایک خوب صورت لڑکی جب اسے پہاڑوں کا شہزادہ اور زمانہ قدیم کا دلیر انسان کہتی تھی تو بابر جاہ کا سینہ فخر سے پھول جاتا تھا۔ رابعہ سونیکا ہر وقت اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور بابر جاہ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

"میرا بس چلے تو میں ساری زندگی ان برف زاروں میں آپ کے ساتھ گزار دوں مسٹر بابر جاہ۔"

"بابر جاہ۔" بابر شاہ نے کہا اور ہنس پڑا۔

"معاف کرنا کوئی اور نام رکھ لو مجھ سے نہیں صحیح نام لیا جاتا۔"

"تم جو بھی کہتی ہو سونیکا! مجھے اچھا لگتا ہے۔"

باز میر نے بابر جاہ سے کہا۔

"خان جی آپ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہو گئے ہیں۔ اس لڑکی سے۔"

"باز میر۔ میں نے زندگی میں بہت سے کھیل کھیلے ہیں اسے تو میں اس لیے اپنے ساتھ لایا تھا کہ کچھ عرصہ اسے اپنا مہمان رکھوں گا اور اس کے بعد بھگا دوں گا لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس لڑکی کی تقدیر میں اس حویلی کے حصے داری لکھ دی گئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں خان جی!" باز میر بولا۔

"میں اس سے شادی کروں گا باز میر! وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے اسے یہاں رکھا جا سکتا ہے۔"

دوسری طرف خانم فردوسیہ الجھن میں گرفتار تھی۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا تو اس نے ٹرانسمیٹر پر کرنل رحیم شاہ سے رابطہ قائم کیا۔

"کرنل صاحب! آپ نے ہمارے لیے کچھ کیا نہیں بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی چاہتی ہوں کہ اس سلسلے میں کم از کم کام کا آغاز تو کریں۔"

"آغاز ہو چکا ہے بھابی جی۔ میری ٹیم آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔"

"آپ کی ٹیم۔"

"ہاں۔ صوفی صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس وقت وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ حویلی میں مقیم ہیں۔"

"صوفی صاحب۔"

"حلیہ بتاتا ہوں آپ کو ان کا، ہو سکتا ہے آپ کی ان سے ملاقات ہوئی ہو۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور پھر جو حلیہ اس نے خانم فردوسیہ کو بتایا اسے سن کر خانم فردوسیہ ششدر رہ گئی۔

"میرے خدا تو یہ میر شکاری، میرا مطلب ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"بالکل بالکل۔ یہ وہ شخص ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا۔ آپ اسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں۔ بس ذرا ٹائپ ایسی ہے اس کی اور انداز اسی طرح کا اختیار کر لیتا ہے۔"

"میرے خدا..... میرے خدا....." خانم فردوسیہ سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

♥.....♥.....♥

خانم فردوسیہ نے آراشیہ کو غور سے دیکھا آراشیہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کے سائے تھے۔ خانم فردوسیہ نے کہا۔

"کیا بات ہے آراشیہ افسردہ ہو۔"

"ہاں خانم افسردہ ہوں۔ اچھا نہیں لگ رہا موسم بھی ڈھل ہے اور ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہاں ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے بس صبح ہوتی ہے شام ہو جاتی ہے نہ کوئی تفریح نہ اور کچھ۔ مما ایک بات کہوں آپ سے۔"

"ہاں بولو۔"

"کیا مل رہا ہے ہمیں سنگینہ میں مما! شہر چلیے کم از کم وہاں زندگی کی رونقیں تو ہیں۔"

"میں خود بھی اسی انداز میں سوچ رہی تھی ایک کام کر لیتے ہیں آراشیہ! اگر تم پسند کرو تو۔"

"جی مما! بتایئے۔"

"ہم شہر چلیں گے وہیں اپنے لیے قیام کا بندوبست بھی کریں گے۔ لیکن کچھ عرصے رک جاتے ہیں یہاں کی ذمے داریاں ہم پولیٹیکل ایجنٹ کو سونپ دیں گے۔ اپنے سارے مفادات کا نگراں اسے بنا دیں گے یا ایک ٹیم بنا دیں گے جو سنگینہ میں ہمارے مفادات کی نگرانی کرے۔ لیکن بیٹا! ہم نے ایک مقصد چنا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی زندگی کے دن پورے کر کے زمین کی آغوش میں سما جانا ہے۔ لیکن وطن کی چھت نسلوں کی امانت ہوتی ہے اس چھت کو مضبوط ستونوں پر قائم کرنا اس چھت کے نیچے ایک سانس بھی گزارنے والے کی ذمے داری بن جاتی ہے۔ ہم نے تو زندگی کے بہت سے سال اس چھت کے نیچے گزارے ہیں۔ دیکھو۔ اس چھت نے ہمیں پروان چڑھایا زمین نے ہمیں وہ سب کچھ دیا جو ہماری ضرورت ہو سکتی تھی۔ اپنی تھوڑی سی زندگی کی دل بستگی کے لیے کیا ہم اس چھت کو تنہا اور ویران چھوڑ دیں۔ ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔ جو اس کے ستونوں کو ڈھا کر اسے زمین بوس کر دیں۔ آراشیہ۔ مجھے جواب دو۔"

"نہیں ماما! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی اپنی بوریت کا اظہار کر رہی تھی۔"

"آپ نے جو کوشش کی تھی اس کا کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہوا۔"

"کون سی کوشش کی بات کر رہی ہو۔"

"وہی انکل رحیم شاہ سے ملاقات کی۔"

"عجیب و غریب انکشاف ہوا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان کے دیے ہوئے ٹرانسمیٹر پر۔"

"کیا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ جو کچھ مہمان آئے ہیں نا۔ تم نے دیکھا ہوگا بابر جاہ کے ساتھ۔"

"ہاں کچھ عجیب وغریب چیزیں آئی ہیں۔ ایک خاتون بھی ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں نظر آتی مجھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں خواتین سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے اور انکل بابر جاہ! بس مما میں کیا بتاؤں چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔"

"یہ اسی ٹیم کی فرد ہے نا۔"

"ہاں۔"

"اور مزید کچھ لوگ بھی ہیں۔"

"ہاں کل چھ افراد ہیں اور ان میں ایک عجیب وغریب چیز ہے۔ مما! میں اس شخص کی بات کر رہی ہوں۔ جو شیروانی اور ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے رہتا ہے اور کوئی قدیم روح معلوم ہوتا ہے۔"

"اراشیہ! رحیم شاہ نے بتایا ہے کہ وہی صوفی صاحب ہیں یعنی ان کے بھیجے ہوئے یہ ٹیم رحیم شاہ کی ہے۔"

"کیا۔" آراشیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ بے اختیار ہنس پڑی اور بولی۔

"کیا رحیم شاہ صاحب نے فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد کوئی سرکس بنانے کا فیصلہ کیا ہے ان جوکروں کو اکٹھا کر لینے کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے۔"

"کیا پتا۔ وہ انتہائی سنجیدہ آدمی ہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ سن کر کہ وہ کہہ رہے تھے کہ صوفی بڑے کام کا آدمی ہے۔ بس اسے برداشت کر لینا بڑی بات ہوگی۔"

"آراشیہ! ایک کام کرو۔"

"جی۔"

"ذرا پتا لگاؤ بابر جاہ کہاں ہے اگر بابر جاہ کہیں مصروف ہو تو ذرا صوفی کو بلا کر لاؤ۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کسی کے ہاتھ بلوا لوں۔"

"نہیں۔ تم صورت حال کا جائزہ لو اور اس کے بعد بتاؤ۔"

"میں دیکھتی ہوں۔"

"پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ صوفی کے ساتھ اندر آ گئی۔ صوفی شیروانی اور پائجامے میں ملبوس تھا۔ منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں بنا سپتی گھی کا ایک ڈبا تھا اور اس ڈبے میں پان کا ملغوبہ۔ اراشیہ کی ناک چڑھی ہوئی تھی۔ خانم فردوسیہ نے گہری نگاہوں سے صوفی کو دیکھا۔ اور صوفی لکھنوی انداز میں جھک جھک کر سلام کرنے لگا۔

"آیئے صوفی صاحب! آیئے تشریف رکھیے۔ آراشیہ دروازہ بند کر دو۔" آراشیہ نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا صوفی نے ڈبا ایک جگہ زمین پر رکھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"یہاں تشریف رکھیے آپ اور یہ ڈبے میں کیا ہے۔"

"غم غم، قم قم..... غم غم، قم قم۔" صوفی نے دوبارہ کہا۔

"اوہو..... آپ نے اسے اگال دان بنا رکھا ہے۔ چلیے ابھی تو کام چلایئے میں آپ کو اگال دان مہیا کروں گی۔"

"غپڑ یہ..... غپڑ یہ۔" صوفی نے کہا پھر ڈبا اٹھا کر منہ کا سارا ملغوبہ اس میں الٹ دیا اور اس کے بعد شیروانی کی جیب سے ایک رومال نکالا جو خون آلود محسوس ہوتا تھا لیکن وہ خون نہیں تھا بلکہ کتھے چونے کا رنگ تھا۔ ہونٹوں کو اچھی طرح صاف کر کے اس نے رومال دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ آراشیہ کو الٹی آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں جاؤں مما!"

"نہیں بیٹھو۔ صوفی صاحب! میں معافی چاہتی ہوں کیا آپ پانوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"نہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔ کیا مطلب۔"

"اس کائنات کی چھت کو قائم رکھنے میں درویشوں، پیروں، ولیوں اور بزرگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے محترمہ! اس لیے میں عاشق درویش ہوں اور ہر کام ان کی رضا اور پوری رغبت کے ساتھ کرتا ہوں۔"

"خیر..... آپ کا اپنا عمل ہے صوفی صاحب! آپ سے جو بات میں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ براہ کرم اس کا صحیح جواب دیں۔ مجھے تو پہچانتے ہیں نا آپ۔"

"دل وجان سے دل وجان سے، درویشوں کے کرم سے۔"

"ایک بات بتایئے، دل وجان سے یا درویشوں کے کرم سے....." آراشیہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔ خانم نے ہاتھ اٹھایا اور بولیں۔

"بیٹھ جاؤ آراشیہ! کھڑی کیوں ہو۔" آراشیہ بیٹھ گئی تھی وہ بہ غور صوفی کے حلیے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا اسے، خانم نے کہا۔

"جی صوفی صاحب! ہمارے ایک کرم فرما ہیں کرنل رحیم شاہ! جانتے ہیں آپ انہیں۔"

"جی درویشوں کے کرم سے اور محترمہ میں آپ سے کوئی لگی لپٹی بات نہیں کروں گا آپ کو تسلی دینا بھی ضروری تھا۔ ہم لوگ کرنل رحیم شاہ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ کرنل صاحب نے تمام صورت حال بتا کر ہمیں یہاں بھیجا تھا ہم نے براہ راست یہاں آنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ بابر جاہ صاحب ہمیں خود ہی یہاں آنے کی دعوت دے دیں درویشوں کے کرم سے، اور اس کوشش میں ہمیں کامیابی حاصل ہوگئی۔ محترمہ! آپ بے فکر ہو جائیں جو ذمے داری ہم نے سنبھال لی ہے سمجھ لیجئے اسے پورا کر کے ہی چھوڑیں گے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ موقع بہتر ہے آپ ہمیں تھوڑی سی تفصیل بتا دیجئے۔"

"یہ لوگ جو آپ کے ساتھ آئے ہیں صوفی صاحب! یہ سب آپ کے اعتماد کے لوگ ہیں۔"

"یہ پوری ٹیم کرنل رحیم شاہ کی ہے۔"

"ہوں۔ تب تو خیر ٹھیک ہے۔ یقیناً شاہ جی نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا ہوگا۔ صوفی صاحب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ جوان دنوں بابر جاہ کے ساتھ دیکھی جارہی ہے۔"

"دیکھیے..... ہر طرح کی کوششیں کی جاتی ہیں بس سمجھ لیجیے کہ وہ مکڑی کی طرح بابر جاہ کے شانوں پر سوار ہو چکی ہے اور یقیناً دور کی کوڑی لائے گی درویشوں کے کرم سے۔ آپ براہ کرم ہمارے لوگوں کے کرداروں پر تنقید نہ کریں۔ آپ یہ فرمایئے کہ آپ کو بابر جاہ سے متعلق کس طرح کے شکوک وشبہات ہیں۔" خانم فردوسیہ وہ تمام گفتگو دہرانے لگی۔ جو اس نے کرنل رحیم شاہ سے کی تھی۔

"بابر جاہ صاحب! ہمیں جس پوائنٹ پر ملے تھے وہ پوائنٹ مشکوک ہوسکتا ہے۔ بس اب بہت جلد ہم ادھر کا دورہ کرنے والے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ان کا طریقہ کار کیا ہے اگر آپ کا شک صحیح نکلا تو آپ بالکل اطمینان رکھیے گا ہم وطن دشمنوں کو منظر عام پر لے آئیں گے۔"

"ایک درخواست کروں صوفی صاحب۔"

"جی جی۔"

"آپ شکاری پارٹی کی حیثیت سے وہاں جائیں گے نا۔"

"جی سفید لومڑیوں کے شکاری کی حیثیت سے۔"

"میں اگر آپ کے ساتھ چلوں تو....." صوفی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

"آپ ضرور چلیے گا ہم آپ کے لیے گنجائش نکال لیں گے۔" صوفی کافی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا اور اس کے بعد خانم نے اسے رخصت کر دیا۔

آراشیہ صوفی کے باہر نکلتے ہی ہنس پڑی۔ اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر بولی۔

"پان نوش فرمایئے گا درویشوں کی دعا سے۔"

"نہیں آراشیہ! آدمی خاصا ذہین معلوم ہوتا ہے۔"

"وہی پرانی کہاوت ہے غالباً تیمور لنگ کے دربار میں ایک شخص آیا تھا جو اندھا تھا نام تھا دولت۔ بادشاہ نے اس سے نام پوچھا۔ اور جب اس اندھے نے اپنا نام بتایا تو وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ اب دولت اتنی اندھی بھی نہیں ہوتی کہ اندھوں کے پاس آجائے۔ اندھے نے ہنس کر کہا۔

"دولت اندھی ہی ہوتی ہے جناب! ورنہ لنگڑے لولوں کے پاس کیسے پہنچ جائے۔ تو اب ذہانت بھی اونٹوں میں تقسیم ہونے لگی۔ مما! کیسا آدمی ہے اس دور میں بھی ایسا لباس پہنتا ہے اور پھر ایسے ادارے سے متعلق! وہ چاہے تو اپنا حلیہ بہتر بھی بنا سکتا ہے۔"

"کاش وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو۔" خانم فردوسیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔"

باز میر خود ہی شامت کا مارا غلام قادر کے سامنے آگیا تھا۔ شاید ہلکے سے نشے میں بھی تھا اس کے ساتھ اس کا خاص آدمی شاکر خان بھی تھا۔ شاکر خان کو یہ لوگ سینڈو کہتے تھے اور وہ خاصا طاقت ور آدمی تھا۔ فطرت میں سرکشی بے پناہ تھی۔ باز میر نے ان لوگوں کو دیکھا اس وقت دلاور اور غلام قادر گردن جھکائے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ باز میر، شاکر خان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"اوہ۔ کالی بلا کیا ہو رہا ہے یار! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ تم لوگوں کا شکار پارٹی سے کیا

تعلق۔ اور شہزادی صاحبہ نے تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے۔"

"تمہارے کو کیا خٹکا ہو گیا ہے۔ ابھی دیکھو نا دلاور بھائی سالہ پدی جیسا آدمی ہے۔ اور بات کرتا ہے میرے سے۔ ابھی دیں گا ایک فٹکا تو ناک غائب ہو جائے گا۔ جاؤ ڑے..... ہمارے منہ مت لگو۔ ہمارا دماغ پھرا ہوا ہے۔"

"ابے مجھے جانتا ہے میں کون ہوں!"

"اڑے ماں قسم اس حرامی کا شامت ہی آگیا ہے۔ دلاور بھائی نکال دوا سے باہر ابھی دیکھو تمہارے کو جو بولتا تھا۔ ابھی اس آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ مہمانوں کے کمرے میں آواز مار کر آنا پڑتا ہے۔ ابھی جاؤ تم اگر تمہارا شامت نہیں آیا تو۔" باز میر بھی ترنگ میں تھا اور اس نے شاکر خان سے کہا۔

"اس کی بکواس سمجھ میں آرہی ہے۔"

"اڑے خدا کا قسم اس کا کٹی کیے بغیر کام نہیں چلے گا دلاور بھائی۔ ابھی اسے نکالو باہر۔"

"شاکر خان اس کو بتاؤ میں کون ہوں۔" شاکر خان ویسے ہی غصے میں آرہا تھا آگے بڑھا اور غلام قادر کا گریبان پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

"اڑے اخروٹ کا چٹنی تمہارے کو شامت بلائے بغیر کام نہیں چلے گا۔" غلام قادر نے اس کے ہاتھ سے گریبان چھڑایا اور پھر اس کا گریبان پکڑ کر ایک زوردار سر کی ٹکر شاکر خان کے سر پر ماری۔ شاکر خان کی ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہو گئی۔ اور ناک سے خون کا فوارہ بہ نکلا۔ غلام قادر نے پلٹ کر ایک گھونسا اس کے جبڑے پر دیا اور شاکر خان اپنے تمام تر تن وتوش کے ساتھ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ دلاور جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں بس غلام قادر بس۔"

"ارے تو دیکھو نا اس خانہ خراب کو میرے منہ کائے کو لگتا بابا! ابھی جاؤ نہیں تو ہڈی پسلی ایک کر دیں گا۔ ماں قسم دلاور بھائی اس کو نکال دو باہر۔ اڑے خانہ خراب کا بچہ بلاوجہ لگنے کو آگیا۔ اڑے ماں قسم ابھی اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دے گا۔ اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گا یہ۔"

"میں دیکھ لوں گا تمہیں دیکھ لوں گا۔"

"اڑے جاؤ نا بے زمیر..... بے زمیر ہی ہے نا تیرا نام، وہ بولتے ہیں نا دلاور بھائی کیا بولتے ہیں یار! آلو خاں، بینگن خان، منڈی خان، لوٹا خان، مٹکا خان یہ سالہ لوگ ایسے ہی نام رکھ لیتا۔ جو مرضی آئے نام رکھ لیا۔ اڑے نکالو اس کو کمرے سے باہر۔" غلام قادر آہستہ آہستہ غصے میں آتا جارہا تھا۔ دلاور نے کہا۔

"آپ لوگ خود جانا پسند کریں گے یا کچھ کوشش کی جائے۔" شاکر خان آستین سے خون پونچھ کر پھر غلام قادر کی طرف متوجہ ہوا تو باز میر نے کہا۔

"نہیں شاکر خان آؤ..... ذرا بات کرتے ہیں بابر جاہ صاحب سے! انہوں نے انہیں اتنا منہ کیوں لگا رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اڑے ابھی بتائیں تمہارے کو۔ چھوڑیں گا یا نہیں چھوڑیں گا۔"

"بس ٹھیک ہے آؤ۔" اور باز میر شاکر خان کے ساتھ باہر نکل گیا تو غلام قادر بولا۔

"چلا گیا ابھی میرے مغز لگتا ہے میں اس کو ٹھیک کر دیں گا دلاور بھائی۔"

"بس بس۔ اچھی مرمت کر ڈالی تم نے کہیں صوفی صاحب کو اعتراض نہ ہو۔"

"ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیں گا چھوٹے بابا سے۔ پھر آپ دیکھو نا ہم تو وہاں نہیں گیا تھا۔" اتنی دیر میں صوفی آ گیا۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر صوفی کو چھوٹے بابا اور رحیم شاہ کو بڑے بابا کہنا شروع کر دیا تھا صوفی نے گردن ہلا کر کہا۔

"سب کچھ میں نے دیکھ لیا اور سن بھی لیا۔ درویشوں کے کرم سے ٹھیک جا رہے ہو۔" غلام قادر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

♥.....♥.....♥

صوفی تقریباً پوری حویلی کا چکر لگا چکا تھا جب نہ جانے کس طرح بابر جاہ کی آنکھ کھل گئی اور اس نے صوفی کو دیکھ لیا۔ صوفی حویلی کا پوری طرح جائزہ لے چکا تھا۔ بہ ظاہر تو کوئی ایسی مشکوک بات نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن پھر وہ ایک راہ داری سے باہر نکلا ہی تھا کہ بابر جاہ سامنے آ گیا۔ وہ متجسس نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ صوفی آنکھیں کھولے ہوئے سیدھا اسی طرف آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اس نے چال میں ایک اجنبی سی کیفیت پیدا کر لی تھی۔ اور پھر وہ بابر جاہ کے بالکل قریب سے گزر گیا۔ تو بابر جاہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ صوفی کی لاتعلقی یہ بتاتی تھی کہ وہ ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

بابر جاہ اس کا پیچھا کرنے لگا صوفی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ اور بابر جاہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی اداکاری میں مزید استحکام پیدا کر لیا۔ سامنے ایک دیوار آئی تو وہ اس دیوار سے جا ٹکرایا اور اس کے بعد اس نے رخ بدل کر بائیں سمت اختیار کر لی۔ پھر ایک جگہ تین سیڑھیاں آئیں تو وہ بڑے آرام سے نیچے جا گرا۔ کچھ دیر اوندھے منہ پڑا رہا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھ کر سیدھا چل پڑا۔

اب بابر جاہ کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ آخر کار صوفی نے اپنی آرام گاہ کا رخ کیا اور جب وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر اپنے بستر پر جا گرا تب بابر جاہ نے اس کا پیچھا چھوڑا۔ لیکن دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس نے شازیہ سے سب پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"ڈیئر سونیکا! کیا تمہیں میر شکاری کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہے جو عام لوگوں سے ہٹ کر ہو۔" صوفی اس دوران شازیہ کو یہ بتا چکا تھا کہ رات کو اسے حویلی میں گھومتے پھرتے دیکھ لیا گیا ہے۔ شازیہ نے کہا۔

"نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ماہر شکاری ہے۔ ابھی تک تو خیر میں نے اس کے شکار کا انداز نہیں دیکھا۔ لیکن لوگ یہی کہتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ برفانی علاقوں میں شکار کھلانے والا اس سے اچھا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"یقیناً ایسی بات ہو گی۔ لیکن میں جو سوال پوچھ رہا ہوں وہ ذرا مختلف ہے۔ یہ شخص کیا کسی خاص

بیماری کا شکار ہے۔"

"ہاں اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ یہ نیند میں چلنے کا عادی ہے۔"

"یہی میں پوچھنا چاہتا تھا۔ رات کو میں نے اسے نیند میں چلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"اوہ۔ کیا واقعی آپ نے مجھے کیوں نہیں جگا لیا بابر جاہ صاحب! میں نے اس مرض کے بارے میں صرف سنا ہے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔" بابر جاہ مسکرا دیا پھر بولا۔

"آپ کو نیند سے جگانے کو دل نہیں چاہا تھا ورنہ خواہش تو یہی تھی۔"

"اگر آپ دوبارہ اسے نیند میں چلتا دیکھیں تو پلیز مجھے بھی جگا لیں میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ نیند میں چلنے والوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ دن رات آپ کے ساتھ جاگتا رہوں۔" بابر جاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے اب آپ مجھے سنگینہ سے واپس نہیں جانے دیں گے۔" شازیہ نے ایک دل کش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھلا اب کیا سوال پیدا ہوتا ہے اس کا۔"

"کیا مطلب۔" شازیہ ناز بھرے انداز میں بولی۔

"آپ کو واپس کہاں جانے دوں گا ذرا غور کریں سنگینہ کی ملکہ سنگینہ میں رہے گی یا کہیں اور جائے گی۔"

"آپ نے نام بڑا اچھا لیا سنگینہ کی ملکہ! لیکن وہ ہے کون۔" بابر جاہ نے مسکراتے ہوئے شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

"آپ۔" اس وقت صوفی کمرے میں داخل ہوا تھا اور بابر جاہ کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

"صوفی صاحب! کیا کمروں میں داخل ہونے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ویسے تو آپ شکل و صورت سے اونٹ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ حرکات و سکنات بھی آپ کی اونٹوں جیسی ہیں۔"

"معافی چاہتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اصل میں ہم آپ سے بات کرنے آئے تھے۔ ہمیں پتا چلا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ واپس جاتے ہیں دوبارہ اجازت طلب کر لیں گے۔"

"آجائیے..... آجائیے..... جب آ ہی چکے ہیں یہاں پر، کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے۔"

"وہ ہمیں تو پتا چلا تھا بلکہ شہزادی صاحبہ نے ہم سے یہی کہا تھا کہ انہیں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے کا شوق ہے اور ہمیں لایا بھی اسی لیے گیا تھا یہاں۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمیں اس چار دیواری میں قید کر کے رکھ دیا گیا ہو۔"

بابر جاہ نے سنجیدہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

"تو آپ شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔"

جناب دو..... درویشوں کے کرم سے نجیب الطرفین ہے۔ آج تک جو کھایا ہے محنت کر کے کھایا ہے۔ ہمیں شکاری کی حیثیت سے یہاں لایا گیا ہے چھوٹی بیگم صاحبہ سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتی ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا ہم تو یہی چاہتے ہیں۔ اپنا فرض پورا کردیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے بس یہ احساس قتل کیے دے رہا ہے کہ بیٹھ کر مفت کا کھا رہے ہیں۔ کچھ ہاتھ پاؤں ہلیں تو......"

"شکار کرنا آتا ہے آپ کو۔" بابر جاہ کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

"جی...... وہ...... درویشوں کی دعاؤں سے میر شکاری ہیں۔"

"چلیے...... یہی بتا دیجیے کہ یہ میر کیا چیز ہوتی ہے۔ شکاری تو خیر پتا چل گیا۔"

"میں......" ہونقوں کے سے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

"یعنی بڑے شکاری...... یعنی شکاریوں کے استاد۔"

"اور آپ ان دو شکاریوں کے استاد ہیں۔"

"جج ہاں...... جج، جی ہاں درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اس نے بٹوے کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اصل میں شکاریوں کی صحبت رہی ہے۔ وہ ممن خان ہیں نا اپنے ممن خان کے ممیا سسر بڑے نامور شکاری تھے۔ ان کی تو پوری زندگی اعلا درجے کے شکاروں میں گزری۔ بتاتے ہیں کہ وہ آنکھ سے شست نہیں باندھتے تھے۔ بلکہ کان سے نشانہ لیا کرتے تھے۔"

"کان کا نشانہ۔"

"مطلب یہ ہے کہ رائفل کی نال سے کان کے ذریعے نشانہ لیا کرتے تھے۔ یعنی آواز پر نشانہ لگاتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ایسے ہی ایک برفانی علاقے میں لومڑیوں کا شکار کھیلنے نکل گئے۔ رات کا وقت تھا برف کی ایک جمی ہوئی جھیل کے گرد ڈیرے لگائے گئے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا ماحول پر گھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پٹ پٹ، پٹ پٹ کی آواز فضا میں ابھری اور ممن خان صاحب کے ممیا سسر نے رائفل نکال لی۔ سمجھ گئے کہ لومڑی بیٹھی ہوئی کچھ کھا رہی ہے۔ بس جناب آواز پر نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ لوگ دوڑ پڑے اور جب اس جگہ پہنچے جہاں نشانہ لیا گیا تھا تو وہاں دیکھا انہوں نے کہ خون کے کچھ چھینٹے ہیں اور پتھر پر لومڑی کی سفید دم رکھی ہوئی ہے پتا یہ چلا کہ لومڑی پتھر پر دم مار رہی تھی۔ نشانہ چونکہ آواز کا لیا تھا اس لیے دم وہاں رہ گئی۔ اور لومڑی بھاگ گئی۔" بابر جاہ دانت پیستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"لومڑی بھاگ گئی۔"

"درویشوں کے کرم سے۔"

"ٹھیک ہے آپ شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔"

"خود نہیں کھیلنا چاہتے بلکہ چھوٹی بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے معاوضے کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو میں شکار پر ...... جائیے تیاریاں کیجیے کل ہم شکار پر چل رہے ہیں۔"

"بہت نوازش بڑا شکریہ درویش آپ کو خوشیاں عطا کریں۔" صوفی نے بٹوہ کھولا تو بابر جاہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ گندگی آپ میرے سامنے نہیں کریں گے۔"

"اصلی قوام مراد آبادی۔"

"گیٹ آؤٹ۔" بابر جاہ غرایا اور صوفی خوف زدہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے منہ سے ہلکی سے آواز نکلی۔

"درویش رحم کریں۔" اور اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ بابر جاہ نے شازیہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کس جال میں پھنس گئی ہیں آپ مس سونیا کیا چیز ہے یہ شخص میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ اگر آپ کو واقعی لومڑیوں کے شکار کا شوق تھا تو کسی ڈھنگ کے آدمی سے کام لیا ہوتا۔"

"میں نے کہا نا میرے سیکریٹریوں نے پتا نہیں کہاں سے ان صاحب کو تلاش کر لیا۔ میں تو ویسے بھی یہاں کے ماحول سے ناواقف ہوں۔"

"آپ کے دونوں سیکریٹری بھی مجھے گدھے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کو بھی شکار کا شوق ہے۔

جہاں تک لومڑی کی کھالوں کا تعلق ہے میں آپ کو اپنا گودام دکھاؤں گا۔ میزن میں میرے آدمی شکار کھیلتے ہیں۔ اور لومڑیوں کی کھالیں ایکسپورٹ کرتے ہیں بڑا اعلا درجے کا ذخیرہ ہے میرے پاس آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی اور یہ لبواونٹ کا بچہ کل اسے شکار کھلاؤں گا۔ زندگی بھر یاد رکھے گا۔" بابر جاہ نے کہا اور اس کے بعد اس نے بازمیر کو بلا لیا۔

"بازمیر شکار کی تیاریاں کرو۔ کل ہم شکار کے لیے نکلیں گے۔"

"ٹھیک ہے خان جی۔" بازمیر نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں صوفی نے رات کو خفیہ طور پر خانم فردوسیہ سے رابطہ قائم کیا تھا۔

"شکار پر جا رہے ہیں ہم لوگ درویشوں کے کرم سے۔"

"اوہ اچھا۔ مگر صوفی صاحب کیا میں نہیں جا سکتی شکار پر۔"

"محترمہ عالیہ۔ یہ فیصلہ تو آپ کریں گی درویشوں کی دعاؤں سے، ویسے میرا خیال ہے آپ کا جانا مناسب ہوگا کم از کم آپ قرب و جوار کی نشان دہی تو کر سکیں گی۔ وہ جگہ جہاں آپ کے خیال میں کوئی غلط کام ہوتا ہے۔"

"ہاں ایسے پوائنٹس تو میرے ذہن میں ہیں۔ خیر ٹھیک ہے صوفی صاحب! میں خود کوشش کروں گی۔" اور جب خانم نے تیاریاں ہوتے اور گاڑیاں کستے ہوئے دیکھا تو وہاں پہنچ گئی۔

"کیا تم لوگ شکار کھیلنے جا رہے ہو۔" اس نے براہ راست بابر جاہ سے سوال کیا۔ بابر جاہ نے پر ادب لہجے میں کہا۔

"ہاں بھابی خانم! یہ مہمان جو آئے ہیں نا ہمارے انہیں بھی شکار کا بڑا شوق ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تھوڑی سی سیر کرا دی جائے انہیں۔"

"کیا میں اس قابل نہیں تھی کہ تم لوگ مجھے بھی پوچھ لیتے۔" خانم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں بھابی خانم! یہ بات نہیں ہے ہم نے سوچا کہ آپ شاید ہماری کمپنی پسند نہ کریں۔"

"ہاں میرے لیے تو زندگی کی ساری دلچسپیاں موجود ہیں۔ اس دن گئی تھی سوچا تھا کہ شاید تم بھی ساتھ دو اور یہ سوچ کر کہ بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ تو کم از کم بھابی کے لیے بھی تو تھوڑا سا وقت نکال لو لیکن بابر جاہ تم ہمیں اپنے ذہن سے نکال چکے ہو۔"

"ارے ارے نہیں بھابی خانم! ایسی بات نہیں ہے۔"

"ہے نا ایسی ہی بات ورنہ ایک بار تو پوچھ لیتے مجھے نہیں تو کم از کم بھتیجی کو پوچھ لیتے جو باپ کی موت کے بعد ایک ایک کی شکل دیکھتی رہتی ہے۔"

"آپ پلیز چلیے ہمارے ساتھ۔ ایسی کوئی بات بالکل نہیں تھی بھابی خانم! چلیے آپ ہمارے ساتھ۔" بابر جاہ نے بہ حالت مجبوری کہا۔

"ہاں میں جاؤں گی۔ تم لوگ کتنا ہی مجھے نظر انداز کر دو لیکن میرا بھی دل چاہتا ہے۔" اور خانم تیار ہونے چل پڑی۔

بابر جاہ ہونٹ سکوڑے اسے دیکھتا رہا پھر پیچھے ہی باز میر کھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"خان جی۔"

"ابے خان جی کے بچے! سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا ہم تو بڑے تفریحی پروگرام بنا رہے تھے۔ اس سالے لم ڈھینگ کو سبق دینا تھا پر مصیبت کہاں سے گلے پڑ گئی اور پھر سونیکا یار! بڑی گڑبڑ ہو گئی۔"

"خان جی ایک بات کہوں وہ جو ایک مثال ہے نا کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آج یہ کھیل بھی ختم کر دیں۔"

"کون سا کھیل۔"

"یہی پھانس جو آپ کے دماغ میں چبھتی ہے۔ میری مراد خانم فردوسیہ سے ہے لے جاتے ہیں وہیں پر دھڑن تختہ کر دیں گے۔"

"دھڑن تختے کی اولاد! کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ ابھی یہ ممکن نہیں ہے جائیداد اور زمینوں کا قصہ جب تک ختم نہیں ہو جاتا ساری چیزیں میرے نام منتقل نہیں ہو جاتیں۔ خانم اور آراشیہ کی زندگی ضروری ہے۔ میں ایک ایک کر کے مختلف طریقوں سے ضروری کاغذات پر دستخط لوں گا۔ ان کی زندگی تو بہت ضروری ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہو خان جی! یہ بات پتا نہیں کیوں بار بار میرے دماغ سے اتر جاتی ہے۔"

"اپنے دماغ کا علاج کرا جب تو یہ باتیں کرتا ہے تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔"

"ٹھیک ہے خان جی! کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔" باز میر نے سوکھے سے منہ کے ساتھ کہا۔

"ایک کام کرنا ہے تجھے۔"

"بولو خان جی! حکم کرو۔"

"ہمیں کسی خاص پوائنٹ پر جا کر الگ الگ ہو جانا ہے اور تجھے اس سلسلے میں میری مدد کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے خان جی! یہ کون سی بڑی بات ہے آپ کا مطلب ہے کہ آپ میڈم کے ساتھ....."

"جی میرا یہی مطلب ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔" بابر جاہ نے کہا۔

"جی نہیں۔ بالکل نہیں ہم تو آپ کو مبارک باد دینے والوں میں سب سے آگے آگے ہیں۔"

"جو میں نے کہا ہے اس کا پورا انتظام بھی کرنا ہے اور خیال بھی رکھنا ہے۔"

"آپ فکر ہی مت کرو جی۔"

"ایسا نہ ہو کہ خانم میرے پیچھے پیچھے رہیں اور میں تیرا سر پھاڑنے پر غور کروں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔" باز میر نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے کہا۔

ادھر صوفی بھی اپنے گروپ کے ساتھ تیار ہو گیا تھا۔ دلاور اور غلام قادر نے چست لباس پہنے ہوئے تھے اور صوفی کو دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دبا رہے تھے کیونکہ صوفی بھی اس وقت زبردست قسم کے شکاری لباس میں تھا اور اس کی اس ہیئت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پانوں کی جگالی بہ دستور چل رہی تھی۔ پانوں کا بٹوہ اس طرح پتلون کی بیلٹ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ جیسے ہولسٹر لٹکا ہوا ہو۔ کارتوسوں کی پیٹیاں اس نے دونوں شانوں پر سجائی ہوئی تھیں اور اس میں بارہ بور کے زبردست کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ اور اس کے چمڑے کا ایک کیس موجود تھا دونوں شانوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اور وہ واقعی میر شکاری نظر آ رہا تھا۔ آراشیہ نے تو اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ماں نے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

"ماما! قسم سے یہ جانور ہمارے چڑیا گھر میں کیسا اچھا لگے گا۔ ماما پلیز ایک چڑیا گھر بنا لیجیے گھر میں۔"

"بری بات ہے آراشیہ! تم چاہے کچھ بھی کہو میں کرنل رحیم شاہ کو معمولی شخصیت نہیں سمجھتی۔"

"ایک بات اور ہے مما!"

"ہاں کہو۔"

"آپ کو کرنل رحیم شاہ بھابی کہتے ہیں نا۔"

"ہاں۔"

"کہیں انہوں نے بھابی دیور کا رشتہ نہ نبھایا ہو۔"

"بے کار باتیں نہ کرو تیار ہو جاؤ۔" خانم کے لیے الگ جیپ تیار کی گئی تھی۔ لیکن جب صوفی نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی تو بابر جاہ بے چینی سے بولا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ صوفی صاحب! تین گاڑیاں جا رہی ہیں کافی نہیں ہوں گی۔" بابر جاہ کو اپنا منصوبہ فیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان تینوں گاڑیوں کے سلسلے میں اس نے اپنا پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ ایک گاڑی کو وہ راستے سے ہی غائب کرنا چاہتا تھا۔ جس میں شازیہ اس کے ساتھ ہوتی۔ یہ بات اس نے باز میر کو بتا دی تھی باز میر نے کہا۔

"خان جی! آپ بالکل فکر مت کرو۔ آپ عیش کرو جی! ہم ساری صورت حال کو سنبھال لیں گے۔ لیکن اب یہ چوتھی بے تکی جیپ جسے نہ جانے کون سے زمانے میں اور کس نے خریدا تھا۔ جو طرح طرح کے سامان سے لدی ہوئی تھی۔ پیٹرول کے چھوٹے چھوٹے ڈبے ایک مخصوص انداز میں اس میں سجے ہوئے تھے۔ اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا الم غلم۔

بہر حال بازمیر سے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ تھوڑا سا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزاریں گے اور راستہ بدل دیں گے۔ غرض یہ کہ اس سج دھج کے ساتھ یہ گاڑی چل پڑی۔ صوفی نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جناب اعلا! وہ جو کہتے ہیں نا کہ بیوی اور گاڑی اپنی ہونی چاہیے اور اپنے ساتھ ذہنی چاہیے تو درویشوں کی دعاؤں سے، بیوی کا تو کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن گاڑی ہماری اپنی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے ہم اس کے نخرے اٹھا لیا کرتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور عزت سادات رہ جاتی ہے۔"

"شرم کی بات ہے صوفی صاحب! آپ نے اس طرح محدود کر لیا ہے اپنے آپ کو کیا کہا جائے آپ کے بارے میں۔"

"لفویت سے پرہیز فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے ہمیں بھی غصہ آتا ہے۔" صوفی نے برا مان کر کہا۔ اور بابر جاہ کے قہقہے ابلنے لگے۔ گاڑیاں چل پڑیں۔

بابر جاہ شازیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اور بار بار اس کی جانب دیکھنے لگتا تھا۔"

شازیہ اس کے لیے ایک عجیب و غریب حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ جب کہ وہ اس طرح کا انسان نہیں تھا اس نے سوچا تھا کہ زندگی میں تھوڑا بہت ٹھہراؤ بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ لڑکی اس کی بیوی کی حیثیت سے پہاڑوں میں فروکش ہو جائے تو اچھا وقت گزرے گا۔ اس نے شازیہ سے کہا۔

"سونیکا! اپنے مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچا۔ باہر کی دنیاؤں میں زندگی گزارنے کے بعد جب تم نے اپنے وطن کا رخ کیا ہوگا تو تمہارے ذہن میں خیالات تو بہت سے ہوں گے۔" شازیہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں تھے۔ بابر جی! ایک عمر ایسی ہوتی ہے جس میں انسان خواب دیکھے بغیر نہیں جی سکتا۔"

"آپ بھی خواب دیکھتی رہی ہیں۔"

"کیوں۔ کیا وہ عمر مجھ پر نہیں آئی۔"

"آپ تو اس عمر سے گزر رہی ہیں۔"

"گزار تو نہیں چکی ہوں نا۔"

"کتنی بامحاورہ باتیں کر لیتی ہیں آپ حالانکہ آپ نے دیار غیر میں وقت گزارہ ہے۔"

"بس میں بھی پہاڑوں کے شہزادے کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔"

"پہاڑوں کے شہزادے کے۔" بابر جاہ کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

"ہاں۔"

"ملا وہ شہزادہ آپ کو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔" شازیہ نے کہا۔

"نہیں یہ بات تو آپ بتائیں گی سونیکا۔"

"نہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گی وہ دیکھیے وہ کیا چیز ہے۔" شازیہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور بابر جاہ چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر تعجب سے بولا۔

"کہاں؟ کیا ہے؟ ایک منٹ۔" یہ کہہ کر اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور دیر تک دیکھتا رہا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا، کیا تھا؟"

"لیجیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا کچھ ہوتا تو بتاتی۔" شازیہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی بابر جاہ شرمندہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"تو مذاق ہو رہا تھا جناب۔"

"جی۔"

ادھر خانم فردوسیہ جان بوجھ کر صوفی کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھی تھی۔ آراشیہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ صوفی کے بارے میں یہ جان کر کہ اس کا تعلق کرنل رحیم شاہ سے ہے ماں بیٹی کو شدید حیرت تھی۔ کبھی کبھی تو خود خانم فردوسیہ سوچنے لگتی تھی کہ کہیں کرنل رحیم شاہ نے اس کی بات کو محض مذاق سمجھ کر تو نہیں ٹال دیا۔ فردوسیہ کے شوہر نے کرنل رحیم شاہ کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا تھا اس سے خانم فردوسیہ متاثر ہوئی تھی۔ اور اتنی مشقت اٹھا کر کرنل رحیم شاہ تک پہنچی تھی۔ اس وقت بھی صوفی اس سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور دلاور جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ غلام قادر جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً آراشیہ نے کہا۔

"مما! یہ گاڑی تو بڑے کمال کی بنی ہوئی ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس ناہموار راستے پر بھی کوئی جرک نہیں ہے۔ ویسے انکل صوفی کیا اس کار بنانے والی کمپنی نے صرف یہی ایک گاڑی بنائی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے تو ہم نے کبھی ایسی گاڑی کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔"

"درویش بہتر جانتے ہیں۔ بس شکار کے لیے اس سے اچھی گاڑی دوسری نہیں ہو سکتی۔"

"ایک بات بتایئے انکل! آپ خود بھی تو درویش ہیں۔"

"توبہ توبہ۔ درویش رحم کریں۔ یہ تو بڑی بعد کی منزل ہوتی ہے نہ جانے انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں درویش کا درجہ ملتا ہے۔ ایک بات بتائیں گی آپ۔"

"جی۔"

"کبھی آپ نے اپنی حویلی میں قوالیاں کروائی ہیں۔"

"قوالیاں" آراشیہ ہنس پڑی۔

"کیوں؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔"

"ہنسنے کی بات یہ ہے کہ میں قوالیوں کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک بہت موٹا سا آدمی بیچ میں بیٹھا ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ سیاروں پر رہنے والی مخلوق سے محو گفتگو ہو اور اس کے ساتھ باقی لوگ اس خلائی مخلوق کو بھگانے میں کوشاں ہوں۔ ہاتھ ایک دوسرے پر مار مار کر منہ سے ہش ہش کر کے۔ ایک عجیب و غریب صورت حال ہوتی ہے، آپ اسی کی بات کر رہے ہیں نا۔"

"توبہ فرمایئے، توبہ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اچھا ایک بات بتایئے۔ میں درویشوں کی دعاؤں سے توبہ کیسے فرماؤں۔"

"مم..... میرا..... مطلب ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ..... کہ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''انکل! اچھا ایک بات اور بتایئے یہ آپ اتنے پان کیوں کھاتے رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔''

''آراشیہ!'' مما کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''مما! میں انکل سے معذرت کر لیتی ہوں۔ میں نے کسی مقصد کے تحت یہ بات نہیں کہی میرا مطلب ہے انکل! اتنے پان کھاتے ہیں اور انہوں نے اپنا حلیہ پتا نہیں ایسا کیوں بنا رکھا ہے۔ انکل! یہ بتایئے آپ جو کپڑے پہنتے ہیں نا۔ وہ کون سے سیارے کے ہیں۔''

''ان کا تعلق شرفا سے ہے۔''

''شرفا! کیا یہ کسی قبیلے کا نام ہے۔'' آراشیہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

''ہاں۔ یہی سمجھ لیجیے۔ شرفا کا ایک قبیلہ ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''قبیلہ بھی درویشوں ہی کے کرم سے ہوتا ہے۔''

''بی بی! آپ درویشوں کے بارے میں جانتی نہیں ہیں۔ اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ یہ تختہ زمین درویشوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے آپ جو کچھ اپنی دنیا میں دیکھتی ہیں اس کے پس منظر میں درویشیت اور روحانیت کی ایک دنیا آباد ہے۔ شہر کا نظام آئی جی ڈی آئی جی۔ ایس پی۔ ڈی ایس پی۔ اور اس کے بعد انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور پھر کانسٹیبل سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں ایک ایسا نیٹ ورک ہوتا ہے جس کے تحت شہر میں امن وامان اور برائیوں کی روک تھام کا عمل ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے روحانیت کی دنیا میں بھی یہی تمام عہدے ہوتے ہیں مقصد یہ کہ ان کے مساوی عہدے اور اس طرح یہ درویش، ولی، مجذوب، ابدال یہ اپنے اپنے کام سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اور شہری نظام کو ان آفات سے بچاتے ہیں جو برائیوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ جرائم کی کیا کیا اقسام ہیں۔ بعض جرائم قابل دست اندازی پولیس ہوتے ہیں۔ اخلاقی اور ایمانی جرائم ہوتے ہیں۔ اور بعض جرائم پس پردہ ہوتے ہیں برائیاں انسان کے وجود میں پرورش پاتی ہیں اگر ان ساری برائیوں کو فروغ حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجئے آپ کہ یہ چھوٹی سی کائنات جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔ معافی چاہتا ہوں۔ اب آپ خود دیکھ لیجئے خانم فردوسیہ آپ کے گھر سے جرم جنم لے رہا ہے۔'' خانم فردوسیہ نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور بولی۔

''چھوڑیئے صوفی صاحب! اس موضوع پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔''

''درویش ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھیں۔'' صوفی نے کہا۔

خاصا سفر طے کر لیا گیا تھا۔ اب تا حد نظر برف کے ویران پھیلے ہوئے تھے ابھی تک انہوں نے گاڑیاں نہیں روکی تھیں حالانکہ کئی بار برفانی لومڑیوں کے غول کے غول سامنے سے گزرے تھے، لیکن بابر جاہ نے ان پر گولی نہیں چلائی تھی۔ ویسے بھی طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ پہلے کسی جگہ کیمپ لگایا جاتا ہے اور اس کے بعد منظم طریقے سے شکار کھیلا جاتا ہے۔'' شازیہ نے یہ سوال بابر جاہ سے کر ہی ڈالا۔

''میرا خیال ہے جو لومڑیاں ہمارے سامنے سے گزر جاتی ہیں ان سے ہمارا کوئی روحانی تعلق نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' بابر جاہ ہنس پڑا۔

''آخر ہم شکار کیوں نہیں کر رہے؟''

''وجہ ہے اس کی۔'' بابر جاہ مسکرا کر بولا۔

''کیا وجہ ہے۔''

''اگر ہم شکار کا آغاز کر دیتے ہیں تو شکار یہیں سے شروع ہو جائے گا۔ جب کہ میں یہاں سے ہٹ کر صحیح معنوں سے شکار کے لطف سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر تک ہم لوگ ان کے ساتھ رہیں گے اور اس کے بعد شکار ہی کھیلنے کے انداز میں ان سے دور ہو جائیں گے۔ بعد میں پورا دن یہ شکار کھیلیں گے اور ہم.....'' بابر جاہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

عادل اور فیضان کو اس نے دوسری گاڑی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ رکھا تھا حالانکہ وہ باڈی گاڈز، کے طور پر ساتھ تھے لیکن اس سلسلے میں بھی بابر جاہ نے کہا تھا۔

''محترمہ! آپ پہاڑوں کی پناہ میں ہیں۔ آپ کو ان معمولی سے باڈی گارڈز کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے باڈی گارڈز تو ہم لوگ ہیں۔'' شازیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی تھی۔

''یہ سفر ایک جگہ ختم ہوا اور یہاں کیمپ لگا دیا گیا بہت ہی خوب صورت پیراشوٹ کے خیمے جگہ جگہ نصب کر دیے گئے اور جنگل میں منگل ہو گیا برف کے اس وسیع و عریض میدان میں یہ خیمے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ صوفی وغیرہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

فیضان کی نگاہیں شازیہ پر تھی جو یہاں آنے کے بعد سے اب تک بابر جاہ کے ساتھ نظر آتی رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ دوربین آنکھوں سے لگائے شازیہ اور بابر جاہ کو فوکس کیے ہوئے تھا کہ عادل اس کے پاس پہنچ گیا۔

''میں نے تمہارے اینگل کا جائزہ لے لیا ہے تم اس وقت ان دونوں کو دیکھ رہے ہو۔''

''عادل مجھے ایک بات بتاؤ۔ شازیہ! ہمارے درمیان ایک کارکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم بھی بے وقوف نہیں ہو۔ میں بھی بے وقوف نہیں ہوں۔ اس نے جو رویہ اور طریقہ کار اپنایا ہے تمہارے خیال میں کیا وہ ہمارے لیے قابل برداشت ہے۔''

''دیکھو میں تمہیں ایک بات بتاؤں اصولی طور پر اگر میرے دل کی بات پوچھتے ہو تو مجھے کرنل صاحب کا یہ طریقہ کار پسند ہی نہیں آیا یہ شخص جس کا نام صوفی ہے آخر ایسی کون سی خوبیوں کا مالک ہے اگر بعض معاملات میں اس کا ساتھ دے دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ کوئی مدبر ہو گیا۔ چلو۔ پچھلے معاملے میں کوئی تکا لگ گیا لیکن ہر بار ایسا کوئی تکا لگ سکتا ہے۔

''اس بات کو چھوڑو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کیا شازیہ اسی لیے یہاں آئی تھی کہ اپنے لیے تابناک مستقبل تلاش کرے مجھے تو یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے بابر جاہ کو اپنے جال میں پھانس کر اپنے مستقبل کا بندوبست کر لیا ہے؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ صوفی ان کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عادل نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بہر حال اس کا ماضی اس کی شخصیت کا عکاس ہے وہ کہیں سے....."

"درویش رحم کریں۔ آپ لوگ بڑی غلط گفتگو فرما رہے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے" صوفی کی آواز سنائی دی اور دونوں چونک کر پلٹے۔ صوفی نے کہا۔

"دیکھیے آپ میں سے ہر شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کسی بھی کیس کی تفتیش کرتے ہوئے آپ لوگ اپنے ذہن سے بھی کام لے سکتے ہیں اور اگر کوئی مناسب ترکیب آپ کے ذہن میں آجائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا کریں کہ مشورہ کر لیں آپس میں کہ اس پر عمل کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ جہاں تک گرین فورس کے ممبروں کے کردار کا تعلق ہے تو سب سے پہلے آپ کو اپنے آپ پر اعتبار کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے تو سمجھیے سب کچھ بے کار ہے۔ شازیہ کے ماضی کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"وہ.....وہ نہیں چھوٹے بابا! اصل میں۔"

"بات کھل کر کرنی چاہیے ورنہ آپ کو غیر مخلص قرار دیا جا سکتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی کے لہجے میں ایک انوکھی کرختگی تھی جسے ان دونوں نے محسوس کر لیا۔

"چھوٹے بابا! آپ یقین کریں گرین فورس کا ایک ایک کارکن غلام قادر اور دلاور سمیت ہمیں بالکل اپنا لگتا ہے اور یہ ایک خاندان بن گیا ہے صرف ٹیم نہیں۔ شازیہ ہماری عزت ہماری آبرو ہے آپ دیکھیے، لیجیے یہ دوربین۔"

"درویشوں کا کرم ہے میری بینائی بہت تیز ہے۔ شازیہ نے ہم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ایک ایسے نقطے پر انگلی رکھ دی ہے درویشوں کے کرم سے جو ہمیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دے گا۔ بابر جاہ ہی اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ اور شازیہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر جال ڈال دیا ہے۔ شازیہ ہمیں بہت جلدی رزلٹ دے گی بس اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر رہی مجھے بھی اعتماد ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور آپ کو بھی اعتماد ہو جانا چاہیے۔"

"سوری چھوٹے بابا! فیضان نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ شکار کی تیاریاں ہوئیں صوفی نے اپنی جیپ کو بدستور اپنے استعمال میں رکھا تھا۔ وہ اس سے اترا ہی نہیں تھا جب کہ کئی بار بابر جاہ نے بھی اس سے کہا کہ وہ میر شکاری کے طور پر ان کے ساتھ آگے آئے خانم اور آراشیہ بھی صوفی کے ساتھ تھیں۔ کیمپ میں کچھ ملازموں کو چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ لوگ شکار کھیلنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ اب باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ بابر جاہ نے کہا۔

"بس تھوڑی دیر ان کے ساتھ گزارتے ہیں ذرا تمہارے میر شکاری کو بتاؤں کہ سفید لومڑیاں اتنی شریف زادی نہیں ہوتیں کہ آسانی سے شکار کر لی جائیں ان کے شکار کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔"

"مگر آپ کیا کریں گے بابر جاہ صاحب۔"

"وہ دیکھیے لومڑیوں کا ایک غول سامنے آرہا ہے۔" بابر جاہ نے کہا۔

صوفی وغیرہ نے بھی لومڑیاں دیکھ لی تھیں۔ خانم نے کہا۔

"صوفی صاحب! ہمارا مقصد بے شک شکار نہیں ہے آپ نے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ لگایا۔"

"جن علاقوں سے میں گزرا ہوں درویشوں کے کرم سے میرا ان کے بارے میں یہ اندازہ ہے کہ وہاں سرحد پار اسمگلنگ نہیں ہو سکتی چونکہ راستے دشوار گزار ہیں۔ جو کارروائیاں ہو رہی ہیں اس کے لیے یقینی طور پر کوئی ایسی جگہ موجود ہے جہاں سے سرحد عبور کی جا سکتی ہے۔ اور محافظوں کے علم میں نہیں آتی۔"

"ہمیں جگہ تلاش کرنی ہے۔"

"گولی چلایئے لومڑیاں قریب آچکی ہیں۔" صوفی نے پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اسی وقت ایک فائر ہوا اور لومڑیوں کے غول نے راستہ بدل لیا۔ صوفی کے منہ سے آواز نکلی۔

"خدا کا شکر ہے بچ گئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"جی۔" آراشیہ حیرت سے بولی۔

"بی بی دیکھو تو سہی برف کی یہ سفید شہزادیاں، معصوم معصوم سی، دم اٹھائے، اپنی زندگی کے سفر میں مصروف ہیں ہم انہیں مار کر کیا کریں گے؟"

"ارے تو کیا آپ شکار نہیں کھیلیں گے۔"

"ہم لومڑیوں کا شکار نہیں کھیلتے۔ ہاں اگر برفانی ریچھ یا پھر خوف ناک درندے سامنے آئے تو ان سے اپنی جان بچانے کے لیے گولی چلائی جا سکتی ہے۔ ان بے چاریوں کو مارنے سے کیا فائدہ۔" آراشیہ ایک گہری سانس لے کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ خانم فردوسیہ نے گردن ہلا کر کہا۔

"خدا کی قسم یہی نظریات میرے ہیں صوفی صاحب! اللہ آپ کو سلامتے رکھے۔"

دوسری طرف بابر جاہ ہنس رہا تھا۔

"یہ آپ کے میر شکاری صاحب تو ایک بھی لومڑی نہیں مار سکے۔"

"آپ نے فائر کر کے انہیں بھگا جو دیا۔"

"یہی تو میرا منصوبہ ہے ایک لومڑی مار کر دکھا دے یہ شخص تو میں جانو۔ آپ بھی رابعہ بس یونہی ہیں بلاوجہ ایسے لوگوں پر بھروسا کر لیتی ہیں۔"

"آپ نے مجھے رابعہ کہہ کر پکارا۔"

"ہاں۔ سونیکا اجنبی نام لگتا ہے۔ اور اب آپ میرے لیے اجنبی نہیں رہی ہیں حالانکہ بہت خوب صورت نام ہے آپ کا لیکن میں آپ کو صرف رابعہ کہوں گا۔ آپ نے ایک بات کہی تھی نا رابعہ۔"

"کیا۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ کو بھی پہاڑوں کے شہنشاہ کا انتظار ہے اور یہ آپ کی عمر کا تقاضا بھی ہے۔"

"جی کہا تھا۔"

"تو آیئے میں آپ کو پہاڑوں میں اپنی مملکت دکھاؤں۔ آیئے۔"

"جی!" تو کیا ان پہاڑوں میں بھی آپ کی کوئی مملکت ہے۔" شازیہ نے بابر جاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سنگینہ سے ہٹ کر؟"

"علاقہ تو یہ پورا سنگینہ ہی کا ہے لیکن میری مملکت کی برانچ...... باز میر! میں ذرا اسٹیشن فور جا رہا ہوں تم لوگ ادھر کے حالات سنبھالو۔"

"ٹھیک ہے خان جی! آپ بے فکر رہیں۔" باز میر نے کہا اور اس کے بعد اچانک بابر جاہ نے اپنی جیپ کا رخ تبدیل کر دیا۔ اس وقت وہ ایک ایسی ڈھلان میں تھا جہاں سے صوفی وغیرہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ سفر چونکہ ساتھ ساتھ ہی ہو رہا تھا اس لیے بابر جاہ نے اپنی جیپ خاص طور سے ڈھلان میں رکھی تھی۔ تاکہ داہنے ہاتھ پر سفر کرنے والوں کو اس کی جیپ نظر نہ آئے وہ سیدھا ہی سیدھا جیپ کو ایک طرف لیتا چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دوسری گاڑیاں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

شازیہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا دو صورتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ بابر جاہ کے ساتھ سفر کرنے سے انکار کر دے۔ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود تھا۔ لیکن ظاہر ہے وہ اسے فی الفور استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر بابر جاہ کو بے وقوف بنا کر آگے کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتیں تو یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے صوفی سے اجازت لیے بغیر بابر جاہ کو اپنا ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ اصل میں تھوڑی بہت معلومات انہیں ان معاملات کے بارے میں صوفی سے ہی ملی تھیں کہ اصل کیس کیا ہے اور سنگینہ میں انہیں کیا کرنا ہے۔ ان حالات میں بابر جاہ نے جیسے ہی اس کی جانب توجہ سے دیکھا تو اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ شخص کام کا ہو سکتا ہے اور اگر جڑ پر ہی ہاتھ ڈال دیا جائے تو باقی شاخیں اور پتیاں خود بہ خود قابو میں آ سکتی ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ ہر طرح کے کرداروں سے نمٹ چکی تھی۔ اس سے پہلے ملازمتوں کی تلاش میں دفتروں کے چکر کاٹے تھے۔ تب بھی اسے اس طرح کے سینکڑوں لوگ ملے تھے۔ جو اسے ملازمت نہیں دینا چاہتے تھے بلکہ اس کی کفالت کرنا چاہتے تھے۔ پھر جب بھکاریوں کی دنیا میں آئی تو لوگوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اس طرح اسے یہ تجربہ اچھی طرح ہو چکا تھا اور بابر جاہ کے مزاج کو وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

اس نے اللہ پر بھروسا کیا اور فیصلہ کر لیا کہ اگر بابر جاہ کسی غلط ارادے سے اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے تو اس تربیت کو کام میں لائے گی جو پہلے بھی اس نے حاصل کی تھی۔ اور اس کے بعد صوفی نے بہت سے گر اسے بتا دیے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور بابر جاہ سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن ان راستوں کو وہ پوری طرح اپنے ذہن میں رکھ رہی تھی جن سے بابر جاہ گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ بابر جاہ ایک ایسی برفانی دیوار کے پاس پہنچ گیا جس کے دوسری طرف بھی پہاڑی ٹیلے موجود تھے۔ برفانی [illegible] اور پہاڑی ٹیلوں میں موجود تھے اور بابر جاہ نے جیپ اس برفانی دیوار کی آڑ میں روک دی۔

"کیسی عجیب جگہ ہے۔" شازیہ نے حیران لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ میری اصل مملکت۔" بابر جاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

کافی وقت گزر چکا تھا اور اب شام زمین پر اترنے لگی تھی ایسے برفانی علاقوں میں جب بادل جھکتے ہیں تو آن کی آن میں منظر بدل جاتا ہے ان لوگوں نے سفر کا آغاز دن کی روشنی میں کیا تھا اس کے بعد کیمپ

وغیرہ لگانے اور کھانے پینے میں خاصا وقت گزر گیا تھا پھر وہ برف پر شکار کے لیے نکلے تھے۔ برف کی سفیدی جہاں روشنی کو مزید چمکا دیتی ہے۔ وہیں اگر بادل جھک آئیں تو شام کے سائے میں اس پر اسی برق رفتاری سے جھکتے ہیں۔

بابر جاہ نے شازیہ کو اشارہ کیا اور پھر وہ غار جو برف میں چھپا ہوا تھا۔ شازیہ کی نگاہوں کے سامنے آیا بابر جاہ اسے لے کر غار میں داخل ہوا تھا۔

"یہ...... یہ برفانی غار۔" شازیہ بولی۔

"ہاں ڈیئر سونیکا! آؤ میں تمہیں ایک عجیب و غریب دنیا سے روشناس کراؤں۔" بابر جاہ نے کہا اور اس کے بعد وہ غار میں داخل ہو گیا۔ غار میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بہت ہی نفیس قسم کا جنریٹر تھا۔ جو بے آواز تھا لیکن اس نے غار کو دن کی طرح روشن کر دیا اور اس کے بعد سونیا نے اس عجیب و غریب غار کا منظر دیکھا۔ یہاں لکڑی کی لمبی لمبی پیٹیوں کے انبار تھے۔ یہ پیٹیاں قدرتی دیواروں کے ساتھ ساتھ چھت تک چنی ہوئی تھیں۔ بابر جاہ نے مسکراتی نگاہوں سے سونیکا کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اس نے ایک کھلی ہوئی پیٹی کا تختہ اٹھا دیا۔ سونیکا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ...... یہ تو اسلحہ ہے۔"

"ہاں روسی کلاشنکوفیں جنہوں نے افغانستان میں تباہی مچا دی تھی۔ اور پھر روسی انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ لاکھوں کی تعداد میں دوسرے لوگوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ اسمگلروں نے انہیں حاصل کیا اور ضرورت مندوں کو دینا شروع کر دیا۔ ہمارے پاس ان کا اتنا ذخیرہ ہے کہ باقاعدہ ایک اسلحہ خانہ بنایا جا سکتا ہے۔ آؤ......" وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ پھر غار کے اندر دوسرے غار میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور دیواروں کے ساتھ ساتھ کارٹن چنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کارٹنوں میں الیکٹرونکس کی اشیاء بھی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کس کس طرح کے الیکٹرونک کے آلات تھے کروڑوں روپے کی مالیت کے یہ آلات یہاں ان غاروں میں چھپے ہوئے تھے۔ بابر جاہ نے کہا۔

"اور یہ بھی میری مملکت ہیں ہمارے ملک کی مارکیٹیں ان اشیاء سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے دس پرسنٹ قانونی طور پر منگوائی جاتی ہیں اور نوے پرسنٹ ہم سپلائی کرتے ہیں ہمارے پوائنٹس بنے ہوئے ہیں اور ہمارے گاہک مستقل ہیں آؤ۔" شازیہ کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تو یہ لوگ یہاں پر آئے تھے اور یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ لیکن کیا ان غاروں سے زندہ واپسی ممکن ہو سکے گی۔ کیا وہ چھوٹے بابا کو اپنے اس کارنامے کے بارے میں بتا سکے گی۔ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود تھا لیکن وہ ایک خاص پوائنٹ پر لگا ہوا تھا ایک بٹن دبا دینے سے اس ٹرانسمیٹر پر کال کرنے والے کو یہ پتا چل جاتا تھا کہ اس وقت مخدوش حالات ہیں۔ اور ٹرانسمیٹر کے مالک کو کال کرنا مناسب نہیں تھا۔ یہاں ان غاروں میں ایسا چانس ملنا تو بڑا مشکل تھا۔

بہرحال وہ ان غاروں کا جائزہ لیتی رہی درحقیقت ان میں اتنا کچھ موجود تھا کہ بیان نہیں کیا جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔اچانک ہی بھیڑیوں پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔

"یہ بابر جاہ کہاں مر گیا کم بخت!" لیکن صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا۔آراشیہ سہمی ہوئی نگاہوں سے بھیڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔گولیوں کی پہلی باڑ نے کئی بھیڑیے برف پر گرا دیے۔جو بھیڑیے زخمی ہو کر گرے تھے ان پر تمام بھیڑیے ٹوٹ پڑے اور خون کی بو پر دیوانے ہو جانے والوں نے آن کی آن میں انہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ادھر باز میر اور اس کے ساتھیوں نے بھیڑیوں پر مسلسل فائرنگ جاری رکھی تھی۔ایک سمت یہ خونریزی ہو رہی تھی۔دوسری جانب وہ لوگ پیچھے سے آنے والوں سے بے خبر تھے جو آن کی آن میں کیمپ تک پہنچ گئے اور اس کے بعد دوسرے بھیانک منظر کا آغاز ہو گیا۔اور باز میر کیمپ کے ملازموں پر یہ بھیڑیے ٹوٹ پڑے۔ان کے ہاتھوں سے رائفلیں گر پڑیں۔اور بھیڑیوں نے انہیں نرخروں سے پکڑ لیا۔ایک ایک شخص کو ایک ایک درجن بھیڑیے نوچ بھنبھوڑ رہے تھے کوئی کسی کا بازو اکھاڑ کر لے جا رہا تھا۔تو کسی نے کسی کی گردن کو چبانا شروع کر دیا تھا۔کوئی آنتیں منہ میں دبائے انہیں کھینچنے میں مصروف تھا خانم فردوسیہ نے اگر آراشیہ کا منہ پوری قوت سے نہ بھینچ رکھا ہوتا تو آراشیہ کے حلق سے نکلنے والی دل دوز چیخیں بھیڑیوں کو اس طرف متوجہ کر دیتیں۔ابھی تک وہ اس جانب بالکل متوجہ نہیں ہوئے تھے جب کہ برفانی ٹیلے کے پاس سے گروہ کے گروہ گزرے تھے۔اور انہیں بالکل قریب سے دیکھا گیا تھا اگر وہ پلٹ کر اس ٹیلے پر لگی ہوئی جیپ کی جانب متوجہ ہو جاتے تو یقینی طور پر ان کا رخ اس سمت بھی ہو سکتا تھا کیونکہ کیمپ میں تھے ہی کتنے افراد۔صوفی نے سرد آواز سے کہا۔

"صرف میں گولی چلاؤں گا اور کوئی ایک بھی گولی نہ چلائے۔اپنے سانسوں تک کو بند کر لو۔درویشوں کے کرم سے۔" یہ کہہ کر صوفی نے کچھ کارروائی شروع کر دی۔عجیب و غریب جیپ سے اس نے پیٹرول کے چھوٹے چھوٹے تین چار ڈبے کھولے اور ان کے کارک ہٹانے لگا پھر اس نے غلام قادر سے کہا۔

"کیا تم لوگ یہ ڈبے پوری قوت سے ان خیموں تک پھینک سکتے ہو جو سامنے لگے ہوئے ہیں؟"

"اڑے ماں قسم آپ بولو چھوٹے بابا صاحب تو میں ان کو....."

"بس بس بس۔میں اب فائرنگ کرتا ہوں۔جیسے ہی یہ خیمے گریں تم ان پر نشانہ باندھ کر یہ پیٹرول کے ڈبے پھینکو گے۔" صوفی نے حکم دیا۔

خانم فردوسیہ خاموش نگاہوں سے یہ بھیانک منظر دیکھ رہی تھی۔صوفی نے رائفل سنبھالی پھر ایک تنے ہوئے خیمے کے ان کھونٹوں پر جس پر خیمے کھڑے ہوئے تھے۔صوفی نے فائرنگ کی خیموں کی رسیاں کھل گئیں اور خیمے زمین بوس ہو گئے۔غلام قادر کے ہاتھ سے نکلا ہوا پیٹرول کا ڈبا گرے ہوئے خیمے پر پڑا۔صوفی نے اس طرح دوسرا اور تیسرا خیمہ گرایا۔اور غلام قادر اور دلاور نے اپنی شان دار مہارت سے کام لے کر پیٹرول کے وہ ڈبے ان خیموں پر پھینک دیے۔پیٹرول کی بو فضا میں پھیل گئی تھی بھیڑیے بہ دستور اپنے کام میں مصروف تھے۔دفعتاً ہی صوفی نے فائر کیا اور گولی ایک پیٹرول سے بھیگے ہوئے خیمے پر پڑی ایک دم سے خیمے نے آگ پکڑ لی تھی۔بھیڑیے ایک لمحے کے لیے رکے لیکن پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔انہوں نے وہاں موجود ہر ذی روح کو چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور اب لاشوں کو گھسیٹتے اور بھنبھوڑتے پھر رہے تھے۔

"اس نے اچانک ہی ان جلتے ہوئے خیموں پر کارتوسوں کی پیٹیاں گھما کر پھینکیں دوسرے ہی لمحے یہ کارتوس خوف ناک آوازوں کے ساتھ پھٹنے لگے۔بھیڑیوں میں بھگدڑ مچ گئی آگ سے تو خیر وہ ڈر رہے تھے۔لیکن اس کے بعد جو کارتوس دھماکوں سے پھٹے اور ان کے ذریعے جو تباہی پھیلی انہوں نے بھیڑیوں کو نروس کر دیا۔ایک لمحے کے لیے وہ اپنی وحشت ناکی سے رکے اور اس کے بعد ان کی خوف ناک آوازیں گونجنے لگیں۔ان کی تنظیم دیکھنے کے قابل تھی۔انہوں نے ایک سمت کا رخ کیا اور برق رفتاری سے دوڑ پڑے۔اس کے بعد کسی بھی بھیڑیے نے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے برفانی بھیڑیوں کا یہ غول اس طرح غائب ہوا کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا لیکن کیمپ کے آس پاس موجود انسانی جسموں میں ذرہ برابر کوئی جنبش نہیں تھی وہ سب موت کا شکار ہو چکے تھے اور ان کی لاشیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں سفید برف پر خون کے نشانات کے سوا کچھ نہیں تھا۔

خانم فردوسیہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی صوفی نے دلاور سے کہا۔

"دلاور..... جیپ آرام سے نیچے اتار دو۔بلکہ ایسا کرو جیپ اسی جگہ رہنے دو آؤ فیضان..... عادل..... آ جاؤ درویشوں کی دعاؤں سے۔دیکھیں ان میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے اور کسی کو ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔وہ سب احتیاط کے ساتھ جیپ سے اترے صرف آراشیہ اور خانم فردوسیہ جیپ میں بیٹھی ہوئی تھیں فردوسیہ نے آہستہ سے کہا۔

"آراشیہ! کیا خیال ہے تمہارا۔کرنل رحیم شاہ نے غلط تو نہیں کہا تھا۔دیکھو خود کو سنبھالو تم چٹان زادی ہو چٹانوں جیسا ہی کردار ادا کرو اپنے آپ کو عام لوگوں کی طرح خوف زدہ نہ کرو۔"

"میں ٹھیک ہوں مما!" آراشیہ کی ہلکی سی آواز ابھری۔

♥.....♥.....♥

شازیہ کے سارے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی بابر جاہ نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور مسکرا کر بولا۔

"پہاڑوں کی شہزادی کی صحت کا جام..... لیجیے پرنسز مونیکا۔"

"مم میں شراب نہیں پیتی۔" شازیہ بولی۔

"کیوں....." بابر جاہ حیرت سے بولا۔

"بس ماحول نہیں ملا۔"

"باہر کے ملکوں میں رہ کر بھی۔"

"ہاں۔ہم مذہبی رہے۔"

"مگر یہ بابر کی مملکت ہے۔بابر ملکہ کو چاہتا ہے۔لیکن یہ چاہت تعمیل حکم بھی چاہتی ہے۔آپ شراب پئیں۔"

"سوری بابر صاحب۔"

"کیا بکواس ہے۔اس حسین ماحول میں کسی بھی بات کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور پھر سونیکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان میں تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ جس طرح ان غاروں کی دنیا میری ہے اسی طرح تم بھی میری ہو تمہارے وجود کا ہر ذرہ میرا ہے۔ چلو گلاس اٹھاؤ.....'' بابر نے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ شازیہ نے خود کو سنبھالا پھر بولی۔

''آپ بہک رہے ہیں۔ بابر جاہ۔ آیئے باہر چلیں۔''

''گلاس اٹھاؤ اور یہ لباس اتار دو۔ میں اپنی نئی مملکت کے ہر گوشے سے روشناس ہونا چاہتا ہوں۔''

''بابر صاحب۔ ایسا نہ کریں۔''

''تم میرے غصے کو جگا رہی ہو۔ گلاس اٹھاؤ۔'' بابر جاہ غرایا۔

''آپ جلدی کر رہے ہیں بابر جاہ۔ مجھے تو ابھی آپ سے بہت سی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ آپ کا کھیل ختم کر کے مجھے افسوس ہوگا کیونکہ ابھی مجھے آپ کی اس مملکت کے بارے میں کافی تفصیل معلوم کرنی تھیں۔''

''سب کچھ بعد میں.....'' گلاس اٹھاؤ۔''

''اٹھا لوں گلاس۔'' شازیہ کی آواز بدل گئی۔

''اٹھاؤ..... بابر جاہ چیخا اور شازیہ نے گلاس اٹھا لیا۔ بابر جاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا گلاس دوبارہ بھر لیا۔ ''میں نے دوسری فرمائش بھی کی تھی۔''

''لباس اتارنے کی۔''

''ہاں۔''

''یہ کام آپ خود کریں بابر صاحب۔ شازیہ نے خود سپردگی کے انداز میں کہا اور بابر جاہ نے جھومتے ہوئے اپنا گلاس رکھ دیا پھر آگے بڑھا اور شازیہ کے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شازیہ نے اچانک گلاس میں موجود شراب اس کے چہرے پر اچھال دی۔ اور دوسرے لمحے اس نے گلاس ایک سخت پتھر پر مار کر اس کے کنارے توڑ دیے۔ گلاس اب ایک تیز دھار ہتھیار بن گیا تھا۔

لیکن بابر جاہ کے چہرے پر غصے کے بجائے ایک زہریلی مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''اب تم میرے لیے ایک عام لڑکی بن گئیں۔ وہ نہیں رہیں جو میں نے سوچا تھا۔ بے بی، اس غار میں یہ کھیل اکثر ہوتا رہتا ہے۔ میرا نام بابر جاہ ہے دنیا کے خطرناک ترین لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے تم تو ایک معصوم سی بچی ہو۔''

''کھیل واقعی بدل گیا ہے بابر جاہ۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تم سے تمہاری اس اسمگلنگ کے طریقہ کار کے بارے میں معلوم کروں۔ تم سے پوچھوں کہ تمہارے ساتھ مقامی افراد میں اور کون کون لوگ شامل ہیں۔ اور پھر ایک مکمل رپورٹ اپنے افسران کو پیش کروں۔ لیکن اب مجھے تمہاری لاش ان کے حوالے کرنا ہوگی۔''

''افسران.....'' بابر جاہ چونک کر بولا۔

''ہاں بابر جاہ۔ ہمارا گروپ تمہارے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے سنگینہ آیا ہے۔ اور بہت ہی مختصر وقت میں ہمیں تمہارے بارے میں تفصیل معلوم ہوگئی۔ نہ صرف تفصیل بلکہ یہ ٹھکانا بھی۔'' شازیہ کے انداز میں بے خوفی تھی۔ لیکن بابر جاہ کے چہرے پر آگ سلگنے لگی تھی۔

♥.....♥.....♥

کچھ دیر وہ خونی نگاہوں سے شازیہ کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو یا کوئی ڈراما کر رہی ہو۔''

''نہیں بابر جاہ! جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''اور تمہیں یہاں کس نے بلایا۔ کیا اس کتیا نے میرا مطلب ہے نتاشا فردوسیہ نے۔

''اگر تم اسے کتیا کہتے ہو تو تمہاری مرضی ہے لیکن ہمارا کام اتنی جلدی ہو جائے گا یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ ویسے بابر جاہ یقین کرنا نہ جانے کیوں مجھے لگا تھا کہ میرے لیے کام کے آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔''

''حرام زادی! تجھے ان علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں اور میں جو کچھ سن چکا ہوں اور جو میرا اندازہ ہے وہ یہ ہے کہ اب تک بھیڑیوں کے غول نے ان کا تیا پانچہ کر دیا ہوگا اور وہ زندگی سے محروم ہو گئے ہوں گے اگر تو اس بات کی توقع رکھتی ہے کہ ابھی تیرے مددگار یہاں پہنچ جائیں گے، تو نکال دے اس خیال کو ذہن سے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بالکل بے فکر رہ۔'' شازیہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''نہیں بابر جاہ! ہم جتنے افراد ہیں نا ہمیں تربیت دی گئی ہے کہ جو کچھ بھی کریں خدا پر بھروسا کر کے کریں اس کے بعد اپنے آپ پر۔ مجھے یہاں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس خود اپنے ذرائع ہیں۔''

''دیکھتا ہوں میں تیرے ذرائع کو کیا کر لیتی ہے ان ذرائع سے بے وقوف عورت بہت بدنصیب ہے تو میں تجھے سنگینہ کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ تو نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بہت مختصر وقت میں خانم فردوسیہ اور اس کی بیٹی آراشیہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائیں گی۔ انہیں صرف اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کہ کچھ ضروریات ان سے اٹکی ہیں ورنہ اب تک وہ زندگی کی بازی ہار چکی ہوتیں۔ میں نے اپنے بھائی کو نہیں چھوڑا تو وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مجھے شبہ تھا کہ وہ بہت کچھ سمجھ چکی ہے اور میرے خلاف کارروائی میں مصروف ہو گئی ہے لیکن پروا نہیں۔ یہی تو بابر جاہ کی خوبی ہے کہ ہر طرح کے بگڑے ہوئے حالات کو ٹھیک کر لیتا ہے۔ کیا سمجھی میں نے تو یہ سوچا تھا کہ تجھ جیسی خوب صورت اور ذہین عورت کو اپنی زندگی میں شامل کر لوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ ورنہ عورت میرے لیے ایک بے نام اور بے حقیقت چیز ہے۔ مجھ جیسے آدمی کو عورت کا حصول کوئی مشکل مرحلہ نہیں محسوس ہوتا۔ لیکن کچھ لوگ تیری طرح بدقسمت ہوتے ہیں اور اب، اب تو اپنی زندگی کے سب سے بدترین وقت سے روشناس ہونے کے لیے تیار ہو جا۔''

''میں تیار ہوں بابر جاہ! بولو کیا کروں۔ تم یقینی طور پر پہلے میرا لباس نوچو گے کیوں۔'' شازیہ کی وہ فطرت ابھر آئی جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے بابر جاہ کے چہرے پر حیرت کے نقوش نظر آئے۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''اور یہ ایک اچھی عادت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا لیکن بے وقوف وہ بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی شازیہ نے اس کے قریب آنے پر اپنا پاؤں گھمایا وہ بیٹھ گیا اور اس کے بعد اس نے شازیہ کا ایک پاؤں اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن اب یہ شازیہ کا فن تھا کہ اپنا ایک پاؤں مضبوط گرفت میں آنے کے بعد اس نے اس کا سہارا لیا اور پلٹ کر دوسرا پاؤں پوری قوت سے بابر جاہ کے منہ پر دے مارا۔ یہ بابر جاہ کے لیے نئی جہت تھی اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منہ پر بہت زوردار لات پڑی تھی اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اسے بھی برا نہیں سمجھتا کیونکہ بہر حال جسے پسند کیا جاتا ہے اس کے اندر کچھ خوبیوں کی توقع بھی کی جاتی ہے۔ البتہ اب یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گا میں تم سے کہ تمہارا تعلق کیا محکمہ خفیہ سے ہے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔"

"مگر تمہیں کیا اطلاعات دی گئی ہیں میرے بارے میں اور کیا اب بھی تم اس بات کا اعتراف نہیں کرو گی کہ یہ کام خانم فردوسیہ نے کیا ہے۔"

"اگر میں یہ اعتراف کرلوں تو تم کیا کرو گے ڈیئر بابر جاہ۔"

"اصل میں بس وہ جو بات ہوتی ہے نا۔ انسان اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا ہے کبھی کبھی میرے اندر شرافت ابھر آتی ہے۔ حالانکہ میں شرافت کو حماقت کہتا ہوں تو مطلب یہ کہ شرافت ابھر آئی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ بہتر ہے کہ کسی کو میری ذات سے بے مقصد نقصان نہ پہنچے لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہے تو پھر ذرا اندر سے اطمینان ہو جاتا ہے۔" بابر جاہ نے کہا۔ اپنی دانست میں وہ شازیہ کو باتوں میں الجھا کر بے وقوف بنا رہا تھا اور ایسی سچویشن طے کر چکا تھا جس سے وہ شازیہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ حقیقتاً اسے خود بھی اپنی اس حماقت کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ اس بار شازیہ کی لات اس کے سینے پر پڑی اور اتنی زور سے پڑی کہ اس کی پسلیاں ہل گئیں سینے میں شدید تکلیف ہوئی اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس کے اندر بھی دیوانگی بے دار ہونے لگی لیکن دیوانگی ایسے موقعوں پر سب سے مہلک چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جذباتی ہو کر آگے بڑھا تھا اس سے شازیہ کو اپنے کام میں آسانی ہوگئی۔ پے در پے تین لاتیں اس نے بابر جاہ کے سر سینے اور آخری لات کمر پر ماری اور وہ اوندھے منہ فرش پر جا گرا شازیہ فوراً ہی آگے بڑھی اور اوندھے پڑے ہوئے بابر جاہ کی کمر پر پاؤں رکھ کر اس نے بابر جاہ کی ایک ٹانگ پکڑ کر اوپر اٹھالی اور ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے موڑ دیا اس طرح ریڑھ کی ہڈی کے منکے سرک جاتے ہیں۔ بابر جاہ کے منہ سے نکلنے والی آوازیں دور دور تک سنی جا رہی ہوں گی۔ وہ شدید اذیت کا شکار ہوگیا اور کمر ٹوٹے سانپ کی طرح بل کھا کر لوٹیں لگانے لگا۔

شازیہ نے دو تین لاتیں اس پر رسید کیں اور بابر جاہ کے ہوش وحواس درست ہوگئے۔ لیکن پھر اس نے فوراً ہی ریوالور نکال لیا۔ بڑی مشکل سے سیدھا ہو کر شازیہ پر لگاتار کئی فائر جھونک مارے لیکن شازیہ زمین پر لیٹ گئی اور اس طرح اس سے بچنے میں کامیاب ہوگئی۔ بابر جاہ دیوانہ وار اس پر فائرنگ کر رہا تھا لیکن میگزین خالی ہوگیا اور شازیہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"بابر جاہ! تم اپنی زندگی کے بدترین نقصان سے دوچار ہو رہے ہو مجھے افسوس ہے۔" یہ کہہ کر شازیہ اس کی جانب بڑھی اور ایک بار پھر اس نے بابر جاہ کے چہرے پر ہاتھ ڈال کر اس کی گردن اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لی پھر ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اسے ایک سمت موڑ دیا۔ بابر جاہ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ تڑپنے لگا اور چند ہی لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ شازیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"شاید میں ایسا نہ کرتی بابر جاہ! لیکن تم نے میری نسوانیت کی توہین کی تھی اور اس کی سزا میں ابھی ہی نہیں ہمیشہ ایسی حرکت کرنے والے کو اسی انداز میں دوں گی۔" اس کے بعد اس نے ٹرانسمیٹر نکال لیا تھا۔

♥.....♥.....♥

خانم فردوسیہ اور آراشیہ صوفی کی طرف سے ہونے والی کارروائیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں ساکت تھیں ان کے سامنے بابر جاہ کے آدمیوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ لیکن خانم فردوسیہ، آراشیہ اور صوفی کے ساتھ موجود کسی شخص کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ خانم فردوسیہ نے پھر آراشیہ سے کہا۔

"کرنل رحیم شاہ بہت ہی پراسرار شخصیت ہے۔"

"مگر خانم اس وقت تو کرنل رحیم شاہ یہاں موجود نہیں تھے یہ کارنامہ تو اس شخص نے سرانجام دیا ہے۔ جسے شخص کہتے ہوئے بھی ہنسی آتی ہے۔"

"نہیں آراشیہ! انسان کی جسمانیت پر اس کی شخصیت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ تم دیکھو جو کچھ کیا ہے اس نے تمہارے سامنے ہی کیا ہے۔ قدرت نے ہر شخص کو کسی نہ کسی صفت سے نوازا ہے۔ تم دیکھو کیا انوکھی شخصیت پائی ہے اس نے۔" اچانک ہی آراشیہ نے صوفی کو ٹرانسمیٹر نکال کر کسی سے بات کرتے دیکھا۔ فردوسیہ خاموشی سے قرب وجوار میں پھیلے ہوئے ہول ناک مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ صوفی کسی سے بات کرتا رہا۔ پھر اس نے ٹرانسمیٹر پر کسی اور سے گفتگو کی اور اس کے بعد دانت نکالے ہوئے خانم فردوسیہ کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ کا یہ بابر جاہ تو بڑا ہی کچا انسان نکلا درویشوں کے کرم سے۔"

"جب درویشوں کا کرم ہو صوفی صاحب! تو پھر کچا پکا کیا معنی رکھتا ہے۔" خانم فردوسیہ نے بھی اس وقت ظرافت سے کام لیا۔

"حق اللہ..... حق اللہ..... آپ کے لیے خوش خبری ہے محترمہ! درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"بتا دیجئے۔"

"وہ لڑکی جس کو آپ نے کوئی فاحشہ سمجھا ہوگا درویشوں کے کرم سے اپنا کام سرانجام دے چکی ہے۔"

"صوفی صاحب! پہلے تو آپ اپنے الفاظ درست کر لیجئے کتنی ہی بڑی قسم لے لیجیے مجھ سے میں نے اس لڑکی کو ایک لمحے کے لیے بھی غلط نہیں سمجھا۔ ہاں اس وقت تک ذرا الجھن کا شکار تھی۔ جب تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ آپ لوگوں کا تعلق کرنل رحیم شاہ سے ہے لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی اور آپ یقین کر لیجیے کہ میں نے آراشیہ سے بھی یہ بات کہی تھی کہ صرف ایک جال ہو سکتا ہے جو بابر جاہ پر پھینکا گیا ہے۔"

"بالکل۔ درویشوں کی دعاؤں سے یہ جال بڑی کامیابی سے بابر جاہ پر پھینکا گیا ہماری ساتھی لڑکی نے ان غاروں کا پتا لگا لیا ہے جہاں اسمگلنگ کا سامان رکھا جاتا ہے اور ایک افسوس ناک خبر بھی آپ کو سننا پڑے گی کہ بابر جاہ اس لڑکی کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا؟"

"ہاں۔ اس بے وقوف آدمی نے اس چھلاوے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب، صوفی صاحب درویش ایسی دعائیں کسی کو نہیں دیتے آپ براہ کرم ہر مسئلے میں درویشوں کو نہ گھسیٹ لیا کریں۔"

"یہ رمز کی باتیں ہیں خانم فردوسیہ آپ نہیں سمجھیں گی درویشوں کے کرم سے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں یہ مما! درویشوں سے ذرا ہماری واقفیت کم ہی ہے۔" آراشیہ بھی ہنس کر بولی لیکن خانم فردوسیہ حیران سی اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"کیا واقعی بابر جاہ مر گیا۔"

"ظاہر ہے، اس نے ٹرانسمیٹر پر ہمیں اطلاع دی ہے ہم اپنے ہر شخص کی بات پر بھرپور بھروسا کرتے ہیں۔ مار دیا اس نے بابر جاہ کو، مجبوری ہی ہوگی۔ ویسے کسی موذی کا جلد از جلد دنیا سے چلے جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کرنل صاحب کو اطلاع دے دی گئی ہے کیا آپ ان جگہوں کو دیکھنا پسند کریں گی۔ جن کے بارے میں خود آپ کو معلومات حاصل نہیں ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" خانم فردوسیہ نے جواب دیا۔

شازیہ نے ہی راستوں کی نشاندہی کی تھی اور صوفی اپنے اس مختصر قافلے کو اپنی مخصوص جیپ میں ان غاروں تک لے گیا تھا۔ شازیہ غاروں کے دہانے کے باہر ہی ملی اور اس کے بعد وہ ان لوگوں کو لے کر اندر ان غاروں میں پہنچ گئی۔ صوفی، دلاور اور باقی لوگوں نے ان غاروں میں موجود اسمگل کی ہوئی اشیا کے اس عظیم الشان ذخیرے کو دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی غار کے اندر پڑی ہوئی بابر جاہ کی لاش سب لوگوں کے لیے عبرت کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ خانم فردوسیہ نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"وہ میرے شوہر کا بھائی تھا اور شروع میں مجھے بہت عزیز تھا لیکن میرا وطن دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس کے لیے دل میں اگر دکھ کا ہلکا سا احساس پاتی ہوں تو وہ اس لیے فنا ہو جاتا ہے کہ وہ وطن دشمن تھا۔"

"نہیں خانم آپ کو یہ سن کر شاید دکھ ہو بلکہ یقیناً دکھ ہوگا کہ وہ آپ کے شوہر کا قاتل بھی تھا مجھ سے گفتگو کے دوران اس نے اپنے کالے کارنامے بیان کرتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو راستے سے ہٹایا اور اس کے بعد وہ آپ کو زندگی سے محروم کرنا چاہتا تھا اب تک اس نے صرف ایسا اس لیے نہیں کیا کہ کسی مسئلے میں اسے آپ کی ضرورت بھی تھی۔" آراشیہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"یہ میرے باپ کا قاتل ہے آہ..... کاش! مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہو جاتا اور یہ زندہ ہوتا۔"

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم شاہ نے بھرپور سرکاری قوتوں کے ساتھ ان غاروں پر ریڈ کیا تھا اور وہاں سے اربوں روپے کی قیمت کا یہ سامان سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ اربوں روپے کی قیمت کے اس سامان کی کوئی

حیثیت نہیں تھی۔ اصل مسئلہ اس کے یہاں تک آنے کا تھا چنانچہ ایک رپورٹ تیار کی گئی اور ان راستوں کی مزید حفاظت کی تیاریاں کی گئیں جہاں سے اسمگلر آسانی سے اپنا کام کر لیا کرتے تھے اس طرح حکومت کی نگاہ میں کرنل رحیم شاہ کی ایک اور حیثیت کا اندراج ہو گیا تھا اور پھر جب ان تمام کارروائیوں کی تفصیل کا جائزہ لینے کے بعد صوفی واپسی کے لیے تیار ہوا تو آراشیہ اور خانم فردوسیہ پیچھے پڑ گئیں۔

"نہیں صوفی صاحب! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ابھی نہیں جانے دوں گی میں۔ آپ بے شک میرے لیے مجبور نہیں ہیں اور میں آپ کو روکنے کا کوئی جواز نہیں رکھتی لیکن بس درخواست ضرور کروں گی کہ ابھی نہ جائیں مجھے آپ سے کچھ مشورے بھی کرنے ہیں۔" صوفی یہ حالت مجبوری رک گیا تھا۔ آراشیہ نے شازیہ سے کہا۔

"مجھے معاف کرنا شازیہ! میں نے تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا خاص طور پر چچا بابر جاہ کے ساتھ تمہارا جو رویہ تھا۔ میں یہ سوچتی تھی کہ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بابر جاہ ایک دولت مند آدمی ہے اور تم اسی لیے اس سے پینگیں بڑھا رہی ہو کہ بعد میں تم اس کی حیثیت سے فائدہ حاصل کر سکو۔" شازیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی تو آراشیہ کہنے لگی۔

"لیکن ایک بات کہوں تمہارا پہلا نام مجھے بے حد پسند تھا۔ رابعہ سونیکا! میں نے اس وقت انتہائی افسوس سے سوچا تھا کہ کاش! تم اپنے نام کی طرح اچھے کردار کی مالک بھی ہوتیں لیکن مجھے معاف کرنا۔ بعض اوقات انسان جہالت میں بہت سے فیصلے کر لیا کرتا ہے۔"

"نہیں آراشیہ! اسے جہالت نہ کہو ظاہر ہے تمہیں معلوم ہی کیا تھا میرے بارے میں۔"

"مجھے تھوڑا سا وقت دو۔" خانم فردوسیہ نے اس رات صوفی کے ساتھ ایک لمبی نشست کی اور بولی۔

"صوفی صاحب یہ پہاڑ، یہ برف زار مجھے بہت عزیز ہیں لیکن جس شخصیت کی وجہ سے یہ مجھے عزیز تھے۔ وہ ہمارے درمیان نہیں رہی۔"

"درویش رحم کریں۔"

"میں دارالحکومت میں جا کر آباد ہونا چاہتی ہوں یہاں کے لیے میں کیا کروں۔"

"یہاں چند مزارات بنوا دیجیے میرا مطلب ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مزارات!"

"نہیں وہ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔" صوفی نے کہا اور جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کرنے لگا۔

یہی مشورہ خانم فردوسیہ نے کرنل رحیم شاہ سے کیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر یہاں آیا تھا۔ فوجی دستے ان علاقوں پر کنٹرول حاصل کر چکے تھے۔ خصوصی طور پر خاردار تاروں کی باڑیں دور دور تک لگائی جا رہی تھیں جنہیں عبور کر کے اسمگلر اس طرف کبھی نہیں آ سکتے تھے۔ یہ تمام کارروائیاں کرنل رحیم شاہ کے مشوروں سے ہو رہی تھیں۔ شاہ میر خاں صاحب نے خصوصی طور پر اس کے لیے سفارش کی تھی کہ کرنل صاحب اس بارے میں حکومت کو مشورے دیں۔ تمام کاموں سے فراغت ہو گئی تھی اور کرنل رحیم شاہ سنگینہ کی اس پہاڑی حویلی میں خانم فردوسیہ کا مہمان بنا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت اچھی بات ہے یہاں کا کنٹرول پولیٹیکل ایجنٹ کے قبضے میں دے دیا جائے۔ خاص طور پر اسمگلروں کی اس کارروائی کے نتیجے میں حکومت مکمل توجہ کے ساتھ یہاں اپنے اسٹیشن قائم کردے گی تاکہ اسمگلنگ روکی جاسکے۔ آپ اس موقع سے فائدہ اٹھائیے واقعی آراشیہ کو شہری زندگی کی ضرورت ہے۔"

"اور وہاں میں صوفی صاحب سے بھی مل سکوں گی۔ بہت ہی دل کش انسان ہیں یہ درویشوں کی دعاؤں سے۔" آراشیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر اسی رات جب صوفی، رحیم شاہ کے پاس بیٹھا ہوا اس سلسلے میں تفصیلات بتا رہا تھا تو باہر سے ہارمونیم بجنے کی آواز سنائی دی اور دونوں چونک پڑے۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"پتا نہیں۔" ہارمونیم کے ساتھ ساتھ ڈھول اور دوسرے ساز کی آواز آئی تو یہ باہر نکل آئے۔ حویلی کے ایک گوشے میں تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور بہت سے لوگ یہاں جمع تھے۔

"یہ کیا طلسم ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی کے منہ سے نکلا اسی وقت عقب سے خانم فردوسیہ کی آواز سنائی دی۔

"یہ آپ کے اعزاز میں ہے صوفی صاحب۔ آراشیہ نے کبھی قوالی نہیں دیکھی تھی اور یہاں ان پہاڑوں میں اس کا رواج بھی نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کے اعزاز میں اس کا بندوبست کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ پہنچ گئے۔"

"تو یہ اپنے ڈھولن شاہ اور ہم نوا کی آوازیں ہیں۔ ڈھولن شاہ تو اس وقت قیامت مچائے ہوئے ہیں۔ قوالی کی دنیا میں۔"

صوفی خوشی سے ناچنے لگا۔ کرنل رحیم شاہ بھی ان تمام چیزوں کا شوقین تھا۔ آراشیہ، خانم فردوسیہ اور تمام لوگ قوالی میں پہنچ گئے اور اس کے بعد تو آراشیہ ہنس ہنس کر دہری ہوگئی۔ جب صوفی کو ڈھولن شاہ کی ایک غزل پر زبردست حال آگیا اور وہ اٹھ کر ناچنے لگا۔ شیروانی، ڈھیلا پاجامہ، منہ سے ٹپکتی ہوئی پانوں کی پیک، آنکھیں بند دونوں ہاتھ فضا میں بلند۔ ہونٹ بھینچے ہوئے اور جب بھی ان سے کوئی آواز نکلتی لوگ اس طرح بچنے کی کوشش کرتے جیسے منہ سے چھرّے نکل رہے ہوں۔ منہ میں دبے ہوئے پان اور چھالیوں کا تصور تک ختم ہوگیا تھا۔ وجد کا عالم تھا اور صوفی کا رقص۔ آراشیہ ہنس ہنس کر دہری ہوئی جارہی تھی۔ شازیہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یہ آج چھوٹے بابا کو کیا ہوگیا۔ کیا کر رہے ہیں وہ۔"

"اڑے ماں قسم ابھی میرے کو تو یہ لگتا ہے جیسے کوئی جن ون آگیا اپنے چھوٹے بابا پر اڑے روکو نا ان کو۔"

"نہیں غلام قادر! حال آگیا ہے ٹھیک ہوجائیں گے۔" دلاور نے غلام قادر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ماں قسم تمہارے کو بول دیتا ہے دلاور صاحب! ابھی میرے چھوٹے بابا کو کچھ ہوگیا تو میں بس

سر پھاڑ کر خودکشی کرلوں گا۔ اڑے دیکھو تی کیسا ناچتا پڑا ہے۔" غلام قادر نے گردن ہلا کر کہا۔ آراشیہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

♥----♥----♥

سنگینہ کیس کو ختم ہوئے دو مہینے گزر گئے تھے۔ خانم فردوسیہ دارالحکومت منتقل ہوگئی تھی۔ آراشیہ بے پناہ خوش تھی اس نے صوفی سے درخواست کی تھی کہ یہاں جب تک وہ اپنے دوست بنانے میں کامیاب نہیں ہوجاتی صوفی ان سے ملتا رہے اور کبھی کبھی انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ظاہر ہے وہ لوگ اسے گرین ہاؤس نہیں بلا سکتے تھے۔ کیونکہ گرین ہاؤس بہرحال ایک خفیہ جگہ تھی وہاں کے مکین عام سے انداز میں رہتے تھے اور دیکھنے والے صرف اتنا جانتے تھے کہ گرین ہاؤس میں خاصے افراد رہتے ہیں ایک نگرانی ملازم، ایک خطرناک قسم کا چوکیدار، ایک اونٹ اور انسان کی ملی جلی قسم وغیرہ۔ یہ اس گھر کے مکین ہیں۔ سادہ اور پرسکون سی زندگی گزارتے تھے کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ ایک بار آراشیہ پیچھے ہی پڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"چھوٹے بابا۔ میں آپ کے گھر چلوں گی۔"

"ہمارے گھر در..... درویش رحم کریں۔"

"کیوں۔ اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔"

"نہیں خوف زدہ ہونے کی بات تو نہیں لیکن پھر بھی۔"

"کیا پھر بھی! آپ ہمیں اپنا گھر نہیں دکھائیں گے۔"

"بس وہ گھر ہے ہی نہیں۔"

"چھپاتے ہیں آپ۔ چھپا رہے ہیں ہم سے۔" آراشیہ نے کہا۔

"درویش رحم کریں ہم پر بھی اور تم پر بھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

"آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"یہ خدا ابتدا ہی نہیں ہوئی درویشوں کی مہربانی سے، بچائے رکھا ہے انہوں نے، قربان جاؤں ان کی ذات اقدس کے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارا مطلب یہ ہے کہ..... کہ..... کہ بیوی نہیں ہے اس لیے بچے بھی نہیں ہیں۔"

"کہیں رہتے تو ہیں نا آپ۔ گھر تو ہے آپ کا۔"

"ہاں ہے بی بی لیکن وہ خانہ درویش ہے۔"

"وہاں بھی درویش ہوتے ہیں؟"

"وہاں ہوتے نہیں ہیں درویش بلکہ ان کا ایک عقیدت مند وہاں رہتا ہے۔"

"دیکھیں گے ہم چھوٹے بابا ورنہ جھگڑا ہوجائے گا آپ سے بتائیے کب لے کر چلیں گے آپ ہمیں۔"

"وو..... وو..... درویش رحم کریں۔ آپ یقین کیجیے وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ وہاں جائیں۔"

"چھوڑیے..... یہ ہم پر چھوڑ دیجیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"صوفی صاحب! بچی کتنے پیار سے آپ سے کہہ رہی ہے آپ مان کیوں نہیں لیتے اس کی بات اور پھر اتنی مان اور چاہت سے شہر آئے ہیں آپ ہی تو ہمارے ہیں اور کون ہے آپ ہی پر ناز کرتے ہیں۔"

"درست فرمایا آپ نے لیکن ہم بھی صحیح کہہ رہے ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"کیا صحیح عرض کر رہے ہیں آپ۔"

"یہی کہ جہاں ہم رہتے ہیں وہ جگہ۔"

"بری بات ہے صوفی صاحب! آپ تو بہت اچھے انسان ہیں آپ جہاں رہتے ہوں گے وہ بری نہیں ہوگی۔"

"محترمہ! سمجھنے والوں کے لیے بے شک بری نہیں ہے اور جو اس جگہ کو سمجھ نہیں پاتے وہ اسے برا ہی کہتے ہیں۔"

"گویا آپ نے ہمیں ناسمجھ قرار دے دیا ہے۔"

"ہرگز نہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"تو پھر ہم سے احتراز کیوں کر رہے ہیں۔"

"وعدہ کیجیے چھوٹے بابا!" خانم فردوسیہ اور آراشیہ اس طرح پیچھے پڑ گئیں کہ صوفی کو اقرار کرنا پڑا۔

"ٹھیک ہے لے جاؤں گا آپ کو اپنے ساتھ۔"

"مگر ایک شرط ہے آپ وہاں کوئی رد و بدل نہیں کریں گے۔ آپ سچ بولتے ہیں ہمیں یقین ہے اگر آپ وعدہ کریں گے تو ایسا ہی کریں گے جیسا کہہ رہے ہیں۔" صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔ ادھر بالکل اتفاقیہ طور پر یار محمد نے دوبار صوفی کو ایک کار میں خانم فردوسیہ اور آراشیہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ بس فطرت ہوتی ہے انداز ہوتا ہے انسان کا۔ یار محمد بے چارہ سیدھا سادھا مل مزدور، اتنی خوب صورت کار، خوب صورت لڑکی اور عورت کو کو دیکھ کر ایک ہی تصور اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ممن خان تو خیر صوفی کا بہت گہرا دوست تھا اور اگر ممن خان کے سامنے صوفی کے بارے میں کوئی بات کہہ دی جائے تو اگر غلط بات ہو تو بڑی ہی مشکل سے معافی مل سکتی تھی۔ لیکن اور لوگ تھے۔" چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے یار محمد نے کہا۔

"یار نظام علی! یہ صوفی صاحب جو ہیں نا کتنے عرصے سے رہتے ہیں ہمارے درمیان۔"

"بہت عرصے سے۔ یہی لگتا ہے جیسے اسی محلے میں پیدا ہوئے ہوں۔ تجھے معلوم نہیں ہے یار محمد! بڑے بڑے لوگوں نے صوفی صاحب کو نہ جانے کیا کیا پیش کشیں کی ہیں۔ کوٹھی بنگلے، مگر صوفی صاحب نے یہ محلہ نہیں چھوڑا۔ کوٹھیاں چھوڑ دیں، بنگلے چھوڑ دیے۔"

"مگر یار انہوں نے ایک زیادتی کی ہے ہمارے ساتھ۔" یار محمد نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"صوفی صاحب نے زیادتی کی ہے کسی کے ساتھ، بات یقین کرنے کی نہیں ہے۔"

"کی ہے۔ کہوں گا تب ہی تم یقین کرو گے۔"

"ہے کسی اچھی بات کی توقع تو فوراً کی جا سکتی ہے ان سے۔ لیکن کسی زیادتی وغیرہ کے بارے

میں بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"مگر بتا تو کیا زیادتی کی ہے۔"

"یار! انہوں نے ہم سے یہی کہا ہے کہ ان کی بیوی اور بچے نہیں ہیں۔"

"تو پھر۔"

"بیوی بھی ہے ان کی اور ایک بیٹی بھی ہے۔"

"کیا؟" نظام الدین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔ یہ بات میرے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ہے نا یار! کئی بار دیکھ چکا ہوں۔"

"بھائی تم کیا سمجھتے ہو اپنے یار کو؟ پولیس کا بڑے سے بڑا افسر رہ چکا ہے۔ ہزاروں بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان ہے۔ یہ کیا بات ہوئی اگر تم نے کسی....."

"سمجھا کرو نظام الدین کسی کی بات اور ہوتی ہے اور بیوی بچوں کی بات اور ہوتی ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میں نے بھی آخر دنیا گزاری ہے۔"

"بات بڑی عجیب کہہ رہے ہو تم یار محمد مگر ایک بات میں تمہیں بتا دوں ممن خان سے بات کرتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو ممن خان کو ضرور پتا ہوگا۔"

"یار ممن بھائی برا نہ مان جائیں۔"

"نہیں بس پوچھیں گے خیال ظاہر کریں گے۔" اور ممن کو شریک کر لیا گیا نظام الدین نے یار محمد کی بات بتائی تو ممن خان ایک دم ہنس پڑے۔

"ابے کیا بکواس کر رہے ہو۔ صوفی صاحب مرد خدا ہیں درویش صفت ہیں ساری باتیں اپنی جگہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لا کر اسی گھر میں رکھتے وہ بیوی بچی کو۔ بچی کتنی بڑی ہے؟"

"جوان ہے۔" یار محمد نے کہا اور ممن خان ہنس پڑے۔

"پاگل ہوا ہے تو یار محمد! یعنی تیرے خیال میں۔"

"آپ سمجھے نہیں ممن خان بھائی! بہت سی کہانیاں عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ اپنے بھائی صوفی غم کے مارے ہوئے ہیں۔ وہ عورت جوان کی گاڑی میں نظر آئی تھی نا۔ بڑی خوب صورت تھی۔ بچی بھی بڑی خوب صورت تھی اور کسی بڑے گھر کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اپنے صوفی بھائی ٹھہرے ہمت والے مرد کسی بڑے گھر میں شادی ہوگئی ہوگی اب تم عورتوں کو تو سمجھتے ہی ہو نا۔ مرد ذرا ان کی طبیعت سے ہلکا ہو تو نظروں سے گرا دیتی ہیں میرا خیال ہے۔ جھگڑا چل رہا تھا میاں بیوی دونوں کا اور اسی جھگڑے کے عالم میں صوفی جی درویش بن گئے۔ اب ہو سکتا ہے کسی وجہ سے صلح ہوگئی ہو۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کی بیٹی اس جگہ کیسے آئے گی۔ صوفی صاحب نے بھی بس ضد پکڑ لی ہو۔ ٹھیک ہے وہ ادھر ہی رہیں گے ہم لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے بیوی بیٹی کو چھوڑنا پڑے۔ مجھے لگ رہا ہے کچھ مفاہمت ہو رہی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" ممن خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے۔"

"بس دیکھتے ہیں سوچتے ہیں بات کریں گے صوفی صاحب سے۔ ویسے یار یہ تو بڑی دل توڑنے والی بات ہے۔ ہم سے کہہ دیتے تو ہم اسے کوئی اچھا راستہ ہی دکھا دیتے۔" ممن خان بھی کچھ اداس سے ہو گئے۔ ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی اور ادھر صوفی بے چارہ بہ حالت مجبوری آراشیہ اور فردوسیہ کو اپنا گھر دکھانے پر بادل نہ خواستہ تیار ہو گیا تھا اور اس دن اس کی کار اپنے محلے میں داخل ہوئی۔ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا خانم فردوسیہ اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ صوفی کو اتنی ہی عزت دی جاتی تھی۔ آراشیہ کار کے پچھلے حصے میں تھی۔ بس ایسی جگہوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہی صوفی کی کار گلی کے سرے پر نمودار ہوئی اتفاق کی بات کہ یار محمد نے ہی دیکھ لیا، ایسی دوڑ لگائی کہ بڑے بڑے دوڑنے والوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ممن خان کے ہوٹل میں جا کر دم لیا۔ لو ممن خان ہو گئی بات کی تصدیق۔"

"کیا ہوا؟"

"صوفی صاحب! اپنی گھر والی کو لے آئے۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ مان ٹوٹ گیا ہے آ گئی ہیں شوہر کی یاد میں تڑپتی ہوئی اور کیوں نہ ہو بیٹی جوان ہو گئی ہے باپ کا سایہ تو سر پر ہونا ہی چاہیے۔"

"اماں کیا کہہ رہے ہو بھائی یار محمد! کیا واقعی۔"

"دیکھو وہ دیکھو کار آ رہی ہے۔"

"اچھا..... بھئی یہ تو بڑی بات ہے۔" ذرا سی دیر میں چاروں طرف مورچہ بندی ہو گئی۔ مورچوں میں چھپ چھپ کر دیکھا جا رہا تھا صوفی کے منہ میں پان دبا ہوا تھا اور چہرے پر شدید بدحواسی تھی۔ دروازے کے قریب اس نے کار روک دی اور بولا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" آراشیہ نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا یہ کچی پکی آبادی، سڑک ٹوٹے پھوٹے مکانات، ننگ دھڑنگ کھیلتے ہوئے بچے راستے میں کئی جگہ چھوٹے چھوٹے کوڑا گھر۔ سامنے ہی ایک جھونپڑا قسم کا ہوٹل اور یہ ٹاٹ والا دروازہ جس کے آگے کوئی ایک فٹ والی نالی بہ رہی تھی اور یہ نالی ڈھکی ہوئی بھی نہیں تھی۔ اس میں گندگی اور غلاظت بیٹھی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفی نے ٹاٹ کا پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"قدم رنجہ فرمایئے درویشوں کے کرم سے۔" آراشیہ تو کچھ بدحواس سی ہو گئی تھی لیکن خانم فردوسیہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ نالی پھلانگ کر وہ لوگ اندر داخل ہو گئے اور اس کے بعد صحن کا منظر سامنے آ گیا۔ ایک طرف کسی بیل گاڑی کا پہیہ رکھا ہوا تھا ایک طرف مرغیوں کا خالی ڈربا۔ لیکن زمین پر باقاعدہ باجرے اور مکئی کے دانے پڑے ہوئے تھے۔ صحن کچا، ایک طرف تین ٹوٹے ہوئے گملے جن میں پھول وغیرہ نہیں تھے۔ سامنے پکی اینٹوں کا دالان لیکن اس میں پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی۔ جس کے بان زمین سے لگے ہوئے تھے۔ پائینتی کی طرف ایک گدا اور ایک چادر رکھی ہوئی۔ سیدھے ہاتھ پر غار نما باورچی خانہ جس میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس کے بعد بڑے سے کمرے کا دروازہ۔ صوفی ان لوگوں کو دالان میں لایا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

"مما! یہ....." آراشیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن خانم فردوسیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش کر دیا۔ صوفی اندر سے ایک چارپائی لے آیا جو قدرے سلامت تھی اس نے جلدی سے اس پر دری بچھائی اور بولا۔

"تشریف رکھیے خانم۔"

"شکریہ صوفی صاحب! تو یہ ہے آپ کا دولت خانہ۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مگر یہاں کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" آراشیہ نے سوال کیا۔ صوفی جھلنگا چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"خانم! آپ سے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ گھر میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"مگر دروازہ تو کھلا ہوا تھا؟" آراشیہ نے کہا اور صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک طرف منہ کر کے پان کی پیک تھوک دی۔ باہر کے تکلفات اپنی جگہ گھر کے ہر گوشے میں ایسے سرخ سرخ سوکھے ہوئے دھبے جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ بولا۔

"ایسے علاقوں میں گھروں کے دروازے کھلے ہی ہوا کرتے ہیں چھوٹی بی بی صاحبہ! چونکہ یہاں گھروں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ بات یہ نہیں ہے کہ "رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔" آپ گھروں میں سونا بھر کر رکھ دیجیے یہاں۔ وہ بالکل محفوظ ہوتا ہے ہر شخص ایک دوسرے کے گھر کا محافظ ہوتا ہے گھر کا ہی نہیں عزت آبرو کا محافظ بھی ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔ ایسے محلوں میں بس سڑکیں، گلیاں اور بازار گندے ہوتے ہیں۔ دل بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں صوفی صاحب! یہ بچی ہے زمانہ ناشناس اسے پتا نہیں لیکن میں جانتی ہوں یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے۔"

"مما! دیکھیے وہ کیا ہے؟" آراشیہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ایک کھونٹی پر شیروانی لٹک رہی تھی۔

"شیروانی ہے اور کیا ہے۔"

"مگر مما کتنی میلی کچیلی ہے یہ۔"

"عزیزو! آپ یقین کیجیے ہم اس شیروانی کو قیامت تک نہیں بھول سکتے۔ کیونکہ ہمارے ایک دوست نے بڑی محبت سے ہمیں تحفتاً دی تھی بس۔"

"صوفی صاحب کم از کم استری تو کر لیا کریں آپ اس پر۔" آراشیہ نے کہا۔

"کرتے ہیں جب کہیں جانا ہوتا ہے۔ اگر دن میں جانا ہوتا ہے تو رات کو ہم اسے تہ کر کے کمر کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں صبح کو تیار ملتی ہے اور اگر کہیں شکنیں پڑی بھی ہوں تو دیسی استری کا معقول انتظام ہے۔"

"دیسی استری۔"

"جی ہاں کچن میں موجود ہے۔ دکھائیں آپ کو۔" صوفی نے کہا اور اندر سے ایک پیتل کی گڑوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھالایا۔"

"بس تھوڑا سا پانی چھڑکیے اور اس گڑوی سے استری کر لیجیے۔ جادو کی گڑوی ہے یہ درویشوں کے کرم سے۔"

"اور یہاں کوئی نہیں ہے۔ اچھا یہ بتایئے یہ گاڑی کا پہیہ کیوں رکھا ہوا ہے۔"

"یہ خدا آج پہلی بار دیکھا ہے ہم نے۔ کسی کا ہوگا، لاکر رکھ گیا ہے، لے جائے گا۔"

"آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کس کا ہے۔"

"ضرورت ہی نہیں ہے معلوم کرنے کی، کسی کو رکھنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی رکھ گیا۔"

"اور مرغیوں کا ڈربا۔"

"محلے کی مرغیاں کبھی کبھی آجاتی ہیں۔ یہ دانہ دنکا بھی انہی کے لیے ڈال دیا ہے کہ آئیں تو بھوکی پیاسی نہ جائیں اور کسی کی بھلا کیا خدمت کی جاسکتی ہے۔"

"آج ایک بات سمجھ میں آ گئی صوفی صاحب۔" خانم فردوسیہ نے کہا۔

"کیا.....؟"

"یہی کہ ہر بات درویشوں کے کرم سے کیوں ہوتی ہے۔" فردوسیہ مسکرا دی ادھر یہ لوگ محو گفتگو تھے اور ادھر ممن خان نے محلے میں طوفان مچا دیا تھا۔ صوفی کی بیگم اور بیٹی آئے تھے۔ بھلا اس طرح کیسے جاسکتے تھے۔ چنانچہ انتظامات شروع ہوگئے۔ فوراً ہی لوگوں کو ادھر ادھر دوڑا دیا گیا۔ سارے کام بند کر دیے گئے۔ کھانے پینے کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور گلی میں پتنگ کے کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں باندھی جانے لگیں۔ اندر صوفی اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا اور باہر اس طرح بھاگ دوڑ ہو رہی تھی جیسے کوئی منسٹر کسی علاقے میں آجاتا ہے اور سرکاری حکام وہاں عارضی انتظامات کرتے ہیں گلی کے کناروں پر نالیوں کے اوپر گملے سجا دیے گئے تھے۔ جو برابر کی نرسری سے ادھار مانگ کر لائے گئے تھے اور نالیوں پر پھول لہلہا رہے تھے۔ پھر باقی انتظامات ہوئے اچانک ہی ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈھول والے صوفی کے دروازے پر آگئے تھے اور دھما دھم ڈھول بج رہا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد کئی افراد صوفی کے گھر میں داخل ہوگئے۔ اجازت وغیرہ کی ضرورت تو پیش آتی ہی نہیں تھی یہاں اس علاقے میں۔ ممن خان کے ہوٹل کی تین بڑی میزیں وہاں منتقل ہوگئیں اور اس کے بعد وہاں چادریں ڈال دی گئیں۔ کئی رنگوں کی چادریں تھی لیکن صاف ستھری تھیں۔ خانم فردوسیہ اور آراشیہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ لیکن صوفی نے کہا۔

"تشریف رکھیے۔" پھر آگے بڑھ کر بولا۔

"اماں یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ۔" کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے بعد پلیٹیں چمچے اور کھانے پینے کی اشیاء آنا شروع ہوگئیں۔ مٹھائی کے انبار، پھلوں کے انبار ہر طرح بیکری کے آئٹم، تینوں میزیں اس طرح بھر دی گئیں جیسے سو پچاس آدمیوں کا انتظام کیا جا رہا ہو۔ صوفی کا بھی منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ آراشیہ اور فردوسیہ بھی تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر آراشیہ نے کہا۔

"یہ.....مما یہ.....صوفی صاحب یہ.....آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟"

"یہ خدا درویشوں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا۔ یہ تو بس ان لوگوں کی مہمان نوازی ہے آپ لوگ یہاں آئے ہیں نا۔" اسی وقت ممن خاں اندر داخل ہوا اور آراشیہ نے کہا۔

"باہر جو دھم دھم ہو رہی ہے یہ کیسی ہے؟" ممن خان کے ساتھ یار محمد، نظام الدین، گل شیر خان اور بھی چند افراد تھے سب کے سب گلاب کے تازہ پھولوں کے ہار ہاتھوں میں سجائے ہوئے تھے۔ ممن خان نے کہا۔

"تم سے تو بعد میں نمٹیں گے صوفی میاں! ذرا بھابی اور بھتیجی کو ہار پہنا دیں۔"

"بھا..... بھا....." صوفی کا منہ بھاڑ ہی کی طرح کھل گیا تھا۔ بھا بھا کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکا تھا۔ باہر ڈھولچی ڈھول بجا رہے تھے اور اس میں تیزی آتی جا رہی تھی پھر ممن خان نے بہت سے نوٹ نچھاور کیے ڈھول بجانے والے اندر آگئے تھے۔ آراشیہ دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ڈھول بجانے والے ناچ رہے تھے اس کے ساتھ ہی دوسرے چند لوگوں نے بھی ٹھمکے لگانے شروع کر دیے۔ صوفی ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑا ہوا تھا اور بچی کھچی پان کی پیک اس کے گریبان پر آپڑی تھی۔ اب وہ ممن خان وغیرہ سے بھی کوئی سوال نہیں کر رہا تھا۔ یہ ہار خانم فردوسیہ اور آراشیہ کے گلے میں ڈالے گئے۔ یہی شکر تھا ان لوگوں نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن جب ممن خان نے سو سو کے پانچ نوٹ آراشیہ کو اور دس خانم کو پیش کیے۔ تو دونوں حیران ہوگئیں۔

"بھابی جی! بس ہم غریبوں کی یہی اوقات ہے قبول فرمایئے مہربانی ہوگی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ بیٹی یہ آپ لے لیں۔"

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"کہا نا ہم غریب لوگ ہیں اسی طرح اپنی محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔"

"آپ بہت بڑے لوگ ہیں مگر یہ زحمت نہ کیجیے۔"

"دکھ ہوگا ہمیں، چھوٹی سی رقم ہے اگر آپ نے ٹھکرا دی تو۔"

"میں تو نہیں ٹھکراؤں گی میں تو انہیں سنبھال کر رکھوں گی۔" آراشیہ نے کہا۔ ڈھول والے بہ دستور ڈھول بجا رہے تھے اور صوفی کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

"اب ایسا کریں آپ صوفی صاحب! بھابی جی کو ناشتا کرائیں میں چائے بھجواتا ہوں چلو بھئی۔ چلو باہر نکلو۔" ممن خان ڈھول والوں کو باہر لے گئے۔ ایک ایک کر کے سارے باہر نکل گئے۔ خانم فردوسیہ اور آراشیہ ہنستی مسکراتی نگاہوں سے یہ تمام مناظر دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ہی خانم فردوسیہ نے کہا۔

"یہ بھابی کا رشتہ کیسے قائم کر لیا ان لوگوں نے۔" صوفی جو صورت حال کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بس یہاں یہی ایک رشتہ ہوتا ہے حالانکہ وہ آپ کے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن ظاہر ہے کہ انہیں بھائی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے آپ کو بھابی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ..... واقعی کیا لوگ ہیں۔ خدا کی قسم کبھی کبھی تو ایسے لوگوں کے درمیان رہنے کو دل چاہتا ہے۔ عزت محبت پیار واقعی آپ نے ٹھیک کہا صوفی صاحب! بھلا ایسے علاقے میں گھروں کے دروازے بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں خلوص کی پہرے داری ہو۔" خانم فردوسیہ بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ اچانک ہی آراشیہ نے کہا۔

"ایک اور بات بتایئے چھوٹے بابا!"

"جی آیئے اس میں سے کچھ لے لیجیے۔"

"خدا کی پناہ۔ یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے پوری بارات کے لیے ہو۔ آئیں مما! میں تو کھاؤں گی میرے دل میں تو ایک اور خیال آ رہا ہے۔ چھوٹے بابا ان گھروں میں عورتیں بھی تو ہوں گی نا وہ بھی اتنی ہی مخلص ہوتی ہوں گی۔"

"ظاہر ہے یہ محبت نگر ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یقیناً ایسی جگہوں پر درویشوں کی دعائیں ہی ہوتی ہیں۔"

"تو پھر ہمیں ان سے ملوایئے نا۔"

"اس وقت..... اس وقت ممکن نہیں ہے پھر کبھی۔"

"ہاں بھئی آراشیہ ایک وقت میں سارے کام نہیں ہو جانے چاہیں۔ تم بے فکر رہو میں صوفی صاحب کو مجبور کروں گی کہ وہ ہمیں یہاں آنے دیا کریں۔"

"اچھا ایک بات بتایئے صوفی۔" خانم فردوسیہ نے کہا۔

"ارشاد۔" صوفی بولا۔ اسے خوشی تھی کہ صورت حال ہموار ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کا جو انداز تھا اس سے اس نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا۔ وہ تو بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔

"کرنل رحیم شاہ صاحب! آپ کو کچھ نذرانہ تو دیتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"اور یہ بھی میرے علم میں ہے کہ آپ گورنمنٹ کے لیے پرائیویٹ فورس کا کام کرتے ہیں۔"

"ہاں مگر اس کا معاوضہ قبول نہیں کرتے درویشوں کے کرم سے البتہ کرنل صاحب کو خود اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے کہ وہ ان سارے معاملات کو بہ آسانی ہینڈل کر لیا کرتے ہیں۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اس کا بھی ایک مصرف ہے۔"

"وہی مصرف میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔" خانم فردوسیہ نے کہا۔

"بس معزز خاتون! آپ نے یہاں کا ماحول دیکھ لیا ہو گا یہ گلی یہاں سے وہاں تک ہمارا گھر ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اپنا گھر چھوڑ کر کون ادھر ادھر بھاگتا ہے آپ جیسے کرم فرماؤں کی محبت بہت کچھ دے دیا کرتی ہے۔ لیکن یہاں ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم سب جو کھاتے ہیں مل کر کھاتے ہیں۔ ہمارے مسائل ایک دوسرے کے مسائل ہیں ہم انتظار نہیں کرتے کہ کس کے پاس کیا ہے اور کسے کیا درکار ہے۔ سمجھ لیجیے سب کچھ ہمارے درمیان آپس میں ہی ہو جاتا ہے۔ ہم مشترکہ خوشیاں مناتے

ہیں۔ عید ہوتی ہے تو یہاں ہر گھر کے بچے کے بدن پر نئے کپڑے ہوتے ہیں چاہے اس کے والدین اس کے لیے نئے کپڑے بنوانے کی اہلیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ پھر ہم سب مل کر کھاتے پیتے ہیں۔ ممن خان کا ہوٹل ایک بہت بڑا باورچی خانہ بن جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے علاوہ بھی جتنے یہاں گھر موجود ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بات ان گھروں تک ہی محدود نہیں ہے کوئی شخص اگر کھانا کھا رہا ہو اور کوئی اجنبی یہاں کسی کا پتا معلوم کرنے کے لیے آ پہنچے یا کسی کام سے آ پہنچے۔ تو اسے کھانا کھلائے بغیر واپس جانے دینا حرام تصور کیا جاتا ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"خدا کی پناہ..... خدا کی پناہ آراشیہ سن رہی ہو دیکھ رہی ہو جہاں زندگی گزارنے کا انداز یہ ہو۔ وہاں کی خوشیوں کا ٹھکانا کیا۔ صوفی صاحب ایک بات اور بتایئے۔"

"جی ارشاد..... ارشاد۔"

"دو دفعہ۔" آراشیہ نے ہنس کر پوچھا۔

"درویشوں کے کرم سے۔" صوفی بولا اور خانم فردوسیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے کہا۔

"چھوڑیے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ یہ واقعی بہت اچھی جگہ ہے۔ کاش! یہاں ایک گھر میں بھی لے سکتی۔"

"یہ گھر آپ ہی کا ہے خانم! جب بھی آپ کا دل چاہے یہاں تشریف لے آیا کریں۔"

"بات زبانی نہیں ہے۔ آپ سوچ لیجیے صوفی صاحب میں بھی اس خاندان کی ایک ممبر بننا چاہوں گی۔"

"ہم نے عرض کیا نا یہ لوگ بہ خوشی آپ کو قبول کریں گے۔"

"چلیے مسئلہ حل ہو گیا مما! ویسے آپ یقین کیجیے آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے میں تو بڑی متاثر ہوئی ہوں یہاں کے ماحول سے۔ ہم لوگ نقلی زندگی گزارتے ہیں ہمارے درمیان وہ لوگ پھیلے ہوئے ہیں جنہیں ہم ان کے خلوص کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ پیسے دیتے ہیں انہیں خود سے محبت کرنے کے لیے۔ کتنا فرق ہے مما! کتنا فرق ہے۔" بہر حال یہ دونوں یہاں آ کر بہت متاثر ہوئی تھیں اور پھر جب یہ واپسی کے لیے نکلیں تو خانم فردوسیہ خود ممن خان کے ہوٹل چلیں۔ آراشیہ بھی ساتھ تھی اس نے ممن خان سے کہا۔

"مجھے آپ کا نام معلوم ہو چکا ہے ممن خاں ہے آپ کا نام، میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔"

"ارشاد فرمایئے۔ ارشاد فرمایئے۔" ممن خان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"بات یہ ہے" خان صاحب! کہ میں آپ کے اس خوب صورت خاندان میں شمولیت اختیار کرنا چاہتی ہوں اور میری آرزو ہے کہ آپ مجھے اپنے درمیان آنے کی اجازت دیں۔"

"خاتون یہ تو بہت بڑی بات کر رہی ہیں آپ بھائیوں کے گھر، بہنیں اجازت لے کر تو نہیں آتیں وہ تو ان کا اپنا میکہ ہوتا ہے اور جب بیٹیاں میکے آتی ہیں تو میکے والے نثار ہو جاتے ہیں۔ یہاں سب آپ کے بہن بھائی ہیں۔ جب بھی آئیں گی ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کبھی آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" خانم فردوسیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

♥.....♥.....♥

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا۔ بالکل خاموشی طاری تھی اکثر خانم فردوسیہ کے ہاں نشست ہو جایا کرتی تھی کرنل رحیم شاہ بھی زیادہ تر دارالحکومت ہی رہا کرتے تھے اور شاہ میر خان صاحب سے بھی میٹنگیں ہو جایا کرتی تھیں۔ کرنل رحیم شاہ کے اہل خاندان بہ دستور وہیں اپنے مخصوص علاقے میں ہوتے تھے وہ لوگ اس جگہ کے عادی تھے ویسے بھی سردار پور ایک خوب صورت پہاڑی علاقہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دارالحکومت سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں تک آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ادھر خانم فردوسیہ نے اپنے لیے ہر طرح کی آسائشیں پیدا کر لی تھیں۔ وہ صوفی اور کرنل رحیم شاہ سے مسلسل رابطہ رکھتی تھیں آراشیہ بھی اب صوفی کو چھوٹے بابا کہنے لگی تھی۔ اور اس نے اس کا تکیہ کلام درویشوں کی دعاؤں سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ خانم فردوسیہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

"کرنل رحیم شاہ صاحب! قدرت جب کسی کو کچھ دینے پر آ جاتی ہے کتنی خاموشی سے دے دیا کرتی ہے کہ انسان سوچنے بھی نہ پائے۔ بڑا محدود ہوتا ہے انسان اپنی عقل میں، اپنی ذات میں سنگینہ میں رہتے ہوئے میں اپنے آپ کو اس پہاڑی بستی کا مالک سمجھتی تھی ہر کام میری ہدایت پر آنکھیں بند کر کے کیا جاتا تھا اس کے بعد بابر جاہ نے برائیوں کا آغاز کیا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ بس یہ کہنا چاہیے کہ قدرت بابر جاہ کو اس کے کیے کی سزا دینا چاہتی تھی۔ جو مجھے آپ تک آنے کا موقع ملا اور اس کے بعد آپ نے اس قابل فخر شخصیت کو وہاں بھیجا جس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا لیکن سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مجھے پتا نہیں کیا مل گیا۔ زندگی اس قدر خوب صورت ہے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے بھائی صوفی۔ زندگی سے جس قدر قریب ہیں کوئی جانے یا نہ جانے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ ویسے کرنل صاحب باقی تو سب ٹھیک ٹھاک ہے جیسے کہ محب وطن ہونے کی حیثیت سے آپ نے چند دنوں کے اندر اندر ان وطن دشمنوں کو خاک میں ملا دیا اور حکومت کو اربوں روپوں کا فائدہ پہنچایا اس سے یہ تو پتا چل گیا کہ قدرت نے کچھ لوگوں کو دوسروں کی بقا کے لیے متعین کر دیا ہے اور وہ بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے اپنا کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ بہر حال میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہونا چاہتی ہوں۔ آپ مجھ پر مکمل طور پر اعتبار کریں زندگی کی قیمت پر بھی کبھی آپ لوگوں کے کسی مفاد کے خلاف زبان نہیں کھولوں گی۔"

"میں جانتا ہوں کہ بھابی بیگم! میرا ابھی زندگی کا ایک تجربہ ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور پھر بولا۔

"اور مجھے مسرت ہے کہ میں اپنے دوست کے اہل خاندان کے لیے تھوڑی سی خوشی مہیا کرنے کا ذریعہ بنا۔ بہر حال میں آپ سے رابطہ کروں گا اگر کہیں کسی مرحلے پر آپ کا یا آراشیہ کا کوئی کردار ہوا تو میں ضرور آپ کو زحمت دوں گا۔"

"انکل، شازیہ، دلاور، غلام قادر وغیرہ بھی تو آپ کی ہدایت پر کام کرتے ہیں میں بھی ایسا ہی کروں گی۔"

"ہاں کیوں نہیں آراشیہ! میں نے کہا نا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں ضرور تکلیف دوں گا۔ اس دوران دو تین بار خانم فردوسیہ ان لوگوں کو بھی اپنے گھر بلانا چاہتی تھی۔ شازیہ کے اہل خاندان دلاور کے بیوی بچے یہ سب یہاں اس کی کوٹھی میں بے فکری اور بے تکلفی سے آتے جاتے رہتے تھے اور خانم فردوسیہ ان سے بہت محبت بھرا سلوک کرتی تھی۔ اس طرح سے الگ ایک چھوٹا سا خاندان بن گیا تھا۔ پھر ایک دن کرنل

رحیم شاہ نے صوفی کو فون کر کے طلب کیا اور صوفی اپنی سج دھج کے ساتھ گرین ہاؤس پہنچ گیا۔

اس کی مشہور زمانہ موٹر سائیکل اس کی بہترین سواری تھی اور جب بھی کبھی فرصت کے اوقات ہوا کرتے تھے۔ صوفی اسی موٹر سائیکل پر سفر کیا کرتا تھا۔ جس مکینک کے پاس اس موٹر سائیکل کی مرمت ہوتی تھی۔ اس نے کئی بار کہا تھا۔

"یار صوفی صاحب! یہ کسی زمانے میں موٹر سائیکل ہو گی اب تو اس میں پرانی ایک بھی چیز نہیں ہے۔ پیٹرول کی ٹینکی سے لے کر رم کی تاریں تک بدلی جا چکی ہیں۔ سوائے اس ایک رجسٹریشن نمبر کے، باقی بتایئے اس میں کون سی چیز پرانی رہی۔ کبھی کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو اسے بدل دیا جاتا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ خلیل بھائی! درویشوں کی دعاؤں سے۔ انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے نام دیا جاتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مذہب بدل جاتے ہیں۔ رشتے تبدیل ہو جاتے ہیں نام تو تبدیل نہیں ہوتا اسے اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ چاہے اس کے ہزار نام رکھ لیے جائیں۔"

"سو تو ہے۔" مکینک کہتا۔

"بس تو سمجھ لو کہ اس کا رجسٹریشن نمبر ہی اصل چیز ہے۔" مکینک بھی ہنس کر خاموش ہو جاتا۔ صوفی کو کون نہیں جانتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے گرین ہاؤس کے برآمدے میں صوفی کا استقبال کیا۔

"صوفی صاحب! موٹر سائیکل کا سائیلنسر کیوں نہیں بدلوا لیتے آپ۔"

"چل رہا ہے جناب! درویشوں کے کرم سے۔"

"چل تو رہا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ راستہ چلتے ہوئے لوگ کبھی کبھی اس کی آواز سن کر دوڑ لگا دیتے ہیں کہ شاید کہیں کلاشنکوف چل گئی۔"

"درویشوں کا کرم ہے جناب! یہ تو اس کی خوبیاں ہیں۔"

"آیئے اندر آیئے۔ آج کل آپ ذرا درویشوں سے کچھ دور نظر آنے لگے ہیں۔"

"درویش رحم کریں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہ محفل نہ قوالی۔ آپ کو پتا ہے انتہائی محترم بزرگ فضل کمال شاہ صاحب کا عرس مبارک شروع ہو چکا ہے اور ہم ہیں کہ اس طرف توجہ ہی نہیں اخبار میں تین چار بار خبریں آ چکی ہیں۔"

"اماں تمہیں واللہ فضل کمال صاحب کا عرس ہو رہا ہے۔"

"جی جی..... اور محفل قوالی چل رہی ہے۔ رات رات بھر تب تو واقعی پھٹکار ہے ہم پر، درویشوں کی دعاؤں سے میرا مطلب ہے مجھ پر۔"

"نہیں مجھ پر بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے مسخرے پن سے کہا۔

"یہ جرات نہیں کر سکتے ہم درویشوں کے کرم سے۔"

"تو پھر چل رہے ہیں آج۔"

"نہ جانے کل کا کیا سوال ہے باقی دنوں کی کسر بھی پوریں کریں گے۔" بس اس کے بعد کرنل رحیم شاہ بھی مست ہو گیا۔ دونوں طویل ترین فاصلہ طے کر کے شہر سے کافی دور پہنچ گئے۔ یہاں واقعی جنگل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منگل منایا جارہا تھا۔ جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ موسم میں ذرا خنکی تھی۔ زائرین اور عرس کے شرکاء نے اپنے اپنے آرام کا بندوبست کر لیا تھا۔ بہت سے لوگ نظر آ گئے۔ یہاں خال خال درخت تھے۔ جن کے نیچے ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرح کے لوگ پیر فضل کمال کے معتقدین تھے۔ چنانچہ اعلیٰ درجے کی گاڑیوں کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی مزار شریف کے احاطے سے قوالیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ صوفی نے بھی اپنی گاڑی پارک کی۔ کرنل رحیم شاہ نے اسٹک سنبھالی اور صوفی کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے کشاں کشاں مزار شریف کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ جگہ بھی مل گئی تھی۔ قوال بہت اچھے تھے اور بہت عمدہ قوالی گائی جا رہی تھی۔ دونوں نے فاتحہ خوانی کی اور اس کے بعد محفل قوالی میں جا بیٹھے۔ ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ جس جگہ ان لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ ملی تھی وہاں مزار شریف کے احاطے کی دیوار ختم ہوتی تھی اور اس کے بعد سیڑھیاں چلی گئی تھیں۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ رش کی وجہ سے زیادہ دور آگے نہیں جا سکے تھے۔ بس اسی جگہ کو غنیمت سمجھا گیا اور وہ اپنا ذوق پورا کرتے رہے پھر اچانک ہی ایک آواز سنائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے فیاض۔ کیا ہو رہا ہے نیند آ رہی ہے کیا" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ مرد کی آواز ابھری۔

"نہیں ری نیند نہیں آ رہی چکر آ گیا ہے ذرا سنبھال مجھے۔ چکر آ گیا ہے۔"

"ارے تو خود کو سنبھال فیاض! ہمیں کچھ ہو گیا تو ہمارے رحمت علی کو تو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہے ارے ہمیں ہی تو اس کے لیے کوشش کرنی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"میرے پاس یہ روٹی ہے۔ چپ چاپ کہیں بیٹھ کر کھا لو پیٹ میں کچھ نہیں ہو گا تو چل پھر نہیں سکو گے۔ یہیں کسی پیڑ کے نیچے گر کر مر جاؤ گے۔ لو کھا لو۔"

"ارے ارے اللہ رسول کا نام لیا جا رہا ہے اور میں بیٹھ کر روٹی کھاؤں۔"

"مر جاؤ گے فیاض علی مر جاؤ گے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ لو کچھ کھا لو۔"

"اور تم تو جیسے پیٹ بھرے بیٹھی ہوئی ہو حمیدہ! تم کب سے بھوکی ہو پتا ہے کچھ۔"

"کیا کھاؤں کیسے کھاؤں، اسے دیکھا تھا تم نے۔" عورت کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہاں دیکھا ہے۔"

"بات تک نہیں کرنے دی ہمیں اس سے۔"

"ہاں حمیدہ! پولیس والے بڑے سخت دل کے مالک ہوتے ہیں۔"

"ذرا سی بات کر لیتے ہم اپنے بیٹے سے تو کیا بگڑ جاتا ان کا۔"

"پگلی ہو بالکل پگلی ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ ماں باپ کے دل کیسے دکھی ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر کام کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں حمیدہ! ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے تو وہ ہمیں اس سے بات کر لینے دیتے۔"

"تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا فیاض علی! یہ میرے پاس جو تھوڑے سے پیسے ہیں۔ ہم انہیں دے دیتے۔ کیا ہماری بات ہو سکتی تھی اپنے بچے سے۔"

"پتا نہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"سوچو کچھ سوچو۔ فیاض علی ہمارا رحمت اگر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تو کیا ہو گا۔"

"اسی لیے تو مرشد کے قدموں میں آیا ہوں۔ مرشد دعا کرو دو اللہ سے، دعا کرو۔ مرشد سبھی تو تمہیں کچھ نہ دیتے ہوں گے۔ سبھی تو تمہیں کچھ نہ دیتے ہوں گے؟ ہمارے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ مگر فقیر کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ تو پھیلا سکتے ہیں۔ دعا کرو دو مرشد دعا کرو۔ مرد کی آواز لرزنے لگی تو عورت نے جلدی سے کہا۔

"خود کو سنبھال فیاض! خود کو سنبھال۔ دیکھو اللہ سے لو لگائی ہے۔ اللہ کچھ نہ کچھ تو کرے گا ہی۔ لو تمہیں اللہ کا واسطہ یہ کھا لو۔"

"بس تجھے تو ایک ہی پڑی ہوئی ہے یہ کھا لو۔ یہ کھا لو کس دل سے کھا لوں۔ پتا نہیں پولیس والے میرے بیٹے کو کچھ دے بھی رہے ہوں گے یا نہیں۔ جیل میں تو سنا ہے بڑی سختی کی جاتی ہے۔ کیسا منہ نکلا ہوا تھا جب عدالت میں اسے لایا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کیسی آنکھیں جھکالی تھیں اس نے۔"

"روٹی کھا لو پہلے۔"

"روٹی روٹی لگا رکھی ہے تو نے، مجھے اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ دکھا کیا ہے؟"

"یہ روٹیاں ہیں تھوڑی تھوڑی کھا لیتے ہیں اگر نہیں کھائیں گے تو چلا نہیں جائے گا۔ تم یقین کرو مجھے بھی چکر آ رہے ہیں فیاض۔"

"ٹھیک ہے مرشد کے قدموں میں پڑے رہیں گے۔ جب تک ہمیں روشنی نہیں دکھائیں گے وہ۔"

"میری تو کمر میں درد ہو رہا ہے رات کو جس درخت کے نیچے سوئے تھے بس..... سنا ہے درختوں کے نیچے تو سونا بھی نہیں چاہیے۔"

"ارے کون سی زندگی پانی ہمیں، ہمارا بیٹا چھوٹ جائے بس اس کے سوا ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"ہائے کیسے بچائیں ہم اپنے رحمت علی کو۔"

"ہم کیا بچائیں گے اللہ ہی بچائے گا۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے فیاض! جیسے یہ لوگ ہمارے رحمت علی کو مار ڈالیں گے۔"

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔"

"تو کیا کریں گے ہم؟"

"نہیں حمیدہ! کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے پھانسی ہوئی نا تو اسی پھانسی گھر کے سامنے ہماری لاشیں بھی پڑی ہوں گی۔ سمجھیں..... ہماری لاشیں بھی وہیں پڑی ہوں گی ارے یہ سہارا تو ہے نا ہمارے پاس، ہمارا رحمت علی اگر پھانسی چڑھ گیا تو ہم بھی خودکشی کر لیں گے۔ گناہ گار تو ہم ہیں ہی۔ جہنم میں جانا ہی ہے دنیا میں بھی اور آسمان میں بھی۔ ایک گناہ اور سہی۔"

"لوگوں نے کس طرح اپنا رویہ بدل لیا۔ سب ہی منہ موڑ گئے۔ دلاور نے کس طرح کہہ دیا کہ بھائی جیسی کرنی، ویسی بھرنی اب اپنے حالات خود دیکھو کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لو روٹی لے لو۔"

"اور تیرے پاس کیا ہے۔"

"لے لو نا قسم کھاتی ہوں مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔"

"تو مجھ سے کیوں کہے جا رہی ہے۔" مرد کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔

"تمہیں چکر جو آ رہے ہیں۔ پڑ گئے تو میں تو اٹھا کر کہیں لے جا بھی نہیں سکوں گی۔"

"پاگل ہو گئی ہے تو، جوان بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ میں تو اتنا چل سکتا ہوں حمیدہ کہ بڑے بڑے بھی چلنے کا تصور نہ کریں۔ میں چل لوں گا تو فکر مت کر۔"

"روٹی تو کھا لو تھوڑی سی تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

"کیا روٹی روٹی لگا رکھی ہے۔ کلیجہ چبا رہا ہوں اپنا کوئی گنجائش نہیں ہے۔ روٹی کی میرے پیٹ میں۔" فیاض کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔

"دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کھا لو۔"

"بہت تیرے کی۔ بلاوجہ قسمیں دے دیتی ہے۔ ساری زندگی تیری قسمیں پوری کرتا رہا ہوں۔ منع کروں گا تو کہے گی بدل گیا۔ لا ادھر لے آ..... لے آ۔" بڑی عجیب و غریب گفتگو تھی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ذہن قوالی سے ہٹ گیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے۔ کون ہیں یہ دکھ کے مارے اور کس طرح یہ آواز کانوں تک پہنچائی گئی ہے۔ یہ کیا قصہ ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے صوفی کی طرف دیکھا تھا صوفی بھی اپنی مجذوبانہ کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ سرگوشی میں بولا۔

"صوفی صاحب۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ نے یہ باتیں سنی ہیں۔"

"بحمد اللہ..... آپ کا کیا خیال ہے۔ جناب من کیا ہمیں ہی سنی تھیں یہ باتیں۔"

"کیا مطلب صوفی صاحب۔"

"حضور عالی! انہیں ہمارے کانوں تک پہنچایا گیا ہے۔ یہی تو رمز ہوتے ہیں بزرگوں کے درویشوں کی دعاؤں سے۔ کرنل رحیم شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔

"گویا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں صوفی صاحب! جو میں سوچ رہا ہوں۔"

"یہ ہم آہنگی ہی ہمارا درمیانی رشتہ ہے کرنل صاحب! ورنہ سچ یہ ہے کہ نہ کوئی لالچ نہ ضرورت نہ مجھے ہے نہ آپ کو۔ بس یہ انداز ہی ایک دوسرے کا ساتھ بنائے ہوئے ہے۔" صوفی کے لہجے میں ایک عجیب سی تمکنت پیدا ہو گئی اور کرنل رحیم شاہ متاثر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی صوفی بالکل ہی نئے رنگ میں نظر آتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ چور نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ دونوں روٹی کھا رہے تھے اور ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ کرنل رحیم شاہ کا دل بھی بھر آیا۔ کھاتے کھاتے دونوں ہی سسکنے لگتے تھے اور ان کے منہ سے آوازیں نکلتی تھیں۔

"یا ولی، یا پیر، یا مرشد، مشکل حل کر دے ہماری مشکل حل کر دے۔ تیرا احسان ہو گا دعا کر دے۔ ہمارے رحمت علی کے لیے اللہ سے، تیری دعاؤں میں ہماری دعاؤں سے کہیں زیادہ قوت ہے۔ دعا کر دے ولی ہمارے لیے، بڑی آس لے کر آئے ہیں تیرے در پر، بے سہارا ہیں کوئی پرسان حال نہیں ہے مدد کر دے ہماری ولی، مدد کر دے۔ تیری دعائیں ضرور کارگر ہو سکتی ہیں ہمارے لیے، بچا لے ہماری زندگی بھر کی کمائی کو، اور کچھ نہیں ہے ہمارے پاس، ہمارے رحمت علی کے سوا۔ بچا لے ولی، بچا لے ولی....." صوفی اور کرنل رحیم شاہ دم بہ خود تھے۔ محفل قوالی صبح پانچ بجے تک چلتی رہی اور پانچ بجے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ زائرین اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"صوفی صاحب! میں جا کر گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔ آپ ان دونوں کو ٹریس کیجیے۔"

"درویش رحم کریں ٹھیک ہے۔" اور اس کے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب صبح کے ساڑھے چھ بجے کا وقت ہوا صوفی کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچا۔

"دونوں ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو گئے ہیں غالباً یہاں رکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ہاں عرس ابھی کافی دن تک جاری ہے لیکن صوفی صاحب انہیں لے کر چلتے ہیں ہم، ان کے مسئلے کو دیکھنا ہو گا ویسے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ کام ہمیں کرنا چاہیے نا۔"

"اب بھلا کسی خیال کی کیا گنجائش ہے۔ حضور من درویشوں کی دعاؤں سے بزرگوں کا حکم ہو چکا ہے اور میں تو پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ مرشد فضل کمال نے دعوت ہی ہمیں اس کام کے لیے دی تھی اپنا فرض لے کر یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"بالکل صوفی صاحب! ویسے بھی طویل عرصہ ہو گیا ہے ایک طرح سے معطل ہی بیٹھے ہوئے ہیں ہم۔ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی چاہئیں۔ ویسے میرا ایک اور خیال ہے اس بارے میں۔"

"کیا درویشوں کے کرم سے۔"

"بھئی دیکھیے۔ ملکی دفاع تو سرزمین وطن کے ایک ایک چپے پر کیا جاتا ہے۔ ہم یہ دفاع کس لیے کرتے ہیں کہ اہل وطن مشکلوں سے نکلیں انہیں ہر لمحے اپنوں کا تحفظ حاصل ہو۔ ملک دشمن اگر سرزمین وطن پر برائیوں کی کارروائی کریں تو ہم ان کے سامنے سینہ چوڑا کر کے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس طرح اگر کوئی مظلوم دادرسی کا خواہش مند ہو تو کیا وہ ہمارا ہم وطن نہیں ہے۔ کیا اس کی یہ مشکل دور کرنے کے لیے کوشش کرنا ہمارا فرض نہیں ہے۔ صوفی صاحب ایک طرح سے ایک نئی جہت ذہن میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم خود کو صرف مخصوص راستوں کا راہی نہ بنائیں۔ بلکہ مشکل جہاں کہیں بھی ہمارے سامنے آئے ہم اس میں اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں صوفی صاحب یہ تو بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ دو مظلوم جس طرح ہمارے سامنے ہیں اصولی طور پر ہم پر سکون حرام ہو جانا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا۔

"آیئے پھر نکل چلیں یہاں سے، کام جتنی جلدی ہو زیادہ بہتر ہے پتا نہیں کیا صورت حال نکلے ویسے گاڑی جا سکتی ہے وہاں جہاں وہ موجود ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی بالکل۔" صوفی نے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کرنل رحیم شاہ اس کے برابر بیٹھ گیا اور پھر وہ لوگ وہاں جا کر کے جہاں وہ دونوں بے چارے میلی کچیلی چادریں اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ کرنل رحیم شاہ نے اشارہ کیا اور صوفی نیچے اتر گیا۔ پھر اس نے فیاض علی کو جگایا تھا۔ فیاض علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہو گیا بھائی صاحب۔"

"اٹھیے اور انہیں بھی اٹھائیے۔"

"ایں۔ کیا ہم غلط جگہ سو گئے ہیں۔ یہ آپ کی جگہ ہے کیا؟"

"ہر جگہ اللہ کی ہوتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے آپ اٹھیے اور انہیں بھی اٹھائیے۔"

"حمیدہ! حمیدہ! اٹھ نا۔" عورت بھی جاگ گئی تھی۔

"آیئے۔"

"کک..... کہاں؟"

"آیئے بعد میں بتا دیں گے۔" صوفی نے فیاض علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ہاتھ کی گرفت کافی سخت تھی وہ اسے گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ تو فیاض علی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھیے بھائی جی۔ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو ہم تو عرس پاک میں شرکت کے لیے آئے تھے اور رات کو قوالیاں سنتے رہے تھے پھر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے۔ کوئی بات ہو گئی ہے تو ہمیں بتایئے ہم تو ویسے ہی مرے ہوئے ہیں۔"

"آپ آیئے درویشوں کے کرم سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"گگ..... گاڑی میں کیوں بٹھا رہے ہیں آپ ہمیں۔ پولیس والے ہیں بھائی صاحب۔ کچھ بتا تو دیجیے۔"

"آیئے حمیدہ بہن! آپ بھی آ جایئے۔ بے فکر رہیں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" بہ مشکل تمام ان دونوں کو گاڑی میں بٹھایا گیا اس دوران صوفی نے دروازے لاک کر دیے اور اسٹیئرنگ پر آ بیٹھا سیدھے سادے لوگ تھے۔ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھتے لیکن راستے بھر وہ چیختے چلاتے رہے تھے۔

"ہمیں ہمارا قصور تو بتا دیجیے بھائی جان! ارے آپ کو نہیں معلوم ہم تو ویسے ہی ادھ مرے ہیں۔ دعا مانگنے آئے تھے مزار پاک پر بھائی جان کہاں لیے جا رہے ہیں بتا تو دیجیے۔"

"جو لوگ بزرگوں کے مزاروں پر آتے ہیں نا انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بلکہ فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں۔ آپ آیئے بے فکر ہو کر بیٹھیے۔" پھر گاڑی گرین ہاؤس کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ کیس گرین ہاؤس ہی کا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کو وہاں لے جانے میں کوئی الجھن نہیں محسوس کی جا سکتی تھی۔ دونوں بے چارے بری طرح بدحواس تھے۔

"فیاض علی اور حمیدہ بہن! پہلے بھی میں نے آپ سے کہا تھا درویشوں کی دعاؤں سے کہ جو لوگ بزرگوں کے مزارات پر جاتے ہیں۔ انہیں فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں نقصان نہیں ہوتے۔ آپ آرام

سے اندر آ جایئے۔ جس مقصد کے لیے آپ گئے تھے۔ اس میں ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

"ارے بھائی! آپ کو نہیں معلوم ہمارا مسئلہ کیا ہے ارے بھائی! پتا نہیں کیوں لے آئے ہیں آپ ہمیں یہاں ارے بھائی کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیجیے۔" فیاض علی گڑگڑاتا رہا۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ انہیں کمرے میں لے آئے اور پھر دلاور کی بیوی سے کہا گیا کہ حمیدہ کے کپڑے وغیرہ بدلائے۔ اسے نہانے کو کہے۔ غلام قادر کے حوالے فیاض علی کو کر دیا گیا تھا۔ غلام قادر نے کہا۔

"اڑے ماں قسم تم تو کتے کا مافق ٹیاؤں، ٹیاؤں کرتا پڑا ہے ڑے۔ اڑے چلو ابھی کپڑا بدل لو نہیں تو دیں گا ایک فیٹ۔ بولے جا رہا ہے بولے جا رہا ہے۔"

بہرحال غلام قادر کی اپنی ایک فطرت تھی۔ دونوں کے لباس تبدیل کرائے گئے اور اس کے بعد ناشتے کے کمرے میں لے جایا گیا۔ بہترین ناشتا لگا دیا گیا تھا۔ فیاض علی نے کہا۔

"آپ لوگ تو یوں لگتا ہے جیسے الف لیلہ کے بادشاہ ہوں۔ ہارون الرشید کی بیگم نے منصور نامی نوجوان کو ایک رات کے لیے اغوا کر کے اپنی رہائش گاہ میں بلایا تھا اور اسے یہ بتا دیا تھا کہ وہ بادشاہ ہے۔ بس اس کے بعد بے چارہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی مر گیا۔ خود کو بادشاہ سمجھنے لگا لیکن ہمارا معاملہ بھائی کچھ اور ہے ہم درد کے مارے غم زدہ لوگ ہیں۔"

"آپ ناشتا کیجیے ناشتا کرنے کے بعد مجھے آپ سے تفصیلی گفتگو کرنی ہے۔ مختصر الفاظ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ رات کو جب آپ محترم بزرگ فضل کمال کے مزار پر اپنے بیٹے رحمت علی کے لیے دعائیں مانگنے کے لیے گئے تھے تو ہم آپ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے آپ دونوں کی باتیں سنیں اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی بھرپور مدد کی جائے گی۔ رحمت علی کو قانون کے چنگل سے بچایا جائے گا خدا کرے۔ وہ جس کیس میں بھی ملوث ہوا ہے وہ جھوٹا کیس ہو۔ تاکہ ہمیں سچائی ثابت کرنے میں آسانی ہو۔ آپ سمجھ لیجیے کہ یہ بزرگ فضل کمال صاحب کا ہی کمال ہے۔ اور آپ اس پر بھروسا کیجیے۔ چلیے اب ناشتا کیجیے۔" جواب میں فیاض علی رو پڑا۔ پھر بولا۔

"جانتے ہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے میرے بیٹے کو کیا کھانے کو ملا ہوگا۔"

"دیکھیے..... بے شک آپ ماں باپ ہیں۔ میں آپ کے جذبات کا احترام کرتا ہوں لیکن جب کچھ لوگ خلوص دل سے آپ کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ ہوں تو آپ کا تعاون ضروری ہے۔"

"جی....."

"چلیے ناشتا کیجیے۔ اسے آج جو کچھ مل رہا ہے کل وہ نہیں ہوگا۔ آپ ہمیں بھرپور طریقے سے اس کے بارے میں بتایئے۔ ناشتے کے بعد۔" آخرکار کرنل رحیم شاہ اور صوفی، فیاض علی کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ آہوں اور سسکیوں کے دوران اس نے کہا۔

"بس بھائی جان جی! یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کب اسے کس کا امتحان لینا ہے ہم جی رحیم یار خان کے ایک چھوٹے سے گاؤں شیخ امانت کے رہنے والے ہیں۔ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے، وہیں زندگی گزاری ابا مرتے ہوئے ایک چھوٹی سی دکان چھوڑ گئے تھے۔ بستی شیخ امانت کے پرانے رہنے والے تھے۔ بستی میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مڈل اسکول بھی تھا۔ چھٹی جماعت تک پڑھائی کی۔ اس کے بعد ابا مر گئے تو دکان سنبھال لی بڑی چھوٹی سی دکان تھی جی۔ اتنی کہ بس دال روٹی مل جائے۔ اللہ نے بیٹا دیا۔ شادی پڑوسیوں نے کرادی تھی بس ایک ہی بیٹا ہوا ہمارا اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی رحمت علی نام رکھا تھا ہم نے اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جی اسے ہم نے مڈل تک پڑھالیا۔ بڑی امیدیں لگا رکھی تھیں اس سے۔ پھر جب وہ جوان ہوا تو رشتے کے ایک بھائی کی بیٹی سے اس کی منگنی کردی۔ دلارے خان بڑا بے وفا نکلا جب منگنی ہوگئی تو بیٹے کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوگئی کہ کمائی کرے ہمارے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا صاحب جی! بستی شیخ امانت میں بھلا نوکری کس کے پاس ہوتی زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی کسی کی بھینس چرالے۔ یا کسی کے کھیت سے آلو نکال لے۔ لیکن ہم یہی چاہتے تھے اور ہمارا بیٹا رحمت علی بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ بن کر بہو بیاہ کر لائے۔ یہ اس کی آرزو تھی جی۔ ہم سے بات ہوئی تو ہم نے کہا بیٹا! جیسا تو مناسب سمجھ کر۔

بس جی کہنے لگا شہر جا کر نوکری کروں گا ہم نے کبھی شہر نہیں دیکھا تھا اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بستی شیخ امانت کے کچھ لڑکے شہر میں کام کرتے تھے۔ ترقی کر گئے تھے جی ہم نے سوچا کہ اللہ ہمارا بھی ہاتھ تھام ہی لے گا۔ دل پر پتھر رکھ کر بیٹے کو شہر بھیجا اور اس کے لیے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئے جی۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کا خط ملا اور اس نے بتایا کہ اسے کام مل گیا ہے۔ ویسے ایک گھر میں چاکری مل گئی ہے پانچ سو روپے تنخواہ ہے گھر والوں نے کہا ہے کہ اگر اس نے ٹھیک سے کام تو اس کی ترقی بھی ہوجائے گی۔ ہمارے لیے تو پانچ سو صاحب جی یہ سمجھ لیجیے کہ پانچ ہزار تھے۔ دکان کی آمدنی سوڈیڑھ سو روپے مہینہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ ہم لوگ خواب دیکھنے لگے کہ بس اب تو سارے دلدّر دور ہوگئے حمیدہ کہتی تھی کہ تھوڑے سے پیسے جمع کر کے سب سے پہلے رحمت علی کی شادی کریں گے۔ یہ جھونپڑی اسے دے دیں گے اور اس کے باہر تھوڑی سی چھت اور ڈال لیں گے گھاس پھونس کی اور اس میں ہم گزارہ کرلیں گے۔ بہو بیٹے اندر رہیں گے اور ہم باہر کبھی کبھی ہم خوابوں میں کھو جاتے تھے صاحب جی! ہم کہتے تھے کہ ہمارے رحمت علی کے ہاں اولاد پیدا ہوگی تو ہم کہاں رہیں گے۔ بس جی زندگی میں تھوڑی سی خوشیاں آ گئی تھیں۔ اور اس طرح کوئی چھ سات مہینے گزر گئے۔

لیکن پھر یہ خوشی کالی ہوگئی تھی جی اچانک ہی رحمت علی کے خط بھی آنا بند ہوگئے اور پیسے بھی۔ ایک مہینہ گزرا دو مہینے اور پھر جب تین مہینے گزر گئے تو ہم بری طرح پریشان ہوگئے۔ حمیدہ کہنے لگی کہ کہیں رحمت علی بھٹک تو نہیں گیا۔ اس نے ہم سے رشتہ تو نہیں توڑ لیا۔ شہر میں وہ کسی کے جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ پر جی لاچار کیا کرتے ہاں وہ خط موجود تھے جن میں اس گھر کا پتا بھی تھا۔ جہاں وہ کام کرتا تھا ہم نے ہمت کی اور دکان بند کر کے شہر آ گیا۔ بڑے صاحب شہر ہم جیسے دیہاتیوں کے لیے وہ جگہ ہوتی ہے۔ جہاں آ کر ہماری عقل کھو جاتی ہے۔ پورے چودہ دنوں میں مجھے اس کوٹھی کا پتا لگا تھا جہاں میرا رحمت علی کام کرتا تھا۔ کوٹھی پر پہنچ گیا اور پھر وہاں نوکروں سے ہاتھ جوڑ کر معلوم کیا تو انہوں نے ایک بری کہانی سنائی ہمیں۔ انہوں نے بتایا جی رحمت علی..... فیاض علی کی آواز ہچکی میں بدل گئی اور حمیدہ زار و قطار رونے لگی۔ صوفی نے دلاور سے پانی لانے کے لیے کہا۔ فیاض علی کو پانی پلایا گیا اور یہ مشکل تمام وہ سنبھل سکا۔

''انہوں نے بتایا کہ رحمت علی کو اس کوٹھی کے مالک کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے اور وہ اب جیل میں ہے۔ بس جی سینہ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا میں تو، نوکروں کو مجھ پر رحم آ رہا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ تو میں نے اسے بتایا کہ بھائی اس کا باپ ہوں میں۔ شیخ امانت بستی سے آیا ہوں تب مجھے نوکر نے تفصیل بتائی۔'' فیاض علی اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ شازیہ نے حمیدہ کو سہارا دے کر کہا۔

''آپ بالکل بے فکر رہیں اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو ہم اسے جیل سے نکال لیں گے سمجھ لیجیے ہم یہی کام کرتے ہیں۔''

''چپ ہو جا حمیدہ۔ چپ ہو جا شکر ادا کر بزرگ پیر فضل کمال شاہ کا۔ انہی کے مزار پر منتیں مان رہے تھے نا ہم ارے یہ بزرگ خود تو نکل کر کام نہیں کرتے سہارا ہی پیدا کرتے ہیں نا۔ صاحب جی ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ آپ یقین کرلو۔ ماں باپ اپنی اولاد سے واقف ہوتے ہیں۔ صاحب جی اپنے بچوں کے ایک ایک عمل کو جانتے ہیں وہ۔ رحمت علی مر کر بھی کسی کو نہیں مار سکتا وہ تو بڑا معصوم ہے جی۔ ہمیں نوکروں سے جو بات معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ جی رحمت نے رات کی تاریکی میں مالک کو چھرا مار کر ہلاک کر دیا اور سامان سمیٹ کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کی تاریکی میں چونکہ گیٹ پر پہرہ ہوتا ہے اور نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے سامان اپنے پلنگ کے گدے کے نیچے چھپا دیا اور انتظار کرنے لگا کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائے۔ مگر رات ہی میں اسے پکڑ لیا گیا اور اب وہ مالک کے قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے صاحب جی۔ سب اپنے بچوں کو بے قصور سمجھتے ہیں۔ مگر میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ رحمت علی نہ چور ہوسکتا ہے اور نہ قاتل۔ وہ کسی کو نہیں مار سکتا صاحب جی۔ نوکروں سے ساری معلومات حاصل کر کے میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی جی۔ اس کے بعد میں نے کیا کیا پاپڑ بیلے اللہ جانتا ہے اور بعد میں، میں نے اپنے رحمت علی سے ملنے کی کوششیں شروع کردیں۔ مجھ جیسے دیہاتی کو اس میں کیا مشکلات پیش آئیں کہنا بے کار ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔ بہر حال پھر جیل میں میری ملاقات میرے رحمت علی سے ہوئی صاحب جی! جالیوں کے پیچھے ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔'' فیاض علی نے یہ مشکل تمام اپنے لہجے کو سنبھالا پھر بولا۔

''صاحب جی۔ مجھے دیکھ کر بلک بلک کر رو پڑا۔ اس نے اپنی ماں کی قسم کھائی کہ اس نے نہ چوری کی ہے نہ قتل کیا ہے صاحب جی! میں جانتا ہوں وہ ماں کی قسم کبھی جھوٹی نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ اس نے کچھ نہیں کیا مگر صاحب جی! ہم اس کے لیے کیا کرتے۔ میری تو سمجھ ہی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ ہانپتا کانپتا بستی پہنچا اور حمیدہ کو ساری بات بتادی اس کے علاوہ ہمارا اور تھا بھی کون۔ ہم دونوں کی کیا حالت ہوئی تھی اللہ بہتر جانتا ہے۔ بس جی ہاتھ پاؤں ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مگر اپنے بیٹے کو جس عالم میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ پاؤں میں پھر زندگی پیدا ہوگئی۔ بستی کے سیانوں سے مشورے سے سب کو بتادیا ہے کہ کیا ہوگیا دلارے خاں بھی آ گیا تھا۔ سنگ دل پتھر آنکھیں بدل لیں بچپن کے ساتھی نے، ارے برا وقت تو کسی پر بھی آ سکتا ہے اللہ سے توبہ کی جائے معافی مانگی جائے۔ اس نے ہم پر بہت سی تہمتیں لگائیں اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا بستی کے لوگ مشورہ دے رہے تھے کہ شہر جا کر رحمت علی کے لیے کارروائی کی جائے مگر ہم جیسے غریب لوگ، جب ایسی بیماری ہم پر آ جاتی ہے جس کا علاج لاکھوں میں ہوتا ہو تو خاموش ہو کر بیٹھ جاتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اور اپنے بیمار کو مردہ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ ہم ان کا علاج نہیں کرا سکتے۔ ہمارے پاس چھوٹی سی دکان تھی ایک جھونپڑی تھی بس یہ بیچ دی اور شہر آ گئے۔ یہاں آ کر وکیلوں کے دروازوں کے چکر لگائے۔ ایک وکیل صاحب ہمارا کیس لڑنے پر تیار ہو گئے۔ ہم جو کچھ لائے تھے ان کے حوالے کر دیا انہیں وہ پسند نہیں آیا برا بھلا کہا ہمیں اور ہم ان کے پیروں میں پڑ گئے ہم نے اسے کہا کہ وکیل صاحب ہم اپنے بیٹے کی جان کی قیمت نہیں دے سکتے لیکن غلامی کریں گے آپ کی۔ بہر حال مقدمہ چالو ہو گیا صاحب جی! مگر یہ ہمیں پتا چل گیا کہ ہمارا مقدمہ آسان نہیں تھا۔ اگر ہم اپنے منہ سے کہتے کہ ہمارا بیٹا بے گناہ ہے تو کون مانتا؟ ہماری حیثیت ہی کیا تھی۔ صاحب جی! بس اس کے بعد مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ابھی تین دن پہلے پیشی تھی۔ پیلا رنگ پڑ گیا ہے صاحب جی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیا گبھرو جوان تھا۔ دیکھنے دکھانے کے قابل پر اب اس کا جو حال ہو گیا ہے صاحب!" ایک بار پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

♥.....♥.....♥

"کرنل رحیم شاہ، صوفی، شازیہ، عادل اور فیضان سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کے چہرے کے نقوش پتھرائے ہوئے تھے۔ البتہ منہ جگالی کر رہا تھا اور عادل اور فیضان نے کئی بار اسے جگالی کرتے ہوئے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے۔ پھر اچانک ہی صوفی کے منہ سے غاؤں غاؤں کی آواز نکلی اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ غسل خانے میں جا کر منہ میں بھرا ہوا سرخ طوفان منہ کی گرفت سے آزاد کیا اس کے بعد کلیاں کیں اور پھر اس سرخ طوفان کے جو آثار غلاظت پھیلے ہوئے تھے ان کی صفائی کرنے لگا۔ باہر فیضان ناک چڑھا کر کہہ رہا تھا۔

"چھوٹے بابا بہت اچھے آدمی ہیں۔ لیکن پتا نہیں یہ پان ان پر کیوں سوار ہو گیا۔ اگر وہ اس غلاظت کے شکار نہ ہوں تو کتنی اچھی بات ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے مسکراتی نگاہوں سے فیضان کو دیکھا اور بولا۔

"فیضان! لوگوں میں پتا نہیں کیا کیا برائیاں ہوتی ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے۔ اس بے چارے کی زندگی کا یہی ایک ساتھی اور مقصد ہے اور حقیقی بات یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے ہمیں اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کی اس چھوٹی سی برائی کی پذیرائی کرنی چاہیے۔"

"پتا نہیں انکل صوفی صاحب کا ماضی کیا ہے۔ کبھی ان کے ماضی کی ایک جھلک بھی سامنے نہیں آتی۔ ویسے میں ان کی رہائش گاہ دیکھ چکا ہوں اتنی سادہ اور عجیب سی زندگی ہے کہ بس عقل حیران رہ جائے۔"

"اس کا وہ ماضی جو بالکل ہی پوشیدہ ہے، ہے تو واقعی قابل تجسس لیکن جتنی معلومات مجھے اس کے بارے میں ہیں وہ یہی ہیں کہ بہت ہی نفیس انسان ہے اور نفس کشی کرتا ہے حقیقی معنوں میں انسانیت کے ان اصولوں پر کاربند ہے۔ جس کا حکم دے کر انسان کو اس کائنات میں بھیجا گیا ہے۔ اپنی ذات پر توجہ دینے کے بجائے وہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کرتا رہا ہے۔ بڑے اچھے اچھے عہدے ملے ہیں اسے لیکن بس وہی اپنی فطرت سے محبت اور اس کو تبدیل نہ کرنے کا شاخسانہ بھگتا رہا ہے۔" یہ لوگ صوفی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ صوفی اندر سے باہر نکل آیا۔ منہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی گہرائی دیکھ کر یہ

اندازہ ہوتا تھا کہ صرف ایک چغد ہی نگاہوں کے سامنے نہیں ہے بلکہ جب سوچ میں ڈوبا ہو تو چہرے پر ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھے غور کرے اور ان کا قائل ہو جائے۔ پھر وہ ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"جی صوفی صاحب! کچھ فیصلے کیے ہوں گے آپ نے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"وہی مطلب ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا صوفی نے ایک پیڈ اور پین اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر لکھنے لگا پھر بولا۔

"نمبر ایک درویشوں کے کرم سے۔"

"جی جی بالکل نمبر ایک درویشوں کی دعاؤں سے۔" عادل نے شرارت سے کہا۔

"ہمارے سامنے وہ گھرانا ہے۔ جس کی تفصیل ابھی تک ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن ہمیں اس کے بارے میں تحقیقات کرنا ہوں گی۔ یہ کام شازیہ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ شازیہ آپ کو بہت جلد اس گھرانے کی تفصیل فراہم کر دی جائے گی۔ آپ یہ کام کر لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھرپور کوشش کروں گی۔"

"میرا مطلب ہے جس شخص کو قتل کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں رحمت علی نے ملازمت کی تھی۔ کیا ہے وہاں کی تفصیل یہ شازیہ کو معلوم کرنا ہوگی۔ اس کے بعد ہم عادل اور فیضان کو آگے بڑھائیں گے۔ کرنل صاحب ہمیں ایک کام کرنا ہے پہلے تو ہم سبھی شیخ امانت جا کر رحمت علی اور اس کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا کام اس وکیل سے ملاقات کرنا ہوگا جسے ان بے چاروں نے اپنا گھر بار بیچ کر معاوضہ ادا کیا ہے۔ یہ ساری تفصیل اس طرح سے ہوگی یعنی ہم کام کو مختلف حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں صوفی صاحب! تھوڑی سی تبدیلی اس طرح کر لیجیے کہ میں عادل اور فیضان کو لے کر بستی امانت شیخ چلا جاتا ہوں۔ شازیہ کو معلومات فراہم ہو جائیں تو یہ اپنی رپورٹ تیار کر لیں اور صوفی صاحب آپ ان وکیل صاحب کا تعاون حاصل کیجیے گا۔ اصل میں آپ کافی عرصے پولیس سے وابستہ رہے ہیں۔ وکیلوں اور پولیس کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ ان سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"جی..... ٹھیک ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ شازیہ نے اپنے مشن کی تیاریاں کیں یہ ایک ذہین لڑکی تھی اور پہلی بار یہ کسی ایسے سول معاملے میں اپنا کام کرنے کے لیے نکلی تھی۔ دوسری طرف کرنل رحیم شاہ نے عادل اور فیضان کے ساتھ بستی امانت شیخ پہنچے۔ بستی کی واحد مسجد میں نماز ختم ہوئی تھی اور نمازی مسجد سے باہر نکل رہے تھے رحیم شاہ نے عادل سے جیپ روکنے کے لیے کہا۔ اور پھر ایک نمازی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"بھائی صاحب بات سنیے گا۔"

"جی کہیے جناب۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر آپ کے پاس وقت ہے۔ تو میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کہیے وقت ہی وقت ہے۔"

"کوئی ایسی جگہ ممکن ہے جہاں ہم تھوڑی دیر بیٹھ سکیں گے۔"

"آپ کی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔" خاصا بے مروت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اس طرح کی چھوٹی بستیوں اور آبادیوں میں اس قدر باخلاق اور مہمان نواز لوگ ہوا کرتے ہیں کہ کبھی کبھی تو ان کی مہمان نوازی پر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ شخص ان روایتوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔"

"آیئے پھر بیٹھ جایئے۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور وہ شخص جیپ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

"اصل میں مجھے کچھ معلومات کرنی تھی ایک شخص کے بارے میں۔"

"ہاں جی حکم کرو۔ بستی کے ہر ایک آدمی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"میں فیاض علی شاہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"فیاض علی۔ او جناب وہ شاہ کیسے ہو گیا۔ بتانا پسند کریں گے آپ۔"

"تمہیں اس بات پر اعتراض ہے۔"

"نہیں جی۔ جس نے بھی اس کے بارے میں آپ کو یہ بتایا تھا کہ اس کا نام فیاض علی شاہ ہے۔ تو غلط بتایا ہے جناب! فیاض علی ہے اس کا نام بستی ہی کا رہنے والا تھا ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ بس جناب وہ جو کہتے ہیں نا کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا اب پتا نہیں اس کا مطلب کیا ہے اور ایک بات تو ہم جانتے ہیں کہ باپ نے کم گل نہیں کھلائے ہوں گے جو بیٹے نے کھلائے اللہ بھی بڑا کارساز ہے جی۔ بال بال بچا لیا اس نے ہمیں۔"

"آپ تو بہت کچھ جانتے ہیں فیاض علی کے بارے میں۔"

"شکریہ جی! اس بار آپ نے اسے شاہ نہیں کہا۔ بڑا غصہ آتا ہے ہمیں۔ ہم نہیں جانیں گے اس کے بارے میں تو اور کون جانے گا۔ اے میاں صاحب! ہماری بیٹی کی زندگی برباد ہوتے ہوتے بچ گئی۔ اللہ نے بچا لیا اگر شادی ہو جاتی جیسے فیاض علی کہہ رہا تھا کہ دلارے بھائی نکاح کر لو منگنی تو بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ میں نے کہا کہ فیاض علی ہمارے پاس ابھی بندوبست نہیں ہے اور نکاح وکاح کر کے لٹکانا نہیں چاہیے لڑکی کو منگنی کا تو معاملہ یہ ہے کہ جی ہوئی ہوئی نہ ہوئی ٹوٹ گئی۔ پر نکاح کا مسئلہ تو خراب ہو جاتا ہے جی۔ بس جی اللہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ بیٹا قاتل نکلا۔ لکھ پتی بننے جا رہا تھا، لک کو مار دیا سسرے نے۔ اپنے مالک کو قتل کر دیا جس کا نمک کھایا اسے قتل کر دیا صاحب جی ایک بات آپ کو بتائیں بس جی دیگ کا ایک چاول دیکھا جاتا ہے جس بندے نے اپنے ان داتا کو مار ڈالا ہو وہ کسی اور کی کیا عزت کرے گا۔ بچ گئی ہماری بیٹی بال بال۔" عادل اور فیضان نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ کرنل رحیم شاہ بھی سمجھ گیا کہ یہی وہ دلارے خاں ہیں جس کی بیٹی سے منگنی ہوئی تھی فیاض علی کے بیٹے کی۔ یہ شخص واقعی برا آدمی تھا۔ اس نے پوچھا۔

"مگر صاحب جی آپ اس کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہو وہ تو اپنی دکان اور جھونپڑی بیچ کر چلا گیا۔ بدمعاش بیٹے کا مقدمہ لڑنا تھا اسے اب اس کا اس بستی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"تعلق ہے دلارے خاں! سمجھے تعلق ہے۔"

"کیا تعلق ہے جی؟"

"ابھی رحمت علی پر مقدمہ چل رہا ہے سزا نہیں ہوئی اسے پیشیاں ہو رہی ہیں ہو سکتا ہے وہ اپنے مالک کا قاتل نہ نکلے سمجھے۔ ایسی صورت میں اگر وہ قاتل نہ ہوا تو بھلا پھر ہم اسے مجرم کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اور پھر تمہاری بیٹی کا معاملہ ہے۔ منگنی توڑی تو نہیں ہے تم نے اس سے۔"

"او یار کیا بات کرتے ہو۔ اب بھلا رحمت علی سے کوئی اپنی اولاد کی تقدیر پھوڑے گا جیل میں ہے وہ آپ کو پتا ہے۔"

"ہاں ہے تو جیل میں مگر ابھی تو مقدمہ چل رہا ہے بھائی ہو سکتا ہے اس پر قتل کا الزام جھوٹا ہو۔"

"او بھائی جان! کچھ بھی ہے اب اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گا۔ بدنام ہو چکا ہے وہ۔ میں خود بھی بدنام تھوڑی ہونا چاہتا ہوں کوئی۔"

"مگر یہ تو زیادتی ہے تمہاری اگر وہ مجرم نہ نکلا تو پھر تو تمہیں یہ رشتہ نہیں توڑنا چاہیے۔"

"او میاں! تمہاری کوئی بیٹی ہے یہ بتاؤ مجھے، کیا رکھا ہے اس ننگے بھوکے کے پاس؟ رہنے کا ٹھکانا تک تو نہیں رہا اب اس کا۔ فرض کرو اگر وہ جیل سے چھوٹ بھی گیا تو کیا کرے گا۔"

"دیکھو دلارے خاں! بات اصل میں یہ ہے کہ ابھی اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جب تک فیصلہ نہ ہو جائے تمہیں اس کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر میاں بھائی تم کون ہو۔"

"میں جو کوئی بھی ہوں ایک بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں یہ خیال اپنے دل سے نکال دو خاص طور سے اس وقت تک جب تک کہ اس مقدمے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

"چھوڑو بھئی چھوڑو۔ میں تو اپنی بچی کے رشتے کے لئے ایک دو جگہ بات بھی کر چکا ہوں مجھے نہیں کرنی اب اس لڑکے سے شادی چاہے مجرم ہو یا نہ ہو۔"

"یہ ظلم ہے دلارے خاں میں نے سنا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے جی! ہم ان کی پسند کو دیکھیں یا اپنی عزت کو دیکھیں۔"

"مان لو میری بات دلارے خاں!"

"او بھائی تو جا اپنا کام کر لنگڑا کہیں کا دلارے خاں کو مجبور کرنے آیا ہے؟ ہماری بیٹی ہے کنوئیں میں ڈال دیں ہم۔"

"اچھا..... عادل چلو ذرا۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور عادل نے چونک کر کرنل رحیم شاہ کو دیکھا اور اس کے بعد جیپ اسٹارٹ کر دی۔ دلارے خاں کچھ نہیں بولا تھا لیکن جب جیپ برق رفتاری سے بستی امانت شیخ سے باہر نکل آئی تو وہ بوکھلا کر بولا۔

"ابے او کدھر جا رہے ہو دماغ خراب ہوا ہے روکو گاڑی۔ روکو میں کہتا ہوں کہاں جا رہے ہو۔ اغوا برائے تاوان، کیا کر رہے ہو ارے روکو بھائی۔"

"کود جاؤ دلارے خاں! اچھا ہے یہیں تمہارا بھیجا کسی پتھر سے ٹکرا کر نکل جائے تم جیسے آدمی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مر جانا بڑا ضروری ہوتا ہے۔"

"ابے لو ابے لو۔ ابے میں نے کیا کر دیا بھائی۔" عادل کو مزہ آ رہا تھا اس نے جیپ کی رفتار اور تیز کر دی۔ دلارے خاں شور مچاتا رہا۔ نہ جانے کرنل رحیم شاہ نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ جیپ دوڑتی رہی دلارے خاں چیختا رہا اور پھر صبر کر کے بیٹھ گیا۔

"میری بات تو سنو۔ چاہتے کیا ہو تم۔"

"کچھ نہیں دلارے خان! تمہیں کچھ دن رحمت علی کے ساتھ جیل میں رکھا جائے گا تھوڑی سی مرمت کی جائے گی تمہاری اور اس کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گے اور یہ خیال دل سے نکال دو گے کہ اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کر دو۔ ہم تو تم سے صرف اتنا ہی کہہ رہے تھے کہ تم تھوڑا سا انتظار کر لو۔"

"ابے تو بھیا! میں کون سی شادی کیے دے رہا ہوں کل۔"

"نہیں شادی تو تم بے شک نہیں کیے دے رہے۔ لیکن تمہارے ارادے جو برے ہیں۔"

"مگر پیارے بھائی تم ہو کون۔ کیا تم مجھے جیل میں ڈال دو گے۔"

"ہاں۔ ہمارا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے اگر بات تمہاری سمجھ میں آ جائے تو۔"

"آ گئی آ گئی۔ مگر فوج رحمت علی کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔"

"یہ سرکاری راز ہیں لیکن ایک بات تم سن لو۔ اگر تم نے اس وقت تک اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو ملٹری تمہارے گھر پر چھاپہ مارے گی اور اس کے بعد تمہارا جو کچھ ہوگا وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"تو یہ بات تم وہیں کہہ دیتے۔ پیارے بھائی! میں مان لیتا۔ بھلا اپنی فوج کا حکم کون نہیں مانے گا۔"

"تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔"

"نیچے اتار دو پیارے بھائی! بس مل جاتی ہے ادھر سے بستی جانے کے لیے، میرے بیوی بچے تو خوف سے مر جائیں گے کہ دلارے خاں کہاں چلا گیا۔"

"دلارے خاں ہم تمہارے پاس آتے رہیں گے۔ ایک وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اگر رحمت علی مجرم نکلا تو تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس مقدمے کا فیصلہ ہوئے بغیر تم نے اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو کم از کم تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تیار ہوں۔"

"گاڑی روک دو۔" کرنل رحیم شاہ نے عادل سے کہا اور عادل نے گاڑی روک دی پھر کرنل رحیم شاہ نے دلارے خاں کو کچھ رقم دے کر کہا۔

"یہاں سے بس میں چلے جانا اور میری بات کا خیال رکھنا۔"

"جی بھائی جی۔" دلارے خاں نے کہا عادل جب گاڑی لے کر واپس لوٹ رہا تھا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"اسے کہتے ہیں لاتوں کے بھوت۔"

♥.....♥.....♥

ایک پرانے جغادری وکیل تھے۔ نام تھا رضوان علی شاہ بعض لوگ شاہوں کو اسی طرح بدنام کرتے ہیں ویسے صوفی سے جان پہچان نہیں تھی۔ اور صوفی نے کبھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ آفس پہنچا تھا اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ پہلے تو رضوان علی شاہ کے اسٹاف نے ہی اسے روکا۔

"جی فرمایئے کیا بات ہے کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"مدرسہ فلاح بہبود ان کے متولی معلوم ہوتے ہیں۔ کسی جاہل نے تبصرہ کیا لیکن صوفی رکے بغیر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جس کے سامنے وکیل صاحب کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی دو آدمی ارے ارے کرتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگے تھے۔ چپڑاسی غالباً کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ صوفی اندر داخل ہو گیا۔ بھاری بھرکم اور شاطرسی شکل والے رضوان علی شاہ نے صوفی کی شکل دیکھی اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کون صاحب ہیں یہ کیا تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں پتا ہے میں اس طرح کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔"

"سر یہ بس..... چلیے جناب باہر چلیے۔"

"اور اگر نہ جائیں تو۔" صوفی نے کہا۔

"ارے یہ بدمعاش اب شیروانی میں بھی آنے لگے۔ شیروانی والے بدمعاش باہر نکل جاؤ مجھے نہیں جانتے تم۔"

"نکلوا دیجیے حضور والا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی پر بھی مستی چھا گئی تھی۔ دونوں آدمی جو اندر گھس کر آئے تھے۔ صوفی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"جی سر! کیا کریں۔"

"اب بھی پوچھ رہے ہو کیا کریں۔ باہر نکالو اسے۔ وکیل صاحب نے نخوت سے کہا۔ اور دونوں آدمی صوفی کو باہر نکالنے کے لیے زور لگانے لگے۔ صوفی اطمینان سے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اسے دھکیلنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن صوفی کو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکے پھر ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش جاگ اٹھے۔ اتنی دیر میں چپڑاسی بھی آ گیا تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا ہی ایک آدمی تھا۔ اس نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر صوفی کی کمر سے لپٹ گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ تین آدمی تھے اور صوفی کو باہر گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لگتا تھا جیسے ایک سنگی ستون ہو جو اپنی جگہ جما کھڑا ہو۔ وہ تینوں بری طرح نروس ہو گئے۔ کیونکہ صوفی کو ہلا بھی نہیں سکے تھے اپنی جگہ سے۔ صوفی کا منہ جگالی کر رہا تھا اور ٹھوڑی پر جگہ جگہ پان کی پیک رینگ آئی تھی پھر اس نے ہونٹ دبا کر کہا۔

"وکیل صاحب اپنے ان مچھروں سے کہہ دیجیے درویشوں کی دعاؤں سے کہ جائیں باہر، بلاوجہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ سے بڑا ضروری کام ہے اور آپ یقین کریں کہ جو کچھ ہم آپ سے کہنا چاہتے ہیں اسے سن کر آپ کو ہمارا یہاں آنا برا نہیں لگے گا۔"

"رضوان علی شاہ صاحب خود بھی یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا بہ ظاہر جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ الگ ہے لیکن درحقیقت کوئی شے ہے۔ انہوں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چھوڑ دو چلے جاؤ باہر جا کر بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں ابھی پولیس کو ٹیلیفون کر کے بلالوں گا اور تین دن تک الٹا لٹکوائے رکھوں گا۔ تب بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔ میں پوچھتا ہوں آخر آپ ہیں کون؟''

''بیٹھ کر بتائیں گے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے آستین سے ٹھوڑی پونچھتے ہوئے کہا اور آستین پر بہت سی لکیریں بن گئیں۔ چپڑاسی اور دونوں افراد جو اچھے خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے حیرت اور غصے کا شکار ہو کر باہر نکل گئے۔ صوفی نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

''رضوان علی شاہ صاحب! احقر کو صوفی کہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''کسی یتیم خانے کے متولی ہیں آپ ظاہر ہے یتیموں کا مال کھا کھا کر انسان اتنا ہی طاقت ور ہو جاتا ہے جتنے آپ ہیں۔ چندہ مانگنے آئے ہوں گے۔''

''جی نہیں، نہ ہم کسی یتیم خانے کے متولی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے کسی دینی مدرسے کے کارکن، ہم تو آپ سے کسی انتہائی ذاتی کام کے سلسلے میں ملاقات کرنے حاضر ہوئے تھے۔''

''کوئی کیس ہے آپ کا تو پہلے بتانا چاہیے تھا باہر وہ لوگ بیٹھے اسی لیے ہیں۔ آپ پہلے تفصیل نہیں بتا دیتے تو وہ آپ کو عزت سے یہاں پہنچا دیتے۔''

''عزت ہے تو ہم اب بھی یہاں آئے ہیں۔ دیکھ لیجیے آپ نے بے عزتی کرنے کی کوشش فرمائی درویشوں کے کرم سے اور ہمارا بال بیکا بھی نہ ہوا۔'' رضوان علی شاہ صوفی کو گھورنے لگا تھا رضوان نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور بولا۔

''اگال دان نہیں ہوگا آپ کے پاس۔'' پھر اس کی نگاہ اس خوبصورت باسکٹ پر پڑی جو میز کے ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر منہ کا سارا ملغوبہ باسکٹ میں الٹ دیا۔ رضوان علی شاہ۔ ارے ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ صوفی نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب منہ میں پان تھا تو آپ سے بات کیسے ہوتی۔''

''میں کہتا ہوں آپ چاہتے کیا ہیں۔''

''حضور من ایک کیس کا مسئلہ ہے ذرا ٹھنڈے ہو کر سنیے گا۔ اگر ممکن ہو تو چائے منگوا لیجیے دودھ پتی کی ہو تو کیا کہنا۔ نہ مل سکے تو جیسی بھی ملے گی چل جائے گی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ نے جو حلیہ بنا رکھا ہے نا اپنا۔ اس کے برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آپ یہ سمجھ لیجیے میرا نام بھی رضوان علی شاہ ہے آپ کی عقل درست کر کے نہ رکھ دوں تو نام بدل دوں گا اپنا۔''

''غصہ نہ فرمائیے گا ہم تو بڑے مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ ہماری عرض داشت سن لیجیے گا اس کے بعد جو فیصلہ فرمائیں گے قابل قبول ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ رضوان علی شاہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ برداشت کر رہا تھا اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ اس کی عقل کھوپڑی سے اوپر ناچنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ ٹھنڈے ہو کر اس بے ہودہ شخص کی بات تو سن لی جائے۔ کون ہے کیا چاہتا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ معلوم کیے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اس نے سامنے رکھے ہوئے پانی کے جگ سے دو گلاس پانی پیا اور گلاس واپس رکھ دیا۔ صوفی نے فوراً ہی وہ گلاس اٹھا لیا تھا اور پھر

اس نے گلاس منہ سے لگا کر پانی کا گھونٹ بھرا اور ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ رضوان علی شاہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ کیا بلا سر لگی تھی۔ مزہ ہی آ گیا تھا۔

اچانک ہی صوفی کے منہ سے غرک غرک کی آوازیں نکلنے لگیں اور پھر اس نے ایک زوردار کلی اسی باسکٹ میں کر دی جس میں اس نے پان کا ملغوبہ اگلا تھا۔ یہ باسکٹ رضوان علی شاہ کے پیروں کے پاس رکھی تھی۔ پان کی پیک کی چھینٹوں سے تو وہ بچ گیا تھا لیکن اب جو سرخ پانی کا طوفان نمودار ہوا تھا اس کی بہت سی چھینٹیں وکیل صاحب کی پتلون پر پڑی تھیں۔

''معافی کے طلب گار ہیں۔ اصل میں آپ سے صاف ستھری گفتگو کرنا چاہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''آپ مجھے کسی پاگل خانے سے بھاگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

''غر.....غر.....غر.....'' صوفی نے دوسرا گھونٹ بھرا اور دوبارہ باسکٹ میں کلی کر دی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اب ٹھیک ہے۔ جی.....تو ہم آپ سے کچھ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔''

رضوان علی شاہ شدید غصے کے عالم میں بول بھی نہیں سکا تھا، وہ بس خونی نظروں سے صوفی کو گھورتا رہا۔

''قتل کا کیس آپ کے پاس ہے۔ ملزم کا نام رحمت علی ہے۔ اس کے والد فیاض علی نے یہ کیس آپ کو دیا ہے۔''

''دیا تھا کہو۔ اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''ہم سمجھے نہیں حضور والا۔''

''آپ ہیں کون اور کیا چاہتے ہیں۔'' رضوان شاہ غرا کر بولا۔

''خادم ہیں حضور آپ کے اور ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ لیکن آپ کے ان الفاظ نے ہمیں۔ شش.....شش.....شش، ہمارا مطلب یہ ہے کہ ششدر کر دیا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ایک بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی آپ کی، پتا نہیں کیا بکواس کر رہے ہیں۔''

''وہ.....جج.....جناب عالی! رحمت علی ولد فیاض علی، ہمارا مطلب ہے کہ قتل کا کیس۔''

''وہ تو سمجھ لیا ہے میں نے، آپ رحمت علی کے کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔''

''پہلے تو ان الفاظ کی وضاحت فرما دیجیے گا درویشوں کے کرم سے کہ آپ کہتے ہیں کہ وہ کیس اب آپ کے پاس نہیں ہے۔''

''ہاں میں نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا۔ وہ میری پوری فیس نہیں ادا کر سکتا تو ظاہر ہے میں اس کیس میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔''

''کتنی رقم ادا کی ہے اس نے آپ کو۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''جتنی بھی ادا کی ہے میرے پاس اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ لیکن وہ میری پوری فیس نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ یوں کیجیے گا کہ اس کیس سے دستبردار ہو جائیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہو جائیں کیا ہو چکا ہوں۔ ابھی میں نے تمہیں یہی بتایا ہے مگر میں پھر سوال کروں گا کہ آخر تم ہو کون۔؟''

''ایک بندہ۔'' ناچیز، عاشق درویش، بے اوقات۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''وہ تو شکل سے لگ رہے ہو اور جو حرکتیں تم نے یہاں آ کر کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی گھٹیا درجے کی صحبت یافتہ ہو کسی بہت ہی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے۔''

''بہ خدا..... کیا زبردست پہچان ہے آپ کی۔ بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ہم چھوٹی لائن دربار اسٹریٹ مین گھر نمبر بیس میں رہتے ہیں۔ اس علاقے میں جائیں گے تو ممن خان کے ہوٹل کے بارے میں معلومات حاصل کر لیجیے گا۔ ممن خان بڑے مشہور آدمی ہیں۔''

''اب آپ جاتے ہیں یا پولیس کو بلاؤں۔'' رضوان علی شاہ نے کہا۔

''نن..... نہیں ہم کوئی غنڈہ گردی تو نہیں فرما رہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ درویش کہاں سے آ جاتے ہیں ہر بات کے بیچ میں۔''

''ہائے یہی تو آپ کی کم عقلی ہے وکیل صاحب۔ بہ خدا ایک دوستانہ مشورہ دے رہے ہیں درویشوں کی شان میں کبھی گستاخی نہیں فرمایئے گا۔ اگر یہ کام شروع کر دیا آپ نے تو، تو سمجھ لیجیے کہ زوال شروع ہو گیا۔''

''اوہ، میرا خیال ہے اب آپ کا زوال شروع ہو جانا چاہیے۔'' رضوان علی شاہ نے ٹیلیفون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بس ایک منٹ جناب! بس ایک منٹ اس سے زیادہ وقت نہیں لیں گے آپ کا، معافی چاہتے ہیں اگر ہماری گفتگو سے آپ کی سمع خراشی ہوئی ہے۔ اصل میں ہماری آرزو ہے کہ آپ ان مظلوم لوگوں کی رقم واپس کر دیں۔ ویسے بھی یہ کیس آپ کے بس کا نہیں ہے۔ بے چاروں کو تجربہ نہیں تھا ورنہ کوئی ڈھنگ کا وکیل کرتے۔ آپ جیسے معمولی وکیل قتل کے کیس کی پیروی کرنے کے تو قابل نہیں ہو سکتے۔'' رضوان احمد اسے گھورتا رہا اور پھر بولا۔

''آپ ایسا کریں مجھے اپنا پتا بتا جایئے میں آپ سے تفصیلی گفتگو یہاں سے الگ ہٹ کر کروں گا یہ تو میرا دفتر ہے اور میں یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ۔''

''چھوٹی سی بات ہے حضور من آپ ان کی رقم واپس کر دیں اور اس سے دستبردار ہو جائیں۔''

''دیکھو..... بہت ہو گئی۔ اب میں مجبور ہوں کہ تمہارے ساتھ برا سلوک کروں۔''

''نانانا..... آپ اچھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں ہم نے تو ایک درخواست کی ہے آپ سے۔''

''میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔'' رضوان علی شاہ خود اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تو صوفی نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ رضوان علی شاہ ایک دم دہاڑا۔

''بچاؤ..... دوڑو..... پکڑو اسے یہ ریوالور نکال رہا ہے۔''

''لیکن صوفی کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں پانیوں کی ڈبیا چھالی تمباکو کا بٹوا تھا۔ لوگ دوڑ کر

اندر آ گئے تو صوفی نے کہا۔

''تلاشی لے لیجیے حضور والا۔ پستول اور ریوالور کی تو بات ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس تو نیل کٹر تک نہیں ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ شاہ صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ویسے شاہ صاحب ساری باتیں اپنی جگہ۔ آپ ایسا کیجیے کہ ان کی رقم بینک سے نکلوا لیجیے۔ ہم وہ رقم آپ کو ہضم نہیں کرنے دیں گے اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ تو پتا نوٹ فرما لیجیے گا۔ جب دل چاہے تشریف لایئے غریب خانے کے دروازے آپ پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ حضور والا آپ پتا لکھ لیجیے۔'' اس نے رضوان علی شاہ کی میز کے پاس کھڑے آدمی سے کہا اور اس شخص نے بادل نخواستہ بال پوائنٹ اور پیڈ اپنے سامنے کر لیا اور پتا نوٹ کرنے لگا۔ رضوان علی شاہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''تو حضور من! پتا حاضر ہے اڑتالیس گھنٹے آپ کو پیش کیے جاتے ہیں یا تو آپ ان اڑتالیس گھنٹوں میں اپنا بندوبست کر لیجیے گا اور اپنے آپ کو ہم سے بچا لیجیے گا اور اگر نہ بچا سکے تو پھر دو باتیں ہیں آپ ان کی رقم ادا کر دیجیے۔ ورنہ پھر جوتے کھانے کے لیے تیار ہو جایئے گا۔ ہماری اور آپ کی ذاتی بات چیت ہے۔ چلتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''دیکھ لوں گا میں تجھے جوتے کے بچے، دیکھ لوں گا۔'' رضوان علی شاہ نے غراتے ہوئے کہا۔ لیکن صوفی آہستہ قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

♥.....♥.....♥

شازیہ نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی میک اپ میں تو اسے مہارت حاصل تھی اور وہ جب بھیک مانگتی تھی تو ایسا ایسا میک اپ کرتی تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں۔ اس وقت بھی اس نے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کا روپ اختیار کیا تھا اور اتنا خوب صورت میک اپ کیا تھا کہ بس دیکھنے والے حیران رہ جاتے اور اس سے زیادہ حیران ہونے والا غلام قادر تھا۔

''اڑے ماں قسم آپ تو شازیہ باجی کوئی امریکن فلٹی لگتا پڑا ہے رے۔ ارے بابا دلاور دری دیکھو نی یہ میم صاحب کدھر سے آ گیا۔'' شازیہ غلام قادر کے شور مچانے پر ہنس پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دلاور اس کے بیوی بچے سب شازیہ کے گرد جمع ہو گئے۔ دلاور کی بیوی نے دانتوں سے انگلی دبالی۔

''ہائے ہائے۔ یہ تجھے کیا سوجھی شازیہ۔''

''اڑی ماں قسم دیکھو نی یار یہ کیا کیا۔''

''کچھ نہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ پریشان نہ ہوں یہ چھوٹے بابا کے ایک کام کے سلسلے میں ہے۔''

''واپس آ کر ٹھیک ہو جاؤ گی نا شازیہ بہن۔'' غلام قادر نے کہا۔

''ہاں بھئی۔ بھلا یہ لباس اور یہ چہرہ مہرہ کوئی شریف زادیوں کا کام ہے۔ بس غلام قادر بھائی جانا ہے ایک جگہ مجبوری ہے۔''

''اڑے سمجھتا ہے ڑے میں تو ایسے ہی بولتا۔ دیکھو نی! تم نے میرے کو حیران کر دیا ہے ایسے بھی چہرہ بدلہ جاتا ہے میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چلیے اب تو دیکھ لیا آپ نے اچھا میں چلتی ہوں۔" شازیہ نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے کہا۔ خاصی بڑی رقم خرچ کی گئی تھی۔ ان اشیا کے حصول میں اور کرنل رحیم شاہ کی پوری پوری مدد اس میں حاصل ہے۔ ظاہر ہے جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ کسی معاوضے کے لیے نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ یہاں وہی جذبہ کار فرما تھا اور خدا کے فضل و کرم سے کرنل کو کسی معاوضے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قیمتی چیزیں یہیں کے ڈیوٹی فری اسٹور سے حاصل کی گئی تھیں اور اچھا خاصا خرچ ہو گیا تھا لیکن شازیہ کے اپنے پروگرام کے لیے یہ اخراجات بہت ضروری تھے۔

بہر حال شازیہ اس پتے پر چل پڑی۔ جہاں رحمت علی ملازمت کرتا تھا۔ یہ مرزا جواد بیگ نامی شخص کا مسئلہ تھا، مرزا جواد بیگ کو قتل کیا گیا تھا اور شازیہ اس وقت اس قتل کی تفتیش کے لیے مرزا جواد بیگ کے گھر جا رہی تھی ایک ٹیکسی اس نے خود ہی روکی۔ اپنا کام خود کرنے کی عادی تھی۔ ذمے داریاں سونپ دی گئی تھیں اور اب ان ذمے داریوں کو پورا کرنا اس کا کام تھا۔ چنانچہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر مطلوبہ پتے پر پہنچ گئی۔ وہ اس وقت بہت ہی ماڈرن نظر آ رہی تھی لیکن اپنے میک اپ میں اس نے انفرادیت قائم رکھی تھی۔ یعنی مقامی چہرہ بھی ہو۔ لیکن اس طرح جیسے زندگی مغرب میں گزاری ہو۔

"آخر کار وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گئی۔ معلومات تو حاصل ہو ہی چکی تھیں ایک خوب صورت سا مکان تھا۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اتری۔ مکان کے سامنے یا آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بل ادا کیا اور اس کے بعد گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک ملازم ٹائپ کے آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔ نظر باز قسم کا معلوم ہوتا تھا شازیہ کو دیکھتا رہا۔ پھر شازیہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔

"ہیلو۔"

"نہیں جی۔ ہم تو نوکر ہیں۔ ہم کیسے ہلیں، آپ اندر جا کر سب کو ہلا لیجیے ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اوہو۔ تھینک یو..... تھینک یو۔"

"پر بی بی جی بات تو سنیے۔" ملازم جلدی سے شازیہ کے سامنے آ گیا۔ شازیہ کے الفاظ پر اور انداز پر وہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا اور بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ شازیہ کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

"پر ملنا کس سے ہے آپ کو، کسے بلانے جا رہی ہیں۔"

"وہ مسز جواد بیگ۔"

"اوہ بی بی! کون سی مسز کی بات کر رہی ہو۔ مسز نمبر ایک یا مسز نمبر دو۔" شازیہ کا کام یہیں سے شروع ہو گیا تھا اس نے مسکراتے ہوئے ملازم سے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"عیدو..... عیدو..... عید کے دن نماز کے بعد پیدا ہوئے تھے۔" ملازم نے کھیسیں نکال کر کہا۔

"تب تو تم بڑے برکت والے ہو۔"

"دوسروں کے لیے جی دوسروں کے لیے۔ اپنے لیے تو بس عیدو ہیں خالی۔ آپ زمرد بیگم سے

ملیں گی۔"

"سب سے پہلے تو مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی عیدو! ایسے دلچسپ لوگ کہاں ہوتے ہیں اس دنیا میں، میں تو حیران ہوں کہ تم جیسی پیاری پیاری باتیں کرنے والا ملازم کیسے ہو گیا۔" عیدو کے چہرے پر افسردگی کے آثار پھیل گئے۔ پھر بولا۔

"بس جی تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ تقدیر ایسی ہی تھی ہماری پر آپ نے دل بڑھا دیا ہے۔"

"عیدو میں تم سے پھر ملوں گی۔ یہ بتاؤ کہاں مل سکتی ہوں۔"

"کسی پارک میں فلم دیکھو گی جی ہمارے ساتھ۔"

"فلم..... دیکھتی تو نہیں ہوں لیکن تم کہو گے تو دیکھ لوں گی۔"

"تو پھر نہر والے پل پر۔"

"نہر کے تو بہت سے پل ہیں۔ کون سے پل پر ملو گے۔"

"نہیں جی۔ وہ تو ہم نے ویسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا آپ خود ہمیں اپنا ایڈریس دے دو جی۔ ہم آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"ایسا کرو عیدو۔ شام کو کسی وقت مل سکتے ہو۔ اچھا ایک بات بتاؤ، مستقل طور پر یہیں رہتے ہو۔"

"ہاں جی بالکل۔ چھوٹا سا کوارٹر ہے ہمارا۔"

"ہوں۔ میں تمہیں ایک پتا لکھ کر دیتی ہوں۔ شام کو چھ بجے اس پتے پر آ جانا وقت تو نہیں ہو گی۔"

"چھ بجے تو شو شروع بھی ہو جاتا ہے۔"

"نہیں۔ فلم کسی وقت پھر دیکھیں گے۔ بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے باتیں کریں گے۔"

"اور گانا گائیں گے۔ گانا آتا ہے آپ کو۔"

"بہت اچھا آتا ہے۔ سارے پروگرام آہستہ آہستہ کریں گے۔ تم خود مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ چلو ذرا مجھے بیگم صاحب سے ملا دو اس وقت، لیکن تم ایک عجیب بات کہہ رہے تھے وہ یہ کہ بیگم نمبر ون، بیگم نمبر ٹو۔"

"ہاں جی بالکل۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ دونوں ساتھ رہتی ہیں۔"

"نہیں جی۔ بڑی بیگم کا بنگلہ الگ ہے اور وہ بھی ان کے ابا جان نے دیا ہے۔"

"ساری باتیں بعد میں ہوں گی عیدو! یہاں جو بیگم صاحب رہتی ہیں ان کا نام کیا ہے زمرد جہاں ہے نا۔"

"ہاں جی بالکل یہی نام ہے۔"

"مجھے انہی سے ملا دو۔"

"اچھا جی۔ آپ آ جاؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ ارے ہاں آپ کا کیا نام ہے۔"

"شازیہ۔"

"واہ جی واہ۔ ہماری بڑی پھوپھی کی نند کا نام بھی شازیہ ہی تھا۔ بس جی غریبی میں مارے گئے۔ ہمیں اس سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر کون غریب کی محبت کو قبول کرتا ہے۔ ایسے ہی دل بہلا لیتے ہیں جی۔ جانتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اپنی اوقات۔" عبدو بکواس کرتا ہوا اسے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کے بعد شاید بیگم زمرد جہاں کو اطلاع کرنے چلا گیا۔ پھر جو عورت اندر سے آئی خاصے بھاری بدن کی مالک تھی۔ چہرے پر بڑی سختی کے آثار تھے اور بہت تند مزاج معلوم ہوتی تھی۔ اس نے شازیہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر ناک چڑھا کر بولی۔

"کون ہیں بی بی آپ کہاں سے آئی ہیں۔"

"معافی چاہتی ہوں میڈم کینیڈا سے آئی ہوں آپ کو ثریا یاد ہے۔"

"ثریا۔"

"آپ زمرد جہاں ہیں نا۔"

"ہاں۔"

"کریم گنج میں رہتی تھیں۔"

"ہاں ہاں۔"

"آپ کے والد عبدالحلیم۔"

"ہاں بالکل۔"

"آپ کو ثریا یاد نہیں آ رہی۔ وہیں آپ کے پڑوس میں رہتی تھی آپ کی دوست۔"

"ثریا؟"

"جی..... وہ تو ہمیشہ مجھ سے یہ کہتی تھی کہ آپ اس کی بیسٹ فرینڈ ہیں۔"

"آپ آئی کہاں سے ہیں۔" زمرد جہاں نے کہا۔ شازیہ کی نگاہیں گہرائی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ خطرناک عورت معلوم ہوتی تھی۔

"میں کینیڈا سے آئی ہوں۔ میں تو کوئی بیس سال سے وہاں ہوں۔ دو ڈھائی سال کی تھی جب میرے والد کینیڈا میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ثریا تو اب کوئی پانچ چھ سال پہلے وہاں پہنچی ہے اور وہ بھی شادی ہو کر مگر تعجب ہے جب بھی وہ آپ کے بارے میں بات کرتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے آپ کی بہترین دوست ہو۔ لیکن آپ اس سے اس طرح اجنبیت کا اظہار کر رہی ہیں جیسے اسے جانتی ہی نہ ہوں۔"

"ہو سکتا ہے ہم دونوں کسی اور نام سے متعارف ہوں آپ کینیڈا سے آئی ہیں۔"

"ہاں دیکھیے اس نے آپ کے لیے تحائف بھیجے ہیں۔" شازیہ نے کہا اور اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور پھر اس میں سے جو قیمتی تحائف نمودار ہوئے انہیں دیکھ کر زمرد جہاں کو سب کچھ یاد آ گیا۔ انتہائی قیمتی جیولری تھی۔ جو بہر حال کرنل رحیم شاہ نے اس کیس کے سلسلے میں شازیہ کی فرمائش پر حاصل کی تھی اور اس کا تعلق یورپ سے ہی تھا۔ وہیں کی کمپنیوں نے اسے بنایا تھا۔ زمرد جہاں اس جیولری کو دیکھ کر سرشار ہو گئی۔

"یہ ثریا نے میرے لیے بھیجی ہیں۔ ارے توبہ..... توبہ، توبہ بھئی تبھی تو میں کنفیوز ہو رہی تھی۔ ہم اسے ثریا نہیں، بینو کہا کرتے تھے بینو۔"

"اچھا..... مجھے کبھی نہیں بتایا ثریا نے یہ نام بینو..... بینو کتنا عجیب نام ہے۔"

"ہائے کتنی خوب صورت بریسلیٹ ہے اور یہ نیکلیس ارے توبہ یہ تکلیف کی اس نے۔ آپ کا نام کیا ہے بی بی؟"

"شازیہ....."

"آپ کینیڈین ہیں۔"

"نہیں مقامی ہوں بتایا نا بیس سال پہلے میرے فادر....."

"ہاں ہاں ہاں۔ بتایا تھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"مگر مجھے کچھ اور پتا چلا ہے ثریا کو تو شاید آپ کے شوہر کی موت کے بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔"

"بس کیا بتاؤں۔ میں عورت ذات جس نے جس کو بتا دیا اس کو پتا چل گیا۔"

"بیمار ہو گئے تھے۔"

"لو تمہیں یہ بات معلوم نہیں۔"

"نہیں میں نے آپ کو بولا نا۔ میں تو کینیڈا سے آئی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے پھر تو ٹھیک ہے۔ بیمار کیا ہوئے تھے بی بی بس..... شکار ہو گئے اپنی بے وقوفی کا۔"

"کیا مطلب؟"

"بس تمہیں کیا بتاؤں آرام سے بیٹھو۔ اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گی چائے یا کوئی اور چیز۔"

"مہمان ہوں آپ کی آپ کا جو دل چاہے پلا دیں۔"

"یہاں کہاں ٹھہری ہو۔"

"میرے رشتے دار ہیں انہی کے پاس ٹھہری ہوں آئے ہوئے بھی ایک ہفتہ ہو گیا۔ ثریا نے کہا تھا کہ یہ تحائف آپ تک پہنچا دوں۔ آپ کی خیریت معلوم کروں۔ بس میں نے سوچا کہ ذرا آرام ہی سے جاؤں گی۔"

"ہاں بالکل۔ کھانا وغیرہ کھا کر جانا۔"

"ارے نہیں آپ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس وقت بالکل اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

"ہاں۔ بس کیا بتاؤں۔ مرزا صاحب عجیب آدمی تھے کہتے تھے زندگی کے آخری سانس تک ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔ پر انہوں نے تو آخری سانس پوری کر لی اور مجھے اس جہنم میں اکیلا چھوڑ گئے۔"

زمرد جہاں بیگم کا انداز اب بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ چہرے کی خشونت غائب ہو گئی تھی۔ بار بار پاس رکھی ہوئی جیولری کو اٹھا کر دیکھنے لگتی تھیں۔ زیور عورت کی کتنی بڑی کمزوری ہے۔ اس وقت شازیہ کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ غم زدہ بھی تھیں۔ لیکن جب بھی ان کی نگاہیں زیورات پر پڑتیں ان کی نگاہیں خوشی سے چمکنے لگتی تھیں۔ شازیہ نے کہا۔

"آپ یقین کریں مجھے تو بہت ہی دکھ ہوا تھا۔ آپ کے شوہر کی موت کا۔"

"بس بی بی ایسے ہی لکھی تھی تمہیں پتا ہے انہیں قتل کیا گیا۔"

"حیرت کی بات ہے کس نے قتل کر دیا انہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے تو یہ ایک لمبی سازش معلوم ہوتی ہے۔ اب کس سے کہوں کس سے نہ کہوں زبان کھولوں گی تو خود میری ہی گردن پھنسے گی۔"

"سازش۔"

"ہاں۔ تمہیں تو خیر کیا ہی معلوم ہوگا۔ ثریا نے پتا نہیں تمہیں بتایا ہو یا نہ بتایا ہو۔ یہ ایک درد بھری کہانی ہے۔" شازیہ کو ہنسی آنے لگی۔ حالانکہ ثریا نامی کسی لڑکی کا وجود خود زمرد جہاں کی زندگی میں نہیں تھا۔ لیکن زیورات دیکھ کر انہوں نے فوراً ثریا کے وجود کو تسلیم کرلیا تھا۔ اب باقی باتیں کینیڈا جا کر دیکھی جائیں گی۔ یہ زیورات ان کے قبضے میں آ گئے۔

وہ واپس جائے گی وہاں ثریا سے بات ہوگی اور غلطی کا احساس ہوگا تو پھر کون کیا کرتا ہے۔ چنانچہ زمرد جہاں بیگم نے ثریا کو فوراً تسلیم کرلیا تھا۔ شازیہ اپنا مطلب پورا کر رہی تھی اور جب وہ راستے سے ہٹ گئیں شازیہ انہیں اپنے مطلب پر لے آئی۔

"آخر ایسا کون سنگ دل تھا جس نے آپ کو اس چھوٹی سی عمر میں بیوہ کردیا۔" یہ چھوٹی سی عمر کا کوڑا ہی پر اثر تھا۔ زمرد جہاں کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

"دنیا تو نہیں جانتی بے شک دوسری بیوی ہوں۔ لیکن تم تو کینیڈا میں رہتی ہو۔ تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں کیا معلوم۔ ماں باپ نے دولت دیکھ کر شادی کردی۔ یہ نہیں سوچا کہ میری اور مرزا صاحب کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے اور پھر وہ پہلے سے شادی شدہ تھے۔ کہتے تھے کہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر رہے ہیں۔ مگر اب تم سے کیا چھپاؤں اور کیا بتاؤں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارے خود اولاد پیدا کرنے کے قابل تھے کہاں۔ بس دوسروں کی زندگیاں برباد کرنے کا ہی شوق تھا۔ مگر وہ شاہ جہاں بیگم بادشاہ زادی انہوں نے مجھے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ بھئی میں خود تو نہیں بھاگ کر آئی تھی۔ اپنے گھر سے۔ میرے ماں باپ کو بے وقوف بنایا تھا مرزا جی نے اور وہ بے چارے چکر میں آ گئے کہ بیٹی راج کرے گی۔ بی بی پتا نہیں کینیڈا میں کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کی بڑی بری حالت ہے۔ اتنی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں معاشرے میں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ ماں باپ یہ نہیں سوچتے کہ بیٹی کا مستقبل کیا ہوگا۔ آرزوؤں، امیدوں کا کیا ہوگا۔ بھلا تو یہ کرو کہاں مرزا جواد بیگ اور کہاں میں۔۔۔ پر۔۔۔۔"

"آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ کوئی لمبی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں نوکر تھا ایک بے چارہ رحمت علی نام تھا۔ ویسے تو ٹھیک ٹھاک لڑکا تھا۔ پر اللہ ہی جانے دماغ میں کیا سمائی۔ تھوڑا سا سامان وغیرہ چوری کیا اور پتا نہیں مرزا صاحب کو اس کا پتا چل گیا تھا کیا ہوا تھا۔ بس مار ڈالا اس نے مرزا جواد بیگ کو اور پکڑا گیا کمینہ کہیں کا۔"

"اوہو۔۔۔۔ تو یہ واقعہ ہوا تھا مگر آپ کے خیال میں دوسری بات کیا ہوسکتی ہے۔"

"دیکھو بی بی تم باہر سے آئی ہو میری دشمن نہیں دوست ہو۔ میں تو زبان کھولے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سارا کیا دھرا شاہ جہاں بیگم کا ہے۔ میں تو دعوے سے کہتی ہوں کہ اگر پولیس تفتیش کرے تو پتا چل جائے گا کہ رحمت علی کو کس نے یہاں ملازم رکھوایا تھا۔ سو فی صدی شاہ جہاں بیگم نے رکھوایا تھا اور انہی کی ہدایت پر رحمت

علی نے مرزا صاحب کو قتل کیا۔

"ہوں۔ شاہ جہاں بیگم تو واقعی بہت خطرناک ہیں۔ یہ تو بڑی انوکھی بات بتائی ہے آپ نے۔"

"ارے بی بی بس وہی کہا جاتا ہے نا کہ بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی۔ شاہ جہاں بیگم کی صورت دیکھو تو لگتا ہے جیسے درویش ہوں، اللہ والی ہوں۔ ہر وقت روزہ نماز پر بی بی گن کی پکی ہیں۔ بدلہ لے لیا شوہر سے دوسری شادی کا، مجھے بیوہ کردیا۔ پہاڑ سی زندگی پڑی ہوئی ہے کیسے کٹے گی شوہر کے بغیر دنیا میں سب کچھ دولت ہی تو نہیں ہوتی۔ مرزا مرحوم بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ پر بی بی۔ اکیلا پن تو اکیلا پن ہی ہوتا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" شازیہ نے ہاں میں ہاں ملائی پھر بولی۔

"مگر یہ ملازم کیا۔۔۔۔ کیا آپ کے خیال میں شاہ جہاں بیگم نے اسے یہاں مرزا جواد بیگ کے قتل کے لیے بھیجا تھا۔"

"انگاروں پر لوٹتی تھیں وہ تو۔ برداشت ہی نہیں کرتی تھیں کہ مرزا صاحب میرے پاس رہیں خود تو محروم تھیں ہی۔ مجھے بھی محروم رکھنا چاہتی تھیں۔ ارے ڈاکٹروں سے معلوم کرتی رہتی تھیں کہ کہیں میرے ہاں بال بچہ تو نہیں ہونے والا۔ اگر کبھی طبیعت خراب ہوئی اور کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔ تو بس شاہ جہاں بیگم کے دل میں کھٹکے لگ گئے۔ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بلی کھاتی نہیں تو لڑکا دیتی ہے۔ بس ایسا ہی ہوا ہے بی بی۔"

"بہت افسوس ہوا۔"

"بس جی افسوس کی کیا بات ہے کرنے والے تو اپنا کام کر گئے۔" بہت دیر تک شازیہ زمرد جہاں کو ٹٹولتی رہی۔ زمرد جہاں کا خیال تھا کہ شاہ جہاں بیگم نے ہی یہ کام کرایا ہے اور بہرحال ایک کردار تو سامنے آیا تھا اب باقی تفصیل بعد ہی میں پتا چل سکتی تھی۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ یہ وزٹ خاصا کامیاب رہا تھا خاص طور سے وہ بے وقوف ملازم جس کا نام عیدو تھا۔ خاصا کارآمد معلوم ہوتا تھا۔ شازیہ اس سلسلے میں اپنی رپورٹ مکمل کرکے ہی دینا چاہتی تھی۔

چنانچہ شام کو چھ بجے وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں عیدو کو آنا تھا اور پھر جب اس نے عیدو کو آٹو رکشا سے اترتے دیکھا تو اس کے حلق میں قہقہے مچلنے لگے۔ عیدو نے جس رنگ کی شلوار قمیض پہنی تھی۔ وہ رنگ شاید ہی دنیا کے کسی مرد نے پہنا ہو۔ آتشی گلابی چمکتا ہوا رنگ آنکھوں میں کاجل منہ میں پان دبا ہوا اور لازمی بات تھی کہ ہونٹوں کو خاص طور سے پان سے سرخ کیا گیا ہے سر میں تیل چپڑا ہوا تھا۔ بال بڑے اسٹائل سے بنے ہوئے تھے اور ماتھے پر چاند نکلا ہوا تھا۔ شازیہ نے پہلے تو سوچا تھا کہ اسے کسی ریسٹوران میں بٹھا کر اپنے ساتھ چائے وغیرہ پلائے گی۔ لیکن اس حلیے میں جس میں عیدو آیا تھا۔ اسے ساتھ لے جا کر شازیہ تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت وہ ٹیکسی میں نہیں بلکہ کار میں آئی تھی اور خود ڈرائیو کرتے ہوئے لائی تھی۔ یہی سب سے بڑی بات تھی۔

"میں آ گیا؟" عیدو نے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں کہا۔

"ہیلو۔۔۔۔ آفت لگ رہے ہو عیدو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آفت ہے قیامت ہے۔" عیدو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آؤ..... گاڑی کی طرف چلتے ہیں۔"

"چلیے جہاں دل چاہے چلیں۔"

"کہیں جائیں گے نہیں ایک دو جگہ رکیں گے بلکہ ایسا کرتے ہیں سمندر کے کنارے چلتے ہیں۔"

"میرا ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔" عیدو نے غالباً کوئی شعر پڑھنے کی کوشش کی لیکن ادھورا پڑھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"ڈوب جانا کوئی بات نہیں ہے۔" شازیہ نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر اس نحوست کو اپنے پاس بٹھالیا اور پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ عیدو نے غالباً کوئی تیز قسم کا عطر بھی لگایا تھا۔ جس کی بو سے شازیہ کو چکر آنے لگے تھے۔ لیکن بہر حال کام اسی کو کہتے ہیں۔ برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

"اب یہ بتاؤ۔ کہاں چلیں۔"

"سمندر۔" عیدو نے جواب دیا۔ پھر ساحل سمندر تک پہنچتے پہنچتے شازیہ کی بری حالت ہو گئی تھی جو عطر عیدو نے لگایا تھا اسی کی طرح متحوس تھا۔ شازیہ بڑی مشکل سے برداشت کر رہی تھی البتہ جب وہ کھلی فضا میں پہنچے تو کچھ سکون ہوا۔

"ہاں بھئی عیدو صاحب! اب آپ بتائیے۔"

"مم..... میں، میں کیا بتاؤں۔ جو کچھ بتانا ہے آپ ہی کو بتانا ہے میں تو بس خادم ہوں جی آپ کا۔ آپ جیسا حکم کرو گی۔ قسم اللہ کی ایسا ہی کروں گا۔"

"ز..... ز..... زندگی بھر۔"

"ہاں جی اب تو بس عید بقر عید کا ساتھ ہو گیا۔"

"کیا؟"

"نہیں میرا مطلب ہے زندگی موت کا ساتھ ہو گیا۔"

"ہو گیا۔" شازیہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا وہ جو کہتے ہیں نا کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔"

"ہاں۔ تو بات تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عیدو! میں بس کیا بتاؤں نہ جانے کیوں اچانک ہی تم سے دل لگ گیا ہے۔"

"ہمارا بھی یہی ہوا ہے جی۔" عیدو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ تمہارا بھی یہی ہو گیا ہے۔" شازیہ بولی۔

"ہاں جی۔ بس آپ یقین کرو جی۔ دن بھر خواب دیکھتے رہے ہیں۔"

"ارے۔ تو کیا میرے آنے کے بعد تم سو گئے تھے۔" شازیہ نے ہنسی روک کر کہا۔

"نہیں جی۔ ہم تو اپنے کام کر رہے تھے۔"

"تو پھر خواب کیسے دیکھے۔"

"ایں۔ وہ بس ہم دیکھ لیتے ہیں۔ ایسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" عیدو سے اور کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔

"تم نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا عیدو۔"

"لو تو آئے کاہے کے لیے ہیں۔ اب بتا دو نا سب کچھ۔" عیدو نے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو ایسا ہوتا ہے عیدو۔ تقدیر اسے کہتے ہیں آئی تھی زمرد جہاں کے پاس اپنے کام اور مل گئے تم۔"

"ہاں جی۔ بس یہی ہوتا ہے وہ جو کہتے ہیں نا۔ تم کیا ملے زمانہ مل گیا۔"

"اچھا یہ کون کہتا ہے؟" شازیہ نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

"نہیں جی۔ وہ گانا ہے کچھ اسی طرح کا۔"

"عیدو۔ میں کینیڈا سے آئی تھی زمرد بیگم کی ایک دوست نے کچھ چیزیں بھیجی تھیں ان کے لیے وہ لے کر۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی معلوم ہوا۔ پتا چلا کہ بے چارے مرزا جواد بیگ کو کسی ملازم نے مار دیا۔"

"ارے چھوڑیں جی چھوڑیں۔ بس یہی تو بدنصیبی ہوتی ہے ہم ملازموں کی۔ مالک کے لیے سو بار جان دے دیں۔ لیکن کہلائیں گے وہی چور اچکے۔ کوئی ہماری عزت نہیں کرے گا جی..... اگر کہیں سے تھوڑی بہت عزت مل جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے عزت کرنے والا ہمارے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"آپ کیا کہتی ہو اب مجھے دیکھو..... میں کسی کو جان سے مار سکتا ہوں۔ دیکھو جی۔ ایک بات کہیں آپ سے۔ دولت ہر شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہم بھی ماں باپ، بہن بھائی والے ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی مالک سے وفاداری کرنا آتی ہے۔ پر ہر شخص ہمیں دیکھے گا ہمیشہ چور اچکے کی نظر سے کبھی اعتبار نہیں کیا جائے گا ہم پر۔ وہ جو بے چارہ رحمت علی تھا نا ایسا سیدھا لڑکا تھا کہ بس کیا بتائیں آپ کو۔ آپ قتل کی باتیں کرتی ہو۔ ہم کہتے ہیں۔ وہ بے چارہ مکھی نہیں مار سکتا تھا۔ معصوم سیدھا سادھا۔"

"اوہ..... واقعی تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا عیدو اور پھر تم جیسے ذہین لوگ تو ہر بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"نہیں جی۔ خیال ویال تو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ پر ایک بات بتاتے ہیں نہ تو وہ چور تھانہ ڈاکو تھا اور نہ قاتل۔ اسے تو بس پھنسا دیا گیا۔ پھنس گیا بے چارہ۔"

"گویا تمہارا مطلب ہے۔"

"دیکھو جی بات اصل میں یہ ہے..... اچھا ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں کہو۔"

"یہ چھوٹی بیگم صاحب سے آپ کا کیا تعلق ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ بس ان کی ایک دوست کینیڈا میں رہتی ہے جو میری دوست ہے۔ میں یہاں آئی تو اس نے کچھ سامان بھیجا میرے ہاتھ۔"

"بس جی یہ چھوٹی بیگم صاحبہ جو ہیں نا۔ یہ ذرا دوسری قسم کی ہیں آزادی پسند اور ہم ایک بات بتائیں آپ کو۔ آپ نے جب یہ بات کہہ دی ہے۔ عیدو کا تجربہ معمولی نہیں ہے تو آپ خود سمجھ دار ہو۔ ہم بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کو صحیح بتا رہے ہیں۔ یہ کیس دوسرا ہے۔"

"عیدو تم کمال کی شخصیت ہو۔ کیا کیس ہے بتاؤ؟"

"وہ جی بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے مالک یعنی مرزا جواد بیگ اور چھوٹی بیگم صاحبہ کی عمر میں کافی فرق ہے۔ بڑی بیگم سے تو ہمارے صاحب کے ہاں کوئی اولاد نہیں پیدا ہوئی۔ چھوٹی بیگم سے انہوں نے شادی اسی لیے کی تھی کہ اولاد پیدا ہو۔ پر جی اللہ کی مرضی میں کس کا دخل ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی وہی ٹائیں ٹائیں فش رہا۔ مگر چھوٹی بیگم صاحبہ ذرا شوقین مزاج ہیں۔ ان کی دوستیاں، دوستیاں نہیں بلکہ دوستے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں جی۔ تو جوان لڑکے جو اکثر کوٹھی میں آ جاتے ہیں اور پھر خوب ڈھول ڈھمکا ہوتا ہے۔ بس جی جواد صاحب کو یہ باتیں ناپسند تھیں اور اکثر دونوں کے درمیان لڑائی رہا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ جواد! تم ہوش میں رہا کرو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں اور..... انہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا جی۔ چھوٹی منہ بڑی بات ہے۔ پر آپ دیکھ لینا بات وہی نکلے گی۔ رحمت علی بے چارہ تو قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ بلا کسی نہ کسی کے سر تو پڑنی ہی تھی۔ سو اس بے چارے کے سر پڑ گئی۔"

"اوہو تمہارا مطلب ہے کہ زمرد جہاں بیگم نے مرزا جواد بیگ کو قتل کرایا۔"

"سوفی صدی جی۔ جو بندے بیگم صاحبہ سے ملنے ان کے پاس آتے ہیں ان میں ایک سے ایک لفنگا ہے۔ ایسے سسرے کر منکاتے ہیں کہ لڑکیاں بھی کیا ناچیں گی۔ بیگم صاحبہ ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔"

"ویسے زمرد جہاں بیگم کی عمر بھی کچھ کم تو نہیں ہے۔"

"معاف کیجیے گا آپ تو باہر کی رہنے والی ہو۔ یہاں کی عورتیں عمر کے معاملے میں بڑی گڑبڑ کرتی ہیں۔ کبھی سچ بول کر جو دکھا دیں۔"

"خیر ایسا تو دنیا بھر میں ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہوگا جی۔ ہماری معلومات اتنی نہیں ہے۔" عیدو نے کہا۔

"اچھا اور وہ بڑی شاہ جہاں بیگم۔"

"بس جی وہ تو فرشتہ ہیں۔ گھر چھوڑ کر خود چلی گئی ہیں۔ مرزا صاحب نے ہی انہیں گھر دلا دیا تھا۔ وہاں اکیلے زندگی گزار رہی ہیں۔ ہم نے تو بہت کوشش کی تھی کہ ہمیں ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ پر ہماری کوشش سے کچھ نہیں ہوا۔ سب کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا ان کا۔ الگ گھر میں رہتی ہیں۔"

"کہاں رہتی ہیں وہ؟ تمہیں تو ان کا پتا معلوم ہوگا۔"

"ہاں جی کیوں نہیں۔" اور عیدو نے شاہ جہاں بیگم کے گھر کا پتا بھی دیا۔ شازیہ کو عیدو سے جو کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہ اس نے معلوم کر لیا پھر بولی۔

"تم یقین کرو تم بہت ہی اچھے دوست ثابت ہوئے میرے لیے۔ میں تم سے ملتی رہوں گی۔"

"لو جی۔ تو جا کہاں رہی ہو۔" عیدو نے کہا۔

"بس اب چلتی ہوں۔ میرے والدین بھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"پھر کب ملو گی۔"

"دو تین دن کے بعد خود تمہارے پاس آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جی۔" اور پھر شازیہ نے عیدو کو ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں اسے واپسی کے لیے بس مل سکتی تھی اور اس کے بعد وہ سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا شاہ جہاں بیگم سے بھی آج ہی مل لیا جائے اور یہی اس نے مناسب سمجھا تھا۔ لیکن شاہ جہاں بیگم سے ملاقات کے لیے وہ کینیڈا والا بہانہ تو چل نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے آج ان سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسی میک اپ اور اسی شکل میں شاہ جہاں بیگم سے نہیں ملنا چاہتی تھی بلکہ اس کے لیے کوئی اور ہی تدبیر مناسب ہو سکتی تھی۔

♥.....♥.....♥

رضوان علی شاہ کی کار پولیس اسٹیشن کے سامنے رکی تھی۔ نوجوان انسپکٹر ناصر علی سے اس کی اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی پولیس اور وکیل کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن ناصر علی خود بھی بہت خوش مزاج نوجوان تھا۔ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ بڑا ہی انسان دوست اور عام پولیس کے آدمیوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تشدد ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ تشدد کرنا پولیس کی مجبوری ہے۔ ورنہ بڑے بڑے سخت جان مجرم ہوا کرتے ہیں جو پولیس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایسے لوگوں کی زبان کھلوانے کے لیے تھوڑی سی غیر انسانی حرکتیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن ہر ایک ساتھ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی رویہ رکھا جائے اور وہ اپنے اس اصول اور عمل سے خاصے فائدے بھی حاصل کر چکا تھا اور ان پولیس والوں میں تھا۔ جن کے دشمن کم اور دوست زیادہ ہوتے ہیں۔

رحمت علی کا کیس بھی اسی کے پاس تھا۔ چونکہ مرزا جواد بیگ جس علاقے میں رہتے تھے۔ وہ اسی کا علاقہ تھا۔ رضوان علی شاہ سے اس کیس کے سلسلے میں ناصر علی کی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن ناصر علی کے رویے سے دونوں دوست بن گئے تھے۔ ناصر علی نے مسکراتے ہوئے رضوان شاہ صاحب کا استقبال کیا۔ اور بولا۔

آیئے وکیل صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے بڑی خوشی ہوئی ہے جب کوئی بے لوث اور بے غرض کسی سے ملنے اس کے پاس آتا ہے۔"

"مگر میں بے لوث اور بے غرض تمہارے پاس نہیں آیا۔" رضوان علی شاہ نے بھاری آواز میں کہا اور ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے بڑے آدمی کو ہماری ضرورت بھی پیش آئی۔"

"یار ناصر علی! ایک بالکل ہی ذاتی سا معاملہ ہے یا پھر تم خالی ذاتی بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس ایک معاملہ ہے جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میری انا کو چیلنج کر دیا گیا ہے اور دیکھو برا مت ماننا اس بات کا، یہ کام میں کہیں سے بھی لے سکتا ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے میری بھی شناسائیاں ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں تم میرے ذہن میں آئے اور میں نے سوچا کہ پہلے تم سے بات کر لیتا ہوں۔"

"تو اتنی الجھن کی کیا بات ہے۔ جب آپ یہ سوچ کر آئے ہیں شاہ صاحب تو پھر بھروسا کریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ پر۔ جس قابل بھی ہوں حاضر ہوں۔"

"یار ایک دو کوڑی کے آدمی نے میرے آفس میں وہ بدتمیزی کی ہے۔ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔"

"کون ہے وہ دو کوڑی کا آدمی۔ ہم اسے دو کوڑی کا بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے شاہ جی کیا واقعی کسی زمانے میں کوڑیاں بھی چلتی تھیں۔ یہ تو سمندر سے نکلتی ہیں۔ اس میں یہ دو کوڑی اور چار کوڑی کا چکر کیا ہوا کرتا تھا۔"

"مذاق نہیں۔ مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا ظاہر ہے۔ معلومات میں اضافے کے لیے کسی سے کچھ نہ کچھ پوچھا ہی جاتا ہے۔ آپ براہ کرم مجھے کوڑیوں کے بارے میں بتایئے۔"

"پتا نہیں کون نامعقول ہے اور کیا چاہتا ہے۔ لیکن اس احمق نے میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔"

"کوئی احمق کسی کا دماغ خراب کر سکتا ہے۔ یہ بات آج ہی میرے علم میں آئی ہے۔ چلیے اب ذرا تفصیل بتا ڈالیے۔ کون ہے وہ احمق۔"

"میاں عجب گدھا ہے۔ وہ ایک کیس تھا تمہارے پاس جو ابھی چل رہا ہے۔"

"میرے پاس تو بہت سے کیس چل رہے ہیں آپ کون سے کیس کی بات کر رہے ہیں۔"

"یار! وہی رحمت علی نامی نوجوان جس نے مرزا جواد بیگ کو قتل کر دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ اپنے مالک کو۔"

"وہی وہی۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہے کہ رحمت علی کے ماں باپ نے یہ کیس مجھے دیا تھا ایک بستی کے رہنے والے ہیں۔ بھئی میرا ایک اصول ہے۔ اپنا فرض بے شک پوری طرح نبھاؤ۔ لیکن اپنے پیٹ سے بھی غداری نہ کرو۔ وہ معاوضہ جو میں وصول کرتا ہوں۔ وہ شخص نہیں دے پایا جس کا نام فیاض علی ہے۔ میں نے اس کیس سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ یہ کہہ دیا ہے اس سے کہ باقی فیس بھی لے آؤ۔ اس کے بعد میں اس مقدمے کی پیروی کروں گا۔ بتاؤ غلط تو نہیں کیا میں نے۔"

"ظاہر ہے آپ کا اپنا موقف ہے کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ان حضرت نے اپنی طرف سے ایک بدمعاش حاصل کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے اس بدمعاش سے انہوں نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ اگر وہ ان کی دی ہوئی رقم مجھ سے واپس دلا دے۔ تو اس رقم میں سے کچھ کمیشن اسے بھی دے دیا جائے گا۔"

"ارے رحمت علی کا باپ فیاض علی تو اس قسم کا آدمی نہیں لگتا تھا۔"

"میاں چھوڑو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس قسم کے آدمی نہیں لگتے۔ زیادہ ہی غلط ہوا کرتے ہیں۔ وہ بدمعاش صاحب میرے آفس میں آئے تھے۔ بدمعاشی دکھائی، دھمکیاں دیں کہنے لگے کہ فیاض کی رقم واپس کر دی جائے۔ ورنہ نتیجے کا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔ اب تم خود سوچو جس پیشے سے میرا تعلق ہے اس میں اگر اس قسم کی دھمکیاں ہم وکیلوں کو دی جائیں تو ہمارا کیا ہوگا۔"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ کون بدمعاش ہے کیا نام ہے اس کا۔"

"نام وام نہیں بتایا پتا بتایا گیا ہے۔"

"صحیح پتا بتایا ہے۔"

"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

"کیا پتا بتایا ہے میں بندے بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں بندے بھیجنے کی بات نہیں۔ تمہیں خود میرے ساتھ وہاں چلنا ہوگا۔ ذلیل و خوار کر کے لائیں گے اسے۔"

"ہوں..... ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو یوں ہی سہی۔ اب میں آپ کو انکار تو نہیں کر سکتا۔"

"خوش رہو۔ بس اسی کام سے آیا ہوں اس وقت تمہارے پاس۔"

"بتایئے کب چلنا ہے۔"

"لو یہ کیا بات ہوئی۔ آج ہی چلنا ہے ابھی چلنا ہے۔"

"تو چلیے۔ لیکن پہلے کچھ کھا پی لیجیے۔ مہمان ہیں آپ میرے۔"

"خون جگر پی رہا ہوں۔ سب سے بڑی خاطر داری میری یہی ہوگی اس وقت کہ تم چلو اسے جوتے مارتے ہوئے یہاں تک لاؤ۔ اور اس کے بعد کم از کم تین دن کے لیے تھانے میں بند کر دو۔"

"آیئے چلتے ہیں۔" اور پھر تھوڑی دیر کے بعد پولیس کی ایک جیپ جس میں رضوان علی شاہ بھی بیٹھا ہوا تھا اس علاقے کی جانب چل پڑی جہاں صوفی کا قیام تھا۔

پولیس جیپ جس وقت صوفی کے محلے میں داخل ہوئی تو چاروں طرف سے گردنیں باہر نکل آئیں۔ سمن خان کے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونک پڑے۔ تاج نے شفیع اللہ سے کہا۔

"یار! لگتا ہے صوفی صاحب کو مجبور کرنے آئے ہیں۔ یہ لوگ کہ وہ دوبارہ انسپکٹری سنبھال لیں۔"

"بھلا انہیں کیا کمی ہے سرکاری حکام مارے مارتے پھرتے ہیں ان کے پیچھے، کیا شان ہے صوفی کی، اللہ نے بہت بڑا درجہ دیا ہے اسے۔" پولیس جیپ صوفی کے دروازے پر رک گئی۔ انسپکٹر ناصر علی نے اپنے آدمی کو نیچے اتارا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

"آ جاؤ بھائی کون ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" ناصر علی ایک دم چونکا تھا۔ یہ الفاظ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے اس نے حیرانی سے رضوان علی شاہ کو دیکھا۔ تو رضوان علی نے کہا۔

"یہی ہے۔ یہی جملے کہتا ہے۔" ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صوفی دروازے میں نظر آیا اور حیرانی سے بولا۔

"یہاں آنے والے کبھی دستک دے کر نہیں آتے۔ میں حیران ہوا کہ ایسا کون ہے جو میرے بلانے کے باوجود باہر کھڑا ہوا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب آپ۔" ناصر علی جو وردی میں تھا آگے بڑھ کر بولا۔

"ایں..... میاں جانتے ہو ہمیں۔"

"حضور والا۔ آپ کے قدموں میں رہ چکا ہوں دو سال تک اس وقت جب آپ گنجان اسٹریٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ایس ایچ۔او تھے۔"

"نا..... ناصر علی، ارے پہچان گئے ہم واللہ تمہیں۔ موٹے ہو گئے ہو بری بات ہے۔ پولیس افسروں کو موٹا نہیں ہونا چاہیے۔ کہاں لگے ہوئے ہو آج کل اور یہ..... یہ ارے رضوان علی شاہ صاحب۔" رضوان علی شاہ کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ناصر علی کا صوفی کے ساتھ تپاک دیکھ کر ایک لمحے کے اندر اسے احساس ہو گیا تھا کہ ان تلوں سے تیل نہیں نکلے گا وہ برا سا منہ بنائے کھڑا ہوا تھا۔

"اندر آؤ..... اندر آؤ..... اندر آؤ..... بڑی خوشی ہوئی آپ بھی آ جایئے شاہ جی۔" صوفی نے کہا۔ ناصر علی تو فوراً اندر داخل ہو گیا تھا۔ رضوان علی شاہ برے برے منہ بنانے لگا۔ صوفی نے جلدی سے بیٹھنے کے لیے چارپائی پیش کی۔ ناصر علی تو بیٹھ گیا لیکن رضوان علی شاہ کھڑا رہا۔ صوفی جلدی سے اس کے لیے کرسی لے آیا تھا۔

"آدمی کو اتنا بڑا وکیل بھی نہیں ہونا چاہیے کہ چارپائیاں بھول جائے۔ یہ تو ہماری اصل ہیں۔"

"غلط فہمی ہے آپ کو یہ آپ کی اصل ہوگی میری اصل نہیں ہے۔" رضوان علی شاہ نے کہا۔

"آپ ہمارے مہمان ہیں جناب! براہ کرم تشریف رکھیے۔" صوفی نے کہا، ناصر علی کو ایک دم یاد آ گیا کہ وہ یہاں آیا کس چکر میں تھا۔ وہ صوفی سے بولا۔

"سنا تھا اس وقت بھی جب آپ ہمارے افسر اعلیٰ تھے کہ آپ بڑی سادہ سی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسی جگہ آپ کا قیام ہوگا۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا پولیس کی نوکری کیوں چھوڑ دی آپ نے؟"

"بھئی نوکری ہمارے لیے الگ سی چیز ہے۔ پکڑنا اور چھوڑنا اچھا لگتا ہے ہمیں۔ زندگی اسی انداز میں دلکش لگتی ہے کہ اسے رسی سے باندھ کر پھینک دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ہمارے اور تمہارے نظریات میں فرق ہو۔ بس ہماری سوچ یہی ہے۔"

"صوفی صاحب! آپ یقین کریں آپ سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

"ہو رہی ہوگی۔ ہو رہی ہوگی۔ خوشیوں کا کیا ہے معمولی سی بات پر مل جاتی ہیں۔ معمولی سی بات پر ختم ہو جاتی ہیں۔ رضوان علی شاہ صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"ناصر علی! ہم لوگ یہاں کسی کام سے آئے تھے۔ شاید۔" رضوان علی شاہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایں۔ وہ ہاں یاد آیا۔ اچھا اوہو۔" ناصر علی بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

"کیا اچھا اور اوہو لگا رکھی ہے۔ یہ صاحب میرے دفتر پہنچے تھے۔ اور مجھے دھمکیاں دے کر آئے تھے۔"

"استغفر اللہ..... استغفر اللہ عزیزی! ہم نے دھمکیاں تو اپنی زندگی میں ان بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو بھی نہیں دیں جو قابل دھمکی تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہاں ہم نے یہ ضرور کہا تھا آپ سے کہ ان مظلوموں کی رقم واپس کر دیں۔ بڑے غریب ہیں بدنصیبی کا شکار ہوئے ہیں۔ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی چھن گیا ہے ان سے۔ جو چھوٹی موٹی رہنے کی جگہ تھی بیچ باچ کر آپ کو آپ کی فیسیں ادا کی اور آپ نے وہ کیس بھی چھوڑ دیا۔ ہم سے ملے تھے بے چارے۔ ایک بزرگ کے مزار پر

دعائیں مانگ رہے تھے۔ بات ہمارے علم میں آ گئی۔ پوری تفصیل معلوم کی ہم نے ان سے تو پتا چلا کہ اکلوتا بیٹا عذاب میں گرفتار ہو گیا ہے اور ان کی آنکھوں میں چراغ بجھتے جا رہے ہیں۔ بزرگ کا حکم ہوا کہ مدد کرو ان مظلوموں کی۔ بعد میں جب ہمیں ساری تفصیلات معلوم ہوئیں تو پتا چلا کہ ان کے ساتھ تو جو کچھ ہوا ہے وہ ہوا ہی ہے۔ آپ نے بھی ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ رضوان علی شاہ صاحب آپ نے ان کا کیس لڑنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ انہیں آپ کی پوری فیس ادا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ ان کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ گھر بار بیچ کر انہوں نے آپ کو پیسے دیے۔ اب تو سر چھپانے کا ٹھکانا بھی چھن چکا ہے۔ نہیں رضوان علی شاہ صاحب! کم از کم انسانیت کے رشتے سے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے آپ نے مظلوموں کو بے سہارا چھوڑ دیا تو وہ رقم آپ نے کس حساب میں ہڑپ کر رکھی ہے ہم تو اس مقصد سے آپ کے پاس گئے تھے کہ آپ سے بات کریں گے ان کے لیے آپ سے مدد مانگیں گے۔ پر آپ نے ہم سے ڈھنگ سے بات تک نہیں کی شاہ صاحب آپ کو اپنا پتا بتا آئے تھے۔ اس بچے کو آپ شاید ہماری گرفتاری کے لئے لائے ہیں۔ دیکھیں قانونی طور پر بھی تو یہ گرفتاری ممکن نہیں ہے۔ بات بالکل صحیح ہے اب آپ نے اس قصے کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ ناصر علی ان سے کہو ہم نے انہیں اڑتالیس گھنٹے دیے ہیں۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اگر انہوں نے ان کی رقم واپس نہ کی تو شاید ہمیں کوئی بڑا قدم اٹھانا پڑے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں بس یہ سمجھ لیجیے اس وقت کہتے ہیں جب فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں کہ یہ کرنا ہے۔"

"دیکھ رہے ہو تم دیکھ رہے ہو۔ کیا دی ہوئی فیس واپس کی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح دھمکی دے کر۔"

"میں آپ سے بات کرتا ہوں رضوان علی شاہ صاحب! دو منٹ۔"

"صوفی صاحب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی رقم انہیں واپس مل جانی چاہیے۔"

"دیکھو عزیزی یہ رضوان علی شاہ صاحب جو ہیں یہ بے رحمی سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ابھی تک، بلکہ ان کے بیٹے کا کیس چلتا ہے تو یہ عدالت تک میں نہیں ہوتے۔ وہ ولیوں اور درویشوں سے دعائیں مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ایک وقت کی روٹی تک نہیں ہے ان کے پاس اب ایسے حال میں انہیں ان کی رقم واپس تو کرنی چاہیے اور جانتے ہو ناصر علی ہم اس رقم سے کیا کریں گے ہم اس شخص سے ملیں گے جس نے ان کا گھر خریدا ہے ہم اسے کہیں گے کہ یہ گھر انہیں واپس کر دے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے گا وہ کریں گے اور اب تو یہ بڑا ضروری ہو گیا ہے ہمیں معاف کرنا ناصر علی اگر آپ ان کی طرف سے آئے ہو تو ہم آپ سے بھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔ انہیں سمجھا لو نہ سمجھیں تو ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جانا۔ باقی ہم خود سمجھائیں گے۔" صوفی کا لہجہ انتہائی خوف ناک ہو گیا۔ ناصر علی نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"نہیں سر!" آپ کہہ رہے ہیں تو رضوان علی شاہ صاحب کو یہ رقم واپس کرنا پڑے گی۔" رضوان علی شاہ کرسی پر کھڑا ہو گیا تھا۔

"واپس لیں گے یہ رقم آپ مجھ سے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں آپ سے باہر چل کر بات کروں گا رضوان علی شاہ صاحب! صوفی صاحب اجازت نہیں دیں گے۔"

"اوہ۔ کچھ چائے وغیرہ۔"

"چائے آپ پر ادھار رہی پھر کسی وقت یہاں آ کر پیوں گا بلکہ آپ ایسا کیجیے پولیس اسٹیشن آ جایئے۔ میں آپ سے رحمت علی کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کروں گا۔"

"ارے ہاں۔ کیا رحمت علی کے کیس کی تفتیش آپ ہی نے کی تھی۔"

"ہاں ایف آئی آر میرے ہی تھانے میں درج ہوئی ہے۔"

"تب تو پھر میں پہلی فرصت میں تم سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ان کو لے جاؤ۔ ہمارے گھر آنے والے مہمان چائے پی کر جاتے ہیں اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ چائے نہیں پئیں گے۔ انہیں بس ایک بات سمجھا دو۔ پیسے واپس کرتے ہیں اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ورنہ اس کے بعد جو نقصان پہنچے گا۔ اس کی ذمہ داری میں قبول نہیں کروں گا۔"

"یس سر۔" ناصر علی نے کھڑے ہو کر سیلوٹ مارا۔ رضوان علی شاہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ ناصر علی نے کہا۔

"آیئے شاہ جی! آیئے براہ کرم۔" یہ کہہ کر ناصر علی رضوان علی شاہ کو لے کر باہر نکل آیا۔ صوفی انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ پولیس والے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیپ واپس چل پڑی۔ رضوان علی شاہ نے کہا۔

"ہاں۔ اب تم مجھے یقیناً نصیحت کرو گے کہ میں وہ رقم واپس کر دوں۔"

"دیکھیے رضوان علی شاہ صاحب! آپ ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جس کی عزت و احترام میں خود بھی کرتا ہوں چونکہ میرا اور آپ کا ہزاروں بار تعلق قائم ہوگا۔ لیکن صوفی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ بڑی حقیقی بات ہے۔ ہمیں انسانی رشتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے میری آپ سے درخواست ہے۔ یہ رقم آپ واپس کر دیں۔"

"اور اگر نہ کروں تو کیا ہوگا۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جو کچھ ہوگا وہ ایسا ہوگا جو تمہارے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ صوفی صاحب بہت بڑے پولیس آفیسر رہ چکے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ درویشانہ مزاج کے مالک نہ ہوتے تو شاید اس وقت انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوتے۔ اتنے ہی ذہین اور اتنے ہی صاحب اختیار ہیں وہ۔ میں آپ کو یہ بتا دوں رضوان علی شاہ صاحب کہ بات پولیس تک ہی محدود نہیں ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے لیے صوفی صاحب نے اتنے زبردست کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ اگر وہ کسی سلسلے میں ملٹری سے ہی مدد مانگ لیں۔ تو ان کی بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے گا۔ اب آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔" رضوان علی شاہ کے چہرے کے نقوش ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

♥.....♥.....♥

"آخر کار شازیہ مرزا جواد بیگ کی دوسری بیوی بلکہ پہلی بیوی شاہ جہاں تک جا پہنچی ایک درمیانے درجے کی آبادی میں چھوٹا سا خوب صورت گھر تھا۔ بیل بجانے پر ایک ملازمہ قسم کی نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھنے لگی۔

"شاہ جہاں بیگم سے ملنا چاہتی ہوں۔" شازیہ نے کہا۔

"آیئے اندر آ جایئے۔ میں خبر کرتی ہوں۔" لڑکی صاف ستھرے لہجے میں بولی اور شازیہ کو اس نے ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جا بٹھایا اندر سے آواز آئی۔

"مہر کون ہے؟"

"ایک بیگم صاحبہ ہیں آپ سے ملنے آئی ہیں آنٹی۔" لڑکی نے کہا اور چند لمحوں کے بعد سفید سلک کے لباس میں ملبوس ایک خاتون اندر داخل ہوئیں۔ چہرے پر نرمی کے تاثرات لباس میں بے حد سادگی۔ بہت ہی نیک اور نفیس چہرہ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھا تھا شازیہ نے کہا۔

"آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئی ہوں بیگم صاحبہ! محکمہ پولیس سے تعلق ہے۔ پولیس کے خفیہ سیل سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"بولو کیا چاہتی ہو مجھ سے۔"

"آپ کے شوہر کے قتل کے سلسلے میں کچھ باتیں رہ گئی ہیں ان کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش مند ہوں۔"

"سرکاری اہل کار ہو۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ بری طرح پریشان ہو گئی ہوں۔ تم نوجوان ہو لڑکی یہ اندازہ تمہیں ابھی نہیں ہوگا کہ بیوگی کیا چیز ہوتی ہے۔ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود شوہر کی چھت اگر حاصل نہ ہو تو ایک ایسا خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اللہ کی پناہ، بتاؤ کیا تفتیش باقی رہ گئی ہے۔ قاتل پکڑا جا چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہیں قانون کے ہاتھ۔"

"بیگم صاحبہ! یقیناً پولیس نے آپ کے بیانات لکھے ہوں گے اور اندازے لگانے کی کوشش کی گئی ہوگی کہ اس کیس میں کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔ آپ نے بے شک ان لوگوں کو ساری حقیقتیں بتا دی ہوں گی۔ لیکن تھوڑا بہت میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔"

"جاننا چاہتی ہو۔ تمہاری مرضی ہے۔ جان لو۔ بولو کیا پوچھو گی۔"

"پہلا سوال، کیا آپ کے خیال میں وہ لڑکا رحمت مرزا جواد بیگ کا قاتل ہے۔" شاہ جہاں بیگم نے گردن جھکائی اور دھیمے لہجے میں بولیں۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر وہ مرزا صاحب کا قاتل ہے بھی تو اس کے پس منظر میں وہ الزام نہیں ہو سکتا جو اس پر لگایا گیا ہے۔"

"یعنی۔"

"یہ کہ اس نے ساز و سامان کے لیے یہ قتل کیا ہے۔ اس نے قتل اگر کیا بھی ہے تو اس کے لیے اسے اس ساز و سامان کی چوری میں ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ارے تم خود سوچو ایسا آدمی جو تھوڑا بہت سامان لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر بھاگنا چاہتا ہو وہ قاتل کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر۔"

"دیکھو مجھے اصل بات بتانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے میں تو اپنا شبہ ظاہر کروں گی باقی کام پولیس کا ہوگا کہ وہ کیا کرتی ہے۔"

"ظاہری بات ہے۔ آپ پولیس مین تو نہیں ہیں جو اپنے شبے کے ثبوت بھی پیش کرتی پھریں گی۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ڈرتی رہی ہوں۔ کون کسی کا تحفظ کر سکتا ہے۔ پولیس بھی بس اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ واردات ہو جاتی ہے تو اس کی تفتیش شروع کر دیتی ہے اگر اس پر اس خدشے کا اظہار کیا جائے کہ واردات ہونے والی ہے اور مخبر کو تحفظ کی ضرورت ہے تو تم یقین کرو آج تک تو ایسا ہوا نہیں ہے۔ کہ پولیس کے تحفظ سے کسی کی جان بچ گئی ہو۔ ہاں اگر پولیس کو اطلاع دینے والا مر جائے تو پولیس اخبارات کو یہ بیان ضرور دیتی ہے کہ بہت جلد قاتل کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب تم مجھے خود بتاؤ۔ مقتول کو اس سے کیا فائدہ قاتل گرفتار ہو بھی گیا تو مقتول کو اس کی زندگی واپس نہیں مل سکتی۔ عجیب طریقہ کار ہیں۔ بلکہ میں تو سچ بات کہتی ہوں میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ قانون میں بہت ہی کمزوریاں، بہت سی خامیاں ہیں۔ خیر مجھے معاف کرنا تمہارا تعلق چونکہ خود قانون سے ہے اس لیے تم میری باتوں کو پسند نہیں کرو گی۔ میں کھل کر یہ بات کہتی ہوں کہ مرزا جواد بیگ کو راستے سے ہٹایا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں ان کی دوسری بیگم ہیں۔ سمجھ رہی ہیں آپ ان کی دوسری بیگم۔"

"اوہ۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں بیگم صاحبہ! شازیہ نے پرتجسس لہجے میں کہا۔"

"بہت بڑی بات کہہ گئی ہوں اپنی زبان سے لیکن ایک بات بتاؤ۔ یہ کام تو تم لوگوں کا ہے کہ حقیقتوں کو معلوم کرو میں جو کچھ بھی کہوں گی اسے اس نگاہ سے دیکھا جائے گا کہ میں سوکن ہوں۔ یا وہ میری سوکن ہے لیکن میرے دل کے چھالے کس طرح پھوٹیں گے۔ یہ بتائے بغیر کہ میری سوتن نے بلی کا کام کیا ہے کہ کھایا اور لڑکا دیا۔ ارے کم بخت میرے شوہر کو میری زندگی کا ساتھی ہی رہنے دیتی جو حاصل کرنا تھا۔ حاصل کر لیتی مگر یہ بھی تو آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ ذرا اس کا ماضی معلوم کر لو۔ معمولی سے گھرانے کی عورت ہے کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہے اس کا۔ اس طرح کی عورتوں میں سے ایک ہے جو مردوں کو رجھاتی ہیں اور اپنا مستقبل بنا لیتی ہیں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ ٹکے ٹکے کی زندگی گزارنے والی عورت کو اتنی دولت ملی تو یہ احساس ہو گیا کہ یہ دولت جا بھی سکتی ہے۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ بات یہ تھی کہ مرزا جواد بیگ کو اولاد کی کوئی بہت زیادہ خواہش نہیں تھی۔ وہ تو سب بہانے ہوتے ہیں ان مردوں کے، اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں اصل بات تو یہ تھی کہ زمرد جہاں نے بے چارے مرزا جواد بیگ کو اپنے حسن و جمال کے جال میں گرفتار کر لیا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی اس حیلے سے کی کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اللہ تو بہت بڑا ہے۔ مرزا جواد کو اس نے اولاد سے پھر بھی محروم رکھا لیکن ان کا رابطہ مسلسل مجھ سے بھی تھا۔ زمرد جہاں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تقدیر میرے دن پھیر دے اور میں صاحب اولاد ہو جاؤں۔ بس یہ خوف اس کو کھائے جا رہا تھا وہ دوسرے مزاج کی عورت ہے وہ جو نچلے درجے کی عورتیں ہوتی ہیں نا۔ جنہیں ان کی

اوقات سے زیادہ مل جائے۔ تو سب سے پہلے وہ اپنی اوقات کو بھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ورنہ بی بی ذرا سی معلومات حاصل کر لو۔ کس پائے کی عورت ہے وہ کیا کرتی ہے؟ اور کیا نہیں کرتی۔ اب محترمہ کلبوں میں بھی جاتی ہیں گھر میں بھی سنا ہے رقص و موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نوجوان دوست آتے ہیں اور رات رات بھر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے۔ مجھے بھی کچھ ملازموں سے پتا چلتا رہتا ہے۔ تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ مرزا جواد بیگ کچھ بھی تھے لیکن مرحوم کا ایک خاندانی پس منظر بھی تھا عورت کے جال میں تو بڑے بڑے لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ لیکن پھر شاید یہ احساس ہو گیا کہ غلطی کر بیٹھے ہیں۔ اس پائے کی عورت کو بیوی نہیں بنایا جس پائے کی عورت ان کے لیے ضروری تھی کچھ کہا سنا ہوگا۔ یہ ظاہر کیا ہوگا کہ وہ اسے طلاق دے دیں گے۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے زمرد جہاں کی ان رنگ رلیوں کی خبر انہیں ہو گئی تھی۔ اور زمرد جہاں نے اپنے اختیارات سے کام لے کر کام دکھا دیا ہو۔ دیکھو..... دل میں آگ بھڑک اٹھی ہے اس لیے زہر اگل رہی ہوں لیکن یہ سب بے مقصد نہیں ہے۔ اس کا کوئی پس منظر ہے اپنی تفتیش کرو۔ اور پتا چلا لو۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔ میں تم سے کھلے الفاظ میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ مرزا جواد بیگ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں زمرد جہاں کا ہاتھ ہے۔"

"شازیہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی وہ بہت خوش ہو گئی تھی ایک بار پھر اسے ایک کیس کو حل کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب کہ سنگینہ بستی کی خانم فردوسیہ کے مسئلے کو صحیح معنوں میں اسی نے حل کیا تھا اور اس کی اسے داد بھی ملی تھی ویسے اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ شازیہ گرین فورس کی بہترین ممبر ثابت ہو رہی تھی اور اس نے بہت کچھ کر کے دکھایا تھا۔ کام تو باقی لوگ بھی کر رہے تھے۔ لیکن شازیہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ شاہ جہاں بیگم سے باتیں کرتی رہی۔ شوہر کا ذکر کرتے ہوئے شاہ جہاں بیگم زار و قطار رونے لگیں۔

"ساتھ تو ہوتا ہے نا، زندگی کا ایک عرصہ گزرتا ہے تب کہیں جا کر اتنی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے مگر پتا نہیں کیسے ہوتے ہیں یہ مرد لمحوں میں برسوں کی رفاقت کو بھلا دیتے ہیں۔ دہری زندگی گزارتے ہیں ہائے اتنے برے نہیں تھے مرزا جواد بیگ شروع شروع میں تو بہت اچھے رہے تھے میرے ساتھ۔ رہنا چاہتی تو میں جانتی تھی کہ میری حق تلفی نہ ہوگی۔ لیکن بی بی سوتن کے ساتھ گزارہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا سکی ارے اگر وہیں رہتی تو کم از کم اس حرافہ کی حرکتوں سے تو باخبر رہتی۔"

"بہت دیر تک شاہ جہاں بیگم آنسو بہاتی رہیں۔ شازیہ بہرحال اس حد تک معلومات کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ چھوٹے بابا کو یہ بتا سکے کہ شاہ جہاں بیگم کا کیا موقف ہے۔ وہ واپسی کے اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ جہاں بیگم نے اسے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھو..... اور تو کچھ نہیں کہتی میں۔ اگر اپنی تفتیش کا آغاز کرو تو میرا نام کسی طرح نہیں آنا چاہیے۔ میرا تو کوئی سہارا نہیں ہے کہ میں اس سے سہارا لے سکوں۔" شازیہ انہیں مطمئن کر کے وہاں سے باہر نکل آئی۔

بہرحال وہ اپنی اس کارروائی کو بے مقصد قرار نہیں دے سکتی تھی۔ تھوڑی سی حقیقتوں کا ادراک ہوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ ابھی اس نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اچانک ہی اس نے ایک موٹر بائیک کو شاہ جہاں بیگم کے گھر کے دروازے پر رکتے ہوئے دیکھا۔ موٹر بائیک سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نیچے اترا اور شازیہ اسے دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس نے ایک دروازے کی آڑ لے لی تھی۔ جو ایک گھر کا دروازہ تھا۔ موٹر بائیک سے اترنے والا گل جان تھا اور گل جان ایک پیشہ ور قاتل کی حیثیت سے کئی بار پولیس کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سب سے خاص بات یہ تھی کہ وہ قتل بھی کرتا تھا اور اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ پولیس کو کئی بار اس پر شبہ ہوا تھا۔ لیکن ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پولیس گل جان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی تھی۔ گل جان نے شاہ جہاں بیگم کے دروازے پر دستک دی اور اس ملازم لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ گل جان اطمینان سے اندر چلا گیا۔ یہ اس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ شازیہ بہت دیر تک وہاں کھڑی حیرت میں ڈوبی رہی۔ پھر جب اسے احساس ہوا تو اس نے جلدی سے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ گل جان جیسا بدکردار اور بری شخصیت کا مالک یہاں کیسے آیا تھا۔ یہ بات قابل غور تھی۔ پھر اچانک ہی شازیہ نے گل جان کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس طرح لپک کر باہر آیا تھا جیسے کسی کی تاک میں ہو اور پھر وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ لیکن شازیہ آڑ میں تھی۔ خوش قسمتی سے اس وقت اس آڑ میں کھڑی رہی لیکن اس کی ذہانت اس پر عقل کے دروازے کھول رہی تھی۔ گل جان شاہ جہاں بیگم کے پاس کیوں آیا تھا اور اس طرح باہر نکل کر اسے تلاش کر رہا تھا۔ اسے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ گل جان تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اندر واپس چلا گیا۔

اب شازیہ نے برق رفتاری سے یہاں سے بھاگ جانا مناسب سمجھا تھا۔

♥.....♥.....♥

"صوفی پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گیا وہ ناصر علی کو فون کر کے بتا چکا تھا کہ وہ آ رہا ہے ناصر علی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے بھی اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ صوفی اندر داخل ہوا تو ناصر علی نے کھڑے ہو کر اسے سلیوٹ کیا اور صوفی ہنستا ہوا آگے بڑھا۔

"اماں کیوں ذلیل کر رہے ہو ناصر علی۔ اب یہ سلیوٹ کسے کیا جا رہا ہے۔ ہماری وردی تو پھر ہو گئی۔"

"آپ کس سے بات کر رہے ہیں صوفی صاحب۔" میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ایک ہلکا سا اشارہ محکمہ پولیس میں واپس آنے کا کریں تو ہمارے نئے آئی جی صاحب! خود بازو پر وردی ڈالے آپ کا انتظار کریں گے۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے کہ محکمہ پولیس نے آپ کو نہیں چھوڑا بلکہ آپ نے محکمہ پولیس کو چھوڑ دیا ہے۔"

"بس کرم ہے درویشوں کا بات اصل میں وہی ہے ناصر علی، وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہمارے تو نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا مالک کریم جہاں اور جس عالم میں زندگی گزروا دے بات زندگی گزارنے کی ہے۔"

"آپ بیٹھیے صوفی صاحب! یہ بتائیے کہ کیا پئیں گے۔"

"پان تھوک رکھا ہے۔ منہ صاف کیے رکھا ہے کیونکہ جانتے تھے کہ تم کچھ کھلائے پلائے بغیر باز نہیں آؤ گے۔ بس کچھ بھی منگواؤ۔ ٹھنڈی چیز ہو تو بہتر ہے۔" ناصر علی نے فوراً ہی اردلی کو بلایا اور کچھ مشروب لانے کے لیے کہا۔ صوفی نے بڑے اطمینان سے پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ نکال کر میز پر رکھ لیا تھا۔

"سنائیے صوفی صاحب۔ کیا ہو رہا ہے آج کل۔"

"بس میاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہے۔ ہماری تو حضرت حال یہی ہے نا کہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا دو وقت کی روٹی مل جائے تو زندگی گزر جاتی ہے۔ بس یہی ایک طلب ہے۔ دو وقت کی روٹی، ڈھکا بدن اور درویشوں کی قربت سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کرم فرما ملتے رہتے ہیں۔ بڑی اعلیٰ حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ سر پر ہاتھ رکھ دیں تو سمجھ لو تو وہی ہما کے سائے والی بات ہو جاتی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ناصر علی نے کہا۔

"صوفی صاحب! آپ کے پرستاروں میں سے ہوں ان میں سے جو بے لوث آپ کی عزت کرتے ہیں اور واقعی آپ اس عزت کے مستحق بھی ہیں۔ بہر حال رضوان علی شاہ کا کیا معاملہ ہے۔ ذرا سی تفصیل اگر میرے علم میں آ جائے تو اچھی بات ہے۔ ویسے میں نے رضوان علی شاہ کو سمجھا تو دیا ہے کہ جو کچھ صوفی صاحب کہہ رہے ہیں وہ کر دیں۔ میرا خیال ہے بات سمجھ میں آ بھی رہی ہے ان کی۔ چنانچہ دیکھیے کب رابطہ قائم کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ ضروری ہے بہت ضروری اڑتالیس گھنٹے دیے ہیں ہم نے انہیں درویشوں کی دعاؤں سے، اس کے بعد ان کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں دیکھو کیا کرتے ہیں وہ۔ ایک زحمت کریں آپ اگر مناسب سمجھیں تو۔"

"ہاں بولو۔"

"کسی شخص کو عقل آنے میں کبھی کبھی دیر بھی لگ جاتی ہے۔ رضوان علی شاہ کو کرنا وہی پڑے گا جو آپ نے کہا ہے صوفی صاحب لیکن اگر آپ تھوڑا سا وقت مجھے بھی دے دیں تو میں ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"وہ کس سلسلے میں عزیزی۔" صوفی نے سوال کیا۔

"رضوان علی شاہ کو سمجھاؤں گا ویسے رقم کتنی ہو گی۔"

"ستر اسی ہزار روپے ہیں بات ستر اسی ہزار کی نہیں ہے۔ اصل میں جس کی وہ رقم ہے اس نے پوری زندگی ستر اسی سو تک نہیں دیکھے ہیں اپنی دیوانگی اور محبت میں ادھر کی رقم ادھر منتقل کر دی ہے۔"

"کچھ اور تفصیل سمجھائیں گے۔"

"ہاں سمجھانا ضروری ہے اصل میں ناصر علی وہ لڑکا جس کا نام رحمت علی ہے اور جسے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں بے گناہ ہے میں اس وقت ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کے مزار پر حاضری میں تھا کہ میں نے دو ستم رسیدہ افراد کی دل دوز فریاد سنی۔ وہ بھوکے پیاسے مزار پر منت مانگنے آئے تھے۔ یہ رحمت علی کے والدین تھے۔ رحمت علی کی پوری تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ بستی شیخ امانت کا رہنے والا ہے نوکری کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اسے نوکری مل گئی۔ بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ ساری تفتیش میں نے مکمل کر لی ہے اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس معاملے میں تمہاری تفتیشی رپورٹ کیا ہے ہاں وہ رقم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا معاملہ رہ گیا درمیان میں، بے چارہ غریب باپ بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے شہر آ گیا اور نہ جانے کس طرح رضوان علی شاہ سے ٹکرا گیا۔ انہوں نے اسے اپنی فیس بتائی اور وہ بھاگ دوڑ میں لگ گیا۔ چھوٹی سی جھونپڑی تھی اس کی بستی شیخ امانت میں وہ بیچ دی اس نے دکان و مکان سب بیچ دی، جو وہ وہاں کرتا تھا اور یہ ستر اسی ہزار روپے کی رقم لے کر رضوان علی شاہ کے پاس پہنچ گیا اور رضوان علی شاہ نے شاید اس سے بھی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا رحمت علی کا کیس لڑنے کے لیے۔ وہ رقم اس نے فوراً اپنے قبضے میں کر لی۔ مگر اس کے بعد جو گھناؤنا قدم اس نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ انہوں نے فیاض علی سے کہا کہ باقی رقم کا ابھی بندوبست کرے۔ اور اگر اس نے باقی رقم کا بندوبست نہیں کیا تو وہ اس کا کیس نہیں لڑیں گے اور اس نے ایسا ہی کر دکھایا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جھونپڑی بھی اسے واپس خرید کر دینی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ وہ جھونپڑی بیچ گئی ہے اسے وہ جھونپڑی واپس کرنا ہوگی اور اس رقم سے وہ جھونپڑی دوبارہ واپس ملے گی۔ دیکھو اس رقم کا بندوبست کوئی بھی مخیر آدمی کر سکتا ہے۔ تم یقین کرو میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ لیکن رضوان علی شاہ کا طریقہ کار غلط ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" ناصر علی نے پرجوش لہجے میں کہا وہ خود بھی ایک جوشیلا نوجوان تھا اور یہ ساری باتیں سن کر جوش میں آ گیا تھا۔ اردلی نے مشروبات لا کر رکھ دیے تو ناصر علی نے کہا۔

"لیجیے صوفی صاحب۔"

"از حد شکریہ۔ اب ناصر علی ہمیں اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔"

"جی مرزا جواد بیگ اچھے خاصے دولت مند آدمی ہیں۔ دو شادیاں کی ہیں بڑی بیگم الگ رہتی ہیں۔ رحمت علی پر یہ الزام ہے کہ اس نے گھر کا سامان چوری کیا اور اسے لا کر اپنے کوارٹر میں چھپا دیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے مالک کو قتل کر دیا اور یہاں سے نکلنے کی فکر میں لگ گیا۔ لیکن وقت سے پہلے پکڑا گیا۔"

"رحمت علی نے اس سلسلے میں کیا کہا ہے۔ اعتراف جرم کرتا ہے وہ۔"

"نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ سامان اس کے گدے کے نیچے کہاں سے آیا۔"

"ہوں ثبوت اور ملے۔"

"نہیں اس سے بڑا ثبوت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ آلہ قتل بھی وہیں موجود تھا۔ اور خون آلود بھی تھا پھر وہ ساز و سامان جو وہاں چوری کیا گیا تھا۔" صوفی نے سامنے رکھا ہوا مشروب کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا پھر بولا۔

"پان کھا سکتا ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ صوفی صاحب۔ آپ کا خادم آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اصولی طور پر مجھے اس کرسی پر آپ کے سامنے بیٹھنا بھی نہیں چاہیے براہ کرم آپ پان کھائیے۔ میں پیک تھوکنے کے لیے باسکٹ منگوا کے دیتا ہوں۔ یہاں اگال دان کا انتظام تو نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ ملاقات کرتے رہنے کا وعدہ کریں تو اگال دان بھی منگوایا جا سکتا ہے۔"

"شکریہ شکریہ۔" پان کی گلوری منہ میں رکھ کر چھالی تمباکو اور اس کے بعد قوام کھایا گیا اور صوفی اس طرح اونگھنے لگا جیسے بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ اگر بھینس کی طرح جگالی نہ کر رہا ہوتا تو یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ سو گیا

ہے۔ کوئی دس منٹ تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور ناصر علی بیٹھا احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ پھر صوفی نے بھاڑ سا منہ کھولا اور اس کے منہ سے سرخ پرنالہ بہنے لگا۔ باسکٹ میں یہ ملغوبہ اگلنے کے بعد اس نے کہا۔

"سامان کی نوعیت بتاؤ گے۔"

"ہاں۔ کچھ قیمتی برتن جو بہرحال اچھی خاصی مالیت کے تھے اور کچھ ڈیکوریشن پیس تھوڑی سی رقم جو مرزا جواد بیگ کے کوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ بس یہی چیزیں تھیں۔"

"آلہ قتل کیا تھا۔"

"ایک چھرا جو خون میں ڈوبا ہوا تھا۔"

"ہاتھوں کے نشانات آلہ قتل سے ملے۔"

"نہیں غالباً اس کے دستے کو رومال سے پکڑا گیا تھا۔"

"رومال ملا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"گویا آلہ قتل کو رومال سے پکڑا گیا رومال پھینک دیا گیا اور آلہ قتل محفوظ کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ چوری شدہ اشیاء کچھ ڈیکوریشن برتن اور تھوڑے سے روپے تھے کیا ڈیکوریشن پیس اور برتن مرزا جواد بیگ کے کمرے میں ہوا کرتے تھے اور کیا مرزا جواد بیگ اور ان کی چھوٹی بیگم الگ سویا کرتے تھے۔"

"نہیں دونوں کا بیڈروم مشترک تھا جیسا کہ ہوتا ہے۔"

"برتن اور ڈیکوریشن پیس حاصل کرنے کے بعد ملزم رحمت علی کیا ان تمام چیزوں کو لے جانے کی اجازت لینے گیا تھا ان کے بیڈروم میں۔"

"وہ کسی اور چیز کی تلاش میں ہوگا جیسے کوٹ میں رکھی ہوئی رقم۔"

"ہوں۔ دیکھو کوئی چور اگر چوری کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ تو پہلے وہ اپنے بچاؤ کا انتظام ضروری سمجھتا ہے۔ یعنی اس جگہ سے بھاگ جان جہاں اس نے چوری کی ہے۔ یہ کیسا مطمئن چور تھا درویشوں کی دعاؤں سے۔ جو چوری کرنے کے بعد آرام سے اپنے کوارٹر میں جا کر سو گیا کہ جو کچھ ہوگا صبح کو دیکھا جائے گا رات کا کام ختم۔"

"صوفی صاحب اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جاری ہے کہ رات میں وہ باہر نکل نہیں سکتا تھا۔"

"ایک دیہاتی آدمی جس کے بارے میں یہ پتا چل چکا ہے کہ اس نے اپنی ساری زندگی اس چھوٹی سی بستی شیخ امانت میں گزاری۔ وہ اتنا ذہین اور سفاک قاتل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص آلہ قتل کے دستے کو رومال سے پکڑتا ہے اور قتل کرنے کے بعد اس آلہ قتل کو اپنے کمرے میں چھپا لیتا ہے اس طرح چوری شدہ مال و اسباب کو وہ باہر نکالنے کے لیے بھی کوششیں کر سکتا ہے اور ان کوششوں میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ یار! ذرا غور کرو ناصر علی! ایسا مطمئن اور دور نگا چور ہم نے تو پہلے کبھی نہیں دیکھا درویشوں کے فضل سے تم کیا کہتے ہو اس بارے میں۔

"نہیں۔ کیس میں گڑبڑ تو ہے۔ لیکن صوفی صاحب وہی والی بات ہو جاتی ہے کہ ہم اصل کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تلاش کریں۔ بس ثبوت، کچھ چوری شدہ اشیاء سامنے آئیں اور بات ختم ہوگئی۔ یہی تو اختلاف رہا ہے مجھے اپنے محکمے سے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جرم کو ختم کیا جائے۔ لیکن ہر چیز کی چھان بین کے بعد یہ نہیں کہ کچھ مخصوص مجرم سوچی سمجھی پلاننگ سے جرم کریں اور پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے سارے انتظامات کرلیں اور پولیس بڑے پیار سے ان غلط راستوں پر چل پڑے۔"

"ایک بار پھر میں رحمت علی کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں ایک دیہاتی نوجوان نوکری کرنے کے لیے آیا ہے۔ چوری کرتا ہے مالک کو قتل کردیتا ہے اور آرام سے اپنے کوارٹر میں آکر سوجاتا ہے۔ میرے عزیز دوست! ایسا کسی طور ممکن نہیں ہوسکتا۔ پہلا جرم کرنے کے بعد تو انسان آدھا مرجاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے بھلا اسے نیند کیسے آئے گی۔ جب کہ رحمت علی کو نیند کے عالم میں ہی گرفتار کیا گیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ خیر ہم ثبوتوں کی بات کرتے ہیں ثبوت بھی مہیا ہو ہی جائیں گے۔ میں اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تم سے مجھے یہی معلومات حاصل کرنی تھیں۔"

صوفی تھوڑی دیر تک ناصر علی کے پاس بیٹھا رہا اس کی فرمائش پر ناصر علی نے اس کیس کے فائل کی فوٹو اسٹیٹ کرانے کے لیے بھجوادی تھی۔ پھر ایک نئی فائل بنا کر اس نے صوفی کے حوالے کی اور صوفی شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ گیا۔

♥.....♥.....♥

شازیہ بری طرح چکرائی ہوئی تھی۔ دلاور کے پاس بیٹھی ہوئی وہ صوفی کا انتظار کر رہی تھی۔ میک اپ تبدیل کرلیا تھا اور اب اپنی اصل شکل میں تھی۔ پھر صوفی بھی وہاں پہنچ گیا۔ کرنل رحیم شاہ سردار پور میں ہی تھا۔ کیونکہ کوئی اہم ضرورت آج کل نہیں تھی۔ جہاں تک مسئلہ رحمت علی کا تھا۔ تو کرنل نے پیشکش کردی تھی کہ اخراجات چاہے کتنے ہی ہوجائیں رحمت علی کو نکال کر لانا ہے۔ ادھر فیاض علی اور اس کی بیوی بھی آرام سے رہ رہے تھے۔ دونوں دن اور رات میں چند ہی گھنٹے سوتے تھے اور بس عبادت کرتے رہتے تھے۔ اپنے لیے سکون مانگتے تھے اور بیٹے کے لیے زندگی اور اس سلسلے میں خدا کے نیک بندے مصروف عمل تھے۔ صوفی مطمئن انداز میں گرین ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ دلاور، غلام قادر اور شازیہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

عادل اور فیضان سردار پور میں ہی تھے زیادہ تر یہ لوگ وہیں رہا کرتے تھے۔ ہاں جب کوئی ضرورت ہوتی تھی تو صوفی انہیں طلب کرلیتا تھا۔ بہر حال یہ گرین فوس کے سب سے ناکارہ نمائندے تھے۔

صوفی نے شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

"ہاں۔ تم نے کیا کیا شازیہ۔"

"چھوٹے بابا! میں نے خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی ہنسنے لگا پھر بولا۔

"درویشوں کے نام کو مذاق کے طور پر مت استعمال کیا کرو۔ سمجھتی نہیں ہو تم وقت تمہیں خود سمجھا دے گا۔ تم کیا جانو کہ ان کا فیض کیا ہوتا ہے۔"

"نہیں چھوٹے بابا! میں نے مذاق نہیں اڑایا اگر آپ نے یہ محسوس کیا ہے تو معافی چاہتی ہوں۔"

"ہاں تو تم کیا کر کے آئی ہو۔"

"پہلے تو چھوٹے بابا میں نے زمرد جہاں سے ملاقات کی یہ زمرد جہاں مرزا جواد بیگ کی دوسری بیوی ہے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ مرزا جواد بیگ کا اس شادی کے سلسلے میں موقف یہ تھا کہ پہلی بیوی شاہ جہاں سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شاہ جہاں بیگم ایک انتہائی شریف، نیک اور نفیس خاتون ہیں۔ بہر حال میں زمرد جہاں سے ملی شوہر کے بارے میں بات ہوئی۔ شوہر کی موت کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ وہ ایک عیش پرست عورت ہے اور مرزا جواد بیگ اس کے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔ وہ زندگی کو عیش وعشرت کے عالم میں گزارنا پسند کرتی ہے۔ وہاں موجود ملازموں کا خیال ہے کہ رحمت علی جتنا نیک نفس بچہ تھا وہ قتل نہیں کرسکتا۔ بلکہ اسے پھنسایا گیا ہے۔ جب کہ زمرد جہاں دہری کیفیت کا شکار ہے۔ لیکن چونکہ رحمت علی کے خلاف ثبوت ملے ہیں اس لیے وہ لوگ اسی کو قاتل سمجھتے ہیں۔"

بہر حال اس کے بعد میں شاہ جہاں بیگم سے ملی۔ شاہ جہاں بیگم کھلے الفاظ میں یہ کہتی ہیں کہ ان کا سائبان چھن گیا۔ زمردان کی قاتل ہے کیونکہ اس کی رنگ رلیاں رک گئی تھیں ویسے یہ بھی سچ ہے کہ زمرد بیگم عیش پرست ہیں اور ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے لیے ان کی اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے بابا جب کہ اس کے برعکس شاہ جہاں بیگم خاندانی عورت معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے پر نور ہے۔ عبادت گزار بھی ہیں بلک بلک کر رو رہی تھیں کہ مرزا جواد بیگ کچھ بھی تھے ان کی چھت تو تھے۔ میں ان سے ملاقات کرنے کے بعد باہر نکل آئی۔ لیکن چھوٹے بابا اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو میرے لیے حیران کن اور میرے ذہن کو الجھا دینے والا تھا۔"

سب چونک کر شازیہ کو دیکھنے لگے۔ شازیہ نے کہا۔

"میں نکل کر تھوڑی دور چلی تھی کہ شاہ جہاں بیگم کے گھر میں نے ایک شخص کو موٹر سائیکل پر آتے ہوئے دیکھا۔ موٹر بائیک کھڑی کر کے وہ بڑے اطمینان سے شاہ جہاں بیگم کے پاس چلا گیا اور پھر اس طرح دوڑ کر باہر آیا۔ جیسے میری تلاش میں ہو۔ شاہ جہاں بیگم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہو۔ اور وہ یہ دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہو کہ پولیس کی کون سی ایجنسی آفیسر تھی جو شاہ جہاں بیگم سے تفتیش کرنے کے لیے آئی تھی میں تو چھپ گئی تھی۔ وہ دیر تک مجھے تلاش کرتا رہا اس کے بعد اندر چلا گیا اور یہ شخصیت گل جان کی تھی۔ چھوٹے بابا میں گل جان کے بارے میں اس طرح جانتی ہوں کہ جب میں بھکارن بن کر بھیک مانگا کرتی تھی تو میں نے گل جان کا علاقہ بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک خطرناک قسم کا غنڈہ ہے اور ہر طرح کی مجرمانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ چھوٹے بابا آپ مجھے بتایئے کہ گل جان جیسے خطرناک آدمی کا شاہ جہاں بیگم سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

صوفی خاموش تھا لیکن دلاور جلدی سے بول پڑا۔

"گل جان کو میں جانتا ہوں صوفی صاحب! چھٹا ہوا بدمعاش ہے کئی قتل بھی کرچکا ہے۔ لیکن چالاکی سے کام کرتا ہے۔ آدمی بہت خطرناک ہے۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زمرد جہاں نے گل جان کو حاصل کیا ہو اور اسے حکم دیا ہو کہ وہ شاہ جہاں بیگم کو قابو میں رکھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" سب سوچ میں ڈوب گئے۔ دلاور نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چھوٹے بابا! ایک سیدھا سادھا کام دنیا کا سب سے اچھا کام ہوتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''گل جان کو اٹھا لاتے ہیں اس سے معلومات حاصل کریں گے۔'' دلاور نے بے خوفی سے کہا تو غلام قادر بولا۔

''اڑے ماں قسم یہ کام میڑے کو دے دو۔ وڈی میں ایسا فلٹھی لگاؤں گا کہ وہ اپنی پیدائش کا حال بھی اگل دے گا۔'' صوفی دیر تک سوچتا رہا تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ گل جان بہت سے انکشافات کرے گا اس کے لیے یہاں مہمان نوازی کا انتظام کرلو۔''

♥.....♥.....♥

''کرنل رحیم شاہ اچانک ہی گرین ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ اس وقت گرین ہاؤس ایک مکمل ہاؤس بنا ہوا تھا۔ شازیہ دلاور کی بیوی کے ساتھ کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ دلاور اور غلام قادر گرین ہاؤس کی کیاریاں درست کر رہے تھے اور صوفی گلے میں ایپرن باندھے ہوئے پورے گھر کی ڈسٹنگ کرتا پھر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے حیرت سے ان تمام لوگوں کے مشاغل دیکھے اور ہنستا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ صوفی کو دیکھ کر تو وہ بہت ہی ہنسا تھا۔

''اوہ صوفی صاحب! یہ آدھا پائجامہ آپ پر خوب جچ رہا ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے صوفی کے نچلے بدن کے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ درحقیقت یہ کوئی باقاعدہ جانگیا نہیں تھا بلکہ کسی پائجامہ کو درمیان سے پھاڑ کر اسے جانگیا بنالیا گیا تھا اور کچھ ایسے اناڑی ہاتھوں نے اسے پھاڑا تھا کہ ایک پائنچہ اونچا اور ایک نیچا ہوگیا تھا اوپر سے صوفی نے قمیص اس جانگیے کے اندر کرلی تھی۔ سوکھی ہوئی دبلی دبلی ٹانگیں جانگیے کے سامنے ٹخنوں تک اترنے والا ایپرن، منہ میں پان، سر پر ٹوپی، صوفی واقعی ایک کلاسیکل چیز لگ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے حلق سے کئی قہقہے نکل گئے اور صوفی نے جالے صاف کرنے والا برش جو لمبے بانس میں بندھا ہوا تھا نیچے رکھا اور کرنل کو سلیوٹ کرنے لگا۔

''وعلیکم سلیوٹ! کیا ہو رہا ہے یہ صوفی صاحب۔''

''بضم.....بضم.....بضم.....'' صوفی نے اپنے پچکے ہوئے گال پھلاتے ہوئے کہا۔

''ایسا کریں آپ اس بضم بضم سے نجات حاصل کرلیں اور میرے پاس آجائیں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔'' یہ کہہ کر کرنل رحیم شاہ اس بڑے ہال نما کمرے سے نکل گیا اور اپنے کمرے میں جا کر صوفی کی دلچسپ شخصیت پر غور کرنے لگا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر صوفی کرنل کے سامنے پہنچ گیا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل مناسب لباس میں تھا منہ بھی پان سے صاف تھا۔ اندر داخل ہوکر اس نے سلیوٹ کیا تو کرنل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

''آیئے تشریف رکھیے۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔''

''درویشوں کا کام ہے۔ حق اللہ۔''

''وہ دونوں ٹھیک ہیں۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیا پیش رفت ہوئی ہے اس سلسلے میں؟''

''کام جاری ہے اندازے قائم کیے جا رہے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ رحمت علی بے گناہ ہے اس بے چارے کو اس جرم میں پھانسا گیا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

''یقیناً صوفی صاحب! آپ نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔''

''گرین فورس معروف عمل ہے جناب والا! اور ہم بہت جلد اصل مجرم کو منظر عام پر لے آئیں گے اور اس بچے کو اس کے بعد والی چیشی میں چھڑا لیں گے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے صوفی صاحب! بہت سوں کا سہارا ہیں آپ۔''

''حق اللہ.....حق اللہ.....حق اللہ.....مگر جناب ایک اور ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس کے سلسلے میں یا تو آپ رہنمائی فرمایئے اور اگر مشکل درپیش ہو تو ہم کوشش کرتے ہیں۔''

''ہاں بتایئے۔''

''جب اس انداز میں بھی کام کرنے کا ارادہ کرلیا ہے آپ نے کہ ہر مظلوم کی دادرسی کی جائے تو ہمیں بہت سے نئے ساتھیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ انسپکٹر اور تھانہ تو میں نے تلاش کرلیا ہے کیونکہ یہ میرا شعبہ رہ چکا ہے۔ ہمیں ایک بہت ہی قابل وکیل کی ضرورت درپیش ہے۔''

''واہ.....کیا عمدہ بات کہی آپ نے صوفی صاحب! ابھی میں جس شخص کے پاس سے اٹھ کر آرہا ہوں اس کا نام فرقان جلیل ہے۔ یہ نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔''

''بیرسٹر فرقان جلیل۔ وہ تو بڑے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔''

''میرے بچپن کا دوست ہے ہم نے میٹرک ایک ساتھ ہی کیا تھا اس کے بعد ہم دونوں کے راستے جدا جدا ہوگئے۔ پہلے بھی اکثر ملتا رہا ہے لیکن کچھ رشتے چل رہے تھے۔ اس نے مجھے فون کیا تھا کہ میں ذرا اس کے پاس آجاؤں اور اس کی بیٹی کے اس رشتے کے بارے میں بات کروں۔ جو آیا ہے اس بات چیت کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری مصروفیات کیا ہیں میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتادیا۔ بہت متاثر ہوا کہنے لگا کہ اگر وکیل کی حیثیت سے اس کی ضرورت پیش آئے تو اسے بھی ان نیک کاموں میں ہمیشہ شریک رکھا جائے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا اور یہ کہا کہ جس بچے کے بارے میں ہم لوگ اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اس کے کیس کو ری اوپن کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس نے آمادگی کا اظہار کردیا ہے۔''

''حق اللہ.....حق اللہ.....اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ یہ بڑے کام کی بات ہوتی ہے اور پھر کرنل رحیم شاہ کو تفصیلی رپورٹ دینے لگا۔

♥.....♥.....♥

پورا اسکرپٹ عادل کے سامنے تھا اور وہ تین چار بار اس کی ریہرسل کرچکا تھا بہرحال اب اس قدر بے صلاحیت بھی نہیں تھے یہ لوگ کہ اتنا سا کام نہ کرسکتے۔ آخر کار عادل نے نمبر ڈائل کیا۔ صوفی، شازیہ، غلام قادر سب کے سب موجود تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد دوسری طرف سے رابطہ ہوگیا اور آواز آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں بولو کون ہے۔ کیا بات ہے۔"

"وہ حضور والا ہمیں گل جان صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"ہو کون یار! اور یہ حضور والا یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ کام بتاؤ۔"

"گل جان صاحب بول رہے ہیں۔"

"میں نے کہا نا یہاں صاحب واحب کا چکر نہیں چلتا تم کام بتاؤ۔"

"مگر تم بھی تو اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو۔ اگر گل جان ہو تو صحیح انداز میں بات کرو میں گل جان کا ایک کلائنٹ ہوں اور ان سے ایک بڑا سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو ایسے بولو نا یار! تم حضور والا اور جناب والا کر رہے تھے بلاتا ہوں ابھی ہولڈ کرو۔" دوسری طرف سے کرخت آواز سنائی دی اور پھر چند لمحات کے بعد ایک اور آواز سنائی دی۔

"میں گل جان بول رہا ہوں کون ہو تم۔"

"گل جان صاحب! ایک ضرورت مند ہوں آپ کی مدد چاہتا ہوں اور معاوضہ آپ کو منہ مانگا دینے کو تیار ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نادر علی۔" عادل نے فوراً جواب دیا۔

"ٹھیک ہے نادر علی میرے پتے پر آجاؤ۔ ٹیلی فون نمبر اگر تم نے کہیں سے معلوم کر لیا تو پتا بھی معلوم ہوگا تمہیں۔"

"وہ دیکھیے گل جان! میرے کچھ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں میں نکل نہیں سکتا نواحی علاقے میں ایک خوبصورت پارک ہے۔ میں اس پارک میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ معاوضہ منہ مانگا دوں گا۔ اور یہ معاوضہ ایک سے پندرہ لاکھ تک ہو سکتا ہے۔ کام آپ کی پسند کے مطابق ہوگا۔ مطلب یہ کہ وہ کام جو آپ کرتے رہے ہیں۔"

"میرے بارے میں تمہیں اطلاع کس نے دی۔"

"جب میں نے اپنے مطلب کے لوگوں کو تلاش کیا تو مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ میرا کام کر دیں گے۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہاں سے معلوم ہوا۔"

"گل جان صاحب ایک پریشان حال شخص آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تفصیلی ملاقات کے لیے ہی رہنے دیں۔"

"کب ملنا ہے؟" گل جان نے سوال کیا۔

"میرا بس چلے تو میں اڑ کر آپ کے پاس آجاؤں۔"

"اڑنا جانتے ہو۔" گل جان نے ترکی یہ ترکی کہا۔

"وہی تو نہیں آتا اس لیے درخواست کر رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔"

"ہوں۔ ڈیڑھ بجا ہے۔ دو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ تم گلاب پارک کی بات کر رہے ہو نا۔"

"جی بالکل بالکل۔"

"پہچانوں گا کیسے تمہیں۔"

"میں آپ کو پہچانتا ہوں گلاب پارک میں ایک پھول گڑھی ہے۔ پھولوں کی اس انجمن میں ہماری آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔" عادل نے کہا۔

"ابے زنانہ ہے کیا۔ باتیں تو ایسی کر رہا ہے۔ چل ٹھیک ہے ایک گھنٹے میں پہنچ جاتا ہوں۔ خیال رکھنا کام میرے مطلب کا نہیں ہوا تب بھی تجھے دس ہزار روپے دینے پڑیں گے مجھے وہاں تک آنے کے۔"

"بیس ہزار دوں گا دولت میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔"

"قارون کا پوتا ہے کیا۔" گل جان نے بھاری سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"یہی سمجھ لیجیے آپ۔"

"آرہا ہوں، آرہا ہوں۔" عادل نے فون بند کر دیا۔ جس فون پر یہ بات ہو رہی تھی وہ اس طرح کا تھا کہ اس پر ہونے والی بات چیت ایک بٹن دبانے سے گونجنے لگتی تھی اور اسے بہ آسانی سنا جا سکتا تھا۔ عادل نے فون بند کر دیا۔ صوفی اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"حق اللہ..... تیاریاں کرو۔ نئے مہمان کو عزت اور احترام کے ساتھ لانا ہے کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنی ہے۔"

"اور اگر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ آیا تو۔"

"تو کی کیا بات ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی آئے گا۔ باقاعدہ غنڈہ ہے کوئی لچا، لفنگا نہیں ہے۔ اپنی ہوشیاری بھی کر کے آئے گا۔ اس طرح کے معاملات اسے دن رات پیش آتے رہتے ہوں گے۔"

"تو اب ہم کیا کریں۔"

"دس منٹ کے اندر اندر ہمیں پارک میں پہنچ کر پوزیشن لے لینی ہے۔ پھولوں کے اس کنج کے پاس اونچے اونچے برگد کے درخت ہیں وہ کارآمد ہوں گے۔"

"ملاقات کون کرے گا ان سے۔" دلاور نے پوچھا۔

"عادل، فیضان تم۔ غلام قادر، دلاور، شازیہ تم نے ان لوگوں کو سنبھالو گے جو گل جان کے ساتھ آئیں گے۔ کیا سمجھے۔"

"کیا انہیں بھی ساتھ لانا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔ گل جان کو بھی ہم بے ہوش کر کے ہی لائیں گے۔ ان لوگوں کو بھی کھوپڑیاں ہلا کر بے ہوش ہی کرنا ہوگا۔ بس اتنا کافی ہے۔"

"پوری پلاننگ ترتیب پا گئی دلاور، فیضان، شازیہ، غلام قادر یہ چاروں افراد پوری طرح تیار ہو کر صوفی کی قیادت میں چل پڑے۔ ایک وین ساتھ لی گئی۔ اور ایک کار، جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ پھولوں کے اس کنج والے علاقے کے پاس سے سڑک گزرتی تھی اور اس سڑک پر گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑی کرنا آسان تھا۔ صوفی نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ گلاب پارک پہنچ گئے اور اس کے بعد ساری پوزیشن انہوں نے کنٹرول کر لی۔

گلابوں کے ایک بڑے کنج کے پاس عادل کو ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ قمیض اور پتلون پہنچے ہوئے تھا اور شکل وصورت اس طرح کی بنا دی گئی تھی کہ کوئی اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ باقی لوگ جگہ جگہ پوشیدہ ہو گئے تھے اور اپنا کام کرنے کے لیے مستعد تھے۔ گلاب پارک کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ شہری آبادی سے دور تھا۔ چھٹی والے دن تو یہاں بہت رش ہوا کرتا تھا۔ عام دنوں میں یہاں ذرا کم ہی لوگ آتے تھے اس وقت بھی یہاں ہو کا عالم طاری تھا۔ عادل خاموش بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا وہ دل ہی دل میں اپنے اسکرپٹ کو دہرا رہا تھا کہ اسے گل جان سے کیا بات کرنی ہے۔ گل جان ایک جیپ میں وہاں پہنچا تھا اور اس کے ساتھ تین خطرناک قسم کے غنڈے موجود تھے۔ عادل نے جیپ رکتے دیکھی تو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جیپ سے اترتے ہوئے گل جان کو دیکھتا رہا۔ ایک آدمی جیپ میں بیٹھا رہا۔ دو آدمی گل جان کے ساتھ اس طرف چل پڑے۔ عادل اس وقت بہت اچھی اداکاری کر رہا تھا۔ دور سے وہ گل جان کا جائزہ لے رہا تھا کافی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال سنسنی خیز لمحات قریب آتے جا رہے تھے اور انہیں ایک خطرناک کام سرانجام دینا تھا۔ بے حد خطرناک۔

عادل نے معصوم سی شکل بنا لی تھی۔ ویسے بھی صوفی کی صحبت میں رہ کر اب وہ خاصا تیز ہو گیا تھا اور اپنے معاملات سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ گرین فورس جس انداز میں اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ بہرحال ذہانت کے کام ہی تھے۔ گل جان ادھر ادھر دیکھنے لگا تو عادل جلدی سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

''جناب والا! میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں آپ کو پہچان لوں گا۔ میں نے ہی آپ کو زحمت دی تھی۔''

''ابے او لکھنو کے نائی! تمیز سے بات کر یہ تیزی فضول باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کیا بک بک کر رہا تھا ٹیلی فون پر۔''

''حضور من! اگر میری کسی بات سے آپ کو زحمت ہوئی ہو تو شرمسار ہوں ایک مشکل میں گرفتار ہوں۔ اور آپ کی مدد چاہتا ہوں۔''

''شرمسار ہے اور ایک مشکل میں گرفتار ہے۔ ابے تو تو آغا حشر کا شمیری ہو گیا۔ بول کیا بات ہے۔ آجا ادھر بیٹھتے ہیں۔''

''حضور من۔''

''او بھائی حضور اور من! اب یہ تم دونوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔'' گل جان نے پر مزاح بننے کی کوشش کی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

''میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ تنہائی میں کہنا ہے۔''

''اور تو کوئی نہیں ہے تیرے ساتھ۔''

''نہیں تنہا ہی ہوں اس کائنات میں اور اسی لیے آپ کی ضرورت پیش آئی۔''

''تیری ایسی تیسی اتنا برا بھلا سن چکا ہے پھر بھی آدمیوں کی طرح نہیں بولتا۔ جاؤ بھئی..... تم دونوں ادھر چلے جاؤ۔'' گل جان نے کہا اور پھر عادل کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یار! تم لوگ بس کیا کہوں تمہیں۔ اس نئی نسل نے تو صحیح معنوں میں ہم سب مردوں کی گردن جھکا دی ہے۔ کہیں سے مرد لگتے ہی نہیں ہیں۔ چال میں نزاکت بات میں نزاکت چہرے پر نزاکت۔ ابے سارے کے سارے نزاکتی کیوں ہو گئے ہو یا پھر یہ بھی اینگرو یوریا کا کمال ہے۔ چل بیٹھ جا یار! مجھے غصہ آ رہا ہے تجھ پر۔ ابے کم از کم ایک بات تو مردوں والی کر دے۔''

''آپ جس قدر چاہیں میری توہین فرما لیں۔ میں ایک غمزدہ انسان ہوں۔''

''اچھا۔ انسان بھی ہے۔'' گل جان نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور پھر اسے ایک بنچ پر دھکا دے دیا۔

''ہاں بولو۔ کیا بات ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان اگر کوئی مسئلہ طے نہ ہوا تب بھی دس ہزار روپے لوں گا۔ تجھے مجھ سے کام ہے نالایا ہے دس ہزار روپے۔''

''حاضر خدمت ہیں۔'' عادل نے جلدی سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر گل جان کے سامنے پیش کر دیے اور گل جان بولا۔

''ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ بندہ کام کا ہے۔ اچھا خیر اب اصل بات کہہ دے۔''

''مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''لڑکی سے۔'' گل جان پھر مذاق اڑانے پر اتر آیا۔

''ہاں۔''

''ابے تجھے تو کسی لڑکے سے محبت ہونی چاہیے تھی۔ چل خیر ہو گئی۔ لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی ہو گی اور کہا ہو گا کہ آپا مجھے معاف کر دو۔''

''نہیں وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہن کی طرح چاہتی ہو گی تجھے خیر آگے بول۔''

''لڑکی کے گھر والے ظالم سماج بن گئے ہیں ہم دونوں کے درمیان۔''

''سبحان اللہ..... سبحان اللہ۔ تو اب ظالم سماج کی آخری اولاد مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

''وہ کہتی ہے کہ کچھ بھی ہو میں تم سے شادی کروں گی۔''

''ہیں شادی بھی کرے گی تجھ سے۔ لو کمال ہے یہ ملک بھی فرانس بنتا جا رہا ہے۔''

''اچھا پھر.....''

''آپ کو ہماری مدد کرنا ہو گی گل جان صاحب لڑکی کے والدین نے کچھ غنڈے پال لیے ہیں۔ ہم آپ کو آپ کا منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔ آپ ہم دونوں کا نکاح کرا دیجیے۔''

''بات تو ناجائز ہے مردوں کا نکاح عورتوں سے ہوتا ہے اور عورتوں کا مردوں سے خیر..... ہمیں اس سے کیا غرض۔ خود روئے گی سسری اپنے مقدر کو۔ چل ٹھیک ہے کتنی رقم دے سکے گا ہمیں۔''

آپ ہی بتائیے کہ آپ ہمارے لیے کیا کریں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نکاح کرا دیں گے تیرا۔ دو مہینے تک اپنے پاس رکھیں گے۔ مخالفت میں جو کوئی بھی ہوگا اس کا دھڑن تختہ کر دیں گے اور جو کچھ چاہتا ہے وہ بھی بتا دے۔"

"نہیں بس اتنا ہی چاہتے ہیں۔ ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر شازیہ اور غلام قادر نے مل کر جیپ کے پاس کھڑے ہوئے اس کے غنڈے کو سنبھال لیا تھا۔ سر پہ ضرب لگا کر انہوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور گھسیٹ کر پھولوں کے گنج میں لے گئے تھے۔ وہ باقی دو افراد ایک طرف کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور انہیں جیپ والے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ہی شازیہ دلدوز آواز میں چیخی اور دونوں جو سگریٹ پی رہے تھے بری طرح اچھل پڑے۔

"لڑکی کے چیخنے کی آواز ہے۔"

"ہاں۔ اوہو ادھر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔" دونوں نے ایک طرف اشارہ کیا غلام قادر نے شازیہ کو کندھوں سے پکڑ کر دبوچ رکھا تھا اور دونوں صاف نظر آ رہے تھے۔ غنڈے اس جانب دوڑے۔ غلام قادر شازیہ کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور شازیہ جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔

"او۔ کالو رک جا اگر زندگی چاہتا ہے تو۔"

"اڑے ماں قسم دیکھو یار کیا پٹی ہے اپن کا اس سے سال بھر سے عشق چل رہا ہے داؤ میں آتی ہی نہیں ہے۔"

"او کالے بندر اپنی شکل دیکھی ہے کبھی۔"

"ارے ماں قسم شکل کا کیا کرنا ہے وڑی دل تو دیکھو۔" غلام قادر نے گریبان کھولا۔

"اچھا بیٹا اب پھوٹ لے ادھر سے ورنہ مزہ آ جائے گا تجھے بھی۔" دونوں نے چاقو نکال لیے اور غلام قادر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ شازیہ گہری نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"یار! لڑکی تو چکنی ہے۔ یہ کالا بندر بھلا اس کے قابل کہاں۔ بی بی! ہم دونوں کو دیکھو اور ذرا غور سے دیکھو۔ ہم تمہاری ہر خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چل بے بھاگ جا۔" انہوں نے غلام قادر کو چاقو دکھاتے ہوئے کہا اور غلام قادر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اب کیفیت یہ تھی کہ شازیہ ان دونوں کے عقب میں تھی اور اس نے وہ وزنی لوہے کا ٹکڑا نکال لیا تھا۔ جو پیچھے سے ان لوگوں کو سنبھالنے کے لیے کافی تھا۔ غلام قادر نے کہا۔

"وڑی دیکھو بابا! ابھی تم ادھر سے چلے جاؤ۔ ہمیں غصہ آ گیا تو تم کو نقصان ہو جائے گا۔"

"شرافت سے جا رہا ہے یا....." لیکن ابھی ان کے منہ سے اتنا ہی جملہ نکلا تھا کہ پیچھے سے ان میں سے ایک کے سر پر بھرپور ضرب پڑی اور اسکے حلق سے ایک کرخت آواز نکل گئی۔ دوسرا چونک کر پلٹا ہی تھا کہ شازیہ نے اس پر بھی وار کر دیا اور بہرحال اب وہ اس قدر مہارت ضرورت رکھتی تھی کہ اس کا وار خالی نہ جائے۔ دوسرا غنڈہ چونکہ سامنے آ گیا تھا۔ اس لیے چوٹ اس کی پیشانی پر پڑی تھی اور اس کے منہ پر خون کی چادر پھیل گئی۔ جب کہ پہلے والا اوندھے منہ زمین پر گر پڑا تھا۔ شازیہ کو دوسرا وار کرنا پڑا تب کہیں جا کر بات بن سکی۔ ادھر شازیہ کی چیخ سن کر گل جان بھی چونک پڑا تھا۔ پھر وہ گردن اٹھا کر ادھر دیکھنے لگا۔ اور اسی وقت عقب سے دلاور نکل آیا۔ دلاور نے بھی گل جان کے سر پر ضرب ہی لگائی تھی۔ یہاں پارک میں کوئی ڈرامے

بازی نہیں چل سکتی تھی۔ دوسری یا تیسری ضرب سے گل جان زیر ہو سکا اور اس کے بعد غلام قادر اور عادل اسے سنبھال کر اس بند گاڑی کی طرف لے چلے۔ جو تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ باقی افراد کو یہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس کے بعد گرین ہاؤس کے اس مخصوص کمرے ہی میں گل جان کی آنکھ کھلی تھی۔ جو ایسے کاموں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں کا ماحول بڑا پراسرار اور سنسنی خیز سا تھا اور اس وقت پوری گرین فورس یہاں موجود تھی۔ سوائے کرنل شاہ کے۔ کرنل رحیم شاہ یہاں موجود نہیں تھا۔ صوفی آرام سے بیٹھا ہوا جگالی کر رہا تھا اس کی آسودہ نگاہیں گل جان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور پھر گل جان ہوش میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہی رکھے گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ اور اسکے بعد اچانک ہی اچھل کر اپنی جگہ سے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ایک ایک کی صورت دیکھی دلاور کے چہرے پر آ کر اس کی نگاہ رک گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دلاور کو دیکھنے لگا اور پھر اس کے منہ سے حیران حیران ہی آواز نکلی۔

"دلاور..... یہ تو ہی ہے۔"

"ہاں میں ہوں گل جان۔"

"اور یہ کون لوگ ہیں۔" دلاور نے ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"بس سمجھ لے کہ سارے کے سارے موت کے ہرکارے ہیں۔"

"آہ۔" گل جان کو اپنے سر میں شاید ٹیس محسوس ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی اور پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"تم لوگوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

"ارے ہم سے بات کرو نا۔ کیا ادھر ٹیں ٹیں لگا رکھا ہے۔" غلام قادر سامنے آ کر بولا اور گل جان چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

"مجھے جانتے ہو تم لوگ کون ہوں میں۔ اور ہو تم بھی ہو اس کا مطلب ہے کہ میرے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے۔" اس بار گل جان کی نظر عادل پر پڑی تھی۔

"حضور من۔ جناب والا۔ بس ہم بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔"

"کتنے ہو تم لوگ؟" گل جان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر صوفی کی طرف رخ کر کے بولا۔

"اوئے شتر مرغ! کیا تماشا لگا رکھا ہے یہ تم لوگوں نے بیوقوفو! دلاور تو مجھے جانتا ہے۔ میں تم سب کی چٹنی بنا کر پھینک دوں گا۔ تمہاری یہ سازش کامیاب نہیں ہوگی میرے آدمی کہاں ہیں۔ کیا انہیں بھی اٹھا لائے ہو تم۔"

"ہمیں صرف آپ کی ضرورت تھی حضور والا۔" عادل نے کہا۔

"تو پھر میرا خیال ہے مجھے تجھ سے ہی ابتدا کرنی چاہیے۔" گل جان آگے بڑھا اور عادل کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے عادل کا گریبان ہاتھ میں پکڑا اور اسی وقت عادل کا زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ گل جان پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔ پھر اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈال کر غالباً ریوالور تلاش کیا۔ لیکن بے وقوف آدمی کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا۔ صوفی نے اچانک ہی پاس رکھا ہوا اگال دان اٹھایا اور منہ کی تمام غلاظت اس میں الٹ دی۔ اس کے بعد دو چار مرتبہ اس میں تھوکا اور تھوکتے ہوئے بولا۔

''آپ نے ہمیں شتر مرغ کے نام سے یاد کیا ہے حضور من! گویا بدتمیزی فرمائی آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے اور اب جوتے بھی ہمارے ہاتھوں سے کھائیے۔'' صوفی نے پاؤں سے جوتا اتار لیا۔ گل جان بہت غصہ ور تھا۔ اس طرح کی بے عزتی اس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ طاقت ور بھی تھا۔ وہ تو بس عقبی چوٹ کی وجہ سے نقصان اٹھا گیا تھا۔ لڑنے بھڑنے کا موقع ملتا تو یقینی طور پر بہت کچھ کر سکتا تھا۔

بہر حال صوفی اس کے سامنے آ گیا باقی لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب جوتا ہو گا اور گل جان کا سر۔ اور یہی ہوا۔ پہلا جوتا اس کے عین سر پر ہی پڑا تھا۔

''شتر مرغ کہا آپ نے ہمیں۔ اپنے الفاظ واپس لیجیے گا۔''

''میری.....'' گل جان نے موٹی سی گالی بکی لیکن اس بار تین جوتے پڑے تھے دو منہ پر اور ایک سر پر اور اس کے بعد ایک دلچسپ تماشا شروع ہو گیا۔ گل جان لپک لپک کر صوفی کو پکڑ رہا تھا اور صوفی صرف اس کے جوتے جھاڑ رہا تھا۔ گل جان کا چہرہ سوج گیا تھا وہ بھی دیوانہ ہی تھا۔ بس اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح صوفی کو اپنی گرفت میں لے لے۔ پھر صوفی نے جوتا ایک طرف پھینک دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''اب تک جو کوشش فرماتے رہے ہیں آپ۔ اب ذرا اس سے بھی لطف اندوز ہو لیجیے۔'' گل جان اس بار آگے بڑھا اس نے صوفی کے بدن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شازیہ کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکل گئی تھی۔ لیکن فیضان نے کہا۔

''نہیں شازیہ نہیں۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک ایسے آدمی سے صوفی صاحب کی کشتی دیکھی ہے۔ جو ہم لوگوں میں بڑا تیس مار خاں مشہور تھا۔ لیکن اس کی جو درگت بنی دیکھنے والوں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔''

شازیہ سامنے دیکھنے لگی۔ گل جان نے صوفی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر تھوڑے سے حیرت کے نقوش بھی تھے۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے لوہے کے بنے ہوئے کسی ڈھانچے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس نے کئی جھٹکے صوفی کو ادھر سے ادھر دیے لیکن صوفی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔ اسکے بعد اس نے گل جان کی دونوں کلائیاں پکڑیں اور انہیں موڑتا چلا گیا۔ پہلے اس نے گل جان کی گرفت ختم کی اور اس کے بعد پلٹ کر اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہتھیلی گردن پر جمائی۔ اور پھر اسے مرغا بناتے ہوئے بولا۔

''جب ہار مان لو تو اپنے منہ سے کہہ دینا۔'' گل جان پہلے تو برداشت کرتا رہا اسکی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جا رہی تھی۔ عجیب و غریب داؤ تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے کوئی کیکڑا اپنے سارے ہاتھ پاؤں کے ساتھ کسی انسانی جسم سے لپٹ گیا ہو اور اس پر قوت آزمائی کر رہا ہو لیکن وہ قوت آزمائی بھی معمولی نہیں تھی۔ گل جان اگر غیر معمولی طور پر طاقت ور نہ ہوتا تو ایک لمحے کے اندر ہی بول پڑتا۔ اس کے پورے بدن نے پسینہ اگل دیا تھا اور اس کے حلق سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ آخر میں اس نے کہا۔

''ہار مانتا ہوں۔ ہار مانتا ہوں۔ چھوڑ دے۔ چھوڑ دے مجھے جانور۔''

''جانور نہیں ہمیں صوفی کہتے ہیں۔ عزت سے مخاطب کرو۔''

''چھوڑ دے بھائی چھوڑ دے۔ تیری مہربانی ہو گی۔ صوفی..... ارے او صوفی۔''

''ارے او نہیں، درویشوں کی دعاؤں سے آپ اگر مناسب سمجھیں تو صوفی صاحب کہہ کر اپنا بدن چھڑا سکتے ہیں۔''

''چھوڑ دیجیے صوفی صاحب! چھوڑ دیجیے۔'' گل جان اب واقعی بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ صوفی نے اسے چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ باقی تمام لوگ منہ دبا کر ہنس رہے تھے۔

''نہیں کسی ہارے ہوئے کا مذاق نہیں اڑاتے۔ گل جان صاحب! ہم آپ کو ایک خاص مقصد کے تحت لائے ہیں۔''

''خدا تمہیں غارت کر دے۔''

''واہ۔ خدا کا نام تو یاد آیا آپ کو۔ اب یہ الگ بات ہے کہ خدا کیا کرتا ہے۔ یہ خدا ہی جانے۔''

''کون ہو تم؟''

''غلام قادر دلاور۔ گل جان صاحب کو عزت سے اٹھا کر بٹھاؤ۔ پانی پلاؤ ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ کوئی دو گھنٹے تک ان کے اعضاء کام نہیں کریں گے۔ البتہ زبان چلتی رہے گی۔ اور گل جان اگر تم نے بے ہوش ہونے کی کوشش کی درویشوں کی دعاؤں سے تو ہم تمہاری دونوں آنکھیں نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیں گے۔''

''ابے تم ہو کون..... دلاور تو بھی ان کے ساتھ شریک ہے۔ اور تو نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ میری تیری تو کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی۔''

''میرا نام دلاور نہیں عبدالقدوس ہے۔'' دلاور نے جواب دیا۔

''کیا؟''

''ہاں تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔'' دلاور بولا۔

''خیر بیٹا! سب کو دیکھ لوں گا مجھے یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے۔''

''ہم عرض کرتے ہیں ہمیں کچھ معلومات درکار ہیں۔ براہ کرم ذرا سی وضاحت فرما دیجیے گا۔''

''سب ایک جیسے ہو۔ سب ایک جیسے ہو۔''

''دیکھیے اس بار ہم آپ کا پاؤں پکڑیں گے۔ اور اس کے بعد یقین کیجیے ساری زندگی آپ کو عرق النساء ہوتا رہے گا۔'' دلاور کی ہنسی نکل گئی۔ گل جان نے قہر آلود نگاہ سے صوفی کو دیکھا تو صوفی نے آگے بڑھ کر اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

''نہیں نہیں۔ کچھ مت کرو۔ کیا بات ہے کون ہو تم؟ پولیس والے تو نہیں معلوم ہوتے مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

''حضور والا ہم آپ سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہم جو پوچھیں وہ آپ سچ سچ بتا دیجیے گا۔ اصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ہمارے پاس سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنے والا آلہ موجود ہے۔ جھوٹ بولیں گے جناب اعلا تو ہم آپ کو جو کچھ بتائیں گے۔ زبان سے ادا کرتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے۔" گل جان قہر آلود نگاہوں سے صوفی کو دیکھتا رہا تھا۔

دوسرے لوگوں کے چہروں پر بہ دستور ہنسی اور مسکراہٹ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ صوفی نے کہا۔

"جی تو حضور من! فرمائیں گے آپ ہم سے جو ہم پوچھیں گے۔" گل جان حالانکہ خاصی تکلیف میں رہ چکا تھا لیکن کتے کی دم ابھی سیدھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ شدید غصے کے عالم میں دانت پیس کر رہ گیا کچھ بول بھی نہیں سکا تھا۔

"دیکھیے ویسے تو ہم آپ کے ہاتھ پاؤں بھی توڑ سکتے ہیں اور دوسری بدسلوکیاں بھی کر سکتے ہیں آپ کے ساتھ' لیکن درویش اذیت رسانی کو اس طرح پسند نہیں کرتے۔ البتہ ایک چھوٹا سا چٹکلہ ہے بچپن میں ہمارے اسکول کے ماسٹر صاحب ہم پر استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کی تکلیف ہم ہی جانتے ہیں۔ چلیے دلاور بھائی' غلام قادر بھائی ذرا انہیں اس فریم میں کس دیجیے گا۔" صوفی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"مار ڈالوں گا حرامیو! اتنے ٹکڑے کروں گا کہ گننے بھی نہیں جا سکیں گے۔"

"ممکن نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کو ٹکڑے کرنے کے مواقع نہیں حاصل ہوں گے۔ درویشوں کی دعاؤں سے اور پھر کسی انسان کے اتنے ٹکڑے ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ اگر آپ قیمہ کہنا چاہتے ہیں تو بات الگ ہے۔" صوفی نے کہا۔ غلام قادر بڑا مست مولا تھا۔ اس نے وہ فریم اٹھایا اور اسکے چڑے کے تسموں کو ٹھیک کرنے لگا۔

بہر حال دونوں ہی طاقت ور تھے گل جان بے شک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ لیکن انہوں نے اسے فریم میں کس دیا اور اس طرح کسا کہ اب وہ اپنے بدن کے کسی عضو کو جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا سر بھی اس طرح فریم میں فٹ کر دیا گیا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔

بہر حال اس کے بعد صوفی اپنی جگہ سے اٹھا۔ شازیہ دلچسپی سے صوفی کی کوششوں کو دیکھ رہی تھی۔ صوفی بہ ظاہر کسی کو اذیت دینے والوں میں سے نہیں تھا یا پھر شازیہ نے ابھی تک صوفی کا کوئی اور روپ دیکھا نہیں تھا۔

بہر حال صوفی نے ایک عجیب و غریب حرکت کی ایک بڑی سی موم بتی جلائی اور اسے فریم کے اوپر ایک ایسے حصے میں رکھ دیا جہاں سے اس کا موم ٹپک ٹپک کر سیدھا گل جان کی پیشانی پر گرے ایک لمحے تک تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ گل جان خود بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر جلتا ہوا موم اس کی پیشانی پر ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ اس کی ہچکیاں بھی اڑ رہی تھیں اور گل جان کو بار بار آنکھیں بند کرنا پڑ رہی تھیں۔ اس کے حلق سے سسکاریاں سی نکلنے لگیں اور پھر اس پر وحشت کا دورہ پڑ گیا۔ بدن کی جنبش تو پہلے ہی ختم کر دی گئی تھیں۔ سر کی کیفیت تک نہیں بدل سکتا تھا۔ جس قدر دم لگا سکتا تھا لگا لیا۔ لیکن موم بہ دستور اس پر ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اور اسکے بعد اس کی چیخیں دھاڑوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پہلے گالیاں بکتا رہا تھا اور اس کے بعد رونا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور صوفی کسی غم زدہ ماں کی طرح اس کے سرہانے بیٹھا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ صوفی کی صورت دیکھ کر باقی سب لوگوں کو ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن گل

جان کی کیفیت جو تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چیختے چیختے مر ہی جائے گا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔

"بتاتا ہوں..... میں بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں..... خدا کے لیے اسے ہٹا دو..... ارے ہٹا دو اسے خدا کے لیے اسے ہٹا دو۔"

"ابھی حضور والا! آپ کی یہ تکلیف ختم کیے دیتے ہیں۔" صوفی نے کہا اور جلدی سے موم بتی سیدھی کر کے ایک طرف رکھ دی۔ گل جان کے حلق سے اب بھی وحشت ناک آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ بڑے بھونڈے انداز میں رو بھی رہا تھا۔

"میرا ماتھا صاف کرو۔ ہائے دماغ تک جل گیا ہے۔ میرا دماغ تک اندر سے جل گیا ہے۔"

"شازیہ! چھوٹی الماری سے کریم نمبر سترہ نکال دو۔ گل جان صاحب کو افاقہ دے گی۔" صوفی نے کہا۔ سب کچھ ہی موجود تھا یہاں۔ یہ ہومیو پیتھک کی کوئی کریم تھی۔

بہر حال موم صاف کر کے وہ کریم لگا دی گئی۔ گل جان کی دھاڑیں آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ اس نے صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات کہوں تم سے۔"

"ارشاد' ارشاد....." صوفی اس طرح بولا جیسے مشاعرے میں کسی شعر کی فرمائش کی جاتی ہے۔

"زندہ مت چھوڑنا مجھے۔ زندہ مت جانے دینا مجھے یہاں سے ورنہ نسلوں کو ختم کر دوں گا۔ سمجھے' نسلیں ختم کر دوں گا میں' گل جان ہے میرا نام....."

"گل جان میری جان! یہاں نسلوں کا وجود ہی نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے' چنانچہ یہ دھمکی ہم پر بے اثر ہے۔ ویسے ہم تمہاری خواہش پر غور کریں گے۔ اگر انتقال فرمانا چاہتے ہو۔ تو اس کا انتظام ہو جائے گا۔ کیا موم بتی دوبارہ سلگائیں۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"درویش رحم کریں ہم سب پر ذرا سا یہ بتا دو کہ مرزا جواد بیگ کو کس نے قتل کیا۔ دیکھو میاں ایک بات عرض کر دیں سارا کام بیکار نہیں جانا چاہیے۔ اب ہم اس قدر بے وقوف بھی نہیں ہیں کہ ان ساری باتوں سے نا آشنا ہوں۔ تم سے پوچھنے کا اور تمہیں یہاں تک لانے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ ہاں تو مرزا جواد بیگ کو کس نے قتل کیا۔"

"میں نے۔" گل جان نے کراہتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔

"خوب۔ کیا جھگڑا ہے تمہارا ان سے۔"

"کچھ نہیں تھا۔"

"تو پھر۔"

"سپاری لی تھی۔"

"لاحول ولا قوہ۔ خدا کی لعنت ہو ان ہندوستانی فلموں پر' پتا نہیں کیسے کیسے بے تکے الفاظ ایجاد کر دیے ہیں۔ سپاری تو چھالیہ کو کہتے ہیں جہاں تک علم ہے یہ ہندوستانی فلموں میں پتا نہیں یہ سپاری سرکاری طور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر منتقل ہوئی ہے یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے سپاری کوئی سرکاری حیثیت رکھتی ہو۔ لیکن صرف ہندوستانی فلموں میں ہمارے ہاں اگر کسی احمق نے نقل کرلی ہو تو کرلی ہو ورنہ یہاں سپاری کا وجود نہیں ہے۔ خیر..... تو تمہیں سپاری کس نے دی تھی۔"

"تمہیں معلوم ہے۔ تم جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"جان جہاں یعنی جان گل! بتا دو اس بار موم بتی کا موم تمہاری آنکھوں پر ٹپکے گا۔ بخدا ہم جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ نہیں کہتے۔ پلکوں کے پپوٹوں پر گرم گرم موم گرے گا اور آنکھیں چپٹی چلی جائیں گی اور پھر بینائی بھی جل جائے گی۔ نہ کروایسا کہ ہمیں خود دکھ ہو۔"

"سپاری مجھے شاہ جہاں بیگم نے دی تھی۔"

"واللہ۔ آگے بولو آگے بولو۔"

"جلتی تھی وہ۔ بری طرح جلتی تھی وہ زمرد جہاں سے اپنے شوہر سے بھی نفرت کرنے لگی تھی۔ اس نے ٹیلی فون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ کہیں سے اسے میرے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ میں نے اسے قتل کیا اور اس کے عوض اس سے دو لاکھ روپے لیے۔"

"ذرا پورا پلان ارشاد فرما دیجیے گا۔ تاکہ غزل مکمل ہو جائے۔"

"پلان یہ تھا کہ میں مرزا جواد بیگ کو قتل کر دوں اور اس قتل کا الزام وہیں پر کسی ملازم پر لگا دیا جائے اور اسے تحقیق کے بعد پتا چلا کہ وہ لڑکا رحمت علی اس کے لیے بہت موزوں ہے۔ وہ لڑکا ایک دوسری بستی کا تھا نوکری کرنے آیا تھا ماں باپ بھی تھے اس کے ایسے ہی لوگ مصیبت کا شکار ہوتے ہیں۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ رحمت علی پر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ قتل کے الزام میں اسے گرفتار کرلیا جائے گا اور وجہ سامنے کی تھی یعنی چوری۔ وہ قیمتی چیزیں لے کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔"

"یہ قیمتی چیزیں اس کے کوارٹر میں کس نے پہنچائی تھیں۔"

"ظاہر ہے میں نے۔ پورے کام کا معاوضہ ملا تھا مجھے بعد میں مجھے اور بھی کچھ کام کرنا تھا۔ لیکن کام بگڑ گیا۔"

"وہ کیا؟"

"بس طے یہ کیا گیا تھا کہ تھوڑے دن تک مقدمہ چلے گا لیکن اس کے بعد رحمت علی کے ماں باپ کو اغوا کرلوں گا اور رحمت علی سے کہا جائے گا کہ وہ قتل کا الزام سیدھا سیدھا زمرد جہاں پر تھوپ دے اور عدالت میں کہے کہ زمرد بیگم نے اسے رقم دے کر اور اس کی زندگی بچا لینے کا وعدہ کر کے مرزا جواد بیگ کو قتل کرایا تھا۔ اس طرح زمرد بیگم کو سزا ہو جاتی اور پھر ساری دولت اور جائیداد شاہ جہاں بیگم کے قبضے میں ہوتی۔" شازیہ کو چکر آ رہے تھے یہاں اس کا سارا تجربہ مات کھا گیا تھا۔

شاہ جہاں بیگم تو اسے بہت نیک اور دیندار عورت محسوس ہوئی تھیں۔ جب کہ زمرد جہاں سے ایک نگاہ ملنے کے بعد ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ شوقین قسم کی عورت ہے۔ اور ہوسکتا ہے کردار کی بھی غلط ہو۔ بہر حال دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد صوفی کی کاوشوں نے عدالت میں گل جان سے پورا

پورا بیان دلوا دیا تھا۔ اور شاہ جہاں بیگم کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔

بعد میں جو ہونا تھا وہی ہوا فرمان جلیل نے اس کیس کو ری اوپن کیا اور پہلی ہی پیشی میں رحمت علی کو آزاد کرا لیا گیا۔ گل جان اور شاہ جہاں بیگم تو گرفتار ہو ہی گئے تھے۔

بہر حال رحمت علی کو اس کے والدین کے پاس لے جایا گیا اور بڑے رقت آمیز مناظر دیکھنے کو ملے۔ ادھر کرنل رحیم شاہ ساری کیفیت سے واقف تھا۔ لیکن سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ پولیس آفیسر ناصر علی نے ایک بھاری رقم انہیں واپس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رقم محترم وکیل رضوان علی شاہ صاحب دے گئے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی ہے۔" رقم چونکہ صوفی کو پہنچائی گئی تھی۔ صوفی نے کرنل رحیم شاہ سے رابطہ قائم کیا جو بہر حال ان لوگوں کے معاملات میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔ رحیم شاہ سیدھا بستی شیخ امانت پہنچ گیا اور اس نے ذرا دھمکا کر ان لوگوں سے وہ جھونپڑی حاصل کر لی۔ جنہوں نے اسے خریدا تھا اور اسکے بعد ایک دن تمام لوگ رحمت علی اس کے باپ فیاض اور حمیدہ بیگم کو لے کر بستی امانت شیخ پہنچ گئے۔

بستی امانت شیخ کے ایک بڑے آدمی کے تعاون سے سارے گاؤں والوں کو جمع کیا گیا اور انہیں صورت حال بتاتے ہوئے کہا گیا۔

"کچھ بڑے لوگوں نے اس معصوم سے آدمی کے خلاف سازش کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ رحمت علی بالکل بے قصور ہے اور ایک نیک اور ایماندار نوجوان ہے اسکے بعد دلاور خاں کو طلب کرلیا گیا۔ دلاور خاں کا موڈ بھی ایک دم بدل گیا تھا۔

"میں خوشی سے اپنی بیٹی کا ہاتھ رحمت علی کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"ایک تجویز ہے میری رحمت علی اگر تم پسند کرو اب یہ جھونپڑی تمہاری ہے۔ تمہاری ساری مشکلیں حل ہو گئی ہیں۔ لیکن میں چاہوں گا کہ تم اب شہر میں رہو۔ تمہارے لیے نوکری اور رہائش گاہ کا بندوبست ہم لوگ کر دیں گے۔" رحمت علی" فیاض احمد اور حمیدہ بیگم کرنل رحیم شاہ کے پیروں میں گر پڑے تھے۔

♥.....♥.....♥

شاہ میر خاں صاحب نے کرنل رحیم شاہ کو طلب کیا تھا دونوں بے تکلف دوست تھے کرنل اپنے دور میں ایک قابل قدر ہیرو رہا تھا۔ شاہ میر خاں بہت محبت کرتے تھے اس سے اور اس وقت بھی انہوں نے صرف دوستی کی بنیاد پر ہی کرنل رحیم شاہ کو بلایا تھا۔

"کوئی کام نہیں ہے یار! کیوں بار بار مجھ سے یہ پوچھے جا رہے ہو۔ کیا میرے اور تمہارے درمیان صرف کام ہی کا رشتہ ہے۔"

"زمانہ یہی کہتا ہے شاہ میر لیکن بہر حال میں جانتا ہوں کہ تم بھی خدانخواستہ کسی ذاتی مقام کے چکر میں نہیں رہتے۔ میں بھی تم سے صرف اسی لیے پوچھ رہا ہوں یہ بات کہ کوئی وطن دوستی کا معاملہ تو نہیں ہے۔ یعنی ہماری ضرورت تو پیش نہیں آ گئی۔"

"نہیں اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کچھ عرصے سے حالات خاصے بہتر چل رہے ہیں۔ بس یونہی تم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملنے کو دل چاہا۔ بہت دن سے نہیں پتا چلا تھا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے آج کل۔"

"بس شاہ میر! اصل میں ایک تشنگی باقی رہ گئی تھی میرے اندر، اگر قدرت مجھے میری منزل کے سفر سے نہ روکتی تو بہت کچھ کر چکا ہوتا اب تک اور بہت کچھ کر رہا ہوتا۔ لیکن معذور ہو گیا۔ خیر اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسا شخص عطا کر دیا جو میری دس ٹانگوں سے بھی زیادہ طاقتور اور پھرتیلا ہے۔ اس کا دماغ میرے دماغ سے دس گنا زیادہ ہے۔"

"یار! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ یہ صوفی آخر کس مٹی سے بنا ہوا ہے۔ دنیا میں لوگ نام ونمود کے لیے زندگی گنوا دیتے ہیں۔ لیکن یہ شخص جہاں تک اس کی ہسٹری میرے علم میں ہے محکمہ پولیس میں بہت عرصے تک ملازمت کرتا رہا ہے۔ کبھی اس کی کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک طرح سے افسران اعلا نے اسے ذلیل وخوار کر کے ہی نکالا ہے۔ پرائیویٹ ادارے کھولے اور بہت کچھ کیا ہے۔ فوج کے لیے بھی بہت کچھ کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کی اپنی حیثیت تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کیا در پردہ....."

"بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے درویشوں کے کرم سے۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور ہنس پڑا۔

"درویشوں کے کرم سے۔"

"ہاں۔ یہ صوفی صاحب کا تکیہ کلام ہے۔" شاہ میر خاں بھی ہنسنے لگے تھے انہوں نے کہا۔

"اچھا خیر چلو۔"

"بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کرنل رحیم شاہ کہ اگر قدرتی طور پر کچھ ایسے لوگ دنیا میں نہ آتے رہے ہوں جو بے لوث اور بے غرض وطن پاک کے مفادات کی نگرانی کرتے رہیں تو پتا نہیں کیا کیا مشکلات پیش آجاتیں۔ ہم کسی پر تبصرہ کرنے کی بجائے اپنے آپ پر تبصرہ کریں تو سب سے موزوں ہوتا ہے۔ ہمارے دلوں میں وطن کے خلاف کوئی برائی نہیں ہے۔ ہم اپنا فرض پوری خوش دلی کے ساتھ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن راستوں کی رکاوٹیں کچھ اس طرح سامنے آجاتی ہیں کہ بس خاموشی اختیار کیے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا۔

بہر حال میں داد دیتا ہوں کہ تم نے زندگی کے بہترین دن مادر وطن کے سپرد کر دیے ہیں۔ اور یہ تو ایک قدرتی بات ہے کہ جب انسان کسی نیک راستے پر قدم اٹھا دیتا ہے۔ تو قافلہ بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی خدمت میں نے بھی سرانجام دی ہے۔ وہ کچھ کاغذات ہیں جو تمہاری نذر۔"

"کاغذات۔"

"ہاں۔"

"کیا ہے ان میں؟"

"میں نے گرین فورس رجسٹرڈ کرا دی ہے۔ اب گرین فورس کے ان تمام ممبران کو جو اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ بہترین تنخواہیں ملیں گی۔ اسکے علاوہ گرین فورس کے تمام ضروری معاملات کے لیے ایک اکاؤنٹ کھلوا دیا گیا ہے۔ جس میں فی الحال پچاس لاکھ منتقل کر دیے گئے ہیں۔ یہ رقم کرنل رحیم شاہ تمہاری ایما

پر خرچ ہوگی اور اس میں سے تم جس طرح بھی چاہو اسے خرچ کر سکتے ہو۔ کیونکہ یہ اعتماد کیا گیا ہے تم پر کہ تم اس میں سے ایک روپیہ بھی جو خرچ کرو گے تو وہ قومی اور انسانی مفاد میں ہوگا۔"

"شکریہ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم نے میرے موقف کو کندھا دیا ہے اور اس سے بڑا سہارا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ بات میں جانتا ہوں کہ اللہ نے تمہیں بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن جو کچھ تمہارا ہے تمہارے بعد دوسروں کی امانت ہے۔ حکومت کے لیے تم نے بے لوث ذمے داریاں سنبھالی ہیں۔ حکومت تمہارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہے اور یہ سب کچھ وہی تعاون ہے۔ بہر حال یہ سپر دجہاں اور جس طرح چاہو یہ رقم خرچ کرو میں ذاتی طور پر تمہیں اس کی مبارک باد دیتا ہوں۔ چونکہ یہ ایک عظیم اعتماد ہے۔" کرنل رحیم شاہ کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

بہر حال یہ ایک اعزاز تھا کافی دیر تک شاہ میر خاں اور رحیم شاہ بات چیت کرتے رہے۔ اور اس کے بعد شاہ میر خاں سے رخصت ہو کر کرنل رحیم شاہ گرین ہاؤس چل پڑا۔ اسے ان کاغذات میں دلاور، فیضان، عادل، غلام قادر اور شازیہ کی تنخواہوں کی تفصیل بتا دی گئی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک بڑے ادارے کے شایان شان تنخواہیں تھیں۔ اور اس سلسلے میں اجازت دے دی گئی تھی کہ ان کے ایڈوانس چیک جاری کر دیے جائیں اور چیک ہولڈر اپنی اپنی تنخواہیں بینک سے وصول کر لیں۔ صوفی کے لیے ایک بہت بڑی تنخواہ مختص کی گئی تھی۔

بہر حال کرنل رحیم شاہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ گرین ہاؤس میں اس وقت پوری گرین فورس موجود تھی۔ یہاں تک کہ صوفی بھی تھا کرنل رحیم شاہ نے تمام کاغذات صوفی کے حوالے کر دیے۔

"یہ کیا ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"دیکھیے صوفی صاحب! اور ان لوگوں کو بھی ذرا اس سے آگاہ کر دیجیے گا۔ صوفی نے کاغذات کا بہ غور مطالعہ کیا اور پھر کرنل رحیم شاہ کی ہدایت کے مطابق ان لوگوں کو ان کی سرکاری تنخواہیں بتانے لگا۔ سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔ خوشی ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔ غلام قادر نے کہا۔

"اڑے ماں قسم۔ غلام قادر تم گدھا گاڑی چلاتے چلاتے وڑی اتنے بڑے افسر بن گئے تم۔ کمال اے نی۔ دیکھو اس کو بولتے ہیں کہ دینے والا جب دینے پر آتا ہے۔ تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔ ابھی میرے کو پتا نہیں کہ اس طرح کے موقع پر کیا کیا جاتا ہے۔"

"کچھ نہیں کیا جاتا۔ بس خوشی منائی جاتی ہے۔ اچھا صوفی صاحب آج کل ذرا ہمارے کرم فرما خاموش بیٹھے ہوئے ہیں اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آئیں اور ہم لوگ مصروف ہو جائیں کیا خیال ہے کیوں نہ کچھ عرصے کے لیے میں سردار پور کا چکر لگا لوں۔ بلکہ اگر یہ تمام لوگ چاہیں تو یہ بھی میرے ساتھ ہی چلیں۔ ان کی مہمان نوازی کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ کیوں شازیہ کیا کہتی ہو تم۔"

"کوئی ہرج نہیں ہے لیکن میں ذرا اپنے چھوٹے بھائی پر توجہ دینا چاہتی ہوں۔"

"خیر ٹھیک ہے صوفی صاحب! آپ تو فارغ ہیں نا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ چلیں گے میرے ساتھ۔"

"جیسا آپ کا حکم ہوگا۔ بس وہ ذرا عبدالقدوس پانی پتی کی بیٹی کی منگنی ہے ہم لوگ نچلے درجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لوگ ہیں اور ہمارے ہاں بیٹیوں کے معاملات بڑے نازک سمجھے جاتے ہیں درویشوں کے کرم سے منگنی کے بعد میں حاضری دے دوں گا۔ باقی لوگوں کا جو بھی مسئلہ ہو۔"

"نہیں ہم تو سردار پور جائیں گے لیکن....."

"او ہو معاف کرنا۔ غالباً میں یہ کہنا بھول گیا کہ آپ تمام لوگ اپنے اہل خانہ کے ساتھ میرا مطلب ہے دلاور کی فیملی، شازیہ کی والدہ وغیرہ میں ان تمام لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں۔ سردار پور ایک پرفضا مقام ہے سیر کر لیں گے وہاں کی آپ کو تو اندازہ ہے ہی صوفی صاحب!"

"واہ! اگر ایسی بات ہے تو بڑے بابا ہم دل و جان سے تیار ہیں۔" شازیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"تم یہ سمجھ رہی ہو گی کہ میں صرف تم لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"جی واقعی ہم یہی سمجھے تھے۔"

"ایسا کرو تھوڑے دن کے لیے میرے ساتھ چلو۔ گھومو پھرو، سیر کرو۔ اسکے بعد چاہو تو واپس آ جانا۔ صوفی صاحب منگنی کب ہے۔"

"تقریباً آٹھ دن کے بعد۔"

"ٹھیک ہے آپ منگنی کے بعد آ جایئے۔ تھوڑی سی تفریح رہے گی۔"

"بہر حال یہ تمام معاملات طے ہو گئے۔ صوفی کو یہی مجبوری تھی کہ وہ عبدالقدوس صاحب کی بیٹی کی منگنی میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ تنخواہوں کے چیک ان لوگوں کو دے دیے گئے۔ صوفی کو بھی اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ عبدالقدوس صاحب سے ملاقات ہوئی تو صوفی نے کہا۔

"ویسے تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے اصل میں بدقسمتی یہ رہی ہے ہمارے ساتھ درویشوں کی دعاؤں سے کہ ہم نے کبھی پس انداز کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ ویسے بھی حکم نہیں ہے اور یہی کہا جاتا ہے کہ کل کی فکر اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ بندے کو اس بے نیاز کی نیازی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن دیکھیے آپ کی بیٹی کی تقدیر سے یہ ایک حقیر سی رقم ہاتھ آئی ہے۔ ہم تو اسے فوزیہ بیٹی کی ہی تقدیر سمجھتے ہیں۔ تو عبدالقدوس صاحب یہ آپ کی نذر۔" پورے ساٹھ ہزار روپے تھے معمولی رقم نہیں تھی۔ صوفی کی ماہانہ تنخواہ ساٹھ ہزار روپے مقرر کی گئی تھی۔ اور بہت سے دوسرے الاؤنس منظور کیے گئے تھے۔ جس میں کار وغیرہ شامل تھی۔ کاغذات کی حد تک تو کار وغیرہ تسلیم کر لی گئی تھی۔ لیکن صوفی ذرا مختلف مزاج کا انسان تھا عبدالقدوس پانی پتی سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے چہرے سے یہی لگ رہا تھا جیسے اب رو پڑیں گے۔

"اماں تمہیں واللہ! کوئی غلط بات کہہ دی ہم نے۔ دیکھیے حضرت اگر انا پرستی کا مسئلہ ہے تو ہماری آپ کی یاد اللہ نہیں بلکہ دوستی ہے۔ درویشوں کے کرم سے اور اس دوستی کے رشتے سے ہم فوزیہ بیٹی کے چچا ہیں اگر آپ اسے محسوس کر رہے ہیں۔ تو ہم اسے اپنی بدقسمتی کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔"

عبدالقدوس پانی پتی جو اس وقت صوفی کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے زار و قطار رو پڑے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگے اور صوفی بری طرح ناچنے لگا؟

"ارے..... توبہ..... دو..... درویش..... قلندر..... درویش....." اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

کیا کہے۔ کبھی عبدالقدوس صاحب کے سامنے بیٹھ جاتا کبھی کھڑا ہو جاتا۔ کبھی شیروانی کے دامن سے ان کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا۔ بہ مشکل تمام عبدالقدوس صاحب کا رونا بند ہوا تو صوفی نے کہا۔

"بہ خدا..... آپ کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچانا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ ہم تو بس..... ہم تو بس....."

"صوفی صاحب! کیا چیز ہیں آپ، میں تو حقیقتاً اب یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ درویش ہیں۔ آپ خود درویش ہیں۔"

"اماں تمہیں واللہ۔ ایسا نہ کہو گنہگار ہوتا ہے انسان، ہم اور درویش! ہاں عاشق درویش کہہ لو تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ کسی درویش کی خاک پا بھی ہو جائیں تو زندگی کا مقصد پورا ہو جائے۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہنا۔"

"صوفی صاحب! بہ خدا..... بہ خدا سولی پر لٹکے ہوئے تھے ہم ایک بہت ہی مجرمانہ بات سوچی تھی۔ کہیں سے انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ جس جگہ بچی کا رشتہ ہو رہا ہے۔ اتنے نیک نفس اور شریف لوگ ہیں کہ اگر ہم پانی کا پیالا بھی پلا دیتے تو بہ خوشی دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پی جاتے۔ لیکن خود ہم سے کہیں زیادہ صاحب حیثیت ہیں۔ دلی ڈھکی زبان میں بچے نے کہا تھا کہ دوست دھوم دھام کرنا چاہتے ہیں۔ بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ وعدہ تو کر لیا تھا۔ ان کی خوشی پوری کرنے کا مگر ہمیں کہیں سے خوشی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ ساری رات دعا کرتے رہے ہیں کہ مالک دو جہاں اب ہمارے ہاتھ بے بسی سے پھیل گئے ہیں۔ تو ہی ہمارے ان پھیلے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ سکتا ہے۔ تو رکھ سکتا ہے ورنہ اب اندھیرے ہیں چاروں طرف، بڑی بیٹی کا کچھ زیور رکھا ہوا تھا آخر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ خاموشی کے ساتھ یہ زیور فروخت کر دیں گے اور کہہ دیں گے کہ چوری ہو گیا۔ پائی پائی کا حساب دیں گے اور کہیں گے کہ بنا کر دیں گے بیٹا! مگر آہستہ آہستہ۔ مگر یہ مجرمانہ عمل صرف اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ عزت رہ جائے۔ بچیاں اچھے گھروں میں چلی جائیں۔ تو والدین کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ کیا کریں صوفی صاحب معاشرہ ہی ایسا ہے۔ وہ بے بسی کا دور پھر سے واپس آ گیا ہے۔ زمانہ قدیم میں رسول اکرمؐ نے بیٹیوں کی قدر و منزلت کو واضح کیا تھا۔ وہ لوگ لڑکیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے وہ زمانہ جہالت تھا اور وہاں نظریہ کچھ اور تھا لیکن لوگ اس نظریے کو آج کچھ الگ شکل دے کر پھر واپس لے آئے ہیں کہ بیٹیاں قتل کر دی جائیں۔ کیونکہ والدین انہیں ان کا مناسب سے ٹھکانا نہیں دے سکتے۔ گھروں میں رہ کر بھی مذہب و ملت سے انحراف ہوتا ہے لیکن نادر اور غریب لڑکیوں کو کوئی قبول کرنے والا نہیں ملتا۔" عبدالقدوس صاحب پھر رونے لگے۔ پھر بولے۔

"صوفی صاحب یہ رقم۔"

"نہیں۔ براہ کرم ہمیں اور زیادہ ذلیل نہ کریں ہم نے آپ سے عرض کر دیا تھا کہ یہ غیر متوقع طور پر ہمیں ملی ہے۔ ہماری حلال اور جائز کمائی ہے۔ ایک پائی بھی آپ غلط نہ سمجھیے گا۔ ہماری محنت کا معاوضہ ملا ہے ہمیں۔ اور ہم نے یہ اس بچی کی نذر کیا۔ آپ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ اسکی واپسی کے بارے میں تصور بھی نہ کیجیے گا درویشوں کے کرم سے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہر حال عبدالقدوس صاحب کے چہرے میں جو خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ وہ قابل دید تھی۔ اگر انسان انسانوں کو اس طرح خوشیاں دے سکے تو اگر اس خوشی میں زندگی بھی چلی جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ بہر حال صوفی نے عبدالقدوس پانی پتی کی بیٹی کی منگنی میں دل کھول کر ہنگامہ آرائی کی۔ محفل قوالی منعقد کرائی۔ منگنی سے ایک دو دن پہلے۔ صوفی اپنی دھن میں مست تھا۔ کوئی پرواہی نہیں تھی اسے۔ اس کے بعد اسے سردار پور پہنچنا تھا۔

چنانچہ منگنی کی شاندار اور یادگار رسم ادا ہونے کے بعد اس نے گرین ہاؤس سے رابطہ قائم کیا۔ پتا یہ چلا کہ گرین ہاؤس اس وقت خالی پڑا ہوا ہے۔ اور وہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ کرنل رحیم شاہ سب کو سردار پور لے گیا تھا۔

صوفی نے اپنی مشہور زمانہ موٹر سائیکل نکالی یہ موٹر سائیکل نہ جانے کب کی یادگار تھی۔ سارے چولے بدل گئے تھے۔ سوائے دو چیزوں کے ایک تو پرانا مخلہ۔ جس کے لیے دنیا کی اعلا سے اعلا ترین جگہ قربان کی جاسکتی تھی اور دوسری وہ موٹر سائیکل جو صوفی کا عکس تھی۔ اصل موٹر سائیکل تو پتا نہیں کب کی ختم ہو چکی تھی۔ بس اس کے پارٹس بدلتے رہتے تھے۔ اور نہ جانے کون سی ایسی چیز تھی جو پرانی باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ بھی اس کی خوبی تھی کہ بڑے ناز نخروں کے بعد چلتی تھی اور لوگ یہی کہتے تھے کہ صوفی نے اس موٹر سائیکل سے شادی کر رکھی ہے اور یہی اس کی شریک حیات ہے۔

چنانچہ شریک حیات کو چمکانا شروع کر دیا۔ سارے پلگ وغیرہ تبدیل کیے گئے اور اس کے بعد صوفی سردار پور کے لیے چل پڑا۔ حلیہ وہی تھا ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ قدیم شیروانی پتا نہیں کس مزاج کا انسان تھا۔ ساٹھ ہزار روپے عبدالقدوس پانی پتی کو دے دیے تھے۔ اپنے لیے جو کچھ چاہتا کر سکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ بعض دن ایسے بھی ہوتے کہ موٹر سائیکل میں پٹرول ڈلوانے کے پیسے نہ ہوتے یہ رقم عبدالقدوس پانی پتی کو دینے کے بعد اس کے پاس پانچ سات ہزار رکھے ہوئے تھے۔ ان روپوں کو جیب میں ڈالا۔ پانوں کی گلوریاں بنوائیں اور ضروریات سے لیس ہو کر وہاں سے چل پڑا۔ موٹر سائیکل نے خاصی دور تک ساتھ دیا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ ہیلمٹ نہیں لگایا ہوا تھا۔ سر کو ہوا لگتی ہے تو لمبا سفر آسان ہو جاتا ہے ورنہ گرمی سے گھٹن ہونے لگتی ہے پھر ہیلمٹ کہاں لادے لادے پھرے گا۔ یہ سوچ کر بغیر ہیلمٹ کے ہی سفر آغاز کر دیا تھا لیکن راستے کی تیز ہوا نے مٹی اور گرد نے حلیہ تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

بدرنگ شیروانی پر پسینے کے بعد مٹی کی تہیں جمنے لگی تھیں۔ خاصا فاصلہ طے ہو گیا اور پھر اچانک ہی موٹر سائیکل سے بھڑ بھڑ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اور صوفی چونک پڑا۔

"ہیں..... یہ آپ کو کیا ہو گیا عزیزہ! درویشوں کی دعاؤں سے پلگ تو نئے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہر چیز اچھی تھی جب ہم چلے تھے وہاں سے، واقعہ کیا ہوا ہے۔" موٹر سائیکل تھوڑی دیر تک چلی اور اس کے بعد اسکا انجن بند ہو گیا۔ اور صوفی نیچے اتر آیا اس نے اسے سڑک کے کنارے کیا۔ پلگ وغیرہ صاف کیے۔ دوبارہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی لیکن موٹر سائیکل نے اسٹارٹ ہونے کا نام نہ لیا اور صوفی کسی قدر پریشانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

پھر بولا۔

"خیر ہمارا آپ کا رشتہ جتنا پرانا ہے اس کے بعد تو آپ پر ناراضگی کا حق ختم ہو گیا ہے۔ لیکن خدارا ناراضگی کی وجہ ضرور بتا دیجیے گا۔ اور وجہ پتا چل گئی۔ ہوا کے دوش پر کہیں سے ہارمونیم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز صوفی کے کانوں کو اس قدر آشنا تھی کہ ہلکی سی لہر بھی آجائے تو پتا چل جائے۔ صوفی چونک پڑا اور پھر اس نے عقیدت سے موٹر سائیکل کو کئی بار چوما۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہم سے زیادہ درویش شناسی آپ میں ہے۔ معافی چاہتے ہیں ہم بھول گئے تھے کہ آج سترہ تاریخ ہے۔ اور سترہ تاریخ کو بزرگ پیر جلال جلالو کی برسی کی تاریخ ہوتی ہے۔ یقیناً وہاں برسی منائی جا رہی ہوگی۔ یاد دہانی کا شکریہ اب یہ بتائیے کہ آپ کو گھسیٹ کر لے چلیں یا اسٹارٹ ہو جائیں گی۔"

صوفی نے موٹر سائیکل کو دھکا لگایا اور اسے ڈھلان میں اتار دیا۔ لیکن آگے جانے کا مرحلہ خاصا مشکل تھا۔

بہر حال وہ پیدل ہی موٹر سائیکل کے ساتھ چلتا رہا سڑک سے کافی فاصلہ تھا اور اسکا اندازہ درست نکلا۔ جلال الدین عرف جلالو کی برسی ہو رہی تھی لوگ بے شک زیادہ نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی اچھا خاصا مجمع پہنچ گیا تھا۔ کوئی عارضی قوال قوالیاں گا رہا تھا۔ اور اس کی بے سری آواز فضا میں پھیل رہی تھی۔ جتنے لوگ بھی یہاں پہنچے تھے انہوں نے اچھی خاصی ہنگامہ آرائی برپا کر رکھی تھی۔ جگہ جگہ دیگچیاں چڑھی ہوئی تھی۔ کھانا پینا تیار کیا جا رہا تھا۔ لنگر بھی ہو رہا تھا۔ صوفی کے لیے ایسا ماحول ویسے ہی مست کرنے والا ہوا کرتا تھا۔

چنانچہ وہ یہاں کی مستیوں میں گم ہو گیا۔ قوال بے شک بے سرا تھا مگر اس نے سماں باندھ رکھا تھا اور صوفی بے خود ہو گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پینا باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی تھی۔ اور اس کے بعد قوالیوں میں مست ہو گیا تھا۔

بہر حال جب قوال تھکا تبھی صوفی بھی تھکا۔ ورنہ کئی مرتبہ اسے "حال" آچکے تھے۔ اور اس حال نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ جیب میں جو کچھ تھا نکال کر قوالوں کی نذر کر چکا تھا۔ ایک روپیہ بھی باقی نہیں رہا تھا جیب میں۔ عالم مستی میں ہمیشہ ہی ایسا ہوا کرتا تھا۔ چھ سات ہزار روپے پاس تھے قوالوں کی نذر کر دیے تھے۔ اور اس پانوں کے بٹوے اور قوام وغیرہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

بہر حال رات کا کھانا لنگر سے مل گیا رات بھی وہیں گزاری اور دوسری صبح ہوش آیا۔ حلیہ بری طرح بگڑ چکا تھا۔ قوال بھی بوریا بستر باندھ کر چلے گئے تھے۔ اور دوسرے زائرین بھی برسی کی تقریب سے فراغت حاصل کر کے جا رہے تھے۔ صوفی کو اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور موٹر سائیکل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے موٹر سائیکل کو کئی بار کک لگائی پھر بولا۔

"محترمہ قوالی میں شرکت بھی ہو گئی اب کیا ناراضگی ہے۔ کم از کم بتا تو دیجیے گا۔ چلیے آگے بڑھتے ہیں۔" تھوڑا سا آگے چلا تھا کہ وہ چھوٹی سی جھیل نظر آئی۔ جو جلال الدین جلالی کی بہت سی روایات سے مرصع تھی۔ صوفی نے سوچا کہ ذرا سا غسل کر لیا جائے۔

چنانچہ وہ موٹر سائیکل کو کھڑا کر کے کپڑے اتارنے لگا۔ شیروانی اور پانوں کا بٹوا وغیرہ تھا۔ جو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے موٹر سائیکل کے کیریئر سے لگا دیا۔ باقی کپڑے جھیل کے کنارے ہی اتار دیے گئے تھے۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ صرف جانگیہ پہنا ہوا تھا۔ یہ عجیب الخلقت انسانی وجود اس طرح کم ہی نظر آتا تھا اور دیکھنے والے لازمی طور پر اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے تھے۔ جھیل میں دیر تک نہاتے رہنے سے پہلے دن کے سفر کی گرد صاف ہو گئی اور باقی حلیہ بھی درست ہو گیا تھا۔

باہر نکلا لیکن یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ کپڑے غائب تھے اس نے پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کے منہ سے ایک سرسراتی آواز نکل گئی۔

''درویش پناہ میں رکھیں۔'' اس جگہ بندروں کی تعداد کافی تھی۔ دو تین بندر بیٹھے اسکے لباس کی دھجیاں کر کے لہرا رہے تھے۔ لباس تار تار ہو گیا تھا۔ صوفی حسرت بھری نگاہوں سے پاجامے اور قمیض کو دیکھتا رہا۔ بندروں نے پاجامے سے فارغ ہو کر ازار بند نیچے پھینک دیا اور صوفی بری طرح اس کی جانب دوڑا۔

لباس کی دھجیاں اتنی تعداد میں ہو گئی تھیں کہ اسے کسی بھی کام میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ازار بند ہلاتا ہوا وہ پریشانی سے سوچنے لگا اب کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً ہی اسے ایک سیاہ رنگ کی گاڑی اس طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اور وہ بری طرح بدحواس ہو گیا گاڑی جھیل کی طرف ہی آ رہی تھی۔ دفعتاً ہی صوفی کی نگاہ اپنی موٹر سائیکل پر پڑی۔ موٹر سائیکل پر شیروانی کیریئر میں لگی ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہی عزت بچانے کا باعث بن سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے موٹر سائیکل پر جھپٹا مارا اور جلدی سے شیروانی اچک لی۔ پھر بھاگ کر اس نے ایک درخت کی آڑ لی۔ اور شیروانی پہن ڈالی۔ لیکن اسکے نیچے ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں۔

بہر حال گاڑی جھیل کے کنارے آ کر رک گئی ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا اور پانی کا ایک برتن لے کر جھیل کی جانب چل پڑا۔ اسی وقت سیاہ رنگ کی خوب صورت کار کے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور دو خواتین نیچے اتر آئیں۔ ان میں سے ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ دوسری ایک نوجوان عورت جس کے چہرے پر غم کے سائے چسپاں تھے۔ دونوں ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگیں۔ صوفی کوشش کے باوجود خود کو نہیں چھپا سکا تھا۔ اچانک ہی دونوں کی نگاہ صوفی پر پڑی۔ عمر رسیدہ خاتون چونک پڑیں۔ صوفی مسمسی سی شکل بنائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ عمر رسیدہ خاتون نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ وہ اسے اپنے قریب بلا رہی تھی۔ ایک لمحے تو صوفی خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا رہا لیکن پھر عورت کی آواز ابھری۔

''امجد..... امجد..... دیکھو یہ کون ہے اسے بلا کر لاؤ'' غالباً ڈرائیور کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے عمر رسیدہ خاتون کے اشارے کی طرف دیکھا۔ پانی کا ڈبا وہ جھیل سے بھر چکا تھا۔ صوفی اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے کہا۔

''او بابا..... بابا صاحب..... ادھر آؤ بیگم صاحب بلاتی ہیں۔'' صوفی عجیب گومگو کا شکار ہو گیا تھا۔ بہر حال چاروناچار وہ بیگم صاحبہ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ بیگم صاحبہ اچھی پر وقار شخصیت کی مالک تھیں۔ انہوں نے اور نوجوان عورت نے گہری نگاہوں سے صوفی کا جائزہ لیا۔ پھر معمر عورت نے کہا۔

''ملنگ ہو۔''

''جج..... جی۔''

''میرا مطلب ہے کہ ملنگ ہو۔ دھمال وغیرہ ڈالتے ہو۔''

''دو..... دو..... درویش..... درویش رحم کریں۔''

''کچھ کھانے پینے کو چاہیے۔ سائرہ ذرا ٹفن نکال دو۔'' ساتھی عورت نے جس کی عمر اٹھائیس انتیس سال کی ہو گی۔ جو انتہائی دلکش نقوش کی مالک تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔ کار کی پچھلی سیٹ سے ٹفن کیریئر نکالا اور بیگم صاحبہ نے کہا۔

''کوئی برتن وغیرہ ہے تمہارے پاس۔ کھانے پینے کی چیزیں ہیں لے لو۔ جھوٹی نہیں ہیں بس یہ سمجھ لو ہمارے کھانے سے بچ گئی ہیں۔ اصل میں ہم لوگ جلالو بابا کے مزار پر حاضری دینے آئے تھے۔ واپس جا رہے ہیں۔ لو ملنگ بابا! یہ رکھ لو۔'' چلو برتن نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں ہے یہ ٹفن ہی رکھ لو۔'' صوفی کے ہاتھ بادل نخواستہ ہی آگے بڑھ گئے۔ بیگم صاحبہ نے پھر کہا۔

''یہ تھوڑے سے پیسے بھی رکھ لو۔''

''نن..... نہیں..... دراصل۔''

''کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ لو.....'' یہ کہہ کر انہوں نے پچھلی سیٹ سے ایک تہ بند ٹائپ کی چیز بھی اٹھائی۔ جس کا رنگ گہرا سرخ تھا اور اس پر نیلی پٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔

''یہ کپڑا بھی رکھ لو تمہارے کام آئے گا۔ امجد پانی ڈال لیا۔'' اس دوران ڈرائیور ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ اس نے پانی ڈال کر بونٹ بند کیا۔ تو بیگم صاحبہ بولیں۔

''چلو۔''

''وہ..... سس..... سنیے..... دو..... درویشوں۔'' صوفی نے کہنا چاہا لیکن ڈرائیور نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ صوفی نے گردن جھٹکی اور اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''دو..... درویش رحم کریں۔ شاید ملنگ سمجھا تھا مجھے لیکن سمجھنا ہی تھا۔ خالی شیروانی اور گھٹنوں سے نیچے پتلی ٹانگیں لیکن قربان جاؤں درویشوں کے کھانے پینے کا کیا انتظام کیا ہے اپنی جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ صوفی نے شیروانی کی خالی جیبیں اچھی طرح دیکھ ڈالی تھیں۔ پھر اسکے بعد اس نے اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ ٹفن کھولا تو کمال کا کھانا نکلا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ جھوٹا نہیں ہے۔ صوفی درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ بہت سے کوے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ٹفن وہیں خالی کر دیا گیا اور اس کے بعد صوفی نے اسے لاپرواہی سے جھیل کے کنارے پھینک دیا۔ ظاہر ہے اس ٹفن کا اسے کیا کرنا تھا پھر وہ پیسے دیکھنے لگا۔ پانچ ساڑھے پانچ سو روپے تھے۔ اس نے انہیں شیروانی کی جیب میں رکھا اور پھر بے اختیار ہنس پڑا۔

''واہ بیگم صاحبہ! اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ نے کوئی احسان کیا ہے مجھ پر تو میں نہیں مانتا یہ تو بس بابا جلال عرف جلالو کا کمال ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے کہ انہوں نے اس برے وقت میں میری مدد فرمائی ہے لیکن محترمہ آپ کو کیا ہوا۔ اب دیکھیے آپ کی یہ بے رخی حد سے آگے بڑھ گئی ہے۔ اب تو رات بھی یہاں گزارنی ہے۔'' صوفی نے کئی بار موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا۔ چلتے وقت موٹر سائیکل میں پیٹرول نہیں ڈالا تھا۔ پرانا ہی پیٹرول چل رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

"دو..... درویش رحم کریں۔" اور پھر اس نے ڈھکن کھول دیا۔ ٹنکی خشک ہو رہی تھی۔

"معاف فرما دیجیے گا قصور آپ کا نہیں ہے۔ میرا اپنا ہی ہے۔" صوفی نے کہا اور اس کے بعد وہ موٹر سائیکل کو دھکا لگاتا ہوا سڑک کی جانب چل پڑا۔ کافی فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا۔ دوسرے سرے پر پیٹرول پمپ نظر آ رہا تھا۔ جس کے سائن راستے میں لگے ہوئے تھے۔ عجیب و غریب حلیے میں پتا نہیں لوگ کیا سوچیں گے وہ کپڑا موٹر سائیکل کے کیریئر پر لگا ہوا تھا۔ جو بیگم صاحبہ نے دیا تھا۔ سرخ رنگ کی یہ لنگی اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ صوفی اسے باندھ لے۔ اس سج دھج کے ساتھ وہ آگے کا سفر کر رہا تھا کہ اوپر بدرنگ شیروانی نیچے لنگی منہ میں پان موٹر بائیک دھکیلتا ہوا پٹرول پمپ تک لے جا رہا تھا۔ اس میں اسے کافی وقت لگ گیا تھا۔ پیٹرول پمپ پر پہنچا۔ موٹر سائیکل کی ٹنکی پوری کرالی۔ کیا انوکھی اور دلچسپ بات تھی۔ لیکن بزرگوں کے مزارات سے اس طرح فیض حاصل ہوتا ہے۔ وہاں تو سب کچھ لٹا دیا تھا لیکن اگر بیگم صاحبہ نہ ملتیں تو پیٹرول کے پیسے کہاں سے آتے یہ سب ایک گورکھ دھندا ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوتا۔ اسکے بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی تو سردار پور پہنچ کر ہی دم لیا۔

کرنل رحیم شاہ کے اہل خاندان اس وقت کوٹھی کے لان میں ہی موجود تھے۔ مہمان خانہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بچے جس مزاج کے تھے اس کے تحت ہنگامہ آرائی تو ضروری تھی۔ خود کرنل رحیم شاہ صاف ستھرے ذہن کا مالک تھا غربت اور امارت اس کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سب گھلے ملے کھیل رہے تھے۔ شازیہ کے اہل خاندان دلاور کے بچے اور کرنل رحیم شاہ کے اپنے گھر کے لوگ لان پر خوب شور مچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ بچے جو پہلی بار یہاں آئے تھے۔ انتہائی بے تکلف ہو گئے تھے اور کرنل رحیم شاہ کے اہل خاندان کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اور پھر صوفی کی موٹر سائیکل گیٹ سے داخل ہوئی تو سارے کے سارے اس خوف ناک گرج کو سن کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔ موٹر سائیکل کی آواز اور ہیلی کاپٹر کی آواز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سب نے حیرانی سے اس طرح دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر سارے کے سارے ایک لمحے تک کے لیے تو ساکت ہو گئے اور اس کے بعد جو قہقہے ابلے تو ایسے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ شیروانی اور نیچے سرخ رنگ کی لنگی اور موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے ظاہر ہے لنگی کو سمیٹ کر اوپر اٹھانا پڑتا تھا۔ چنانچہ صوفی کی سوکھی سوکھی ٹانگیں رانوں تک کھلی ہوئی۔ دیکھنے کے قابل شخصیت لگ رہی تھی۔ موٹر سائیکل بھڑ بھڑ کرتی ہوئی پورچ میں جا کر رکی۔ قہقہے تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ صوفی نروس سا نیچے اتر آیا۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"انکل آپ..... آپ آ گئے۔"

"دو..... درویشوں کے کرم سے۔"

"انکل یہ کومپنیشن آپ نے کہاں سے حاصل کیا۔" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

"کومپنیشن۔"

"شیروانی اور دھوتی۔ ویسے ہم نے شلوار کرتے کے ساتھ کوٹ پر ٹائی بندھی ہوئی تو دیکھی

ہے۔ لیکن شیروانی کے ساتھ دھوتی پہلی بار دیکھی ہے۔"

"اللہ دھوتی تو دیکھو کتنے خوب صورت کپڑے کی ہے۔"

"شوقین ہیں ہمارے انکل۔"

"بھئی کیا کر رہے ہیں آپ لوگ، چھوٹے بابا آپ کپڑے نہیں لائے دوسرے۔"

"دو..... درویشوں نے کرم کر دیا ورنہ وہ بھی غائب ہو جاتے۔ ہماری شیروانی کے نیچے کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے جانگیے کے یہ شیروانی ہماری عزت چھپائے ہوئے ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔" قہقہے تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ صوفی نے کمال بے نیازی سے پوچھا۔

"کیوں ہنس رہے ہیں یہ لوگ۔"

"کچھ نہیں چھوٹے بابا! آپ آیئے اندر..... آیئے ادھر آ جایئے۔" شازیہ صوفی کا ہاتھ پکڑ کر مہمان خانے کی طرف گھسیٹنے لگی۔ صوفی اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا لیکن لڑکے لڑکیوں کا جم غفیر پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

شازیہ کو خود بھی اس حلیے پر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی پھر بولی۔

"چھوٹے بابا یہ آپ نے کیا کیا آپ کبھی کبھی تو مجھے یہ لگتا ہے جیسے آپ اندر سے انتہائی شریر ہوں۔" صوفی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یقین کرو ایسی بات نہیں ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"تو پھر یہ کیا پہن کر آ گئے ہیں آپ اور یہ موٹر سائیکل اسے لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ارے نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ بڑی پیر پرست ہے یہ درویشوں کے سائے میں پلی بڑھی ہے۔"

"موٹر سائیکل۔" شازیہ نے ہنسی روک کر کہا۔

"اسی کی بات کر رہے ہیں۔ اصل میں رات ایک مزار شریف پر گزاری تھی اور پھر کچھ اس طرح کے واقعات پیش آئے۔" صوفی نے ساری تفصیل شازیہ کو بتائی اور شازیہ قہقہے لگاتی رہی پھر بولی۔

"ساری باتیں اپنی جگہ لیکن آپ کپڑے بالکل نہیں لائے یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔"

"ہاں کچھ ذہن میں نہیں رہا۔"

"خیر..... میں آپ کو غلام قادر کے کپڑے لا کر دے دیتی ہوں وہ آپ کے بدن پر آ جائیں گے۔" شازیہ باہر نکل گئی اور کچھ لمحے کے بعد اس نے صوفی کو غلام قادر کی ایک شلوار قمیض لا کر دی۔ کرنل رحیم شاہ نے ان لوگوں کو اپنے مہمان خانے میں ٹھہرایا تھا جو بہت عمدہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرح کی آسائشیں انہیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ صوفی نے ایک بار پھر غسل کیا۔ شلوار قمیض پہن لی۔ شازیہ باہر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کرنل صاحب کسی کام سے گئے ہوئے ہیں وہ رات کو بھی موجود نہیں تھے۔ پتا چلا ہے کہ آج آ جائیں گے۔ ویسے چھوٹے بابا! بڑے بابا بہت اچھے انسان ہیں۔ یہاں ہمیں اتنا لطف آ رہا ہے کہ ہم بتا نہیں سکتے۔ لیکن آپ یہ موٹر سائیکل کیوں لے آئے۔"

"دیکھو بی بی بری بات ہے ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ ہمارا اس سے جذباتی رشتہ ہے۔ اس کے بارے میں بہتر ہوگا کہ کوئی توہین آمیز بات نہ کہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں اس کے کان ہیں کیا؟"

"اس کے نہیں ہمارے تو ہیں درویشوں کی دعاؤں سے ہم اس کی برائی نہیں سن سکتے۔"

"نہیں میں برائی نہیں کر رہی۔ لیکن یہ عجیب ہے۔"

"بی بی! ہم نے آج تک کسی کو عجیب نہیں کہا۔" صوفی مہذب لہجے میں بولا۔

"اچھا آئیے باہر۔ سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں آئیے بتائیے کچھ کھانے پینے کا انتظام!"

"نہیں اللہ کا فضل ہے بتا چکے ہیں کہ بیگم صاحبہ کا ٹفن کیریئر بھرا ہوا تھا اور ہم نے بھی خوب ڈٹ کر کھایا کیونکہ کھانا بے مثال تھا۔"

"مگر وہ بیگم صاحبہ تھیں کون۔"

"اب اتنا کافی تھا کہ انہوں نے ہمیں پیسے بھی دیے اور کھانا بھی ارے باپ رے..... شازیہ ہمیں فقیر سمجھ لیا تھا۔ ویسے بھی انہوں نے ہمیں ملنگ کہہ کر ہی مخاطب کیا تھا۔" شازیہ ہنستی رہی تھی۔ صوفی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ چنانچہ کیا کہہ سکتی تھی اس بارے میں۔

بہر حال صوفی اب یہاں رحیم شاہ کے گھر میں بھی بڑل مقبول ہو چکا تھا۔ کرنل رحیم شاہ دوسرے دن صبح ہی واپس آئے تھے اور صوفی کو دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

"بھئی آپ یقین کیجیے صوفی صاحب! آپ کے بغیر ماحول بڑا سونا لگ رہا تھا۔ بہت دن سے ہم رزم گاہ میں اپنا زندگی کا قرض پورا کر رہے ہیں۔ اب تھوڑا سا اپنی ذات کے لیے بھی کچھ کر لیں۔"

"کیوں نہیں منعقد کرا دیجیے ایک محفل سماں۔"

"دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ پروگرام بنائیں گے آپ آرام سے دنیا کے ہر جھگڑے کو بھول کر یہاں قیام کریں۔ بچے' آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے آپ کو عمدہ ریسپشن دیا ہوگا۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے سب خوش ہیں۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

سردار پور سے تھوڑے ہی فاصلے پر رانا گڑھی کا علاقہ تھا۔ رانا گڑھی کو پھولوں کا دیس کہنا غلط نہیں ہوگا۔ یہاں پھول پیدا ہوتے تھے۔ رانا بختیار جس کے اہل خاندان ہمیشہ سے زمیندار رہے تھے۔ پتا نہیں کون سی نگاہ رکھتا تھا کہ اس نے رانا گڑھی کو پھول گڑھی بنا دیا تھا۔ پھولوں کی کاشت کراتا تھا اور پورے ملک میں رانا گڑھی سے پھول جاتے تھے۔ اتنا پھول پیدا ہوتا تھا یہاں کہ ساری رانا گڑھی مہکتی رہتی تھی۔ ویسے تو موسم بہار ہمیشہ ہی رانا گڑھی کے علاقے میں خوشیوں کی بہار لاتا تھا۔ لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی خوش گوار ہو گیا تھا۔ کیوں کہ رانا بختیار کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور یہ مہمان تھے راجہ امیر علی شاہ دو بیٹیوں' دو ... ایک بیگم اور ڈھائی داماد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔

"راجا شیر بدر ڈھائی آدمی کا مجموعہ تھے۔ قد چھ فٹ ساڑھے تین انچ' پھیلاؤ بے پناہ۔ عقل ... کے برابر۔ شکل و صورت بہت اچھی۔ دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ لیکن صرف اس وقت تک جب تک

خاموش رہے۔ اصل میں آواز موٹی گردن میں چربی کے نیچے پھنس گئی تھی۔ اور بس یہی لگتا تھا جیسے کوئی ہاتھی میاؤں میاؤں کر رہا ہو۔ وہ زویا کا شوہر تھا۔ اور زویا راجا امیر علی شاہ کی بڑی بیٹی تھی۔ بوٹے سے قد اور خوب صورت بدن کی مالک۔ شوہر کے سلسلے میں کمپلیکس کا شکار تھی اور کھنچی کھنچی رہتی تھی۔

راجا صاحب رانا بختیار کی نئی دریافت تھے۔ لندن بائی پاس کرانے گئے تھے جہاں راجا صاحب سے دوستی ہو گئی تھی۔ صحت یاب ہو کر واپس آئے تو راجا صاحب کو دعوت دے آئے تھے اور راجا صاحب نے وعدہ کر لیا اور پھر انہوں نے وعدہ وفا کر دیا۔ ان کے بیٹے بیٹیاں بھی خوش مزاج تھے اور سب نے راجا صاحب کی فیملی کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ کئی دن کی بے تکلفی کے بعد ارم نے زویا سے پوچھ لیا۔

"زویا تمہیں تمہارے شوہر پسند ہیں۔"

"تم یقین کرو بہت اچھا انسان ہے۔ بس جسامت۔ اللہ کی دین ہے۔"

"تم ان کے ساتھ خوش ہو۔"

"ناخوش بھی نہیں ہوں۔ شوہر کی حیثیت سے ایسے لوگ آئیڈیل ہوتے ہیں۔ وہ میرا بہت خیال کرتا ہے اور پھر اس قدر سادہ لوح ہے کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ البتہ بس جب ذرا دیکھنے والے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو مجھے تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے لیکن دوسروں سے کیا لوگ تو کسی بھی شکل میں کسی کو خوش دیکھنا پسند نہیں کرتے۔" ارم خاموش ہو گئی۔ شاید وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن غیر مہذب بات تھی اس لیے خاموش ہو گئی البتہ راجا صاحب نے رانا بختیار کو اپنے داماد کے بارے میں بتایا تھا۔

"وہ ہاتھی کی طرح طاقتور، گینڈے کی طرح مضبوط ہے' بس ریسلنگ کا شوق ہے۔ پہلوانوں سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ اور خود بھی ایک اچھا پہلوان ہے۔ لیکن پروفیشنل نہیں۔ حالانکہ اس کا باپ ایک درمیانی جسامت کا آدمی تھا اور اپنے بیٹے کے اس شوق سے بہت نفرت کرتا تھا۔ لیکن شاید یہ شوق اسے قدرتی طور پر ملا ہے تم یقین نہیں کرو گے رانا بختیار کہ اس نے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو چت کر دیا ہے۔"

"ہاں۔ اچھی جسامت ہے اس کی۔"

"بہر حال یہ کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جو بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہو۔ راجا شیر بدر کی باتیں بھی بڑی معصوم معصوم ہوتی تھیں۔ وہ ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ پھر یہ طے پایا کہ رانا ہاؤس چلا جائے۔ رانا ہاؤس دراصل رانا بختیار علی کا سمر ہاؤس تھا اور یہاں بڑے شان دار انتظامات کیے گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی کے پاس بستی سے تھوڑا ہٹ کر یہ سمر ہاؤس بنایا گیا تھا۔ اور یہاں صرف ایک چوکیدار اپنے خاندان کے ساتھ مستقل رہتا تھا۔ انہی کے سپرد اس سمر ہاؤس کی دیکھ بھال تھی۔

کبھی کبھی رانا فیملی یہاں آ جایا کرتی تھی کیونکہ اس کے نواحات بھی بے مثال تھے۔ پھولوں سے لدی پہاڑیاں۔ موسم بہار میں ایک آفاقی منظر پیش کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھی جب غیر ملکی سیاح ادھر نکل آتے تھے تو یہیں کے ہو رہنا چاہتے تھے۔ ایسی جگہیں خوابوں ہی میں دیکھی جاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں جنگل بھی پھیلے ہوئے تھے۔ بے ترتیب اور ناہموار ان جنگلوں میں کبھی کبھی درندے بھی آ جایا کرتے تھے۔"

چنانچہ رانا کے کچھ ایسے شوقین دوست جو شکار سے دلچسپی رکھتے تھے فرمائش کر کے رانا کے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آجاتے تھے۔لیکن ان دنوں رانا بختیار بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔کیونکہ جنگل کے درندوں کو بھی وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور ان کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔لیکن بس مصلحتیں اور کچھ ایسے تعلقات جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔رانا کبھی یہاں کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔اور یہ بھی حیرت ناک بات تھی کہ ان درندوں نے کبھی پاس کی بستی والوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا اور کوئی ایسی شکایت نہیں آئی تھی۔جس کی وجہ سے رانا کو کوئی تشویش ہوتی۔

ایک دو بار ہی ایسے موقع آئے تھے کہ کوئی شیر انسانی جان کا لاگو ہو گیا۔ایسے موقع پر اس شیر کی تلاش خاص طور سے کی جاتی تھی اور اسے مار دیا جاتا تھا۔لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے برابر ہوا تھا۔

بہر حال سب نے فیصلہ کیا کہ سرہاؤس جانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔اجنبی مہمانوں کو بھی ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔رانا بختیار کی بہت سی اولادیں تھیں۔لڑکیاں لڑکے کچھ کی شادی ہو گئی تھی اور ایسے موسم میں وہ شادی شدہ لڑکیاں بھی آجایا کرتی تھیں۔

چنانچہ سرہاؤس جانے کے لیے جو قافلہ تیار ہوا وہ چار جیپوں میں سفر کر رہا تھا۔زویا کا شوہر عام طور سے ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا رہتا تھا اور وہ اس کے بارے میں طرح طرح کے ریمارکس کس دیتے تھے۔غزالہ نے کہا۔

"زمانہ قدیم کے لوگ تو سنا ہے اس سے بھی لمبے تڑنگے ہوا کرتے تھے۔لیکن یہ شخص بہت عجیب ہے اس کے چہرے پر کسی بچے کی طرح معصوم سی کیفیت نظر آتی ہے۔تم یقین کرو بڑی سادہ سادہ سی باتیں کرتا ہے اور لڑکیوں کے سامنے تو بالکل ہی احمق بن کر رہ جاتا ہے دل چاہتا ہے حلق پھاڑ پھاڑ کر اس پر قہقہے لگائے جائیں۔لیکن اس خیال سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کہ اس کی بیوی برا مانے گی۔"

"اور آواز' آواز تو بس کمال کی ہے۔یوں سمجھ لو اگر تھوڑے سے سراس آواز میں پیدا ہو جائیں تو لتا منگیشکر کی ایسی کی تیسی ہو جائے۔" ان الفاظ پر علکہ بری طرح ہنس پڑی۔

"خدا سے ڈرو تم لوگ' ابھی تم لوگوں کے لیے بھی راستے کھلے ہوئے ہیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کسی کو کوئی ایسا ہی ریسلرمل جائے۔"

"تم جب بھی بات کرنا کفن پھاڑ کر ہی کرنا۔اللہ نہ کرے۔"

"ہوں۔بہر حال ہے ٹریجڈی۔کتنی خوب صورت ہے زویا' نازک نازک سی۔لیکن وہ اس دیو کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔"

"ارے تمہیں نہیں معلوم زویا اسے پسند کرتی ہے۔"

"تب وہ ایب نارمل ہے۔"

"جیپوں پر مشتمل یہ پارٹی سرہاؤس کی جانب سفر کر رہی تھی۔لڑکیوں اور لڑکوں کا یہ گروہ خوب تفریحات کرتا جا رہا تھا۔بوڑھوں نے اپنے لیے ایک ہی جیپ کا انتخاب کیا تھا تاکہ لڑکے لڑکیوں کو ان کی موجودگی سے کوفت نہ ہو۔کئی گھنٹوں کا سفر طے ہو چکا تھا اور اب وہ علاقہ سامنے آگیا تھا جہاں سرہاؤس واقع تھا۔جیپوں نے سڑک چھوڑ دی اور پتھریلی زمین پر چل پڑیں۔آگے سرسبز وادی نظر آرہی تھی۔

رفتار کافی سست ہو گئی تھی کیونکہ یہ راستہ بہت ناہموار تھا۔اور بعض جگہ تو نہایت ہی سست رفتاری سے جیپوں کو گزارنا پڑتا تھا۔لیکن ایک جگہ گڑبڑ ہو گئی۔اس جیپ میں لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔اور رانا بختیار کی ایک تیز طرار بیٹی جیپ ڈرائیو کر رہی تھی۔جیپ ایک پتھر سے نیچے اتری اور اس کا ایکسل دوسرے پتھر پر جا لگا۔دونوں پہیے اوپر اٹھ گئے تھے۔حالانکہ جیپ فور وہیل ڈرائیو تھی۔لیکن کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی تھی کہ آگے کے پہیے اسے آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔پھر جب کافی ریس دینے کے بعد بھی کام نہ بنا تو رخسانہ نے جیپ کا انجن بند کر دیا۔باقی جیپیں بھی رک گئی تھیں۔لڑکے نیچے اتر آئے اور پھنسی ہوئی جیپ کے پاس پہنچ گئے جگہ ایسی تھی کہ وہ لوگ خود بھی کوشش کر کے جیپ کو نہیں نکال سکتے تھے۔لیکن لڑکیوں کی موجودگی میں لڑکے کچھ زیادہ بہادر اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔چنانچہ سب کے سب اس چکر میں پھنس گئے۔جیپ نہیں نکل پائی تھی۔رانا بختیار اور راجا صاحب بھی آگئے۔

"بھئی اب کیا کیا جائے؟"

"اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ دوسری جیپوں کو آگے لے جا کر اس جیپ کو باندھا جائے اور پھر کھینچ کر اسے اتارا جائے۔"

"کوئی رسا ہے باندھنے کے لیے۔"

"ہونا تو چاہیے۔" زویا اور دوسرے لوگ وہیں کھڑے ہوئے تھے۔راجا شیر بدر نے بیوی کی طرف دیکھا وہ بھی تشویش کا شکار نظر آرہی تھی۔

"کیوں۔تم کیوں پریشان ہو۔"

"دیکھوں ناں۔" وہ بولا اور زویا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"ارے یہ سب بونے ہیں ذرا سی جیپ نہیں اٹھا سکتے۔میں ابھی اسے نکالتا ہوں۔"

"سنیے سنیے تو سہی۔اٹھ جائے گی آپ سے۔وہ سب مل کر اسے اٹھا رہے ہیں تو اٹھ نہیں پا رہی۔"

"میں ان سب سے زیادہ طاقتور ہوں۔"

"اچھا جاؤ۔لیکن سمجھ لینا شرمندہ نہ کرنا مجھے۔" شیر بدر آگے بڑھا اور جیپ کے قریب پہنچ گیا۔رانا بختیار نے لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری جیپ میں منتقل ہو جائیں۔ابھی کچھ دیر میں کچھ کر لیا جائے گا۔رسے کی تلاش کی جا رہی تھی۔لیکن اس وقت شیر بدر وہاں پہنچا۔دونوں شاخوں جیسے مضبوط اور چوڑے ہاتھوں سے اس نے لوگوں کو ہٹا کر اور آگے بڑھ کر جیپ کو عقب سے پکڑ لیا۔دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس نے جیپ کو کئی فٹ اونچا اٹھا لیا ہے۔اور اس کے بعد اس نے زور سے اسے آگے دھکیل دیا۔سب کے سب دم بخود رہ گئے تھے۔طاقت تو بیشک دکھائی جا سکتی تھی۔لیکن اس طرح نہیں' وہ سب کے سب شرمندہ ہو گئے تھے اور پھٹی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔شیر بدر نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔اگر ٹرک بھی ہوتا تو میں اسے بھی اٹھا کر اسی طرح نکال دیتا۔اگر کمر کا زور لگا دیتا تو جیپ کو اپنی کمر پر بھی اٹھا سکتا تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یقیناً آپ ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے بعد آپ کی کمر کا کیا ہوتا۔"

"ایں! میں کچھ سمجھا نہیں۔" شیر بدر نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"بہر حال جیپ کی ڈرائیونگ پھر اس لڑکی نے سنبھال لی تھی اور وہ سب آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن اب موضوع وہی تھا۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"سچ بتاؤ جو کچھ بھی ہے وہ تو ایک الگ بات ہے۔ لیکن اس وقت اس کی بیوی کے چہرے پر فخر کے جو آثار ہیں وہ ان کی حقدار ہے۔"

"تو پھر تمہارے لیے بھی کوئی ریسلر ہی تلاش کر لیا جائے۔"

"اب یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کسی کی تعریف کرنے کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے۔"

غرض یہ کہ یہ سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور پھر وہ سمر ہاؤس پہنچ گئے۔ اچانک ہی آئے تھے۔ اس لیے چوکیدار انہیں دیکھ کر بھونچکا ہو گیا۔ لیکن پھر اس نے سب کو سلام کیا اور رانا بختیار اس سے اس کی خیریت پوچھنے لگا۔

"نہیں صاحب خیریت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو بھیج کر ہمیں یہاں آنے کا کہلوا دیتے تو ہم آپ کو ہر ی طرح منع کر دیتے۔"

"کیوں خیریت کیا بات ہے؟" رانا بختیار نے چونک کر پوچھا۔

نوجوان سمر ہاؤس میں آ کر بے قابو ہو گئے تھے۔ ویسے راجا امیر علی شاہ کی دونوں بیٹیاں زویا اور فری تو راستے میں اس علاقے کے مناظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئیں۔ اور آپس میں گفتگو کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک پھولوں کے ممالک کہلاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں پھول قومی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے ایک بار ڈنمارک دیکھا تھا۔ ڈنمارک میں پھولوں کی اتنی فراوانی کہ بعض اوقات غداق محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہاں تو جدھر دیکھو ایسا لگتا ہے جیسے زمین کے بجائے پھول ہی اُگے ہوئے ہوں۔ سمر ہاؤس میں بھی یہی کیفیت تھی۔ حسین و جمیل کشادہ عمارت چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی لیکن پھولوں کی بیلیں ان درختوں کے تنوں پر اس طرح چڑھ گئی تھیں۔ جیسے باقاعدہ ان کی ڈیکوریشن کی گئی ہو اور درختوں کے تنوں کو پھولوں کا لباس پہنا دیا گیا ہو۔ یہ عجیب و غریب ساخت کے پھول تھے جو بیلوں میں کھلتے تھے اسکے علاوہ نیچے بھی یہی کیفیت تھی دونوں سائیڈوں میں لان بنے ہوئے تھے اور ان کے کنارے پھولوں سے اس طرح لہلہا رہے تھے کہ جیسے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہوں۔ فری نے یہاں بھی آنے کے بعد کہا۔

"لگتا ہے پھولوں کے آبشار گر رہے ہوں۔" رانا نے ملازم کی یہ بات سن کر لڑکیوں کو نوجوانوں کے ساتھ اندر بھیج دیا اور وہ سب ہنستی ہوئی قہقہے لگاتی ہوئی سمر ہاؤس کی خوب صورت عمارت کی جانب چل پڑیں۔ راجا امیر علی شاہ بھی چلا جائے تاکہ ملازم یوسف خاں سے اکیلے میں بات ہو سکے لیکن راجا صاحب نے بھی ملازم کی بات سن لی تھی۔ بہر حال رانا بختیار نے سب کے جانے کے بعد کہا۔

"ہاں یوسف خاں۔ کیا بات ہے۔ تم تو ایک اچھے خاصے آدمی ہو ایسی عجیب بات کی ہے تم نے کہ میں حیران رہ گیا ہوں۔"

"سرکار بات اتنی ہی عجیب ہے ہم پڑھے لکھے آدمی تو ہیں نہیں اور ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ ہم آپ کو اس بارے میں خبر بھجواتے۔"

"اب زیادہ تجسس مت پیدا کرو بتاؤ کیا قصہ ہے۔"

"ہمارے سارے علاقے آسیب زدہ ہو گئے ہیں۔"

"کیا۔" رانا بختیار نے سخت نگاہوں سے یوسف خاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی سرکار جنگلوں کے سرے پر جہاں ہماری کاشت ہوتی ہے آسیبوں نے قبضہ جما لیا ہے۔"

"کیسے آسیب۔"

"سرکار وہ درندوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے درندے کہ انسانوں نے کبھی نہ دیکھے ہوں اور اگر ان درندوں کے سامنے کوئی آ جاتا ہے تو بس اس کی خیر نہیں ہوتی۔ بستی کے چار آدمی ایک ایک کر کے ان درندوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ کئی بار ان درندوں نے بستیوں کے آس پاس بھی حملے کیے ہیں اور جانوروں گھوڑوں اور یہاں تک کہ بیلوں کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔"

"کیسے درندے ہوتے ہیں یہ۔"

"لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ اتنے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ جیسے شیر چیتے اور ریچھ پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے۔"

"تم نے دیکھا ہے۔"

"نہیں سرکار۔"

"سنا ہے بس۔"

"جی۔"

"کس سے۔"

"سرکار بستی کے جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں ان کی تدفین میں ہم بھی شریک ہوئے تھے۔ سارے کے سارے ہمارے جاننے والے ہی تھے اور سرکار صاف نظر آتا کہ انہیں وحشی درندوں نے ہلاک کیا ہے۔ انہوں نے ان کی پسلیاں تک چبا ڈالی تھیں۔ بدن کے پورے پورے حصے غائب کر دیے تھے۔ پھر بستی کے لوگوں نے بھی ان درندوں کو دیکھا۔"

"کیا ان درندوں کا شکار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔" رانا بختیار نے پوچھا۔

"سرکار بستی کے لوگ کناروں پر پہرے دیتے ہیں اور ان میں سے کچھ نے ایک آدھ بار درندوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن درندے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ پھر وہ ڈر کر اپنی آبادیوں ہی میں گھس جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں۔"

"درندوں نے بستی میں کسی کے گھر کو نقصان پہنچایا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی تک تو نہیں سرکار۔''

''مگر تم یہ کیسے کہہ رہے ہو کہ یہ علاقہ آسیب زدہ ہو گیا ہے۔''

''سرکار یہی کہتے ہیں اب لوگ کہ یہ اصلی درندے نہیں ہیں۔ بلکہ درندوں کی روحیں ہیں جو ان علاقوں میں بھٹکنے لگی ہیں۔''

''اوہ بکواس بالکل بکواس۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔'' رانا بختیار خاموش ہو گیا۔'' چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''بعد میں بات کروں گا تم سے۔ انتظامات کی کیا کیفیت ہے۔''

''سرکار ہر چیز موجود ہے اور آپ حکم کریں تو سب کچھ بازار سے آجائے گا۔ ابھی تو بستی کے بازار کھلے ہوں گے۔''

''ہوں۔ میں ملازم کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اسے ساتھ لے کر بستی نکل جانا اور نمبردار کو میری آمد کے بارے میں بتا دینا۔ وہ ساری خریداری کرا دے گا اور اس سے کہنا کہ وہ رات کو میرے پاس آجائے۔''

''جی سرکار۔'' یوسف خاں نے جواب دیا اور رانا بختیار اندر چل پڑا۔ راجا امیر شاہ نے کہا۔

''یہ کیا ہے رانا بختیار۔ کیا کہہ رہا تھا یہ شخص جو کچھ یہ کہہ رہا تھا کیا یہ سچ ہے۔'' رانا بختیار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں خاموشی رہی پھر وہ بولا۔

''ابھی اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ نمبردار آجائے تو اس کے بعد پتا چل جائے گا۔''

''ویسے کیا یہ خطرناک بات نہیں ہے۔''

''ہاں ہے تو لیکن فکر کی بات نہیں ہے۔ کیا تم پریشان ہو رہے ہو راجا امیر شاہ۔''

''نہیں بس ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ بچے ساتھ ہیں ناں۔ ویسے میں خود شکاری رہ چکا ہوں اور میں نے بہت بار مختلف علاقوں میں شکار کھیلا کوئی حرج نہیں ہے۔ بس ذرا بچوں کے سلسلے میں احتیاط برتیں گے دیکھ لیں گے تمہارے ان آسیبی درندوں کو بھی۔''

ملازم یوسف خاں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اتر آئے تھے اور موسم ابر آلود ہو گیا تھا۔ بستی کا نمبردار جو رانا بختیار کا ملازم تھا۔ بہت سا سامان ساتھ بھر کر لایا تھا۔ جس میں کھانے پینے کی اشیا کے انبار تھے۔ مہمان چونکہ کافی تعداد میں آگئے تھے اور یوسف خاں نے نمبردار کو بتا دیا تھا اس لیے نمبردار بھی بہت سی چیزیں لے آیا تھا۔ باقی کے لیے اس نے سوچا تھا کہ دن میں لے آئے گا ادھر لڑکے لڑکیاں باہر پھولوں کے کنج میں چہلیں کر رہے تھے اور بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا۔

امیر علی شاہ رانا بختیار کے ساتھ نمبردار کے پاس آبیٹھا۔ رانا بختیار نمبردار کو بتانے لگا کہ یہاں ان لوگوں کا قیام خاصے عرصے تک رہیگا۔ ضروری سامان مہیا کر دے اور نمبردار نے گردن جھکا دی۔ پھر مطلب کی بات آگئی۔ رانا بختیار نے کہا۔

''اور میں یہ کیا کہانیاں سن رہا ہوں۔ یوسف خاں نے مجھے آسیبی درندوں کی کہانی سنائی تھی۔''

''جی رانا صاحب! ان دنوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور سوچنے والوں کی عقل حیران ہے۔ حالانکہ درندے کبھی ان علاقوں کا رخ نہیں کرتے تھے اور ان سے پہلے ایسے واقعات نہیں ہوتے تھے لیکن اب تک چار آدمی ہلاک ہو چکے ہیں اور ان عجیب و غریب درندوں کو بستی کے آس پاس بھی منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا ہے لوگوں نے ان پر حملے بھی کیے ہیں۔ لیکن درندے بھاگ جاتے ہیں۔''

''تم نے دیکھا ہے انہیں۔''

''جی سرکار۔ ایک بار ایک ریچھ دیکھا تھا۔ سرکار بڑا عجیب لگتا ہے۔ اس کا قد کوئی دس فٹ کے قریب ہو گا۔ رنگ گہرا کالا تھا اور وہ جھومتا ہوا چلا آرہا تھا۔ سرکار آنکھوں سے آگ برستی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ہم نے خود دیکھا تھا۔ دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ آسیبی درندے ہی لگتے ہیں۔ کیونکہ سرکار اتنے بڑے درندوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ویسے بستی والوں نے اور بھی درندے دیکھے ہیں ایک ببر شیر دیکھا سرکار۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ مسجد کے گنبد سے تھوڑا ہی چھوٹا سر تھا اسکا اور لمبائی بھی زیادہ تھی۔ بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا چلا گیا تھا۔''

''کوئی ایسا دلیر نہیں تھا تمہاری بستی میں جو ان درندوں کا سراغ لگاتا۔''

''نہیں سرکار..... تھے اور ہیں بھی آپ پٹھان خان کو جانتے ہیں پٹھان خان کے دونوں بیٹے بڑے جی دار ہیں۔''

''ہاں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے۔''

''سرکار! ایک بار انہوں نے بہت دور تک درندے کا پیچھا کیا تھا سمجھ دار لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ ایک عجیب بات بتائی انہوں نے۔''

''کیا؟''

''جس جگہ درندے بھاگے تھے وہاں زمین کچی تھی۔ وہ لوگ زمین پر درندوں کے پیروں کا سراغ لگانے لگے۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ درندوں کے پاؤں کتنے کتنے بڑے ہیں۔ لیکن سرکار ان لوگوں کا کہنا ہے کہ پاؤں کے نشانات ہی نہیں بنتے ان کے۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی یہ کوشش کی تھی۔ زمین پر مٹی بچھائی تھی سرکار! اور درندے اس مٹی پر آئے بھی تھے لیکن پیروں کے نشانات نہیں بنے ان کے۔ بس اسکے بعد سے یہ بات مشہور ہوئی تھی۔ کہ وہ درندے ہیں ہی نہیں بلکہ جنگل کی بلائیں ہیں۔ جو یہاں تباہی مچا رہی ہیں اور اپنے قریب آنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتیں۔ سرکار یہ بات خاص طور سے محسوس کی گئی ہے کہ وہ صرف راستے میں ہی آجانے والوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن بستی کے کنارے کنارے اکثر وہ شکار کی تلاش میں نکل آتی ہیں البتہ بستی کے کسی گھر میں گھس کر ابھی تک انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ویسے اور بھی بہت سے کام ہو رہے ہیں۔''

''کیا۔''

''کچھ جھاڑ پھونک والے بلائے گئے ہیں سرکار جو عمل پڑھ کر جنگل پر دم کر رہے ہیں۔ اور ان بلاؤں کو بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بستی میں کافی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ تین گھر تو خالی ہی ہو گئے ہیں

اور کچھ لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں جس کو موقع ملا ہے۔ بستی میں یہ باتیں بھی ہو رہی ہیں سرکار کہ اگر ان بلاؤں نے بستی میں گھس کر انسانوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تو سرکار ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکے گا۔"

"کیا ان بلاؤں پر گولی چلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔"

"نہیں سرکار۔ ایسا ابھی تک نہیں کیا گیا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے نمبردار اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"وہ سرکار گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ رات میں واپس نہ آنا اگر اجازت ہو جائے تو یہیں کہیں کسی جگہ پڑے رہیں گے۔ کل صبح ہی صبح نکل جائیں گے۔"

"ضرور ضرور نمبردار یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ معافی چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے جانے کے لیے کہا۔ آرام سے رہو۔ بلکہ یہ اچھا ہوگا کہ تم یوسف خان کو ساتھ لے کر ہی نکل جاؤ اور سامان وغیرہ یہاں پہنچا دو۔"

"جی سرکار۔ بہت بہت شکریہ۔"

یوسف خان نمبر دار کو آرام کرنے کے لیے کوئی اچھی سی جگہ دو اور اس کی ضرورت کا خیال رکھو۔" رانا بختیار نے کہا اور اس کے بعد راجا صاحب کے ساتھ ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ راجا امیر علی شاہ کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے خاص طور سے راجا شیر بدر کو اپنا نشانہ بنا رکھا تھا۔ پتا نہیں زویا کی کیا کیفیت تھی۔ بہرحال چونکہ یہ لوگ ان سے کافی دور تھے۔ اس لیے صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ راجا امیر علی شاہ نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں رانا! کہ لندن بہت حسین شہر ہے۔ وہاں زندگی میں ایک الگ حسن ہے لیکن یہ روایات۔ یہ قصے کہانیاں۔ مشرق ہی کا حصہ ہیں اور ان کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ ویسے میں تمہارے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ رہا ہوں اور اس تشویش کو سمجھتا بھی ہوں۔"

"کیا....." رانا بختیار نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے تم یہاں ہمیں اس لیے لائے ہو کہ علاقے کی سیر و سیاحت کراؤ۔ ویسے یہ سرما ہاؤس واقعی تم نے بے مثال بنایا ہے اور میں تمہارے اعلا ذوق کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ لیکن میرے دوست فکر نہ کرو۔ ضروری تو نہیں ہے کہ جنگل گردی ہی کریں۔ کچھ وقت یہاں گزارو جس طرح بھی مناسب سمجھو اس کے بعد جس وقت چاہیں گے یہاں سے واپس نکل چلیں گے۔ شہری زندگی بھی تو بری نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"بتاؤں گا میں تمہیں۔ کچھ ایسے خیالات ہیں میرے دل میں جن کی تصدیق ہو جائے تو بات ذرا بہتر ہو جائے گی۔" رات کے کھانے کے بعد رانا بختیار نے ایک بار پھر نمبردار کو طلب کر لیا۔ راجا امیر علی شاہ اب کیونکہ ان سارے واقعات کا رازدار ہو چکا تھا اس لیے اس سے پرہیز مناسب نہیں تھا۔ نمبردار ادب سے سامنے آ بیٹھا۔

"نمبردار ایک بات بتاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی سرکار۔"

"درندے عام طور سے کس سمت دیکھے جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو ہلاکت کے واقعات ہوئے ہیں۔ کیا وہ مغربی حصے کی طرف ہوئے ہیں اور درندوں کی آمد کے علاقے پر غور کر لیا گیا ہے۔"

"جی سرکار۔ مگر آپکو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔" نمبردار نے حیرت سے کہا۔

"اصل میں تم بہت سیدھے آدمی ہو۔ حالات پر غور نہیں کرتے مغربی علاقے کا دوسرا حصہ کس کی ملکیت ہے۔"

"فیروز خان کی سرکار۔" نمبردار نے کہا اور پھر ایک دم سے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رانا بختیار کو دیکھنے لگا۔ رانا بختیار بھی اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

"جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں شاید تم سمجھ گئے ہو نمبردار۔"

"سرکار! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فیروز خان نے کوئی ایسی بات کی ہے۔"

"کیا اس بات کے امکانات نہیں ہو سکتے۔"

"سرکار۔ فیروز خان ویسے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن یہ درندے اس نے کہاں سے منگوا لیے اور انہیں ان علاقوں میں کیسے چھوڑ دیا۔ سرکار یہاں بات ذرا دوسری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم نے نہیں سوچا تھا کہ فیروز خان ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔"

"وہ بہت تیز اور چالاک آدمی ہے میں کسی پر بلاوجہ الزام نہیں لگا رہا لیکن ایسا عمل کیا جا سکتا ہے۔ فیروز خان اس سے پہلے بھی کئی بار اس طرح کی حرکتیں کر چکا ہے۔"

"سرکار۔ وہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر یہ آسیبی درندے اگر آپ کی سمجھ میں کچھ آتا ہے تو ہمیں بتا دیجیے۔"

"نہیں ایسے سمجھ میں تو نہیں آئے گا۔ لیکن چیک کرنا پڑے گا۔ فیروز خان کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"جی سرکار۔"

"ٹھیک ہے جاؤ تم آرام کرو۔" بعد میں راجا امیر علی شاہ نے پوچھا۔

"یہ فیروز خان کون ہے۔"

"دوسری طرف کے علاقے کا زمیندار۔" رانا بختیار بے اختیار مسکرا پڑا پھر بولا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا راجا صاحب! تمہیں لندن میں منتقل ہوئے۔"

"بیس سال سے زیادہ۔" راجا امیر علی شاہ نے جواب دیا۔

"تب تو تم مشرق کی تمام روائتیں بھول گئے ہو گے۔"

"نہیں..... روایت تو نہیں بھولا۔ بیس سال تو بہت ہوتے ہیں۔ بلکہ بیس سال کی بات میں غلط کر رہا ہوں۔ غالباً چھبیس سال ہو گئے مجھے۔ اس کے بعد میں نے لندن ہی کی فضاؤں میں زندگی گزاری ہے۔ اصل میں یہاں سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا اور سچی بات ہے دل بہت چاہتا تھا کہ اپنے وطن واپس آؤں۔ لیکن اسی لیے واپس نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اپنا کوئی یہاں تھا ہی نہیں اب جب کہ تم ملے اور مجھے یہ احساس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا کہ خلوص دل سے مجھے دعوت دے رہے ہو تو سارے بچے میری اس آرزو میں شریک ہو گئے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہنے کا کہ طویل عرصے سے اپنا وطن اور اس کی روایت سے کٹا ہوا ہوں۔"

"میں تمہیں یہ روایت ضرور یاد دلاؤں گا۔ پرانے دور میں لوگوں کے پاس بڑا وقت ہوا کرتا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ مختلف مشغلے ہوا کرتے تھے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے پاس جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہر چیز کے لیے ملازم موجود ہوا کرتے تھے۔ بٹیریں لڑاتے تھے۔ تیتر لڑاتے تھے۔ کتے لڑاتے تھے۔ غرض نہ جانے کیا کیا کرتے تھے۔ خود لڑنے کا اگر شوق تھا۔ تو مقدمے بازی وغیرہ کرلیا کرتے تھے۔ دشمنی لازمی تھی۔ دوست کتنے ہی ہوں اگر دو چار دشمن نہ ہوں تو دل کیسے لگے۔ بس یوں سمجھ لو فیروز خان بھی ایک ایسا ہی درخت ہے۔ جو بہت قدیم ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"غالباً فیروز خان کے پردادا کے دور کی بات ہے ظاہر ہے اس وقت میرے دادا بھی حیات تھے۔ زمینوں کے مسئلے پر جھگڑا ہوا۔ دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ سال چھ مہینے میں دو چار قتل ہو جایا کرتے تھے۔ اس دشمنی کی بنیاد پر کوئی سال اگر خالی چلا جاتا تو دونوں ٹیمیں اداس ہو جاتی تھیں کہ کسی کا بھی خون نہیں بہا۔ بہرحال جہاں جائدادیں، زمینیں، ورثہ دولت وغیرہ کی شکل میں منتقل ہوتا۔ وہیں مرنے والے کی وصیت بھی ورثے میں ملتی تھی اور وصیت یہ ہوتی تھی کہ فلاں دشمن کو نقصان پہنچائے بغیر سمجھ لو تمہاری شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ورثہ منتقل ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے اور وصیت میں فیروز خان ملے ہیں۔" رانا بختیار نے کہا اور اس کے انداز پر راجا امیر علی شاہ ہنس پڑا پھر بولا۔

"ذرا کچھ اور تفصیل۔"

"پہاڑوں کے پار کی زمینوں کا بڑا حصہ فیروز خان کی ملکیت ہے اور فیروز خان اسی پردادا کی اولاد ہے۔ جس سے میرے پردادا کی دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بھی رسم دشمنی نبھا رہا ہے اور میں بھی۔ لیکن یار بس قتل و غارت گری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور شاید یہ نسل اس دشمنی میں زیادہ کامیاب نہ رہ سکے۔ فیروز خان بھی کچھ ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔ بس چالیں چلتا رہتا ہے۔ مختلف قسم کی۔ برسات میں پانی کے ایسے بند بنا دیتا ہے کہ ہماری نہروں میں زیادہ پانی نہ آسکے۔ ہم آدمی بھیجتے ہیں بند تڑوا دیتے ہیں خفیہ طور پر، کھلے عام جس دن بھی ایسا ہوسکا۔ اس دن اس دشمنی کو خون مل جائے گا۔ لیکن چونکہ فیروز خان نے خود ایسی کوئی کوشش نہیں کی اس لیے میں نے بھی احتیاط رکھی اور لوگوں کو ہدایت کر دی ہے کہ جہاں تک موقع ملے قتل و غارت گری سے پرہیز کیا جائے۔ فیروز خاں خود بھی کافی نارمل آدمی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ بھی پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ جہاں خوں ریزی کا خطرہ ہو۔"

"بہت دلچسپ..... بہت ہی دلچسپ۔" راجا امیر علی شاہ نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"یعنی اس میں دلچسپی کی بات کیا ہے؟"

"بھئی دوستیاں تو نبھائی ہی جاتی ہیں..... دشمنی نبھانا بھی ایک عمل ہے۔ مزے کی بات ہے۔"

"ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال ذرا سنجیدہ شکل اختیار کر چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ انوکھے درندے، کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

"بالکل نہیں۔"

"اور ان سے متعلق روایات پر مجھے تو ایک شبہ ہے راجا امیر علی شاہ۔"

"کیا۔"

"فیروز خاں نے جدید ماحول سے فائدہ اٹھایا ہے اور کوئی نئی سازش تیار کی ہے۔ خیر میں تو یہ نہیں کہتا کہ بستی والے درندوں کے سائز کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے لیکن اس بات کے امکانات ہیں کہ یہ درندے کسی اور جنگل سے ہانک کر یہاں لائے گئے ہوں اور فیروز خان ان کے ذریعے اپنی کارروائی کر رہا ہوں۔"

"یعنی وہ درندے فیروز خان یہاں بھیجتا ہے۔"

"امکان ہے اس بات کا۔"

"مگر کیسے ممکن ہے یہ۔"

"اب یہی تو دیکھنا ہے کہ کیسے ممکن ہے۔"

"بستی والوں پر یقین کرتے ہو۔"

"نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"بستی والے بے چارے سیدھے سادھے معصوم لوگ ہیں۔ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ان کی ہابی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ درندے بے شک ہوں گے۔ آگئے ہوں گے۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے رانا کہ تم فیروز خان کے بارے میں مت سوچو ہوسکتا ہے جنگل میں درندے کہیں سے آگئے ہوں۔"

"فیصلہ کن بات تو نہیں کی میں نے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو اور ہم فیروز خان کے بارے میں غلط سوچ رہے ہوں۔"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا ان درندوں کے بارے میں تحقیقات نہیں کرو گے۔"

"یار! برا مت ماننا راجا امیر علی شاہ! ہم تو پشتوں سے زمیندار ہیں اور ایک ہی شوق ہے ہمارا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ آئے تو پیٹھ دکھا کر بھاگیں نہیں اس کا سینہ تان کر مقابلہ کریں۔"

"تو اس میں میرے برا ماننے کی کیا بات ہے۔"

"اگر اس مسئلے کو میں نے نظر انداز کیا تو صرف تمہاری وجہ سے۔"

"کیوں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس لیے کہ تمہارے ساتھ بچے بھی ہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

''نہیں ولیری اور بزدلی قدرت کی دین ہوتے ہیں۔ میں اگر تم سے یہ کہوں کہ میرے بچے بھی بزدل نہیں ہیں تو تمہیں یقین کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔''

''نہیں راجا امیر علی شاہ خدانخواستہ ان الفاظ سے تمہاری توہین مقصود نہیں ہے مجھے بس مہمان ہو اس لیے تمہارا تحفظ کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو لندن میں زندگی بالکل مختلف ہے۔ وطن کی یادیں وطن کی ثقافت ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ہم یہاں کی مختلف زندگی دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ تم چاہو تو بچوں سے بھی مشورہ کر لینا۔ بلکہ میں اگر ایک بات کہوں تم سے تو غلط نہیں ہوں گی۔''

''کیا۔''

''بچوں کو بھی اس بارے میں بتا دو۔''

''پھر اس سے کیا ہوگا۔''

''ہوں۔ انکا مشورہ۔'' رانا بختیار نے کہا۔

''نہیں ڈیئر رانا۔ یہاں مجھے تم سے اختلاف ہے۔''

''کیا۔''

''بچوں کو ہر حالت میں اعتماد میں لینا چاہیے۔''

''خیر میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ چلو ٹھیک ہے مشورہ کر لیں گے ان سے۔'' دوسرے لوگ جس طرح یہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی بہت تعداد جن میں سے زیادہ تر رانا بختیار ہی کے بیٹے بیٹیاں تھے۔ کوٹھی میں گھومتے پھر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے گھاس نے خوش نما رنگین پھول بکھیر دیے ہوں۔ وہ سب بے حد مصروف نظر آ رہے تھے حالانکہ راجا شیر بدر سب کی نگاہوں کا مرکز تھے اور ان کی دلچسپ باتیں ماحول کو زعفران زار بنائے ہوئے تھیں لیکن پھر بھی لڑکے لڑکیاں صرف زویا کی وجہ سے احتیاط کر رہے تھے راجا شیر بدر کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتے کہ سب کے پیٹ ہنستے ہنستے دکھنے لگتے لیکن بہر حال احتیاط رکھی جا رہی تھی البتہ زویا قریب نہ ہوتی تو شیر بدر کے بارے میں دلچسپ فقرے سننے کو مل جاتے تھے۔

رات کا کھانا لگایا گیا۔ سارا اہتمام ہو گیا تھا اس جنگل میں منگل منانے کا۔ کھانا بھی شان دار بنایا تھا نمبردار نے۔ کھانا پکانے والوں کو بھی بھیج دیا تھا۔ چند ملازموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ ساری ہدایات نمبردار کو رانا بختیار نے دی تھیں۔ بہر حال کھانے کی میز پر بڑی لمبی نشست تھی اور بڑا اعلا کھانا تیار کیا گیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد بچوں نے خود ہی بزرگوں کو گھیر لیا۔ رانا بختیار کے بیٹے اور راجا شیر امیر علی شاہ کی دونوں بیٹیاں بھی تھیں ایک کونے میں شیر بدر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ سب اس خوفناک بلا کی طرف متوجہ تھے۔ ہول ناک چیتا بالکل ہی مختلف سمت تیز رفتاری سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔ ویسے بھیڑیں چرانے والے کی طرف اس کا رخ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کا

کوئی نارگٹ تھا یا پھر یونہی۔ پھر کافی دور جانے کے بعد چیتا اچانک رکا۔ زمین پر اس کے پنجے جمے تو تھوڑی گرد اڑی اور پھر اس کے بعد وہ پھر اسی رفتار سے واپس دوسری سمت مڑ گیا۔ امیر شاہ نے آہستہ سے کہا۔

''اگر اس نے اس بھیڑیں چرانے والے کی طرف رخ کر لیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا۔''

''ہاں۔ یہ راستے تبدیل کر رہا ہے اور کسی بھی لمحے اس کا رخ کسی بھی طرف ہو سکتا ہے۔ وہ ادھر بھی آ سکتا ہے۔ چیتا نپے جما جما کر واقعی بار بار اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا اور اس طرح رخ تبدیل کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے باقاعدہ کسی اسٹیئرنگ سے کنٹرول کیا جا رہا ہو اور اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ لوگ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت یہ ہیبت ناک منظر سب لوگوں کو ساکت کرنے کے لیے کافی تھا ان کی رگوں میں خون جم گیا تھا۔ شوخ شریر لڑکے لڑکیاں دہشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور ان کے سانس رکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ راجا شیر بدر بھی خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھوک نگل رہے تھے اور سانسیں تک آہستہ آہستہ لے رہے تھے کہ کہیں چیتے کی توجہ ان کی جانب نہ ہو جائے اور پھر یہی ہوا اس بار چیتے نے ان پہاڑیوں کی طرف رخ تبدیل کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رانا بختیار نے اپنے گارڈز کو ہوشیار کر دیا۔ اس کی آواز ابھری۔

''ہوشیار..... جیسے ہی وہ اس سمت آنے لگے اس پر فائرنگ شروع کر دی جائے ابھی اس کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے۔ چیتے نے ادھر ہی کا رخ کر لیا تھا اور اچانک ہی اس پر فائر کھول دیا گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ہیبت ناک فضا میں ایک عجیب سی ہول ناک گونج طاری کر دی درندہ اپنی جگہ رکا اور پھر اچانک اس نے اونچی اونچی چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ اس کا رخ تبدیل ہو گیا تھا وہ سب عجیب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور درندے کی اس کیفیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ گولیاں مسلسل چلائی جا رہی تھیں اور یہ اندازہ تک نہیں ہو پا رہا تھا کہ چیتا گولیوں کی رینج میں ہے بھی یا نہیں لیکن وہ یہ ضرور دیکھ رہے تھے کہ وہ بار بار رخ بدل رہا ہے۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی گولیوں کی آواز سے خوف زدہ ہے۔ یہ سنسنی خیز ماحول کافی دیر تک قائم رہا اور پھر رانا بختیار کی ہدایت پر اسٹین گن برداروں نے گولیاں چلانا بند کر دیں۔

درندہ پھر اپنی جگہ رکا اور پھر اچانک اس نے اسی خیمے کی جانب رخ کیا اور دوسرے لمحے وہ خیمے میں داخل ہو گیا پھر ایک اور منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اچانک ہی خیمہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا وہ سب دیوانوں کی طرح پراسرار منظر دیکھ رہے تھے جو کوئی فلمی منظر ہی معلوم ہوتا تھا حقیقت سے اس کا تعلق نہیں لگ رہا تھا اسی وقت نہ جانے صوفی کو کیا سوجھی کہ اس نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں خیمہ لگا ہوا تھا۔

''ارے ارے روکو اسے روکو..... روکو اسے۔'' راجا امیر علی شاہ نے مضطرب انداز میں کہا۔

''روکو وہ کہیں دوبارہ نمودار نہ ہو جائے۔'' رانا بختیار خود بھی سہما ہوا تھا۔ لیکن کرنل رحیم شاہ سرد نگاہوں سے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ صوفی اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں خیمہ لگا ہوا تھا۔ پھر وہ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس سمت آنے لگا جدھر درندہ آیا تھا۔ وہ زمین پر جگہ جگہ نشانات تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ لوگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کر رہے تھے کہ یہ اونٹ کا ماموں زاد بھائی اس وقت انتہائی پھرتیلا اور چوکس نظر آ رہا ہے۔

اچانک ہی راجا امیر شاہ نے رانا بختیار کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

"اس آدمی نے تو چونکا دیا ہے۔"

"کک..... کک..... کس نے؟"

"اسی لیے اونٹ کی بات کر رہا ہوں ذرا اس کے بدن میں تڑپتی ہوئی بجلیوں کو تو دیکھو ویسے تو یہ ایک بغیر ہڈی کی جونک معلوم ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی پھرتی قابل دید ہے۔"

"ہاں۔ ہے کچھ۔" رانا بختیار بے خیالی کے انداز میں بولا۔

"وہ کوئی معمولی شخصیت نظر نہیں آتی رانا۔"

"ہاں..... وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔" رانا بختیار نے آہستہ سے کہا۔

"میں واقعی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔"

"اور اس لڑکی کو نہیں دیکھ رہے تم جو لگتا ہے کہ جیسے کسی شادی کی تقریب میں شریک ہو۔"

"سارے ہی عجیب ہیں۔" اچانک ہی صوفی ان کے پاس پہنچ گیا۔

"درویش رحم کریں مجھے پتا نہیں کیا کیا داستانیں یاد آ رہی ہیں۔ کرنل صاحب آپ کو معلوم ہے کہ جب غول بیابانی جنگلوں میں گشت کرتے ہیں تو اپنے پیچھے بڑی بڑی عجیب چیزیں پھینک جاتے ہیں۔"

"کہاں کی باتیں کر رہے ہیں آپ صوفی صاحب! آپ تو بالکل اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس طرح دادی اماں کی کہانیاں ہوتی تھیں کہ بڑھیا چاند میں چرخا کاتتی ہے۔" صوفی ٹھنڈی سانس لے کر منہ چلانے لگا تھا۔

♥.....♥.....♥

"بھیڑیں چرانے والے نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ماحول پر مکمل خاموشی اور سنجیدگی کا راج تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی بانسری بہ ظاہر لکڑی کی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب اس نے اس میں کچھ سوراخوں کے اندر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے ناب دبائے تو بانسری درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لکڑی کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے ایک بٹن کو دبایا اور بانسری کا بڑا سرا قریب کر لیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی پھر ایک آواز سنائی دی۔

"ہاں..... کیا بات ہے؟"

"زیرو تھری۔" بھیڑیں چرانے والے نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں زیرو تھری بولو۔"

"سر! آپ کو ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہے۔ جو اس وقت ان جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں۔"

"ہاں۔ لیکن یہ مجھے عام لوگ نہیں معلوم ہوتے۔ تمہاری کیا رائے ہے ان کے بارے میں۔"

"سر! بڑے عجیب و غریب لوگ ہیں یہ۔ حد سے زیادہ دلیر ہیں وہ ہمارے سارے کام میں مداخلت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ٹیلی کیسٹر پر گولیاں چلائی ہیں۔"

"وہی میں تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیلی کیسٹر کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔"

"نہیں سر۔"

"تم کہاں ہو؟"

"پوائنٹ پر ہوں۔"

"اب کیا پروگرام ہے۔"

"سر! آپ کا حکم سننا چاہتا ہوں۔" بھیڑیں چرانے والے نے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے دوسری جانب خاموشی طاری ہوگئی۔

"نہیں۔ کام مناسب طریقے سے نہیں ہو رہا۔ یہ گڑبڑ میرے لیے غیر متوقع ہے۔"

"حالانکہ سر! ہم لوگ بڑی محنت سے کام کر رہیں۔ یہ علاقے آسیب زدہ مشہور ہوگئے اور لوگ اس طرف نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی کچھ سر پھرے ایسے ہیں سر! جو ان باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے جیسے یہ ٹیم۔"

"عام لوگوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس اتنا ہی چاہتا ہوں میں کہ قرب و جوار کی آبادیاں خالی ہو جائیں اور کوئی اس طرف نہ آئے۔ تاکہ ہم اپنا کام خوش اسلوبی سے جاری رکھیں۔"

"سر! یہ آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔"

"یہ لوگ آخر ہیں کون؟"

"بہ ظاہر تو سیاح ہی معلوم ہوتے ہیں۔"

"میں بہ ظاہر سے سخت چڑتا ہوں سمجھے۔"

"جی سر! ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ ان علاقوں میں سیاحوں کو بھی نہیں آنا چاہیے۔ تاکہ ہم سکون سے اپنا کام کر سکیں سمجھے۔"

"جی سر..... لیکن بہت زیادہ جلد بازی انتظامیہ کو بھی ہماری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ مجبوری تو ہے۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے ہماری پروڈکشن رکی ہوئی ہے اور تم جانتے ہو کہ دنیا کا ہم پر شدید دباؤ ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ ہم اس کا کام شروع کر دیں۔"

"جی سر! میں جانتا ہوں۔"

"اوکے۔ تمہیں زیادہ تیز انداز میں کام شروع کرنا چاہیے۔ اوکے۔"

"اوکے۔" اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہوگیا۔

♥.....♥.....♥

لڑکیاں اور لڑکے خاصے جز بز ہوئے تھے سبھی نے اپنے اپنے تبصرے کیے تھے اور کسی قدر بے چینی کا اظہار بھی کیا تھا کہ آخر ان خوف ناک حالات میں اب یہاں رکنے کی کیا گنجائش ہے۔ آپس ہی میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم تو بڑی ایڈونچر پسند ہو پھر ہوا کیوں کھسک رہی ہے۔"

"ہوا کھسک رہی ہوگی تمہاری۔ میں تو کہتی ہوں کہ آخر خطرہ مول لینے سے فائدہ کیا ہے۔"

"خطرے کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی، زندگی ہوتی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے مرو یہاں ہمیں کیا؟" ادھر راجا امیر علی شاہ نے بھی کہا تھا۔

"دیکھ لو بھئی..... میں تو خیر ان حالات سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ تم لوگ بچے بچیوں کے بارے میں سوچ لو۔"

"ویسے یہ صوفی صاحب کیا چیز ہیں ذرا ان کا مکمل انٹرویو ہو جائے۔ مجھے تو یہ شخص بہت ہی پراسرار لگتا ہے۔"

"ہم اسے پراسرار اونٹ کہہ سکتے ہیں۔" راجا شیر بدر نے بھی گوہر افشانی کی۔

"اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے شیر بدر صاحب!" نہ جانے کیوں کرنل رحیم شاہ کو صوفی کے بارے میں یہ ریمارکس پسند نہیں آئے۔

"میں تو بس ان لوگوں کی وجہ سے خاموش رہا۔ ورنہ آپ چاہیں تو آپ مجھے اس چیتے کے مقابلے میں چھوڑ سکتے ہیں۔"

"خیر..... میں اپنی بیٹی کو بیوہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"چیتے کا مقابلہ تو بعد کی چیز ہے۔ جسے یہ پراسرار اونٹ کہہ رہے ہیں۔ یہ اسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"یہ نا فرمائیے جناب! آپ یقین کیجیے کہ اگر ایک گھونسا میں نے اس کے سر پر جما دیا تو وہ دوبارہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے گا۔" راجہ شیر بدر نے کہا۔

"ایسی باتیں نہ کیجیے آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہوں۔ صوفی صاحب کو ان کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتے۔" دلاور کو غصہ آ گیا تھا۔

"بلا لیجیے اپنے صوفی صاحب کو اگر میرے ہی ہاتھوں تڑوانا چاہتے ہیں انہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔"

"دیکھیے..... ایک بار پھر آپ کو وارننگ دی جا رہی ہے۔ مہمان ہیں اچھی زبان استعمال کیجیے۔" شازیہ غصے سے بولی۔

"اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنوں گا میں، آپ لوگ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں، مجھے چیلنج کیا گیا ہے..... مجھے۔ جس نے پانچ پانچ آدمیوں کو ایک ساتھ بچھاڑا ہے۔"

"اڑے ماں قسم، تمہارا چٹنی بنا کر تمہارے ملک نہ بھجوا دیا تو غلام قادر نام نہیں ہے بابا لوگ اور کچھ نہیں بولے گا۔ ارے پہلے تو تم میرے سے ہی زور لگا لو صوفی صاحب تو بہت بعد کا چیز ہے۔" دلاور نے کہا۔

"ارے ارے یہ کیا شروع ہو گیا۔ نہیں جناب! میری بھی کوئی عزت ہے میرا وقار ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ جب چاہیں آپ اپنے صوفی صاحب کو میرے مدمقابل لا سکتے ہیں۔ اگر دو منٹ میں چٹنی بنا کر نہ رکھ دی تو میرا نام بھی راجہ شیر بدر نہیں ہے۔ نام بدل دیجیے آپ لوگ میرا۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر آپ کو راجہ شیر بدر نہیں بلکہ راجہ شہر بدر کہا جائے گا۔" شازیہ بولی۔ صوفی یہاں

موجود نہیں تھا۔

"اچھا اچھا دیکھا جائے گا یہ تفریح بھی ہو جائے گی کسی وقت۔" رانا بختیار نے کہا اور اس کے بعد شازیہ کے کیمرے کی طرف توجہ دی گئی۔ لیکن یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ اتنی ساری شوٹنگ کی گئی تھی۔ لیکن چیتے کی ایک بھی تصویر کیمرے میں نہیں آئی تھی۔ سوائے قرب و جوار کے مناظر کے، جو عام سے تھے اور ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔"

"ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایشیا میں خاص طور سے پراسرار داستانوں کا وجود بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے رانا بختیار کہ یہ واقعی کوئی آسیبی چکر ہی ہو۔"

"صوفی صاحب آ گئے ہیں ذرا اب ان کی بھی رائے لے لی جائے۔" ان لوگوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ وہیں خیمہ زن تھے جب کہ ان واقعات کے بعد کافی حد تک لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی بھی تنہا جانے کو تیار نہیں تھا یہ تجویز پیش کر دی گئی تھی کہ لڑکے لڑکیاں اگر چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔

غرض یہ کہ صوفی وہاں پہنچ گیا۔ خاص طور سے راجا امیر شاہ نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں۔

"صوفی صاحب آپ کی دلیری ناقابل فراموش ہے۔"

"بزرگوں کی دعائیں ہیں جناب میرے ساتھ۔"

"آپ بہت زیادہ درویش پرست معلوم ہوتے ہیں۔"

"رکھا کیا ہے حضور والا! اس دنیا میں، آپ لوگ نہیں سمجھتے۔ آپ کی اس سیاسی اور سماجی دنیا کے علاوہ ایک روحانی دنیا بھی ہے۔ یہاں درویشوں کی حکومت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نظام کائنات سونپا ہوا ہے۔ ہر عہدہ موجود ہے وہاں درویشوں کی دعاؤں سے اور اپنے اپنے طور پر کام ہوتا ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے صوفی صاحب! لیکن اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ صورت حال کی وضاحت نہ ہو جائے۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ کیا آپ اسے کوئی آسیبی چکر قرار نہیں دیتے۔"

"اگر یہ کوئی آسیبی چکر ہے تو آپ یقین کیجیے کہ ایک چلے کا بھی نہیں ہے۔"

"چلے۔" راجہ میر شاہ نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ جہاں میں نے چلہ کشی کی یہ رفو چکر ہو جائیں گے۔ نام و نشان بھی نہیں رہے گا ان کا۔"

"ارے تو پھر چلہ کشی کیجیے نا۔"

"کرنل صاحب کے حکم کا انتظار ہے۔" صوفی صاحب نے کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کرنل رحیم شاہ مسکرانے لگا پھر بولا۔

"صوفی صاحب کے چلے بھی واقعی بڑے جان دار ہوتے ہیں اور انہوں نے یہ الفاظ غلط نہیں کہا کہ یہ جب چاہیں انہیں رفو چکر کر سکتے ہیں۔"

"اور میرے چیلنج کا کیا ہوا۔" راجا شیر بدر اصل میں لڑکیوں کے سامنے بے بس ہو گئے تھے جواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہیں ان کی دانست میں مذاق اڑانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ صوفی نے چونک کر انہیں دیکھا تو نوجوانوں میں سے ایک نے کہا۔

"صوفی صاحب! راجا شیر بدر صاحب نے آپ کی دلیری سے ناراض ہوتے ہوئے آپ کو چیلنج کیا ہے کہ آپ ان سے جسمانی مقابلہ کریں۔" صوفی کے انداز میں ایک کھلنڈراپن پیدا ہوگیا۔ اس نے راجا شیر بدر کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ تو ہمارے مہمان ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"بھاگ رہے ہو میدان چھوڑ کر اس طرح دوڑ لگا کر کسی خاص جگہ تک پہنچ جانا الگ بات ہے اور جسم کو جسم کے مقابلے لانا الگ بات میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اگر چاہوں تو صوفی صاحب کی کمر درمیان سے توڑ کر دو ٹکڑے کر سکتا ہوں۔" صوفی کو بھی جوش آ ہی گیا کہنے لگا۔

"اور اگر آپ ایسا نہ کر سکے درویشوں کی دعاؤں سے تو۔"

"تو پھر میرے لیے سزا آپ تجویز فرما دیجیے۔"

"اڑے میں بولتا ہے سزا میرے کو تجویز کرنے دو۔" غلام قادر نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ تو بات طے ہو چکی ہے کہ اگر راجا شیر بدر صاحب ہار گئے تو ان کا نام راجا شہر بدر ہوگا۔ شازیہ بولی۔

"ابھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے فرق تو یہ ہے کہ اگر یہ ہار گئے۔ تو انہیں پانچ سو گز کا فاصلہ چھپکلی کی طرح فرش پر چل کر طے کرنا ہوگا۔"

"بولو منظور ہے۔"

"سب کچھ منظور ہے۔ تم لوگوں نے سمجھا کیا ہے مجھے۔" راجہ شیر بدر اکڑ گئے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی باقی کے کام بعد میں ہوں گے پہلے ذرا یہ ہی طے ہو جائے۔" دلاور نے کہا۔

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے۔ شیر بدر! تم کیوں بے وقوفی کر رہے ہو۔" راجا امیر علی شاہ نے کہا۔ لیکن پھر ان کی آواز سیٹیوں، تالیوں اور چیخوں میں دب گئی۔

"مقابلہ ہوگا، مقابلہ ہوگا۔" صوفی بھی تیار ہوگیا اور اس کے بعد سارے معاملات طے کر لیے گئے۔ غلام قادر نے جو تجویز پیش کی تھی۔ راجہ شیر بدر اس پر تیار ہوگیا تھا اور وہ فاصلہ بھی طے کر لیا گیا تھا۔ جو اسے ہاتھ پیروں کے بل چل کر طے کرنا تھا۔

ادھر طے یہ ہوا تھا کہ اگر صوفی ہار گیا تو کمر کے دو ٹکڑے تو کیے ہی جائیں گے لیکن صوفی کو دو گھنٹے تک مرغا بننا پڑے گا اور صوفی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی لوگ کہتے ہیں کہ میری شکل مرغوں سے ملتی جلتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے، یہ داڑھی اور میری کمر بس دو چیزوں کی کمی رہ جاتی ہے ایک کلغی دوسری دم، نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے پھر ایک تفریح کا سامان پیدا ہوگیا تھا۔ دونوں کی کشتی کے لیے جگہ ایسی تجویز کی گئی تھی۔ جہاں نرم برف موجود تھی۔ راجہ شیر بدر نے باقاعدہ ریسلنگ کا سٹیوم پہن لیا تھا۔ جب کہ صوفی کا حلیہ بہت عجیب تھا۔ اس نے قمیص اتار دی تھی۔ عام طور سے شیروانی اور پائجامہ پہنے ہوتا تھا۔ پائجامے میں اس نے ڈبل ازار بند ڈالا تھا۔ اور اسے

کس کر باندھ لیا تھا۔

اس وقت ایک عجیب و غریب چیز نگاہوں کے سامنے تھی اور لوگ اس کا بدن دیکھ دیکھ کر ہی ہنس رہے تھے۔

غرض یہ کہ دونوں عارضی طور پر ترتیب دیے گئے اکھاڑے میں آ گئے تھے۔ راجا شیر بدر پینترے بدل رہا تھا۔ صوفی نے شازیہ سے پانوں کا بٹوہ طلب کیا۔ تو راجا شیر بدر نے فوراً اعتراض کر دیا۔

"نہیں اس میں طاقت کی دوائیں ہیں۔ یہ دوائیں میں نہیں کھانے دوں گا۔" صوفی ہنس کر خاموش ہوگیا تھا بٹوہ واپس کر دیا گیا تھا۔ لیکن شازیہ، غلام قادر، دلاور اب صوفی کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ شاید سب سے زیادہ غصہ اسے راجا شیر بدر کے انہی الفاظ پر آیا تھا۔ ویسے عادل، فیضان اور کرنل رحیم شاہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ راجا شیر بدر کی شامت ہی آ گئی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے بھی یہ تماشا دیکھ چکے تھے اور پھر اسی تماشے کا آغاز ہوگیا۔ راجا شیر بدر نے فری اسٹائل کے طرز پر ایک ٹانگ گھمائی صوفی کو نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اس کے بعد ہونے کیا والا ہے۔ صوفی نے اس داؤ سے بچنے کے بجائے پھرتی سے وہ ٹانگ پکڑ لی۔ اور پھر اچانک ہی ایک عجیب سی قلابازی کھائی اس نے اور راجہ شیر بدر زمین پر کئی فٹ اونچا اچھلا اور کسی بوری کی طرح زمین پر آ رہا۔ برف بے شک تھی لیکن برف پر بھی چوٹ لگتی ہے۔ پھر بھی راجا شیر بدر نے پھرتی سے اپنے آپ کو رول کیا اس کا خیال تھا کہ صوفی کہیں اس پر آ نہ پڑے لیکن صوفی اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ اور ازار بند درست کر رہا تھا۔ جس کا ایک سرا باہر نکل آیا تھا۔

"ازار بند میں یہی خرابی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"خرابی بھی درویشوں کی دعاؤں سے ہی ہوتی ہے۔" امیر شاہ نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن اتنی دیر میں راجہ شیر بدر نے اپنی جسامت کے برعکس ایک ایسی زبردست چھلانگ صوفی پر لگائی تھی کہ اگر صوفی اس کی زد میں آ جاتا تو واقعی ہڈیاں ہی چیخ جاتیں۔ لیکن یہاں بھی صوفی نے کمال دکھایا۔ وقت کا اندازہ اور پھرتی ناقابل یقین تھی۔ وہ صرف اتنا جھکا تھا کہ راجا شیر بدر اس کے شانوں کو چھو کرتا ہوا گزر جائے۔ لیکن اس نے شیر بدر کو گزرنے نہیں دیا تھا۔ بلکہ اسے اپنے کاندھوں پر لے لیا تھا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن میں گھمایا تھا اور دوسرا اس کے پیروں میں اس طرح پھنسا دیا تھا کہ راجا شیر بدر ہل بھی نہ سکے اور اس کے بعد صوفی نے چکر کھانے شروع کر دیے وہ راجا شیر بدر کو پھرکنی کی طرح گھما رہا تھا اور راجا شیر بدر کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ کوئی پچاس سیکنڈ تک صوفی راجہ شیر بدر کو اپنے کندھوں پر لیے گھماتا رہا اور پھر اس کے بعد اس نے نہایت اطمینان سے اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔

راجا شیر بدر بری طرح چکرا گیا تھا اور اب وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ناچ رہا تھا اپنے آپ کو زمین پر گرنے سے بچانے کے لیے بیلنس کر رہا تھا۔ لیکن اتنے زور کے چکر آ رہے تھے کہ سنبھل نہیں پا رہا تھا کچھ اس طرح سے قدم پڑ رہے تھے اس کے جیسے ٹھمکے لگا رہا ہو لڑکے لڑکیوں کی ہنسی اسٹارٹ ہوگئی۔ امیر شاہ تک ہنس رہا تھا۔ رانا بختیار عجیب سی نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی حالانکہ وہ خود بھی اتنا ہی گھوما تھا اسے بھی چکر آنا چاہیے تھا اس نے کرنل رحیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"کرنل اب شبہ ہو رہا ہے مجھے۔"

"کیا؟"

"وہ انسان ہی ہے نا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کوئی روبوٹ۔ تمہارے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔"

"نہیں یہ انسان ہی ہے اور خاص طور سے خدا نے اسے بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا ہے۔"

"کمال شخصیت ہے۔" راجا شیر بدر آخر کار زمین پر گر پڑا تھا اور صوفی انتظار کر رہا تھا۔

"فیصلہ ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا۔" کئی آوازوں نے کہا لیکن شاز یہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"نہیں فیصلہ نہیں ہوا۔ ان کے دل میں کوئی حسرت نہیں رہنا چاہیے۔" راجا شیر بدر کوئی تین چار منٹ تک اسی طرح بیٹھا رہا اور اس کے بعد اس نے پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور بولا۔

"یہ بے ایمانی ہے مجھے چکر آ گئے تھے۔"

"ارے ماں قسم..... تمام ہارنے والا یہی بات بولتا ہے پر کوئی بات نہیں ابھی تم کھڑے ہو جاؤ ابھی اس کے بعد تمہیں ڈلڈوزا کیا جائے گا سمجھتے ہو؟ نہیں سمجھتے تو سمجھ لینا، مزہ آ جائے گا۔" صوفی آگے بڑھا تو راجا شیر بدر کے انداز میں خوف نظر آنے لگا۔ اس نے اس بار پھر صوفی پر حملہ کیا تھا اور صوفی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے تھے گویا راجہ شیر بدر کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ وہ اس کے جسم کو پکڑے اور اس کے بعد وہی پرانا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ راجا شیر بدر اپنی انتہائی قوت صرف کر رہا تھا لیکن صوفی کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں پایا تھا۔

"میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں آپ کو زمین پر نہیں بھیجوں گا راجا صاحب۔"

راجا شیر بدر خاموش ہو گیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں یہ ایک کھیل تھا۔ کھیلا گیا سب نے لطف لیا۔"

"اڑے نہیں بڑے بابا ایسا کیسے ہوئیں گا ابھی اس کو پانچ سو گز چھپکلی بن کر چلنا ہوئے۔"

"نہیں وہ ہمارا مہمان ہے۔ ہمارا دوست ہے اور پھر یہ تو ایک کھیل تھا۔ کیوں صوفی صاحب آپ بتائیے۔"

"نہیں نہیں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا واقعی یہ ایک کھیل تھا۔ صوفی نے جواب دیا۔

بہر حال بہت سے چہرے لٹک گئے تھے خود راجا امیر شاہ شرمندہ تھا۔ یہ شرمندگی راجا شیر بدر کے چہرے سے بھی ٹپک رہی تھی۔ غلام قادر کے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں تھا جو کچھ کہہ رہا ہو۔ غلام قادر سخت طیش میں تھا اور بار بار اپنی گزارش پیش کر رہا تھا۔ لیکن صوفی نے غلام قادر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! مانا کرو میری بات وہ ہمارا مہمان ہے۔"

"ارے ماں قسم ابھی تم میرے کو بولو تو ہم اس کو شہر بدر کر دے۔" غلام قادر نے کہا۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں اپنا کام کرو ہم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس کی تکمیل ہونی چاہیے یہ تو صرف ایک تفریح تھی جس کو سب نے انجوائے کیا درویشوں کی دعاؤں سے، صوفی نے کہا اور اس کے بعد یہ مجمع منتشر ہو گیا۔

♥.....♥.....♥

رات یہاں بہت سنسنی خیز ہوا کرتی تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے۔ خوش گپیاں ہونے لگیں۔ صوفی غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ وہ ایک الگ گوشے میں بیٹھا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور وہ لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے لیکن طے یہی کیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ مستعد رہے گا۔ مسلح افراد اپنی جگہ موجود اور ہوشیار تھے۔ صوفی نے خود بھی ایک رائفل لی تھی اور اسے لوڈ کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اس کے بعد وہ بدستور گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر نہ جانے رات کا کون سا وقت تھا کہ ہلکی ہلکی سیٹیاں سنائی دیں ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی خطرہ سر پر موجود ہے۔ سبھی ہوشیار ہو گئے۔ لڑکے لڑکیوں کو تو اب ان معاملات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن باقی تمام لوگ چوکنے ہو گئے۔ سیٹیوں کی وجہ معلوم کی گئی تو پتا چلا کہ اچانک ہی کوئی خیمہ نمودار ہوا ہے۔ اچانک صوفی کی آواز ابھری۔

"براہ کرم اس درندے پر آج ایک بھی گولی نہ چلائی جائے۔"

"کیا مطلب؟" رانا بختیار نے پوچھا۔

"تھوڑا سا تجربہ کرنے دیجیے مجھے۔"

"اور اگر اس نے ہماری جانب رخ کیا تو؟"

"تب بھی گولی نہ چلائی جائے۔ یہ اہم ضرورت ہے۔" کرنل رحیم شاہ صوفی کے لہجے کو پہچان گیا اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے گولی نہیں چلائی جائے گی۔" منہ کھلے اور بند ہو گئے۔ لوگ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ رانا بختیار نے البتہ کرنل رحیم شاہ کے کان میں کہا۔

"ذمے داری میری ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس نے کسی کو نقصان پہنچایا تو سب سے پہلا آدمی میں ہوں گا۔"

"نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" اچانک ہی انہیں خاموش ہونا پڑا۔ خیمے سے وہی طوفانی درندہ برآمد ہوا اور چھلانگیں لگاتا ہوا باہر نکلا۔ پھر اس نے ان کی جانب رخ کر لیا تھا ان کے سانس پھولنے لگے۔ کرنل رحیم شاہ آگے آ گیا تھا۔ راجا امیر شاہ کی آواز ابھری۔

"کرنل کے مر جانے سے کیا فرق پڑے گا اس کے بعد تو ہماری باری آئے گی وہ دیکھو وہ اس طرف ہے۔ آہ..... میرا خیال ہے اس نے ہماری بو پا لی ہے۔ یہ صوفی، صوفی....." لیکن انہوں نے دیکھا کہ صوفی غائب ہو گیا ہے۔ مسلح افراد بھی بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے کیونکہ انہیں گولی چلانے کے لیے منع کر دیا گیا تھا جبکہ درندہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ دو گولیاں چلی تھیں۔ سیاہ درندے نے ایک قلابازی کھائی۔ ان لوگوں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی وہ یہ کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیاہ درندے کی وہ دونوں آنکھیں جو بجلی کے بلب کی طرح روشن تھیں۔ اچانک بجھ گئی تھیں اور ان سے خارج ہونے والی روشنی غائب ہوگئی تھی۔ پھر اچانک ہی درندہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گم ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرا حیرت ناک منظر بھی ان کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ خیمہ بھی ایک دم غائب ہوگیا تھا۔ لوگوں پر سکتہ طاری تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہی کیا ہوگیا پھر صوفی انہیں نظر آیا۔ جوان کے قریب آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے علاوہ صورت حال کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ نے آگے بڑھ کر صوفی کو گلے لگا لیا تھا۔

"خدا کی قسم صوفی صاحب! میں نے یہ سب کچھ صرف آپ ہی کے بل پر شروع کیا تھا اور مجھے دلی مسرت ہے کہ میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ..... یہ..... یہ سب..... یہ تو واقعی حیرت انگیز رہا۔" راجا امیر شاہ کی آواز ابھری۔

"درویش زندہ باد۔" رانا بختیار بولا۔

"اڑے ماں قسم، بابا کتنی زور سے اچھلا ہے۔" غلام قادر نے دلاور کے کان میں سرگوشی کی اور شانزیہ اس سرگوشی کو سن کر ہنس پڑی۔

"اس کا مطلب ہے کہ بات کچھ آگے بڑھ گئی۔"

"درحقیقت یہ لوگ ایک چلے کے بھی نہیں ہیں۔" کرنل رحیم شاہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صوفی نے کوئی کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔ بات بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی نہیں تھی۔ لیکن صوفی نے اس وقت ان لوگوں کو ساری بات بتا دینا ضروری سمجھا چونکہ ان کی مدد کے بغیر کام ہو نہیں سکتا تھا۔

"ہم نے زمین پر دیکھا ہے کہ درندوں کے قدموں کے نشانات نہیں بنتے درویشوں کی دعاؤں سے اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز اسے خوف زدہ کر دیتی ہے۔ اس سے ایک احساس ہمارے ذہن میں پیدا ہوا کہ یہ درندہ جسمانی طور پر کچھ نہیں ہے۔ کوئی ایسی چیز جو قابل بے شک ہے لیکن کوئی ٹھوس وجود نہیں رکھتی۔ البتہ یہ بات ذرا حیرت ناک تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے کہ ٹھوس وجود نہ ہونے کے باوجود وہ انسانی زندگی کو کیسے ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ درویشوں نے میری رہنمائی کی۔ میں نے بابا تیر انداز پانی پتی کا تصور کیا اور انہوں نے میری رہنمائی کی۔ میرے دماغ میں اس کی آنکھوں کا خیال آیا۔ وہ آنکھیں غیر معمولی تھیں اور آپ لوگ اس بات کو سن کر حیران ہو جائیں گے کہ وہ ایک انوکھی چیز تھی۔ بس اس کے پورے وجود میں ایک کیمرا نما مشین ہے۔ جو سارا کام کرتی ہے اور وہ مشین آنکھوں کی جگہ لگائی گئی ہے۔ اس کا بقیہ جسم صرف اس مشین سے خارج ہونے والی شعاعوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کیمرا یہ میرے پاس موجود ہے۔ چونکہ اس کے خاتمے کے بعد کیمرے کو تو زمین پر پڑے رہ جانا ہی تھا۔" یہ کہہ کر صوفی نے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بکس جس کے نچلے سرے پر لاتعداد تار لگے ہوئے تھے اور سامنے کے حصے پر ٹوٹے ہوئے بلب لگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے کر دیا۔ وہ سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے حوصلے بے حد بڑھ گئے اور پھر رانا بختیار نے کہا۔

"اب اس کے بعد تو ہم اس مسئلے کے خاتمے کے بعد ہی یہاں سے جائیں گے۔" تیسری رات کا

چاند نکلا تھا۔ سب لوگ اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر کوئی واقعہ ہو تو ہوشیار رہیں۔ پھر کافی فاصلے پر انہوں نے اس بھیڑیں چرانے والے کو دیکھا جو بیٹھا ہوا مدھم آواز میں بانسری بجا رہا تھا۔ صوفی نے کہا۔

"براہ کرم..... مجھے جانے دیجیے۔ غالباً زمانہ قدیم میں، میں ہیر تھا اور بانسری کی تانیں سن کر رانجھا کے پاس چلا جاتا تھا درویشوں کی دعاؤں سے آج پھر میرے دل میں یہی لہر جاگی ہے۔ آپ لوگ میرا پیچھا نہ کیجیے۔" کسی نے کچھ کہنا چاہا لیکن کرنل رحیم شاہ نے روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب تو آپ کو کم از کم صوفی صاحب پر بھروسا کرنا چاہیے۔" صوفی وہاں سے آگے چلا گیا۔ اس نے اسی جگہ اس بھیڑیں چرانے والے کو دیکھا۔ جو مست ہو کر بانسری بجا رہا تھا۔ صوفی اس کے سامنے بیٹھ کر جھومنے لگا۔ چرواہے نے اچانک ہی صوفی کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"تم پھر آ گئے۔"

"درویش مجھ پر رحم کریں۔ تمہاری بانسری کی تانیں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"مگر تمہارے ساتھ تو اور لوگ بھی ہیں۔"

"ہاں۔"

"انہیں بانسری سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"پتا نہیں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں یہ بانسری تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بانسری کا رخ صوفی کی جانب کر دیا۔ کوئی دوسرا شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اچانک کیا ہونے والا ہے۔ لیکن صوفی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اندر سے لے کر باہر تک وہ کیا چیز ہے۔

بھیڑیں چرانے والے نے سادگی سے بانسری کا رخ اس کی طرف کیا تھا دوسرے لمحے بانسری کے سوراخ سے سفید رنگ کا ایک غبار نکلا۔ جس نے صوفی کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن صوفی نے جس دم کر لیا تھا۔ وہ سانس بند کرنے کا ماہر تھا اور دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ سفید رنگ کے غبار نے اس کے چہرے کو لپیٹ میں لے لیا تھا اور صوفی اس وقت دم بہ خود ہو گیا تھا۔ جیسے اس کی روح پرواز کر گئی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جھومنے لگا اور اس کے بعد بے سدھ ہو کر زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔

بھیڑیں چرانے والا جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے صوفی کو اٹھا کر اپنے شانوں پر ڈال لیا۔ وہ انتہائی طاقت ور آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس کے بعد اس نے صوفی کو کندھے پر ڈال کر جس تیزی سے دوڑ لگائی تھا۔ اس پر کوئی بھی دیکھنے والا حیران ہو سکتا تھا۔ صوفی کے دونوں ہاتھ جھول رہے تھے اور اس نے پورا بدن بے سدھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا غبار کے اثرات اس پر تھوڑے بہت اثر انداز ضرور ہوئے تھے اور اسے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔

بھیڑیں چرانے والا اسے لے کر دوڑتا رہا اور صوفی اطمینان سے آنکھیں کھول کر اس راستے کا جائزہ لیتا رہا۔ جدھر سے وہ گزر رہا تھا پھر مشرقی پہاڑیوں کے قریب پہنچ کر وہ ایک جگہ رکا اس نے ایک پہاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چٹان کے رخنے میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولا۔ دوسرے لمحے پہاڑی چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ وہ اسے سنبھالے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور اندر کچھ اور افراد اس کے پاس پہنچ گئے۔ بھیڑیں چرانے والے نے صوفی کو نیچے ڈالتے ہوئے کہا۔

"اسے باس تک پہنچا دو اور بتا دو کہ میں اسے لے کر آیا ہوں۔ میں اپنی جگہ جا رہا ہوں۔"

"اوکے سر! آپ جایئے۔" انہوں نے جواب دیا اور ایک بار پھر صوفی کو اٹھا لیا گیا۔ وہ لوگ اس کشادہ سی سرنگ میں آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے جا کر یہ سرنگ ایک بڑے سے غار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یہاں کا ماحول بالکل ٹھنڈا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں۔ لیکن پہاڑیوں میں یہ سب کچھ بڑا حیران کن تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں ان کا کوئی باقاعدہ نظام قائم ہے۔ صوفی کو ایک ایسے میں غار میں لے جا کر لٹا دیا گیا۔ جو کشادہ تھا لیکن اس کی زمین ناہموار تھی۔ اس میں مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار پر کسی ایسی چیز کا پینٹ کیا گیا تھا جس سے روشنی خارج ہو رہی تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ انہیں احساس نہ ہو کہ وہ ہوش میں ہے۔ وہ لوگ اسے لٹا کر باہر نکل گئے۔ تو صوفی نے آنکھیں کھول کر ماحول کو دیکھا۔

غار کافی بڑا تھا لیکن اسے عجیب و غریب شکل دی گئی تھی۔ جگہ جگہ جھاڑیاں لگائی گئی تھیں۔ جو مصنوعی تھیں ان جھاڑیوں میں گہرے موٹے جالے لگے ہوئے تھے۔ ان جالوں میں مکڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں کہیں کہیں چمگادڑیں بھی چپکی ہوئی تھیں اور ماحول بہت بھیانک تھا لیکن سب بالکل مصنوعی تھا۔ صوفی سر کھجانے لگا۔ کیا مقصد ہے ان لوگوں کا کیا چاہتے ہیں۔ یہ جاننا اسی طرح ممکن تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔

چنانچہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ لیٹا رہا اس کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگر ان لوگوں کا یہ خیال ہو کہ بے ہوشی کتنی طویل ہو سکتی ہے۔ تو اب انہیں یقین آ گیا ہو گا کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔ صوفی منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکالنے لگا اور اس کا نتیجہ اس کی توقع کے مطابق ہی نکلا ایک تیز روشنی کا دھبا سفید تھا اور آہستہ آہستہ وہ دھبا بڑھتا چلا گیا۔ پھر روشنی میں ہی لپٹا ہوا ایک وجود ایک دیوار سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ صوفی دہشت سے کانپنے لگا تھا۔

لیکن یہ انداز سوفی صدی مصنوعی تھا۔ البتہ اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازوں کے ساتھ پڑھنے کی آوازیں نکل رہی تھیں سفید لباس میں ملبوس ایک بہت زیادہ بوڑھا شخص اس کے سامنے آ گیا۔ بڑی سی لمبی داڑھی سینے پر لٹکی ہوئی تھی۔ جو برف کی طرح سفید تھی۔ سر کے بال بھی لمبے لمبے اور بالکل سفید تھے۔ یہاں تک کہ بھنویں بھی سفید تھیں اس کے چہرے کی جھریاں اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھیں اور اس کی گول گول آنکھیں صوفی پر مرکوز تھیں۔

صوفی بدستور خوف زدہ ہونے کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بوڑھا اس سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا تو اس نے صوفی کی طرف نظر اٹھا کر کہا۔

"کون ہو تم؟"

جواب میں صوفی کے منہ سے وظیفے کی آواز نکلنے لگی۔ وہ وظیفہ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکیں مارنے لگا۔

"نہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آتش زادہ ہوں آگ کا بیٹا! اور تو انسان لیکن اطمینان رکھنا میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"مم..... معاف کریں درویشوں کی دعاؤں سے۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"کہہ دیا تجھ سے کہ ہم نے تجھے نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلایا۔ بلکہ ان حقیقتوں سے روشناس کرنے کے لیے بلایا ہے۔ جن سے شاید تمہارے ساتھی واقف نہیں ہیں۔ پہلے یہ علاقہ صرف ہماری ملکیت تھا۔ یہاں ہماری پوری آبادی بکھری ہوئی تھی۔ لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ ہم کچھ عرصے کے لیے ترک سکونت کر کے یہاں سے چلے گئے۔ لیکن زمین جس کی ہوتی ہے اس کی ملکیت ہوتی ہے یہاں بستیاں بن گئیں لوگ بھی رہنے لگے۔ لیکن یہ بری بات ہے جب ہم اپنے قبیلے کے ساتھ واپس آ گئے ہیں تو تم سب لوگوں کو یہ علاقہ خالی کر دینا چاہیے۔ ہم نرم دل اور نیک طبیعت ہیں۔ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن اگر تم لوگوں نے اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو ہم بھی مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں تباہ و برباد کر دیں۔ وہ درندے ہمارے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی آگ سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی ہم نے انہیں قابو میں رکھا ہے اور انہوں نے زیادہ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تم لوگ جو کوئی بھی ہو۔ جہاں سے بھی آئے ہو ہم تمہیں بتاتے ہیں فوراً ہی یہ جگہ چھوڑ دو اور ادھر کا رخ مت کرو۔"

"مم..... میں، مم..... میں، مم..... میں آپ سے ان سب کی طرف سے معافی چاہتا ہوں ہمیں اس بات کا تو پتا ہی نہیں تھا۔"

"تمہارے ساتھ جو لوگ آئے ہیں وہ کون ہیں۔"

"ان میں سے ایک ان علاقوں کا مالک رانا بختیار ہے۔ باقی سب اس کے مہمان ہیں اور ان کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"مجھے کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن رانا بختیار سے کہہ دینا کہ یہ علاقے اس کے نہیں ہیں بلکہ شہنشاہ جنات کی ملکیت ہیں۔ وہ ان علاقوں کو چھوڑ دے۔ جہاں رہ رہا ہے وہاں رہتا رہے لیکن اپنی آبادیوں کو خالی کرا دے اگر ایسا نہ ہوا تو پھر اس کے لیے اور یہاں کے رہنے والوں کے لیے خوف ناک تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر ان درندوں پر کوئی گولی چلائی گئی تو یہ گولیاں واپس پلٹ کر ان لوگوں کو جا لگیں گی۔ جنہوں نے یہ گولیاں چلائی ہوں گی میں انسانی زندگیوں کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی ہونا چاہیے۔"

"کیا یہ سارا علاقہ آپ کا ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"ہاں۔"

"تو آپ لوگوں کے گھر بھی ہوں گے یہاں پر۔"

"مطلب؟"

"میں یہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں جناتوں کے ایسے کچھ راز ہوتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"معافی چاہتا ہوں میں نے کبھی جنوں کا گھر نہیں دیکھا درویشوں کے کرم سے۔"

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے ذریعے ان لوگوں کو یہ پیغام دے دوں۔ ہم یہاں اپنے قبیلے کو دوبارہ آباد کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو پھر ان لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیا سمجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا میں یہاں سے جا سکتا ہوں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" پھر اچانک ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ویسا ہی غبار پھر نمودار ہوا اور صوفی کے چہرے کے گرد پھیل گیا لیکن صوفی اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس بار بھی اس نے حبس دم کر لیا لیکن بے ہوش ہونے کی بہترین اداکاری کی۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح پڑا رہا اس کے کان صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک ہی اسے کچھ سوجھی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر ایک چٹان کے پیچھے پہنچ گیا اس نے اپنی سانس تک بند کر لی تھی۔ آنے والے چار افراد تھے وہ اندر داخل ہوئے اور دفعتاً ان کے منہ سے نکلا۔

"ارے کہاں گیا؟" لیکن اس کے بعد انہوں نے باہر دوڑ لگا دی تھی اور اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ صوفی انتہائی احتیاط کے ساتھ وہاں کا جائزہ لینے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اس کی تلاش میں چاروں طرف بھاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ بھی صوفی تھا اس نے پوشیدہ رہنے کے لیے ایسی ایسی جگہوں کا انتخاب کیا تھا کہ ان فرشتے بھی اسے تلاش نہ کر سکیں اور آخر کار حقیقتوں کا انکشاف ہو ہی گیا۔

وہ ایک خفیہ تہ خانہ تھا۔ تہ خانہ کیا بلکہ غار تھا جہاں مشینیں لگی ہوئی تھیں اور اس جگہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ ساؤنڈ پروف کیا گیا تھا۔ یہاں اسے جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ صوفی دنگ رہ گیا تھا۔ یہ نوٹ چھاپنے کی مشینیں تھیں اور دنیا بھر کی کرنسی کے یہاں انبار لگے ہوئے تھے۔ ڈالر، یورو اور بھی بہت سے نوٹ جو اربوں کی تعداد میں تھے۔ صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر اس کے بعد ایک ہنگامہ خیز مہم کا آغاز ہو گیا۔ یعنی یہاں سے نکلنے کی مہم کا آغاز۔ صوفی جانتا تھا کہ اب اگر وہ اپنی جگہ پہنچا تو اسے واپس نہیں جانے دیا جائے گا اور اتنی دیر کی گم شدگی کا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ لیکن باہر کا ماحول بے حد خوف ناک تھا۔ وہ کالے چیتے اب ایک نہیں کئی کی تعداد میں تھے اور چاروں طرف بھاگتے پھر رہے تھے۔

"در..... درویش رحم کریں۔" صوفی کے منہ سے نکلا۔ چیتوں کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنیاں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ صوفی جانتا تھا کہ اسے ان روشنیوں کی زد سے بچنا ہے اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی جب صوفی ان خیموں کے نزدیک پہنچا تھا جہاں سب لوگ جاگ کر اس کا انتظار کر رہے تھے ساری صورت حال صوفی نے ان لوگوں کو بتا دی اور کرنل رحیم شاہ نے فوراً ہدایت کی کہ یہاں سے جس قدر جلدی واپسی ہو سکے بہتر ہے۔ چنانچہ اسی وقت انہوں نے خیمے وغیرہ یہیں چھوڑ دیے تاکہ وہ سب اس احساس کا شکار رہیں کہ یہ سب یہیں ہیں۔ یہ کوئی نقصان کی بات نہیں تھی۔ بس انہیں یہاں سے نکل جانا تھا۔ پھر اس کے بعد کی کارروائی کرنل رحیم شاہ کے سپرد تھی۔

"فوجی ہیلی کاپٹروں نے اس علاقے کو پوری طرح گھیر لیا تھا جہاں سے جعلی کرنسی بنانے والوں کا

اتنا عظیم الشان نیٹ ورک دریافت ہوا تھا کہ حکومت ہل کر رہ گئی تھی۔ چونکہ اپنے علاقے میں یہ کارروائی ہو رہی تھی اور نہ جانے دنیا کے کون کون سے ملکوں میں یہ جعلی کرنسی پھیل رہی تھی۔ اس لیے اس بات کو پوری طرح صیغہ راز میں رکھا گیا اور خاموشی سے مجرموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن سرکاری طور پر اس مہم جوئی کو بڑی اہمیت دی گئی تھی اور ایک بار پھر وزارت داخلہ نے کرنل رحیم شاہ کو قومی ہیرو قرار دیا تھا اور کرنل رحیم شاہ نے نہایت دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

"کاش! میں ان لوگوں کو بتا سکتا کہ اس تمام اعلیٰ کارکردگی کے پس پردہ کون ہے۔"

"درویش آپ پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی یہ اتنی اہم بات نہیں ہے کہ آپ اس کے لیے پریشان ہو جائیں۔" صوفی نے جواب دیا تھا۔

صوفی کے لیے جب فرصت کے اوقات ہوں تو سب سے بہترین ٹھکانا اس کا اپنا گھر ہی ہوتا تھا۔ ممن خان کا ہوٹل، باہر کی گلی، سب دلچسپیاں ہی دلچسپیاں اعلیٰ درجے کی کوٹھیوں میں رہنے والے زندگی کو اپنے خول میں قید کر دینے والے بھلا ایسے علاقوں کے حسن کا کہاں تجزیہ کر سکتے ہیں۔ جہاں گھروں کے دروازے بند نہ ہوتے ہوں ہر شخص بلا روک ٹوک کسی بھی دروازے سے اندر داخل ہو جائے اور صاحب خانہ یہ تک نہ سوچے کہ وہ کیوں آیا تھا۔ آیا ہو گا اپنے کسی کام سے کام کر کے چلا گیا۔ ایسی جگہوں کی زندگیاں بھی مختلف ہوتی ہیں اور شاید یہی انسانی زندگی ہے بھی۔ تکلفات کے لحاف میں لپٹے ہوئے لوگ بھلا اس زندگی کو کیا جانے۔

چنانچہ صوفی آج کل یہی زندگی گزار رہا تھا۔ گلی میں دو بار محفل قوالی ہو چکی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ گرین فورس کی ٹیم نے یہ قوالی اٹینڈ کی ہی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ بھی اس میں بہ نفس نفیس موجود تھا۔ صوفی کی سرمستیاں شباب پر کیوں نہ ہوتیں۔

بہر حال وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ مستیاں ہی مستیاں زندگی میں تھیں اس وقت بھی وہ صحن میں بیٹھا ہوا ایک بڑی بالٹی قریب رکھے نہا رہا تھا کہ اس کی کوئی مہمان لڑکی اسے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ بدرالدین اسے دروازے کے باہر ہی مل گیا تھا۔ صوفی کا محلے دار تھا۔

"دیکھیے۔ میں یہ ایک پتا معلوم کر کے آئی ہوں وہ صاحب پہلے محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ بعد میں انہوں نے محکمہ پولیس چھوڑ دیا۔ صوفی صاحب کہلاتے ہیں۔"

"تو بی بی اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ وہ صوفی صاحب کہلاتے ہیں۔ تو بس اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا وہ سامنے جو ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا ہے۔ اسے اٹھا کر اندر چلی جائیے۔"

"وہ....." لڑکی حیرت سے بولی۔

"جی ہاں کیوں؟ تعجب کی بات ہے کیا۔"

"نن..... نہیں میرا مطلب ہے کہ..... کہ، دروازے پر کوئی بیل وغیرہ نہیں ہے۔"

"ہم لوگوں کے ہاں دروازوں پر بیل بندھے ہوتے ہیں بیل نہیں ہوتیں آپ آرام سے پردہ ہٹائیے اور اندر چلی جائیے۔ صوفی آپ کو مل جائیں گے۔" لڑکی اندر چلی گئی تھی۔ لیکن پھر دوسرے لمحے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک عجیب و غریب مخلوق گھر کے صحن میں، پیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ برابر بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ بالٹی میں ایک مگا تیر رہا تھا۔ یہ مخلوق صابن میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نچلے بدن پر ایک کپڑا بندھا ہوا تھا اور بس باقی پسلیوں کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جن پر شاید زندگی میں کبھی مناسب گوشت نہیں آیا تھا۔ اسی طرح سے دبلے پتلے ہاتھ پاؤں سارے کے سارے ٹیڑھے میڑھے بس لگتا تھا کہ فرشتوں نے جلدی میں کچھ بنا دیا ہے اور وہ کچھ بہت کچھ بن گیا ہے لیکن بھلا کون ان فولادی بازوؤں کی فولادیت کو جانے جب تک کہ اسے خود ان سے واسطہ نہ پڑے، آنے والی کو الجھن ہوگئی۔ رکے یا باہر نکل جائے۔ اور واقعی وہ باہر آ گئی۔ لیکن باہر بدرالدین بھی جا چکا تھا۔ کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر ایک بار پھر اس نے ٹاٹ کا پردہ ہٹایا اور تیز آواز میں بولی۔

"میں اندر آ سکتی ہوں۔" اور اچانک ہی بھونچال آ گیا۔ پیڑھی پر بیٹھے ہوئے عجیب و غریب شخص نے اندر چھلانگ لگا دی لڑکی نے اس خوف سے آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں اس افراتفری میں وہ بے چارہ اس کپڑے سے بھی محروم نہ ہو جائے۔ جو اس کے بدن سے لپٹا ہوا ہے صابن بہ دستور سر میں لگا ہوا تھا۔ وہ اندر گھس گیا لڑکی کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ پھر اندر سے آواز آئی۔

"کون ہیں آپ کون ہیں؟"

"جی میں صوفی صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ذرا دو منٹ کے لیے باہر تشریف لے جایئے۔ سر پر لگا ہوا صابن دھولوں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔"

"معافی چاہتی ہوں۔"

"آپ کو خدا کا واسطہ بس دو منٹ کے لیے۔"

"نن..... نہیں میرا مطلب ہے میں اس طرح اندر آنے کی معافی چاہتی ہوں۔ جا رہی ہوں باہر۔" پھر دو منٹ سے زیادہ لگ گئے تھے اور لڑکی باہر ہی کھڑی رہی تھی اس کے بعد اندر ہی سے آواز آئی۔

"اگر آپ باہر موجود ہیں تو اندر آ جایئے۔" بالٹی وغیرہ ہٹا کر رکھ دی گئی تھی۔ دالان میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور صاف لگ رہا تھا کہ افراتفری میں ان میں سے ایک چارپائی پر چادر اور دری بچھائی گئی ہے۔ وہ عجیب و غریب مخلوق اب کپڑوں میں تھی۔ لیکن اس میں فرق نہیں آیا تھا۔

"مم..... میں صوفی صاحب سے....."

"جی جی..... آپ تشریف رکھیے تازہ تازہ دری بچھائی ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"جی۔"

"آ جایئے۔" صوفی نے پھر کہا اور لڑکی دالان میں داخل ہوگئی۔ اس نے حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر بولی۔

"دیکھیے یہاں..... ریٹائرڈ انسپکٹر میرا مطلب ہے کہ انسپکٹر صوفی صاحب....."

"خادم ہی کو صوفی کہتے ہیں درویشوں کے کرم سے اور ایک تصحیح فرما لیجیے ہم ریٹائر نہیں ہوئے بلکہ ہم نے محکمہ پولیس کو ریٹائر کر دیا۔ یعنی خود ملازمت چھوڑ دی۔"

"جج..... جی، ہاں مجھے پتا ہے۔"

"آپ فرمایئے ہم سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔"

"صوفی صاحب! مجھے آپ کا کافی وقت درکار ہے آپ براہ کرم میری پوری کہانی سن لیجیے گا۔ اگر آپ کو وہ اس قابل محسوس ہو تو میری مدد کیجیے گا ورنہ....."

"جی جی، جی جی، ارشاد، ارشاد۔" صوفی نے کہا اتنی دیر میں ممن خاں کا باہر کے کام والا لڑکا چائے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر آ گیا اس میں ایک ٹرے میں بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

"لیجیے۔"

"مم..... مگر یہ چائے۔"

"جی ہاں..... آپ تشریف لائیں تو چائے آپ کے پیچھے پیچھے آ گئی۔"

"مگر آپ نے چائے کے لیے کہا تو نہیں تھا۔"

"جس علاقے میں آپ آئی ہیں نامحترمہ! وہاں درویشوں کی دعاؤں سے مہمانوں کے لیے کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ آپ یہاں ستر گھرانوں کی مہمان ہیں۔ ہر شخص آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"واقعی..... میں بہت متاثر ہوئی ہوں اس بات سے میرا نام رابعہ سلطان ہے۔"

"جی رابعہ سلطان صاحبہ! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔"

"اب اگر آپ اجازت دیں تو یہ چائے پی لی جائے۔" رابعہ بے تکلفی سے بولی۔

"ہاں ہاں۔ جی جی جی، حق اللہ، حق اللہ۔"

"صوفی صاحب! اگر میں آپ کا انٹرویو لوں تو کیسا رہے گا۔"

"ہم کیا عرض کر سکتے ہیں۔ مگر آپ اس انٹرویو کا کریں گی کیا؟"

"میں صحافی ہوں۔"

"اچھا..... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میرا پہلا سوال۔" رابعہ سلطان بولی۔

"جی۔"

"یہ درویشوں کی دعائیں آگے پیچھے کہاں سے شامل ہو جاتی ہیں۔"

"ایک مضبوط نقطۂ نظر ہے کائنات کے ستون ایسے ہی ہواؤں پر قائم نہیں ہیں۔ کچھ نادیدہ کندھے انہیں سہارا دیے ہوئے ہیں اور وہ کندھے اللہ تعالیٰ کے پیارے درویش، ولیوں، قطبوں اور ابدالوں کے ہیں۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ آپ نہ پوچھیے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی دعائیں زندگی کی ضامن ہوتی ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ خدانخواستہ میں اختلاف نہیں کر رہی آپ کی بات سے بس چونکہ آپ بار بار یہ تکیہ کلام استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی۔"

"درویش پناہ میں رکھیں۔" صوفی نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ سوچ تو رہے ہوں گے کہ کتنی بے تکلف لڑکی ہے۔"

"جج۔ جی ہاں، جی ہاں۔"

"یعنی آپ واقعی سوچ رہے ہیں۔" رابعہ مسکرا کر بولی۔

"جی نہیں۔ جی نہیں۔"

"جی ہاں..... جی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ میں یہ غور کر رہا ہوں کہ آپ نے اس غریب خانے پر آنے کی زحمت کیسے کی۔"

"آپ کو سچ بتاؤں بہت سی جگہوں سے آپ کے بارے میں مجھے معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور میں اس بات کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ چونکہ تھوڑا سا صحافت سے تعلق ہے اور صحافت سے تعلق ہونے کی بناء پر محکمہ پولیس سے بھی تھوڑے سے رابطے رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ آپ کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات ایسے ہی موصول ہوئی تھیں۔"

"درویش ہم سب پر رحم کریں لیجیے چائے لیجیے۔" چائے پی گئی۔ رابعہ نے کہا۔

"صوفی صاحب! کافی عرصہ محکمہ پولیس میں رہے ہیں آپ، آپ نے اپنا گھر نہیں بنایا۔"

"آپ کو کیسے معلوم محترمہ کہ ہم نے اپنا گھر نہیں بنایا۔"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ پھر آپ یہاں عارضی طور پر رہ رہے ہیں۔"

"صوفی صدی عارضی طور پر جب تک اس پنجر میں سانس قید ہے۔ ہمیں اس عارضی پناہ گاہ میں رہنا ہی پڑے گا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ آسمانوں کی وسعتوں میں اپنا گھر بنائیں اور وہی گھر ہمیں پسند بھی ہے۔"

"آپ واقعی صوفی ہیں۔" رابعہ بولی۔

"آپ اب فرما دیجیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔"

"صوفی صاحب! ایک بہت اہم مسئلے میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ دیکھیے یہ بات میرے دل میں ہے کہ آپ انسان دوست ہیں اور مظلوموں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ میں ایک خاص مسئلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی! آپ دیر نہ فرمائیے۔"

"آپ وقت تو دیں گے نا مجھے۔"

"دے چکا ہوں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان سوچ میں ڈوب گئی۔ بہت دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

"میں نہیں جانتی کہ پولیس والوں کے لیے کون سا موسم، موسم بہار ہوتا ہے۔ مجھے آج تک اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ قدم قدم پر امنگوں بھرے شباب کی حسین آہٹوں کے منتظر یہ نوجوان جب وردی میں آجاتے ہیں تو نہ جانے زندگی کی حقیقی لطافتوں سے اتنی دور کیوں چلے جاتے ہیں۔ میں آپ کو ایک نام بتانا چاہتی ہوں اس کا نام راجا ناصر ہے۔"

"راجا ناصر! پتا نہیں کچھ سنا ہوا نام لگتا ہے۔"

"جی..... میں پچھلے کئی سالوں سے اس سے واقف ہوں بڑا ادبی آدمی ہے اور بڑی بامحاورہ گفتگو کرتا ہے لیکن بہرحال جب پولیس والا ہوتا ہے۔ تو ہر قسم کے ذوق لطیف سے عاری ہو جاتا ہے میں اس دن حسب معمول خبروں کے شکار پر نکلی تھی۔ آپ جانتے ہیں صوفی صاحب کہ انسانوں سے بھرے ہوئے اس شہر میں خبروں کی کمی نہیں ہوتی۔ اس دن آسمان پر بادلوں بھری کجلاہٹوں کے نیچے میری کار مختلف مقامات کے چکر لگا رہی تھی۔ لیکن پھر ان کی جلاہٹوں میں سرمستیاں ابھر آئیں اور ان کی جوانی چھلک پڑی موٹی موٹی بوندوں نے روزمرہ کے معاملات میں مصروف انسانوں کو چھکا دیا۔

"آپ صحافی ہیں، ادیبہ ہیں یا شاعرہ۔"

"نہیں پلیز پلیز، میرے الفاظ پر آپ گرفت نہ کریں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ میرا تعلق جس خاندان سے ہے وہ خالص ادبی ذوق کا حامل ہے اور بچپن ہی سے مجھے یہ موٹے موٹے الفاظ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"درویش رحم کریں۔ بری عادت ہے۔"

"خیر تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور معاشی مسائل میں الجھے ہوئے انسانوں کے لیے موسم کی یہ شاعری بے معنی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھر آتی ہیں جو فکر فردا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اتفاق سے میں اس پولیس اسٹیشن کے قریب سے گزر رہی تھی جس میں راجا ناصر ان دنوں انچارج کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بس یونہی جی چاہا کہ اس سے تھوڑی سی گپ شپ کی جائے ممکن ہے کوئی نئی خبر ہی مل جائے۔ چنانچہ میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ناصر اپنے دفتر میں موجود تھا حسب معمول اس کے سامنے فائل کھلے ہوئے تھے اور وہ موسم سے بے نیاز ان میں گم تھا موسم کی رم جھم یہاں کے ماحول پر بھی اثر انداز تھی۔ پولیس کانسٹیبل ہیڈ محرر کے کمرے میں گھسے ہوئے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ چائے والا زمین پر چائے لیے پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ انچارج کے کمرے سے تھوڑے ہی فاصلے پر رکھی ہوئی ایک بینچ پر ایک نوجوان لڑکی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سادہ سادہ اور معصوم خدوخال کی مالک تھی اور اس کے جسم پر سستا سا لباس تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ نہ جانے بے چاری کس الجھن کا شکار ہو کر اس غیر مناسب جگہ پہنچ گئی تھی۔ میں اس پر ایک گہری سی نظر ڈالتی ہوئی ناصر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ آپ سن رہے ہیں نا صوفی صاحب۔" رابعہ سلطان نے صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا اور صوفی جیسے چونک پڑا۔

"آپ بہت اچھی شاعرہ ہو سکتی ہیں۔ ابھی تک میں صرف آپ کی شاعری سن رہا ہوں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا اور رابعہ ہنس پڑی پھر بولی۔

"بہرحال معافی چاہتی ہوں کوشش کروں گی کہ اب ٹو دی پوائنٹ بات کروں۔ تو میں راجا ناصر کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ اس کی افسرانہ شان برقرار رہی۔ کسی بھی داخل ہونے والے کو سر اٹھا کر دیکھنے کے لیے اس طرح کے آفیسر مجبور نہیں ہوتے۔ اس نے میرے قدموں کی آہٹ کی بھی پرواہ نہیں کی لیکن ایسے بے تکلف افراد چند ہی ہوں گے۔ جو اس کے سامنے ایسے فائل اٹھا کر پٹخ دیں۔ میری اس حرکت پر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ گئی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہو..... کہاں سے آ مریں تم صبح ہی صبح۔"

"یہ صبح ہے۔" میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ راجہ ناصر نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"تم ان فائلوں میں ہی مرے رہو گے یا کبھی تمہارے دل میں انسانیت بھی جاگے گی۔"

"اگر انسانیت جاگ اٹھے گی تو کیا ہوگا۔" اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس بے چاری معصوم اور سادہ سی لڑکی پر اس نے کوئی توجہ بھی نہیں دی تھی۔"

"باہر بارش ہو رہی ہے۔"

"اچھا..... کیا باہر بارش میں لڑکیاں برس رہی ہیں۔" راجا ناصر نے مجھ پر طنز کیا۔

"لڑکیاں بھی برس رہی ہوتیں تو تم یقیناً اسی طرح اپنے دفتر میں گھسے رہتے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بھئی ہم ٹھہرے عوام کے خادم اور حکومت کے وفادار ہمیں اپنے جذبات لاکر میں رکھ کر نوکری کرنی پڑتی ہے۔ موسم سے لطف اندوز تو وہ ہوتے ہیں جو روزانہ صرف ٹیلی فونوں پر لاکھوں روپے ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ خیر چھوڑو کیا لوگی۔"

"کافی لیکن عمدہ، پولیس والی کافی نہیں۔" میں نے جواب دیا اور راجا ناصر ٹیلیفون پر کسی ماتحت کو کافی کے لیے ہدایت دینے لگا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

"کیا مصروفیت چل رہی ہے آج کل۔"

"بس اتر گیا موسم کا بھوت۔ آ گئیں کاروبار پر لیکن افسوس آج کل میرے پاس تمہارے لیے کوئی خبر نہیں ہے۔ کافی پیو اور ٹھنڈی ٹھنڈی رخصت ہو جاؤ۔"

"میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں ناصر تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اچھے خاصے صاحب ذوق ہوتے ہوئے بھی....." ابھی میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دروازے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں اور یوں لگا جیسے کوئی کسی کو زبردستی روک رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی دوڑتی ہوئی اندر گھس گئی۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے میری کرسی کا سہارا لیا تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کو میں اپنی جگہ سے بھی دیکھ رہی تھی۔ باہر بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے ملنا چاہ رہی ہو اور اسے اس کا موقع نہ ملا ہو۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت ایسی ہی کوئی صورت حال ہے۔ اس لڑکی کو میں نے اندر آتے ہوئے دیکھا لیکن پھر ایک دم اس کی آواز سننے لگی۔ وہ بولی۔

"سر!..... سر خدا کے واسطے ایک بار میری بات سن لیجیے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے اگر آپ نے..... آپ نے سر!" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اس کے پیچھے ہیڈ کانسٹیبل اندر گھس آیا تھا۔

"سر! یہ بدتمیز لڑکی زبردستی اندر گھس آئی ہے بارش کی وجہ سے باہر بینچ پر بٹھا دیا تھا ہم نے اسے کہ ایک دم اٹھ کر آپ کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ معافی چاہتا ہوں سر!" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا اور لڑکی کی جانب بڑھا لیکن لڑکی دوڑ کر راجا ناصر کی کرسی کے پیچھے پہنچ گئی۔

"سر! خدا کیلیے میری بات پر توجہ دیں۔ میں چاہتی ہوں آپ مجھے گرفتار کر لیں۔ مجھے بند کریں۔ اس طرح میری زندگی بچ جائے گی۔ ورنہ سر، ورنہ....."

"کیا مصیبت ہے کیا پولیس والوں کو لاک اپ کے علاوہ ایک پاگل خانہ بھی بنانا پڑے گا۔" راجا ناصر نے بے رحمی سے کہا پھر کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر غرایا۔

"تم دیکھ رہے ہو ہم کافی پی رہے ہیں۔ میں باتیں کر رہا ہوں یہ لڑکی اب اب تک یہاں موجود ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم اسے باہر بھگا دو۔" راجا ناصر نے ہیڈ کانسٹیبل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ کو خدا کا واسطہ سر، میں پاگل نہیں، خدا کی قسم میں پاگل نہیں ہوں آپ میری بات پر غور کریں۔ آپ سن تو لیں۔ خدا کے واسطے آپ سنجیدگی سے میری بات سن لیں۔ آپ..... آپ....." ہیڈ کانسٹیبل لڑکی کی طرف دوڑا تو لڑکی نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ ناصر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم جاتی ہو یا میں تمہارے ساتھ پولیس والوں کی طرح پیش آؤں۔" پھر وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بارش شروع ہونے سے قبل تمہیں اسے یہاں سے نکال دینا چاہیے تھا۔ جاؤ اسے لے جاؤ اس کے بعد یہ تمہارے کمرے میں نہ آنے پائے۔"

"آپ کو خدا کا واسطہ سر، آپ کو خدا کا واسطہ، آپ یقین کریں وہ بے حد خوں خوار آدمی ہے۔ سر، دنیا میں اتنی عجیب و غریب اور دہشت ناک شخصیت کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ سر، اس نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ میں نے..... میں نے آنکھ کھول کر اسے کمرے میں دیکھا سر وہ..... سر وہ ایک وحشی کتے کی طرح سے ہے۔ اتنا بڑا چہرہ ہے سر اس کا..... سر وہ، سر وہ..... سر پلیز، میرے ساتھ زیادتی ہوئی۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی سر، میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ سر پلیز، سر میری مدد کیجیے۔ مجھے وہ لوگ وہیں روک لینا چاہتے تھے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں سر، لیکن کسی طرح کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی اور میں وہاں سے بھاگ نکلی ورنہ نہ جانے، نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا، سر نہ جانے میں یہاں تک کس طرح پہنچی ہوں۔ خدا کے لیے سر، میری بات پر توجہ دیں میرے تعاقب میں بہت سے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر مجھے یہاں سے نکال دیا تو..... تو....."

"ہیڈ کانسٹیبل!" راجا ناصر حلق پھاڑ کر چیخا اور لڑکی سہم گئی۔ پھر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو آپ میری بات نہیں سنیں گے سر!" پھر اس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی، تم تکلیف مت کرو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

"ان حالات میں صوفی صاحب! میں ایک خاموش تماشائی بننے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس یہ لڑکی مجھے کسی طرح پاگل نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اس مختصر سے وقت میں مجھے کسی قسم کی مداخلت کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی لڑکی کے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل گیا تھا۔ ناصر مجھ سے نگاہیں چرا رہا تھا۔

"یہ لڑکی پاگل تو نہیں معلوم ہوتی۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت خوب، گویا اب آپ بھی مجھے بور کریں گی۔ کیا اس کی کسی بات میں کوئی ربط تھا۔ آپ سن رہی تھیں اس کی بکواس۔"

"اگر وہ پاگل بھی تھی۔ تو میرے خیال میں تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ نہ جانے کس گھر کی عزت ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اسے اس کے گھر پہنچاؤ۔"

"بس بس محترمہ! پولیس کی مصروفیات کے بارے میں آپ کی معلومات نہایت ناقص ہیں ان رفاہی کاموں کے لیے دوسرے ادارے موجود ہیں۔ محکمہ پولیس کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔" راجا ناصر نے کہا۔

میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ بات وہی تھی راجا ناصر سے میں صرف اس لیے نہیں ملتی تھی کہ وہ پولیس آفیسر تھا اور میں صحافی۔ میں اس کی دل سے عزت کرتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیوں وہ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ میں بھنگی بھنگی سی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں چلتی ہوں راجہ ناصر! پتا نہیں کیوں میرے ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ تم ذرا غور کرو اس کے الفاظ کیا تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے لاک اپ میں بند کر دیا جائے تو اس کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔"

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ تمہارا کیا خیال ہے صرف اس کی بکواس پر میں دوڑ پڑتا یار! یور مت کرو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں سوری۔ میں نے تمہارا کافی وقت ضائع کیا۔"

"بیٹھو، باہر بارش ہے۔"

"نہیں تاریکی پھیل رہی ہے۔ ویسے بھی وقت کافی گزر چکا ہے۔"

"مرضی ہے تمہاری۔" راجا ناصر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ تھانے کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ لڑکی۔"

"وہ تو چلی گئی میڈم۔"

"اتنی تیز بارش میں۔"

"میں نے کہا تھا اس سے کہ وہ باہر درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور جب بارش رکے تو چلی جائے مگر وہ مانی نہیں۔" ہیڈ کانسٹیبل نے نظر چراتے ہوئے کہا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی۔ بارش اب ہلکی ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے سڑکیں جل تھل کر دی تھیں۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کئی گاڑیاں سڑکوں پر بند ہوگئی تھیں۔ اور ان کے مالک انہیں یہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے چل پڑی۔ مجھے کچھ مخصوص راستوں سے گزرنا تھا۔ ایک خاص سڑک پر پہنچنے کے لیے مجھے کوئی چار کلومیٹر کا راستہ طے کرنا پڑتا۔ لیکن ایک پتلی گلی ایسی تھی۔ جو ان دونوں سڑکوں کے درمیان رابطہ تھی اور اس سے فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی گلی کا راستہ اختیار کیا۔ یہ جگہ ناہموار تھی اور جگہ جگہ چھوٹے

گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹ جلانی پڑی تھیں۔ اول تو ویسے ہی رات ہو چکی تھی پھر بادلوں نے اور ماحول کو گہرا کیا ہوا تھا۔ تیز روشنیاں ان گڑھوں کو نمایاں کرنے لگیں اور میں حتی الامکان ان سے بچتی ہوئی آہستہ روی سے آگے نکل پڑی۔ میں نے سڑک پر نگاہیں جما رکھی تھیں اور پھر اچانک ہی مجھے ایک گڑھے میں پڑا ہوا ایک انسانی جسم نظر آیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"کوئی حادثہ ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی سنسان سڑک پر تو کوئی واردات بھی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ میں نے بریک پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور کار اس انسانی جسم سے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گئی۔ کار کی ہیڈ لائیٹس نے اس جسم کو روشنیوں کی زد میں لے لیا تھا اور اس کے بعد میں پھرتی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔ انتہائی دردناک منظر تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کو کسی بھاری گاڑی نے کچل دیا تھا۔ نچلا دھڑ پس کر رہ گیا تھا۔ بارش کی چھینٹوں نے قرب و جوار سے خون دھو دیا تھا بعض اندرونی اعضاء نکل کر بکھر گئے تھے۔ میں سکتے میں کھڑی رہ گئی۔ دفعتاً میری نگاہ لڑکی کے نقوش پر پڑی۔ اور میرے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ میں بے اختیار آگے بڑھی اور اس پر جھک گئی۔ اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو پولیس اسٹیشن پر زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میرے دل میں غم و اندوہ کا طوفان امنڈ آیا۔ اس بے بسی کی موت پر میرا دل رو پڑا۔ اس کی درد بھری آواز کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج اٹھا اور پھر میرا دل غصے سے بھر گیا۔ اگر راجا ناصر اس کی باتوں کو پاگل پن نہ سمجھتا تو اس کی زندگی بچ سکتی تھی۔ میں شدید غم کے عالم میں وہاں کھڑی ہوئی تھی کہ دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔

صحافت کی زندگی صوفی صاحب! بہت سے رموز سے واقف کر دیتی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے راجا ناصر کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ راجا ناصر نے جان بوجھ کر اس لڑکی کی مدد کرنے سے گریز کیا ہے۔ قانون کا محافظ قانون شکن نہیں ہو سکتا۔ بس یہ شبہ تھا۔ میں کشمکش کا شکار ہوگئی اور پھر اچانک ہی میرے اندر کا احساس جاگ اٹھا اگر راجا ناصر نے جان بوجھ کر اس کی درخواست کو نظر انداز کیا ہے تو وہ خود بھی مجرم ہے۔"

بہر حال میرے اپنے بھی کچھ فرائض تھے۔ میں اپنی کار کی طرف بڑھی کار سے اپنا کیمرہ اٹھایا فلش چیک کیے اور پھر لاش کے قریب پہنچ کر مختلف زاویوں سے اس کی تصویر بنانے لگی۔ ابھی میں اس کام میں مصروف تھی کہ دفعتاً دو تیز روشنیاں مجھ پر پڑیں۔ کسی دوسرے نے بھی غالباً میرے ہی انداز میں مختصر راستہ اختیار کیا تھا اور اس سڑک پر نکل آیا تھا۔ میں نے کیمرہ فولڈ کیا اور اسے جلدی سے کار میں ڈال دیا۔

پھر وہ گاڑی قریب پہنچ گئی یہ پولیس جیپ تھی اور اس میں راجا ناصر موجود تھا وہ جلدی سے اتر کر میرے قریب آ گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" میرے بولنے سے پہلے اس کی نگاہ لاش پر جا پڑی اور وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اوہو..... کیا یہ تمہاری گاڑی کا شکار ہوئی ہے۔" راجا ناصر کا لہجہ مصنوعی تھا۔ میں نے غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہوئی تو نہیں ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو اسے میرے سر ڈال سکتے ہو۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ حادثہ کسی بھاری گاڑی سے ہوا ہے۔ تمہاری ننھی سی کار یہ کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتی۔"

"شکریہ میرا تو خیال تھا تم مجھے فوراً ہی ہتھکڑیاں لگا دو گے۔"

"تعجب ہے اس چھوٹی سی سڑک پر بھاری گاڑی کہاں سے آ گئی۔ ویسے حادثہ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔"

"تمہیں اس بات پر تعجب نہیں ہوا راجا ناصر! کہ یہ وہی لڑکی ہے جو اب سے تھوڑی دیر قبل تمہارے سامنے کھڑی تم سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ تمہیں بتا رہی تھی کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"ایں..... ہاں، واقعی یہ تو وہی ہے۔" راجا ناصر کا لہجہ اب بھی مصنوعی مصنوعی سا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"مگر واقعی کیا..... کیا....."

"ہاں..... تم نے اسے بارش میں پولیس اسٹیشن سے نکال دیا تھا۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ سچ مچ موت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔" راجا ناصر بولا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات کیں اور دو کانسٹیبل جیپ میں بیٹھ کر متعلقہ افراد کو بلانے چلے گئے۔ جنہیں اس کے بعد کی کارروائی کرنا تھی۔ ہلکی پھوار میں میرے کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن ذہن بہت خراب ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں مسلسل لڑکی کی آواز گونج رہی تھی۔

"سر وہ لوگ مجھے آپ کے پاس نہیں آنے دے رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ اگر آپ نے، اگر آپ....." دفعتاً راجا ناصر چونک کر میری طرف بڑھا اور بولا۔

"کل تم اس حادثے کے بارے میں خبر شائع کرو گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ بتاؤ۔ رابعہ ہمارے تمہارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس چھوٹی سی خبر کو تم اپنے اخبار میں جگہ نہ دو۔ ممکن ہے تم اس لڑکی کے لیے جذباتی ہو گئی ہو۔ کیونکہ تمہارے سامنے زندہ تھی مگر یہ سوچ کر ایسے سینکڑوں واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم وہاں موجود تھیں۔" صوفی صاحب میں خاموشی سے راجا ناصر کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر میں نے سوال کیا۔

"مگر یہ تھی کون۔"

"میں نہیں جانتا بھیگتی ہوئی آئی تھی الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی اس لیے میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ تم سوچو کتنی الجھنیں ہوتی ہیں ہمارے پاس ان الجھنوں میں اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ میں نے اسی لیے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ سنو رابعہ تم ان واقعات کو پوشیدہ رکھو۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا اور میری درخواست ہے کہ اب تم یہاں سے چلی جاؤ اور پولیس کو اس کا کام کرنے

دو۔" راجا ناصر کے انداز میں ایسی بات میں نے پہلے کبھی نہیں پائی تھی۔ مصلحت نے مجھے محتاط کر دیا۔ میں خاموشی سے اپنی کار تک پہنچی اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ یہ فیصلہ تو اب مجھے کرنا تھا کہ میں اس سلسلے میں کیا اقدامات کروں گی۔ جہاں تک بات اس سنسنی خیز خبر کی تھی۔ تو اس کے لیے میں واقعی کوئی دشمنی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس لڑکی کا خون بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ایک ذمے دار افسر نے میرے سامنے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا تھا اور میرا ضمیر اس غفلت کی پردہ پوشی کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اگر لڑکی کو پولیس کی پناہ مل جاتی تو وہ شاید اس حادثے کا شکار نہ ہوتی۔

ناصر کے رویے سے میرے ذہن میں پہلے ہی شبہات نے سر ابھارا تھا اب مجھے یقین سا ہوتا جا رہا تھا کہ ناصر کسی خاص مقصد کے تحت لڑکی کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی کا آلہ کار ہو اور جب لڑکی تھانے جا کر اس سے ملی ہو تو اس نے کسی کو اس کی اطلاع بھی دی ہو۔ اچانک ہی مجھے پولیس اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا ہوٹل یاد آ گیا جو ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جب میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تھی۔ تب بھی یہ کھلا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہو گیا اور دوسرے لمحے میری کار کا رخ بدل گیا۔

چھوٹے سے ہوٹل میں دو چار آدمی میزوں پر نظر آ رہے تھے کاؤنٹر پر بیٹھے دبلے پتلے شخص کے چہرے پر زردی کے آثار نمایاں تھے۔ میں اسے دیکھ کر خواہ مخواہ مسکرا دی اور وہ چونک کر پہلو بدلنے لگا۔ ویٹر سے چائے طلب کر کے میں اس کی چسکیاں لیتی ہوئی کاؤنٹر کلرک کو دیکھ کر مسکراتی رہی پھر جب میں بل ادا کر کے اٹھی تو سیدھے کاؤنٹر پر پہنچی۔ کاؤنٹر کلرک خاصا بے قرار ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"کیا میں ایک فون کر سکتی ہوں جناب اس نے خاموشی سے فون اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔"

"پریشان نظر آ رہے ہیں آپ۔"

میں نے یونہی ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو..... مگر تم مسکرا کیوں رہی ہو۔"

"آپ کی پریشانی کو جانتی ہوں میں۔ آپ کی پریشانی کی وجہ سامنے والا پولیس اسٹیشن بھی ہو سکتا ہے۔ سچ بتانا کیا پولیس والے تمہیں پریشان نہیں کرتے۔"

"بادشاہ لوگ ہیں کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"ابھی ایک دو گھنٹے قبل انچارج صاحب نے یہاں سے فون کیا تھا اور کال کے پیسے بھی نہیں دیے تھے۔"

"تم کال کی بات کر رہی ہو۔ یہاں چائے یا کافی کے پیسے بھی نہیں ملتے۔"

"فون تو کیا تھا انہوں نے۔"

"ہاں۔ تھانے کا فون خراب تھا۔"

"کتنی دیر پہلے کی بات ہے۔"

"دو گھنٹے کے قریب ہو گئے۔"

"کسی لڑکی کو فون کیا ہو گا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا مجھے تو کاؤنٹر سے بھگا دیا گیا تھا۔" کلرک نے جواب دیا۔ میں نے ریسیور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپس رکھ دیا اور کہا۔

''شاید دوسری طرف کا فون خراب ہے بارش کی وجہ سے۔'' میں دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ بے چارہ کاؤنٹر کلرک حیرت سے منہ کھولے مجھے جاتے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں، لیکن میرا شبہ کتنا درست نکلا تھا۔

بہرحال میرے لیے یہ ایک انتہائی دکھ بھرا مسئلہ بن چکا تھا۔ صوفی صاحب! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کا وقت ضائع کرنے آ گئی ہوں اور اتنی لمبی کہانی سنانے بیٹھ گئی ہوں۔ صوفی صاحب بلاوجہ کبھی کوئی کسی کی طرف کا رخ نہیں کرتا۔ کچھ معلومات مجھے آپ کے بارے میں تھیں۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے صوفی صاحب بس یوں سمجھ لیجیے کہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا ویسے بھی زندگی کے الجھاوے اتنے تھے کہ میں جانتی تھی کہ مجھے ملازمت کر کے زندگی گزارنا ہوگی۔ صوفی صاحب میں اپنی شخصیت کو بھول گئی اور میں نے صحافت کا پیشہ اپنا لیا اور بس ظاہر ہے اس زندگی میں پولیس سے رابطے پڑتے ہیں۔ راجا ناصر تھوڑا سا خوش ذوق بھی تھا پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ سر! میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں اصل میں آپ کے پاس آنے کا مقصد۔''

''آپ مجھے اپنے بارے میں بتاتی رہیے۔ درویش ویسے آپ پر بھی رحم کریں مجھ پر بھی۔''

''صوفی صاحب! آپ مجھے وقت دے رہے ہیں کوئی مصروفیت تو نہیں ہے نا۔''

''یہ بھی ایک مصروفیت ہے۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم محافظت کے شعبے میں بھی برائیوں کا شکار ہیں۔'' لیکن بہرحال صوفی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''سر! اس کے بعد میں نے ان تمام معاملات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد اپنے ذہن میں اس معصوم لڑکی کی زندگی کا خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ شکل وصورت اور لباس سے وہ ایک متوسط گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ سر کہنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ یہ جملہ ادا کرنے کی عادی ہے۔ ممکن ہے کسی دفتر وغیرہ میں ملازمت کرتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ وہ ذہنی طور پر غیر متوازن نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے غم آلود چہرے سے پتا چلتا تھا کہ کسی ذہنی حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ لیکن زندگی کے خوف نے وقتی طور پر اس حادثے سے ذہن ہٹا دیا ہے۔ گویا اس حادثے کے بعد بھی وہ زندہ رہنے کی خواہش مند تھی۔ نمبر تین یہ صوفی صاحب کہ وہ لوگ جو اس کی زندگی کے گاہک تھے اس کی پولیس اسٹیشن پر موجودگی سے واقف تھے اور باہر اسکا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن صوفی صاحب یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کچھ الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں راجا ناصر کا کردار مشکوک ہو جاتا تھا۔ کیا ان لوگوں کو یقین تھا کہ لڑکی پولیس کی مدد حاصل نہیں کر سکے گی اور ان کا یقین اس قدر مکمل نکلا کہ انہوں نے اطمینان سے اس کا تعاقب کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس صورت میں گویا راجا ناصر اس شخصیت سے واقف تھا اور کسی طور اس کے لیے مجبور بھی کہ اس کے خلاف کسی کی مدد نہ کرے۔ اس آخری بات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ذمے دار صحافی کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ حکام بالا کو اس شخص کے ذاتی کردار سے آگاہ کروں جس نے اپنے فرض سے مجرمانہ غفلت برتتے ہوئے اپنے پیشے اور محکمے کو بدنام کیا۔ لیکن راجا ناصر کی شخصیت اور اس سے پہلے میری اس سے واقفیت اور اس

کی شخصیت اور اس کا کردار اس بات کی تردید کرتے تھے۔ لیکن کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

بہرحال راجا ناصر نے ایک طرح سے دھمکی کا انداز اختیار کیا تھا کہ یہ خبر میں اخبار کو نہ دوں۔ لیکن اگر اس نے اپنے فرض سے غفلت برتی تھی۔ تو کم از کم میں اپنے فرض سے غفلت نہیں برتنا چاہتی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ راجا ناصر میرے نکلتے ہی میرے پیچھے پیچھے کیوں چلا آیا تھا جب کہ اس سے قبل اس نے کہیں جانے کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا اور خاص طور سے اس سڑک پر جہاں لاش موجود تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک ننھا سا ڈکٹو ریکارڈر نکال کر اسے فون سے منسلک کر دیا میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ میں یہ رپورٹ اخبار کو نہیں دوں گی اور اس سلسلے میں اپنی معلومات پوشیدہ رکھوں گی لیکن راجا ناصر کو مجھے حقائق سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ لڑکی کی موت کی خبر اگر اخبارات میں نہ آئی تو میں اسے مجبور کروں گی کہ وہ لڑکی کے بارے میں تفتیش کر کے مجھے اس سے آگاہ کرے۔

بہرحال میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی رات کو کوئی سوا گیارہ بجے کے قریب راجا ناصر کا فون آیا۔

''ہیلو۔''

''کیا سو گئی تھیں۔''

''نہیں۔''

''میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر آ جاؤ۔'' میں نے جواب دیا اور تقریباً بیس منٹ کے بعد راجا ناصر میرے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ البتہ اس دوران میں نے کچھ بندوبست کر لیا تھا اور راجا ناصر کی آواز ریکارڈ کرنے کے سارے انتظامات کر لیے تھے۔ راجا ناصر پولیس والا تھا۔ اس کے چہرے سے کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا چنانچہ وہ کافی کی فرمائش کر کے بیٹھ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا ہوں رابعہ! تمہاری زندگی بہت عجیب ہے کیا تمہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم اپنے پیشے کے لیے نہایت موزوں ہو۔ لیکن اس ملک میں اتنے ذہین لوگوں کی قدر ذرا مشکل سے ہی ہوتی ہے۔ بہرحال میں تم سے اپنے آنے کا مقصد چھپانا نہیں چاہتا۔ میں اس لاش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔''

''ہاں بولو..... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی رپورٹ تیار کی ہے۔''

''نہیں میں نے تم سے تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔''

''زندہ باد..... واقعی مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہے کم از کم مجھے اتنا ضرور کرنا چاہیے تھا کہ اسے بہ حفاظت اس کے گھر تک پہنچوا دیتا۔ مگر بس بارش کے موسم نے ذہن پر یہ کہولت طاری کر دی تھی۔''

''اور.....'' میں نے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں میرا مقصد ہے کہ....."

"سوری راجا ناصر! میں نے یقین نہیں کیا تمہاری بات پر۔"

"کیوں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"تم کہولت کا شکار نہیں تھے۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد تم جیپ میں بیٹھ کر باہر نکل آئے تھے۔"

میری چبھتی ہوئی آواز نے راجا ناصر کا چہرہ پھیکا کر دیا۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"برا تو نہیں مانو گے میری بات کا؟"

"اس کی پروا مت کرو تم۔"

"تم صرف میرے تعاقب میں نکلے تھے۔ تمہیں احساس تھا میں لڑکی کے معاملے میں سنجیدہ ہوگئی ہوں، کیا سمجھے۔ تم نے اسے پاگل ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔"

"تم میری توہین کر رہی ہو۔"

"میں نے پہلے ہی تم سے معذرت کی تھی۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ یہ خبر میں نے اپنے اخبار کو نہیں دی۔ جب کہ میرے پاس لاش کی تصویریں بھی موجود تھیں۔"

"کیا؟" راجا ناصر اچھل پڑا۔

"ہاں کیمرا میری کار میں موجود تھا ظاہر ہے ایک صحافی کے لیے ضروری تھا۔ بہرحال میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہارے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گی۔ لیکن تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ گے اور میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس کی موت اور دشمنوں کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم ہیں۔"

"گویا تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔" راجا ناصر نے کہا۔

"جو کچھ بھی تم سمجھو۔" راجا ناصر مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"میں نے لاش ضروری کارروائیوں کے بعد اسپتال پہنچا دی ہے۔ میرے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو چکا ہے۔ لاش سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جو معلومات کا ذریعہ بن سکتی۔ اسپتال میں اس کے بارے میں رپورٹنگ ہو چکی ہے۔ صبح کو اس کی تصویر اخبارات میں شناخت کے لیے چھپ جائے گی۔ یہ کارروائی ہو چکی ہے۔ مجھے صرف اتنا سا افسوس ہے کہ وہ میرے پاس آئی تھی اور میں اس پر توجہ نہیں دے سکا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات منظر عام پر آئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ تفصیل کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ لیکن ایک بات نوٹ کر لو راجا ناصر، مجھے اس لڑکی کے بارے میں مکمل تفصیل درکار ہے اور یہ میرا مشن بن چکی ہے۔"

"تم ضد کر رہی ہو اور میں اس ضد کو ناپسند کرتا ہوں یہ بات ہمارے درمیان شدید اختلاف کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ اوکے۔"

"ارے ارے کافی تو پیو۔" لیکن وہ رکے بغیر باہر نکل گیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا لیکن مجھے

لگ رہا تھا کہ وہ سخت غصے کے عالم میں گیا ہے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آرام سے ڈکٹو ریکارڈر اٹھایا اور اسے ریوائنڈ کر کے وہ آواز سننے لگی۔ کار کردگی تسلی بخش تھی اس میں راجا ناصر کا وہ اعتراف موجود تھا۔ جس میں اس نے بتایا تھا کہ لڑکی موت سے پہلے اس سے ملی تھی۔

بہرحال میں نے خاموشی سے وقت گزارا اپنی کافی ختم کی اور رات کو نہ جانے کس وقت تک میرا ذہن ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ دوسری صبح کے تمام اخبارات چائے کے ساتھ مل گئے۔ میرے اخبار میں اس بارے میں کوئی رپورٹ نہیں تھی۔ لیکن دو اخبارات میں انتہائی چھوٹی سی جگہ پر ایک کالمی خبر لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم گاڑی نے دوشیزہ کو کچل دیا۔ مقامی پولیس اسٹیشن کے انچارج جب بارش کے دوران گشت پر نکلے تو ایک سڑک پر انہیں ایک نوجوان دوشیزہ کی کچلی ہوئی لاش نظر آئی۔ جسے کسی بھاری گاڑی نے کچل دیا تھا۔ پولیس نے لاش قبضے میں لے لی ہے اور گاڑی کی تلاش میں مصروف ہے۔

بہرحال یہ تھی یہ ساری تفصیل، میں نے سب سے پہلے وہ رول لیا جس میں تصویریں موجود تھیں اور اس کے بعد میں اسے لے کر اپنے دفتر پہنچ گئی۔ لیکن اپنے ایڈیٹر کو میں نے بہت ہی مختصر الفاظ میں ایک کہانی گھڑ کر سناتے ہوئے کہا یہ تصویریں بڑی خاموشی کے ساتھ پرنٹ کرا لی جائیں۔ ان کے کہنے سے میں نے مختصر الفاظ میں صرف اتنا کہا کہ بعض اوقات ہمیں اپنے پیشے سے بے ایمانی کرنا ہوتی ہے اور مصلحت سے کام لینا ہوتا ہے۔ میرے ایڈیٹر صاحب مجھ سے بحث کرتے رہے اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اس وقت میں ششدر رہ گئی۔ جب میرے ایڈیٹر صاحب ہی نے مجھے طلب کیا اور بولے۔

"جو لڑکی ان تصویروں میں مقتول نظر آئی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ ہمارا فوٹو گرافر اسے پہچانتا ہے۔"

"اوہ میرے خدا..... کیا اس کے بارے میں کچھ تفصیل پتا چلی۔"

"ابھی نہیں..... میں نے اسے بلایا ہے۔" فوٹو گرافر ایک نوجوان آدمی تھا۔ ایڈیٹر صاحب اس سے تصویروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگے۔ تو اس نے کہا۔

"جی سر! یہ لڑکی ہمارے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔ پچھلے دو سال سے میں اسے دیکھ رہا ہوں جس بس اسٹاپ سے میں سوار ہوتا ہوں۔ اس سے یہ بھی ہوتی ہے۔"

"اس کا مکان بھی معلوم ہے تمہیں۔"

"نہیں جناب! لیکن قریب ہی رہتی ہے۔"

"ہوں، اچھا کیا آج وہ بس اسٹاپ پر نظر آئی تھی۔"

"نہیں سر! آج نہیں دیکھا میں نے اسے۔"

"کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ صبح ہی صبح کہاں جاتی ہوگی۔"

"معلوم نہیں! لیکن کہیں نوکری ہی کرتی ہوگی۔"

"اسکول یا کالج کا وقت بھی یہی ہوتا ہے۔"

"جی نہیں۔ وہ کالج کی طالبہ نہیں تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لباس کیسا پہنتی تھی وہ۔''

''بس صاف ستھرا لیکن معمولی۔''

''کبھی اس کے ساتھ کوئی مرد وغیرہ نظر نہیں آیا۔''

''کبھی نہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ ایک حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔''

''جی۔ اس کی تصویریں بناتے ہوئے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔''

''مجھے بتاؤ رفیق! کیا اس سلسلے میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو۔''

''کیسی مدد میڈم۔''

''ہم اس لڑکی کا گھر تلاش کریں گے۔ تمہیں ایک دو تصویریں ذرا ایسی بنانی ہیں کہ کلوز اپ ہوگا۔''

''جیسا آپ حکم کریں۔'' میرے ایڈیٹر صاحب نے اس کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''یہ رول تمہارے پاس موجود ہے جب کہ کسی اخبار میں ایسی کوئی چیز نہیں چھپی۔ تم مجھے بتاؤ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں۔'' میں سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ بلاشک وشبہ میرے اخبار کے ایڈیٹر صاحب ایک شریف النفس انسان تھے میں نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر میں نے ان سے کہا۔

''جی سر۔ میں نے کل شام اس لڑکی کو زندہ سلامت پولیس اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ وہ تھانے کے انچارج کے سامنے گڑگڑا رہی تھی کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ لیکن انچارج صاحب کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہے چنانچہ اس پاگل پر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے بعد اس کی کچلی لاش ایک سڑک پر پائی گئی۔

''اوہ میرے خدا۔'' ایڈیٹر صاحب نے کہا اور پھر چونک کر بولے۔

''وہ انچارج راجا ناصر تو نہیں ہے۔''

''جی۔''

''یہ تصویریں تمہیں کہاں سے مل گئیں؟''

''سب سے پہلے میں نے اس لاش کو دیکھا تھا اور پولیس کے پہنچنے سے قبل میں نے اس کی تصاویر اتار لیں۔'' ایڈیٹر صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

''تمہارے سینے میں جو جذبہ پرورش پا رہا ہے وہ قابل احترام ہے رالعہ، بلاشبہ ایک سچے انسان کے سینے میں برائی کے خلاف کھڑے ہونے کی لگن ہوئی ہے۔ لیکن احتیاط بھی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ میں تمہارے جذبے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ لیکن بیٹی میں نے اپنی پوری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ عمر کے اس آخری دور میں اگر اپنی ذات کے سکون کے لیے کوئی راستہ ملتا ہے۔ تو میں اس پر دوڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔''

''شکریہ سر۔ میں اس مظلوم لڑکی کی اس آواز کو مرتے وقت تک نہیں بھول سکوں گی جس میں وہ اپنی زندگی کے لیے گڑگڑا رہی تھی۔''

بہرحال ہم لوگوں نے کام کا آغاز کر دیا۔ میں نے راستے میں اپنے فوٹو گرافر سے اس لڑکی کے

بارے میں پوچھا۔

''تم نے کبھی اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''نہیں میڈم! آپ یقین کریں وہ بے حد شریف لڑکی تھی۔ اب آپ سے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی۔ بس وہ نظریں جھکائے رہتی تھی۔ مجھے اس کی لاش دیکھ کر سخت صدمہ ہوا ہے۔''

''کیا ہم اس کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ چھوٹا سا علاقہ ہے۔''

''ٹھیک۔'' کچھ دیر کے بعد کار ایک نواحی بستی میں داخل ہوگئی۔ ہم لوگ گھر تلاش کرتے ہوئے آخر کار ایک مکان تک پہنچ گئے۔

''یہ میرا گھر ہے اگر آپ یہاں تھوڑی دیر انتظار کر لیں تو میں خود جا کر معلومات حاصل کروں۔''

''ویری گڈ.....'' یہ بہت اچھا رہے گا۔'' میں مکان میں داخل ہوگئی۔ فوٹو گرافر کی بیوی بچوں نے میرا بہت اچھی طرح استقبال کیا تھا اور جو کام بے چارہ فوٹو گرافر کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہ اس کے بیوی بچوں نے کر دیا۔

پڑوس کے ایک مکان میں ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ یہ بات گھر سے ہی پتا چل گئی اور صوفی صاحب اس کے بعد ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوگیا کہ لڑکی کسی بہت بڑے آدمی کی درندگی کا شکار ہوئی اور بڑے آدمی نے پولیس کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ صوفی صاحب میرے دل کے ٹکڑے ہوگئے میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے تمکین انداز میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بس کیا کیا جائے۔'' لڑکی کا نام دردانہ تھا اور بے چاری ملازمت کرتی تھی، سترہ سال کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو پڑھ رہا تھا۔ بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ان کے گھر کے حالات تھے۔ لیکن صوفی صاحب اس کے بعد جو ہوا وہ انتہائی دردناک حادثہ تھا۔ پہلے تو اس بات کو صرف ایک حادثہ قرار دیا جا رہا تھا لیکن پھر اس کے بعد اچانک ہی دو تین دن کے بعد اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی۔ جس میں دردانہ کے قتل کا ذمے دار اس کے سترہ سالہ بھائی حفیظ کو قرار دیا گیا۔ اسے بہن کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کی کہانی یوں بنائی گئی کہ خوب صورت دردانہ ایک فرم میں ملازمت کرتی تھی اور ماں اور بھائی کی کفالت کے لیے روزی کماتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے قبل اس کے بھائی کو شبہ ہوگیا کہ اس کا چال چلن خراب ہے اس نے کئی بار بہن کو سمجھایا لیکن دردانہ نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ کیونکہ بھائی خود اس کے زیر کفالت تھا۔ آخر کار غیور بھائی، بہن کی اس روش کو برداشت نہیں کر سکا اور اس نے دردانہ کو قتل کر کے اسے ٹرک کے حادثے کی شکل دے دی۔ پولیس نے حفیظ کو گرفتار کر لیا ہے اور اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

بس یہ تھی صورت حال میں نے ایڈیٹر صاحب سے کہا وہ کسی قدر جھلائے ہوئے سے تھے۔ کہنے لگے۔

''بابا میں کیا کروں۔ میں خود تو ان تمام چیزوں کا ذمے دار نہیں ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن ایڈیٹر صاحب۔"

"بس پلیز..... بس۔"

"اس کے بھائی کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں ضرور کوئی کہانی ہے۔"

"تو پھر تم یوں کرو کہ جس طرح بھی تم سے بن پڑے۔ یہ کہانی معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ تمہیں سمجھانے کی ہر کوشش تو ناکام ہوگئی ہے۔" ایڈیٹر صاحب نے کہا اور صوفی صاحب مجھے یوں لگا جیسے واقعی میں کبھی کچھ نہیں کرسکوں گی۔ کیا میں واقعی کچھ نہیں کرسکوں گی؟ صوفی صاحب نہ جانے کب سے بھاگ دوڑ کر رہی ہوں میری حفیظ سے ملاقات تک نہیں ہوسکی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی کو جاننے کی سزا دی گئی ہے اسے۔ پھر میں نے وکیل فرقان جلیل صاحب سے ملی اور فرقان جلیل نے مجھے کہا کہ اگر تم ایک بے لوث اور انسانیت کے نام پر کسی مددگار کی ضرورت مند ہو تو یہ پتا میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ میں خود بھی آپ کو تھوڑا بہت جانتی تھی صوفی صاحب۔ لیکن فرقان جلیل صاحب نے مجھے یہ پتا دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور میں نے پوری کہانی آپ کے گوش گزار کردی ہے۔"

صوفی نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا رابعہ سلطان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

صوفی کے چہرے سے اس کی کیفیات کا پتا چلا لینا ناممکنات میں تھا البتہ وہ زور زور سے جگالی کر رہا تھا اور اس کی پتلی داڑھی عجیب بہار دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کو اسے دیکھ کر غصہ آ گیا۔

"آپ بڑے بے رحم انسان ہیں!" وہ روتے روتے چیخ کر بولی۔

"در..... درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی بے اختیار بولا

"درویش یہ دعائیں بھی کرتے ہیں۔" وہ غرا کر بولی۔

"نن نہیں۔ مطلب ہے کہ....."

"میں اتنی دیر سے رو رہی ہوں آپ نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔"

"در درویش رحم کریں۔ ہمیں آتا نہیں ہے۔"

"کیا؟"

"خواتین کو خاموش کرانا۔" صوفی نے درد بھری آواز میں کہا اور رابعہ بے اختیار ہنس پڑی۔ صوفی کا چہرہ ہونق ہو رہا تھا۔

"آپ نے شادی نہیں کی؟"

"اسی لیے نہیں کی۔"

"کس لیے؟"

"خواتین ناقابل فہم ہیں ہمارے لیے۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔"

"نہیں آپ مجھے بتائیے۔"

"کک کیا۔"

"ابھی خود آپ نے کہا ہے۔"

"بہت سی باتیں کہیں ہیں ہم نے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔" صوفی نے سادگی سے کہا۔

"آپ نے کہا تھا۔"

"ارشاد ارشاد۔" صوفی بولا۔

"یہ نہیں کہا تھا۔" رابعہ ہنس پڑی۔

"تو پھر....."

"آپ بھی بس کمال ہیں صوفی صاحب۔"

"بس ایسا ہی ہے درویشوں کے کرم سے اور آپ دیکھیے نا ابھی کچھ لمحے قبل آپ رو رہی تھیں اور اب ہنس رہی ہیں۔"

"رو رہی تھی میں اس مظلوم گھرانے کے اوپر اور ہنس رہی ہوں آپ پر اتنے بڑے بڑے کارناموں کے سلسلے میں آپ کا نام لیا جاتا ہے اور آپ ایک خاتون کو خاموش نہیں کرا سکتے!"

"آپ یقین کریں وہ کارنامے کچھ بھی نہیں ہیں کسی خاتون کے آگے، اور پھر تو یہ بڑے بڑے ذہین لوگ کہہ گئے ہیں کہ عورت کو خاموش کرانا ایک ناممکن بات ہے۔ ہم بھلا یہ کیسے کرسکتے تھے۔" نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کے ذہن میں ایک عجیب سی لہر آ کر رہ گئی۔ کیا انسان اتنا معصوم بھی ہوتا ہے۔ شخصیتوں کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ یہ شخص جو چہرے مہرے اور جسمانیت کے لحاظ سے کسی کے لیے بھی قابل توجہ نہیں ہوگا، جو یہ کہتا ہے کہ اسے خواتین کو خاموش کرانا نہیں آتا۔ وہ کیا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا انسان صرف اچھے چہروں سے ہی محبت کرے وہ جو خوب صورت نہیں ہوتے اگر کوئی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھے تو ان کے دل کہیں زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ اس نے محبت بھری نگاہوں سے صوفی کو دیکھا۔ صوفی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد صوفی کی آواز ابھری۔

"وو..... درویش رحم کریں۔"

"درویشوں سے آپ کا بڑا گہرا تعلق لگتا ہے۔" رابعہ سلطان مسکرا کر بولی۔

"ایں..... جی..... جی ہاں، وو..... درویش اور پیر پرستی۔"

"پتا ہے کیوں دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے بہت سی ذاتی باتیں کروں۔"

"دل کی باتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ نہ جانے کیا کیا چاہنے لگتا ہے آپ اس کے چکر میں نہ پڑیں درویش آپ پر رحم کریں۔"

"درویش..... درویش..... درویش اس کے علاوہ بھی آپ کی زندگی میں کچھ ہے۔"

"جس کی زندگی میں درویش ہوں اسے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔" صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ واقعی بڑے عجیب انسان ہیں صوفی صاحب۔"

"اچھا۔ ہوسکتا ہے آپ کا کہنا درست ہو۔"

"پھر بتایئے۔ کیا فیصلہ کیا آپ نے؟"

"کچھ وقت دیں گی آپ ہمیں۔"

"میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔"

"ہمارا مطلب ہے کہ نا موجود ہو کر۔" صوفی نے کہا اور رابعہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جاؤں۔"

"جی یہی عرض کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک۔ تو پھر آپ ہی بتایئے جس مقصد کے تحت میں آپ کے پاس آئی تھی، اس کے لیے آپ نے کیا سوچا۔"

"ابھی تک کچھ نہیں۔" صوفی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں چلتی ہوں لیکن مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ بعد میں آپ کے پاس آؤں یا نہیں۔"

"نن نہیں..... کیوں نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں حاضری دوں گی اور آپ یقیناً کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"یقیناً یقیناً محترمہ!" رابعہ سلطان کا انداز تو ایسا تھا جیسے وہ یہاں سے جانا ہی نہ چاہتی ہو۔ لیکن جانا تو تھا اس کے جانے کے بعد صوفی دیر تک اپنی عادت کے مطابق ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور صوفی چونک کر اس ٹیلیفون کو دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی ان ہونی بات ہوگئی ہو۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"صوفی صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"بول رہا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"واہ..... کیا عقیدہ ہے صوفی صاحب آپ کا۔ یعنی آپ کے منہ سے آواز بھی درویشوں کی دعاؤں سے نکلتی ہے۔"

"کک..... کون صاحب ہیں۔" صوفی نے سوال کیا۔

"فرقان جلیل بول رہا ہوں۔"

"اخاہ..... وکیل صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں۔" صوفی خوش اخلاقی سے بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ اچھا ایک بات بتایئے۔ کیا محترمہ رابعہ سلطان آپ کے پاس پہنچیں۔"

"جی ہاں۔ ابھی ابھی گئی ہیں۔"

"انہوں نے اپنی آمد کا مقصد تو بتا دیا ہوگا۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب! معافی چاہتا ہوں کسی برے نظریے سے میں نے انہیں آپ کے پاس نہیں بھیجا مطلب یہ تھا کہ میں خود تو ہر طرح سے اس مسئلے میں آگے قدم بڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ کرنل رحیم شاہ اور آپ جس مشن پر کام کر رہے ہیں۔ وہ بڑا بے مثال ہے اور میں آپ کے ساتھ اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کرنے پر تیار ہوں۔ رابعہ سلطان نے جس مقتول لڑکی کا کیس بتایا ہے وہ بے چاری دنیا سے بھی چلی گئی اور اس کے بعد اس کا بھائی بھی مصیبت میں ڈال دیا گیا۔ یقیناً اس کے پس منظر میں کوئی کہانی ہوگی۔ کسی نے اپنی زندگی بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ پولیس آفیسر راجانا صرجیسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بک گیا ہوگا۔ بہرحال یہ نہ سمجھیں کہ میں نے صرف آپ ہی کو اس مسئلے میں ملوث کیا ہے بلکہ ہم بھرپور طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کام کریں گے اور اس بچے کو مصیبت سے نکالیں گے بلکہ اصل مجرم کو منظر عام پر بھی لائیں گے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں وکیل صاحب۔"

"پھر آپ یہ بتایئے کہ آغاز کہاں سے کریں گے۔"

"تھوڑا سا وقت دیجیے سوچنے کے لیے جو ہونا تھا وہ تو ہی ہو چکا ہے۔" صوفی نے اس سلسلے میں فرقان جلیل سے بھی وعدہ کر لیا تھا۔ جہاں تک رابعہ سلطان کا تعلق ہے وہ بہت جذباتی قسم کی لڑکی تھی وہ اپنے طور پر سب کچھ کر دینا چاہتی تھی۔

ادھر اس نے صوفی کے بارے میں سوچا تھا۔ اپنے طور پر جو جدوجہد کر رہی تھی اس میں صوفی کا کردار اس کا نام اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے دفتر پہنچی اور ایڈیٹر صاحب سے بات چیت کرنے لگی۔

"جی سر! ہمیں اس سلسلے میں خاصی بھاگ دوڑ کرنی ہے۔"

"مگر کیوں۔" ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سر!" اخبارات کا کام اور کیا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے ایک لڑکی کو قتل کر دیا گیا۔ قتل سے پہلے اس نے ایک پولیس آفیسر سے گڑگڑا، گڑگڑا کر مدد مانگی اور اس سے کہا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر پولیس آفیسر نے اس سے لاپروائی برتی تو وہ موت کی آغوش میں چلی جائے گی اور پولیس آفیسر نے اسے دھتکار کر نکال دیا۔ پھر وہی ہوا جس کا لڑکی کو خطرہ تھا۔ وہ ہلاک کر دی گئی۔ نہ صرف ہلاک کر دی گئی بلکہ اس کے معصوم بھائی کو بھی جال میں پھنسا لیا گیا۔ سر! میں ان واقعات کی گواہ ہوں۔"

"وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو رابعہ..... لیکن۔"

"نہیں سر! یہ لیکن ہی تو سب سے بڑی مشکل ہے اس کائنات میں پتا نہیں ہم اس لیکن سے کب چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔"

"تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنی ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ بہرحال میں تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ جو کچھ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ اخبار کی ساکھ متاثر نہ ہو۔ رابعہ نے صوفی کو فون پر کال کیا۔ لیکن صوفی اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ گرین ہاؤس سے ٹیلیفون آیا تھا اور کرنل رحیم شاہ کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صوفی اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔

''بھئی صوفی صاحب! اب تو دل چاہ رہا ہے کہ ٹانگ کا کوئی علاج کرا ہی لیا جائے تاکہ آپ کے ساتھ بھاگ دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔''

''جناب والا اگر کوئی مناسب علاج ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے تو آپ ضرور یہ علاج کرائیے گا۔''

''ہاں بچے پیچھے پڑ رہے ہیں کہ تھوڑے عرصے کے لیے امریکا جاؤں۔ وہاں سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے ہیں وہ۔ مصنوعی اعضا لگانے والی کچھ کمپنیوں نے ایسے اعضاء تیار کیے ہیں جو بالکل اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ خواہش مند تو خیر میں بھی ہوں۔ ظاہر ہے انسان اپنے اندر کوئی کمی پسند نہیں کرتا۔ یہاں کے معاملات آپ کے سپرد ہیں۔ کچھ وقت لگ جائے گا وہاں مجھے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔''

''بس میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ آپ سے اجازت لے کر ہی عمل کا آغاز کروں گا۔ مصروفیات کیا چل رہی ہیں آج کل۔'' مختصر الفاظ میں صوفی نے رابعہ سلطان کے بارے میں بتایا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''بڑے بڑے المیے ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں بس جو نگاہ میں آ جائے اس پر دکھ ہوتا ہے۔ آپ میرا خیال ہے کام کیجیے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ میں بس تھوڑے سے کام آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً گرین ہاؤس میں ہماری گرین فورس کی دیکھ بھال۔ اس کی نگرانی اور اس کے ذمے داریاں۔''

''جی بالکل۔ میں سمجھ رہا ہوں۔'' صوفی نے جواب دیا۔ کرنل رحیم شاہ بہت دیر تک بتا رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کا یہ پروگرام خاصا طویل تھا۔ لیکن چونکہ ان دنوں ایسی اور کوئی بات بھی نہیں تھی اس لیے کوئی تردد بھی نہیں ہوا۔ دوسرے دن صوفی معمول کے مطابق اپنے عیش کدے میں عیش کر رہا تھا کہ رابعہ سلطان اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ صوفی کی اجازت پر اندر آنے کے بعد دیر تک کھڑی صوفی کو دیکھتی رہی تھی اور صوفی طرح طرح کے پینترے بدلتا رہا تھا۔ رابعہ سلطان نے کہا۔

''صوفی صاحب! مجھے آپ کے ماضی کی رپورٹ درکار ہے۔''

''ج..... خدا کی قسم ہم نے ماضی میں کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو قابل گرفت ہو درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا ہے آپ نے ایک جرم۔'' رابعہ سلطان آگے بڑھ کر ایک پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ج..... ج..... جرم۔'' صوفی ہکلا کر بولا۔

''جی۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' رابعہ نے کہا اور صوفی بھی اچھل پڑا۔

''کک..... کیا فرمایا۔''

''درویشوں کے کرم سے جو کچھ بھی فرمایا صحیح فرمایا۔ اب میں بھی یہی جملہ استعمال کیا کروں گی۔''

''آپ یقین کیجیے بڑی برکت ہوتی ہے درویشوں کے تصور سے اور ہر کام میں ان کا نام شامل کر کے۔''

''اصل میں صوفی صاحب میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔

''کیوں..... کیا اس لڑکے حفیظ کے کیس پر کام کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔'' صوفی نے فوراً ہی کہا اور رابعہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''مطلب؟''

''میرا مطلب ہے پہلے تو آپ اس مسئلے پر کام کر رہی تھیں اب آپ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ درویشوں کی دعائیں ہیں نا۔ کیا آپ بھی میرے لیے دعائیں کر سکتے ہیں۔''

''میں درویش تو نہیں ہوں۔''

''ہیں تو نہیں مگر بننے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اچھا خیر چھوڑیے۔ اس وقت اس موضوع پر بات نہیں کرتے آپ یہ بتائیے۔ کیا سوچا ہے آپ نے۔''

''ہم آپ کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''ہائے ہم۔'' رابعہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور صوفی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر کہا۔

''آپ نے کچھ فرمایا۔''

''درویشوں کے کرم سے۔'' رابعہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

''ج..... جی اب بتائیے..... کک..... کہاں چلنا ہے۔''

''آپ بتائیے۔''

''میرا خیال ہے ہم اس بچے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس جگہ چلیں جہاں وہ رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اور پھر صوفی رابعہ کے ساتھ اس علاقے میں پہنچ گیا۔ ایک مکان پر پہنچ کر رابعہ نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے رابعہ سے کہا۔

''بی بی۔ تم تو پہلے بھی آ چکی ہو شاید۔''

''جی ہاں۔ اسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئی تھی اور آپ کے شوہر نے میرے ساتھ سختی برتی تھی۔''

''ارے وہ..... ہاں..... بے چارے پریشان رہتے ہیں۔ آ جاؤ..... اندر آ جاؤ تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے۔''

''جی ہاں..... یہ صاحب ہیں۔''

''اچھا اچھا..... تمہارے ڈرائیور معلوم ہوتے ہیں۔''

''نن..... نہیں۔''

''پھر..... اردلی۔''

''ارے نہیں نہیں ہم دونوں تحقیقات کرنے آئے ہیں۔''

''تو آ جاؤ نا۔ غلام علی کے ابا گھر پر نہیں ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شکریہ۔"

"ارے تم بھی آ جاؤ۔ تم کیا وہاں کھڑے اونٹ کی طرح جگالی کر رہے ہو۔" عورت نے بے تکلفی سے صوفی کو دیکھ کر کہا اور صوفی کا منہ ایک دم بند ہو گیا۔ پھر وہ غم غم کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ راستے میں اس نے پان منہ میں رکھ لیا تھا اور رابعہ کو کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ رابعہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"آپ اپنے شوہر سے بالکل مختلف لگتی ہیں۔ وہ اس قدر بداخلاق آدمی اور آپ۔"

"کیا بتاؤں بہن! بس مقدر پھوٹ گیا جو قسمت میں لکھا ہو پورا ہو کر رہتا ہے۔ چودہ سال ہو گئے گزر کرتے ہوئے۔ ایسے شکی مزاج آدمی کے ساتھ کہ پتا کھڑکے تو پوچھے کیا ہوا۔ کیا مجال کہ اس کی موجودگی میں کوئی پڑوسن بھی اندر آ جائے۔ کیوں آئی..... کیا کہہ رہی تھی۔ جان عذاب میں آ جاتی ہے ہاں۔ بھلا بتاؤ۔"

"آغم..... آغم..... آغم۔" صوفی کے منہ سے آواز نکلی تو عورت چونک کر بولی۔

"یہ گونگے ہیں۔"

"نہیں۔"

"پھر آغم..... آغم کیوں کر رہے ہیں۔"

"نہیں۔ وہ پان کھایا ہوا ہے۔"

"اے خدا کی پناہ پیک سے منہ بھرا ہوا ہو گا۔ میاں..... جاؤ پاہر تھوک کر آؤ باہر، برا لگتا ہے۔"

"غم غم، غم غم۔" صوفی نے جواب دیا۔ عورت نے چونکہ کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ باہر جائے اور پان تھوک کر آئے۔ چنانچہ پان تھوک کر آنا ہی پڑا۔ عورت رابعہ سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر تم بتاؤ کیا میں محلے داروں سے میل و مروت بھی نہ رکھوں تو کس سے رکھوں۔ پورے دنوں سے ہوں۔ کسی وقت اسپتال جانے کی ضرورت پیش آئی تو کون کام آئے گا۔ یہی محلے والے نا۔ کوئی چھوٹے موٹے کام تو آ سکتا ہے۔ غلام علی تو مدرسے چلا جاتا ہے۔ اچھا خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ چائے بناؤں تمہارے لیے۔"

"ارے نہیں نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ اصل میں وہی آپ کے پڑوسیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آ گئی تھی۔"

"پتا نہیں کیا ہے یہ سب کچھ، مصیبت پڑی بے چاروں پر، برے حال ہو گئے۔ میں نے غلام علی کے ابا سے کہا تھا کہ ذرا مدد کر دان کی پتا نہیں بے چارے کس مصیبت کا شکار ہیں۔ مگر بس انہیں تو اللہ ہی عقل دے۔ اب میں تو اس حالت میں جا نہیں سکتی۔ پورے دنوں سے ہوں۔ اب کون بتائے کہ ان مصیبت کے ماروں کا کیا حال ہے، مگر تم ان کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کر رہی ہو تمہارا کوئی رشتہ ناتا ہے ان سے۔"

"نہیں نہیں..... بس میرا تعلق اخبار سے ہے۔ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔"

"ارے..... اخبار میں لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں ہم دنیا بھر سے رپورٹیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔"

"دنیا بھر کی۔" خاتون آہستہ سے بولیں۔

"ہاں ہاں۔"

"اے بی بی! مجھے بتا سکتی ہو اسامہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔" عورت نے سوال کیا اور صوفی کے منہ سے ایک پھنکار سی نکلی۔

"دو..... درویش..... درویش..... درویش رحم کریں۔"

"میں تو کہوں انہیں کہیں دور بھاگ جانا چاہیے۔ یہ اللہ مارا بش تو پیچھے ہی لگ گیا ہے ان کے۔"

"ہاں۔ اللہ مالک ہے دیکھا جائے گا۔ جو کچھ بھی اللہ کرے گا بہتر کرے گا۔ وہ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ لڑکی دردانہ....."

"ہاں ہاں۔ میں نے کہا نا اب میں تو جا نہیں سکتی۔ وہ ابھی واپس بھی نہیں آئیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں دور چلی گئی ہوں۔"

"لیکن آپ کو ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوں تو مجھے بتایئے۔"

"نہیں نہیں۔ مجھ سے ویسے تو بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن یہ ساری باتیں میرے پلے نہیں پڑی تھیں۔ بڑا لین دین تھا ہمارا ان کا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے ایک پیالی چینی منگوائی تھی فوراً بھیج دی انہوں نے واپس ہی نہیں ہوئی۔ ارے تم میرا پہلے ایک کام تو کر دو۔" خاتون نے کہا۔

"جی فرمایئے۔" رابعہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"حکومت سے کہو کہ چینی ذرا سستی کر دے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تو بڑی مناسب قیمت پر مل رہی تھی۔ غلام علی کے ابا حلوے کے بڑے شوقین ہیں۔ بس ایک دن حلوہ بناؤ تو پندرہ دن چائے نہیں چلتی، مگر کیا کریں۔"

"بہتر..... میں کوشش کروں گی، ان لوگوں سے تو بہت گہرے تعلق ہوں گے آپ کے۔"

"ہاں بھئی غلام علی کے ابا سے چھپ چھپا کر ایک چکر ضرور لگا آتی تھی۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کہ دردانہ کا کردار اچھا نہیں تھا۔ گھر میں اس بات پر جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔"

"ارے ستیاناس ہو۔ ان لگائی بجھائی کرنے والوں کا۔ میرے آگے بچے نہیں ہیں مگر خدا لگتی کہتی ہوں جو بھی اس کے بارے میں یہ سب کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔ خدا ان کے آگے لائے۔" بیگم صاحبہ جذباتی ہو گئیں۔

"تو کیا آپ کے خیال میں یہ افواہ غلط ہے۔"

"ایسی ویسی غلط۔ ایک دو سال سے نہیں دس بارہ سال سے دیکھ رہی ہوں میری آنکھوں کے سامنے جوان ہوئی ہے بچی اور اس بات سے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ اس کا کردار کیسا تھا۔"

"درویش آپ کو خوش رکھیں۔ کسی مرنے والے پر الزامات لگانا تو بہت آسان کام ہے لیکن آپ جو نیکی کر رہی ہیں اس کا صلہ آپ کو ضرور ملے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے بھی اس معاملے میں مداخلت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ پھر وہ ان خاتون سے بہت دیر تک معلومات حاصل کرتے رہے تھے اور خاصی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارآمد باتیں معلوم ہوئی تھیں۔

جب وہ وہاں سے چلے تو خاتون نے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی۔ ''بی بی میرے دو کام ضرور کرنا۔ ایک تو یہ کہ امریکا کو ہمارے ملک میں نہیں گھسنے دینا۔ دوسرے تھوڑی سی چینی سستی کرا دو۔ بہت دن ہو گئے ہیں حلوا کھائے ہوئے۔''

''بہرحال صوفی اور رابعہ سلطان کا اچھا خاصا گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ رابعہ سلطان تو غالباً سر پھری ہی تھی جو صوفی جیسے آدمی سے اس طرح متاثر ہو گئی تھی لیکن صوفی اپنے کام کے سلسلے میں اب پوری طرح حرکت میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مزید کارروائی ہونے لگی۔ گرین فورس کے ممبروں کی فی الحال ضرورت نہیں تھی۔ صوفی اپنے طور پر ہی اس ملکے پھلکے مسئلے کو حل کر لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ بے چارے حفیظ کو تو بہن کے قتل کے الزام میں گرفتار کرایا گیا تھا لیکن اس کی ماں کہاں غائب ہو گئی۔

رابعہ سلطان اور صوفی دونوں ہی اس اسپتال پہنچے تھے جہاں دردانہ کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔ اسپتال کی خوب صورت عمارت کی پورچ میں کار رکی تو رابعہ سلطان نے صوفی کا شانہ دبایا اور صوفی کے منہ سے پان کی پچکاری نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''یہ کیا صوفی صاحب آپ اپنے منہ میں اتنا سا ملغوبہ بھرے ہوتے ہیں خدا کے لیے اسے تھوکیے۔ صوفی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسپتال کی خوب صورت عمارت کے فرش پر پان کی پیک تھوک دی۔ رابعہ نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''سامنے دیکھ رہے ہیں۔''

''کک..... کہاں۔''

''وہ اس طرف دیکھیے۔'' صوفی نے ادھر دیکھا تو اسے راجا ناصر نظر آیا اس کا نام رابعہ نے ہی بتایا تھا۔ راجا ناصر ایک ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بھی رابعہ کو دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

''ہیلو رپورٹر! کہو کیسی ہو؟'' یہ کہہ کر اس نے صوفی پر نگاہ ڈالی۔ وہ صوفی کو نہیں پہنچانتا تھا۔ لیکن طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

''تو آج کل یہ ہو رہا ہے۔ ویسے تم سے ملاقات مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ کتنا ہی بچنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ کہیں نہ کہیں ٹکرا ہی جاتی ہو۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ اپنی راہ چلنے والوں کو خاموشی سے فاصلہ طے کرنا چاہیے۔''

''ارے واہ..... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے یعنی ناراض مجھے ہونا چاہیے تھا۔ الٹا تم ہو رہی ہو۔ چھوڑو کسی خاص کام سے آئی ہو۔''

''ہاں آئی تو خاص کام سے ہی تھی۔''

''کیا کام تھا؟''

''تمہیں بتانا ضروری ہے کیا؟''

''نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں، مقصد یہ تھا کہ اگر جلدی نہ ہو تو سامنے والے ہوٹل میں میری طرف سے ایک کپ چائے ہو جائے۔ ویسے یہ صاحب کتنی دیر تک تم سے چپکے رہیں گے دوسری بات یہ کہ یہ صاحب ہیں بھی یا نہیں۔'' صوفی نے صبر و سکون کے ساتھ اس کے جملے سنے تھے۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''میرا تو کوئی مطلب نہیں ہے۔ البتہ چائے ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' رابعہ سلطان نے کسی خاص ارادے کے تحت کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑی۔ صوفی اس کے ساتھ قدم آگے بڑھانے لگا تو راجہ ناصر نے کہا۔

''اوہو..... اوہو..... یہ پکا جوڑ معلوم ہوتا ہے کچھ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان صاحب کو ہم یہیں چھوڑ دیں تھوڑی دیر کے لیے۔''

''پولیس میں رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدمی پاگل پن کی حد تک بداخلاق ہو جائے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔ چائے کا بل میں ادا کر دوں گی اگر تم چلنا چاہو تو۔ ویسے بھی پولیس کے پیسے کی چائے مسلمانوں کو جائز نہیں ہے۔'' رابعہ سلطان نے بھرپور وار کیا لیکن راجا ناصر مسکراتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔

''ریستوران تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھے۔ ایک بار پھر راجا ناصر نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور بولا۔

''میرا خیال ہے جب سے ہماری شناسائی ہوئی ہے ہمارے درمیان کوئی تلخی نہیں ہوئی لیکن یہ دو دن ہمارے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر گئے ہیں۔ کیا کہتی ہو اس بارے میں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' رابعہ نے بے تکلفی سے کہا۔

''وجہ پتا چل سکتی ہے۔''

''آہا..... کیوں نہیں۔ وجہ وہ مظلوم لڑکی دردانہ ہے، جو تم سے اپنے لیے زندگی مانگ رہی تھی اور تم نے بڑی محنت سے موت دے دی۔''

''مگر تمہیں اس کی اتنی پروا کیوں ہے۔''

''دیکھو۔ برا مت ماننا راجا ناصر! ابھی تک میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں لکھا لیکن دردانہ کے قتل کیس میں تمہارا کردار کافی مشکوک ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اس سلسلے میں کافی محنت کر رہے ہو۔'' راجا ناصر نے ایک بار پھر صوفی کی طرف دیکھا جو اپنے خالی منہ کی صفائی کر رہا تھا اور لگتا تھا جیسے اسے ان دونوں کی گفتگو سے کوئی دل چسپی نہیں ہو۔''

''کم از کم معیار کا خیال رکھا کرو۔'' راجا ناصر برا سا منہ بنا کر بولا۔ پھر کہنے لگا۔

''ہاں۔ تو کیا تمہارے خیال میں میں نے دردانہ کا قتل کیا ہے۔''

''نہیں۔ یہ خیال تو نہیں ہے میرا۔ لیکن تم قاتل کی معاونت ضرور کر رہے ہو۔''

''میں قانون کا محافظ ہوں مس دردانہ۔''

''دکھ تو یہی ہے راجا ناصر! قانون عوام کا آخری سہارا ہوتا ہے۔ قانون ہی بے بس انسان کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھال ہوتا ہے۔ میں اس قابل احترام نام کے ساتھ ہر بے کردار انسان کے وجود سے نفرت کرتی ہوں۔ میں قانون اور جرم کو ایک دوسرے کا مخالف ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"واہ۔ واہ۔ واہ۔ بڑی جذباتی تقریر کرلی ہے تم نے۔" راجا ناصر نے ہلکے سے ہاتھ سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ صوفی کو ان دونوں نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا اور صوفی بھی احمقوں کی طرح بیٹھا ہوا یہ باتیں سن رہا تھا۔

"کیا بات کرتے ہو راجا ناصر! جذبات کا تو انسانی زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔ جذبات ہی تو ہمیں اشرف بناتے ہیں۔ ورنہ ہم خود انسان کیوں ہیں۔"

"دیکھو بے بی! اپنے ذہن سے یہ احمقانہ غلط فہمی نکال دو۔"

"کون سی غلط فہمی۔"

"یہی کہ دردانہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔"

"میں نے یہ بات کب کہی۔ ہاں تم نے اس سلسلے میں قاتل کی معاونت کی ہے۔ سوری ڈیئر۔ راجا ناصر اگر تم چاہتے تو اس لڑکی کی مدد کرکے اس کی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا ہے کیا اس کی تفصیل مجھ سے سننا پسند کرو گے۔"

"بالکل سنوں گا۔ ذرا دیکھوں تو سہی محترمہ نے کیا کہانی بنائی ہے۔"

"کہانی ایک سچ ہے۔ بارش کی اس شام دردانہ تمہارے پاس آئی اور اس نے تمہیں اپنی تباہی کی داستان سنائی۔ لیکن اس داستان میں اس نے ایک ایسی شخصیت کا ذکر کیا جس کا نام سن کر تم بے بس ہوگئے۔ کیوں کہ اس پر ہاتھ ڈالنا تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ تم نے اس لڑکی کو پاگل قرار دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تم نے مناسب سمجھا کہ اپنے دوستوں کو اس خطرناک بات کی اطلاع دے دو۔ لڑکی کسی دوسری جگہ بھی پہنچ سکتی تھی وہ تمہارے دوستوں کا نام بھی لے سکتی تھی چنانچہ تم اپنی جگہ سے اٹھے تم نے سامنے والے ہوٹل سے فون کیا۔ میرے پاس اس کا مکمل ثبوت موجود ہے راجا ناصر۔ بہرحال تمہارے دوستوں نے تمہیں جواب دیا ہوگا کہ تم فکر مت کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور پھر سب ٹھیک ہوگیا۔ لیکن بدقسمتی سے میں درمیان میں پہنچ گئی اور آپ نے میری توجہ ہٹانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ جب میں وہاں سے نکل آئی تو آپ کے ذہن میں تشویش پیدا ہوئی اور لاش کے پاس میرے فوراً بعد آپ خود پہنچ گئے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اس بدنصیب خاندان کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ حفیظ کی ماں کو یہ کہہ کر اغوا کرلیا گیا کہ ان کی بیٹی اسپتال میں ہے اور وہ بے چارے گھر سے نکل آئے۔ تب حفیظ پر الزام لگایا گیا تاکہ کیس ختم ہو جائے۔ مجھے بتایئے راجا صاحب حفیظ کی ماں کہاں ہے؟ بتایئے مجھے۔" رابعہ سلطان کا لہجہ جذباتی ہوگیا اور صوفی نے صاف محسوس کیا کہ راجا ناصر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا البتہ اب اس کا چہرہ کرخت ہوگیا۔ اس نے کہا۔

"رابعہ تم صحافی ہو۔ کرائم رپورٹر ہو تم۔ کرائم رپورٹر اور پولیس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن جو الزامات تم نے مجھ پر لگائے ہیں کیا اس کے بعد بھی تم یہ توقع رکھتی ہو کہ مستقبل میں تم سے کوئی تعاون کروں گا۔"

"سنو...... میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا ہے اس بارے میں لیکن میں ایک عمدہ فیچر تیار کرنے پر غور کر رہی ہوں۔"

"ویری گڈ...... اب اس کا مطلب ہے تم پولیس کو بلیک میل کرو گی۔"

"نہیں...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ دردانہ کے قاتل کو منظر عام پر لایا جائے۔"

"ہوں...... ضرور لاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا رابعہ سلطان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ راجا ناصر بار بار صوفی کی شکل دیکھنے لگتا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ان صاحب کا کچھ تو تعارف کراؤ۔ کون ہیں آخر یہ۔"

"اگر ضروری سمجھتی تو کرا دیتی فی الحال یہ سمجھ لو کہ یہ بے چارے اندھے گونگے اور بہرے ہیں۔"

"واہ۔ گونگے اور بہرے کی بات مان لیتا ہوں لیکن اندھے تو نہیں ہیں یا پھر تم نے اخلاقاً انہیں اندھا بنا دیا ہے۔" ویٹر نے چائے کے برتن لاکر رکھے اور راجا ناصر کہنے لگا۔

"بڑی اچھی چائے ہے شکر ذرا زیادہ ڈال دیتا تاکہ زبان میں مٹھاس پیدا ہو جائے۔ ویسے بی بی بعض اوقات انسان خود اپنی ذہانت سے شکست کھاتا ہے۔ چائے پیو، گھر جاؤ اور آرام کرو۔ ہاں مجھے اجازت دو۔ میں تمہارے لیے نیک جذبات رکھتا ہوں۔ ورنہ تمہاری اس تلخ گفتگو کو برداشت نہ کر پاتا۔" راجا ناصر نے جیب سے بل کی رقم نکال کر رکھ دی اور اٹھ گیا۔ رابعہ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ۔ کیا بات ہے۔ بڑے آدمی ہو دوسروں کو اس طرح چائے پلا دیتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے ہم تو چائے پی کر ہی جائیں گے ویسے ایک بات سن جاؤ دردانہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بات درج نہیں کی گئی ہے کہ اس کی آبروریزی کی گئی لیکن میں نے اس کا ثبوت حاصل کرلیا ہے۔ کیا سمجھے۔" رابعہ سلطان کے ان الفاظ پر صوفی کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن راجا ناصر کے قدم رک گئے تھے۔

اس دوران رابعہ سلطان نے صوفی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آیئے صوفی صاحب! کسی اچھے ہوٹل میں چائے پئیں گے کیا گھٹیا جگہ ہے۔ آیئے......" صوفی خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت یہ لڑکی اسے بڑی اچھی لگی تھی۔ پھر رابعہ سلطان نے کہا۔

"اب کیا کہتے ہیں صوفی صاحب۔"

"واپس۔" صوفی نے کہا رابعہ سلطان کار تک پہنچ گئی۔ وہ غور سے صوفی کا چہرہ دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے صوفی صاحب کہ ہمیں اس سلسلے میں کام کرنا ہے۔ آپ نے راجا ناصر کا رویہ دیکھ لیا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ میرا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے ساتھ ہوں تو پھر کسی کی ہمت نہیں پڑے گی۔"

"درویشوں کی دعا ہے۔"

"ہاں ہاں...... سوری میں یہ کہنا بھول گئی تھی۔" رابعہ سلطان مسکرا کر بولی۔

"بس مجھے یہیں اتار دیجیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں خیریت؟"

"وہ سامنے فرقان جلیل صاحب کا آفس ہے ان سے مل کر جاؤں گا۔" صوفی نے جواب دیا۔

"میرا سلام کہہ دیجیے گا۔" رابعہ سلطان نے کہا اور صوفی وہیں اتر گیا۔ رابعہ سلطان آگے بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی فرقان جلیل کے آفس میں داخل ہو گیا۔ فرقان جلیل نے اس کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ شعر کہنا عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اتنا گھس پٹ گیا ہے مگر تعجب کی بات ہے شاعروں نے اس سے اچھا شعر آج تک کہا ہی نہیں۔ میں اس شعر کی بات کر رہا ہوں کہ۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"

"سلام عرض کرتا ہوں۔" صوفی نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ صوفی صاحب! آیئے تشریف رکھیے۔ کہیے کہاں سے آ رہے ہیں۔"

"آپ مصروف ہیں۔"

"بالکل نہیں۔ آپ کی آمد سے بے پناہ خوش ہوں۔"

"میں رابعہ سلطان کے ساتھ اسپتال گیا تھا۔ وہ اپنے طور پر کام کر رہی ہے۔ ذرا اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"صوفی صاحب! وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ بڑی پرجوش، بڑی باہمت دعائیں ہی کر سکتے ہیں ہم اس کے لیے کہ جس جوش و خروش کے ساتھ وہ اس دنیا میں ہنگامہ کرنے نکلی ہے اور کر رہی ہے اس کے لیے اللہ اس کی حفاظت کرے۔ ابھی تو اصل میں لڑ رہی ہے اور کہیں ایسی جگہ جا کر نہیں ٹکرائی جہاں اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن آپ جانتے ہیں صوفی صاحب کہ کون سا دور چل رہا ہے۔ غلط کام کرنے والوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں سب کچھ کر ڈالتے ہیں وہ اور مخالفوں کو آسانی سے زیر کر لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بہرحال میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ وہ بہت پرجوش ہے۔"

"جی صوفی صاحب! لیکن ایک بات آپ سے عرض کروں۔ بہت اچھی لڑکی ہے میں نے بڑی امیدوں سے اسے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ آپ کا اپنا کیا خیال ہے اور پھر ویسے بھی صوفی صاحب جو بیڑا آپ نے اٹھایا ہے۔ یہ کیس سو فی صدی اس پر پورا اترتا ہے۔ اگر آپ اس کی مدد کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج کے مطابق بات ہے۔"

"درویش سب پر رحم کریں۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ ویسے رابعہ سلطان کے مسئلے میں تھوڑی سی اور معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا میں آپ سے۔"

"ارشاد..... ارشاد۔" فرقان جلیل نے کہا پھر صوفی کافی دیر تک اس سے رابعہ سلطان کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا۔

رابعہ سلطان کے بارے میں جو کچھ فرقان جلیل نے بتایا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اس کے جوش و خروش کا عالم دیدنی تھا اور اس سلسلے میں جو کچھ وہ کر رہی تھی وہ سمجھ دار لوگوں کے لیے بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس نے اپنے

ایڈیٹر کو فون کیا اور اطلاع دی کہ کل کے اخبار میں دردانہ کے قتل کے سلسلے میں ایک خصوصی رپورٹ شائع کرنی ہے۔ وہ اس کے لیے تیاریاں مکمل کر لیں۔

"ٹھیک ہے تم دیکھو..... ظاہر ہے جو چیز اخبار کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی ہم اسے اولیت دیں گے۔" ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں انہیں رابعہ سلطان کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال رابعہ سلطان کام میں مصروف ہو گئی اور اس کے بعد شام کو پانچ بجے وہ اپنا مضمون لے کر ایڈیٹر صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ وہ تصویریں بھی تھیں جو اس نے خصوصی طور پر اس وقت بنائی تھیں جب دردانہ کو قتل کیا گیا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے غور سے رابعہ سلطان کا لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ پھر انہوں نے مضمون ختم کر کے گہری نگاہوں سے رابعہ کو دیکھا اور بولے۔

"کافی سخت ہے۔!"

"ہاں مجھے اندازہ ہے لیکن جناب! ہمارے اخبار کی پالیسی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت مضبوط ہے۔ ہم ہمیشہ حقائق کا تجزیہ کر کے انہیں پیش کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اس سے ہم دشمنی خرید لیں گے۔" ایڈیٹر صاحب بولے۔

"دوستوں کے درمیان تو زندگی آرام سے گزر جاتی ہے سر! لیکن میں سمجھتی ہوں کہ دشمنوں کے بغیر جینے میں کیا خاص مزہ ہے اور پھر ہم تو سچ کی حمایت کرتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں حقیقت سے آنکھیں چرا کر بیٹھ جانا اچھی بات ہے۔ یہ سب کچھ اسی طرح شائع کیا جائے گا۔ براہ کرم اس میں کوئی ردوبدل نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" دوسرے دن وہ تمام تفصیل شائع ہو گئی۔ عنوان تھا دردانہ کا قتل اہل دل کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس کے بعد مقتولہ کی ایک نمایاں تصویر تھی جس میں کچلی ہوئی پڑی تھی۔ پھر لکھا تھا۔

آسمان پر جب بھورے بادلوں کے غول مٹرگشت پر نکلتے ہیں اور ہوائیں ان کی نمی سے متاثر ہو کر اہل زمین کے دلوں میں امنگیں جگاتی ہیں تو زمین پر بسنے والے مختلف کیفیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاعر آرزو کرتا ہے کہ اے ابر کرم آج اتنا برس کہ اس کے محبوب کو واپسی کے لیے سواری نہ ملے۔ ادیب اپنی محبوبہ کے بھیگے بدن اس کی گالوں پر بہتے ہوئے پانی کی قطار سمیٹنے لگتا ہے۔ صاحب زر شراب و کباب کی محفل جما لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں آسمان سے شراب برس رہی ہوتی ہے۔ ان سے چھوٹے لوگ گرم گرم کافی کی بھاپ سے مست ہو جاتے ہیں اور ان سے بھی چھوٹے کسی ٹپکتے ہوئے چھپر کے نیچے بیڑی کے کش لے کر ہی خود کو مطمئن کر لیتے ہیں، لیکن زمین مسائل کی ماں ہے اور ابر کرم بعض انسانوں کے لیے نہ جانے کیا بن جاتا ہے۔ شاید موت کا پیغام بر بھی۔ یہ موت کہیں بجلی کے ٹوٹے ہوئے تار کے کرنٹ سے واقع ہوتی ہے۔ کہیں کھلے گٹر میں گر کر جن میں پانی بہ رہا ہوتا ہے۔ کہیں کسی بوسیدہ چھت کے بیٹھ جانے سے، لیکن افسوس بارش کی اس حسین شام میں دردانہ قتل کر دی گئی۔ اسے بجلی کے کرنٹ نے نہیں، کھلے ہوئے گٹر نے نہیں، کسی بوسیدہ چھت نے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انہوں نے ابر کرم کی رحمتوں سے بھیگی ہوئی سنسان سڑک پر دردانہ کو کچل کر ہلاک کر دیا اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ دردانہ کوئی سماجی یا سیاسی شخصیت نہیں تھی۔ معمولی سے گھر میں اپنی ماں اور زیر تعلیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی کی کفیل ایک غریب لڑکی تھی۔ لیکن یہ غریب لڑکی کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر جب اس ہوس پرست کے لیے خطرہ بنی تو اس کے احتجاج پر دردانہ سے زندگی چھین لی گئی۔ بدنصیب دردانہ کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس ہوس پرست کا راز لے کر نکلی تو بھاگی ہے لیکن اس کی زندگی چند لمحوں کی مہمان ہے۔ چناں چہ اس نے تھانے کا رخ کیا۔ اس نے قانون کے محافظ کے حضور پہنچ کر اپنی زندگی کو لاحق خطرے سے آگاہ کیا، لیکن وہ محافظ بھی سحر زدہ تھا، اس کے سامنے جس بڑی شخصیت کا تذکرہ کیا گیا اس نے اسے بے حس بنا دیا۔ چنانچہ اس لڑکی کو تحفظ دینے کے بجائے نکال دیا۔ اسے موت کے بے رحم سایوں کے حوالے کر دیا اور دردانہ پر کیے گئے ظلم و ستم کی داستان قبرستان میں دفن ہو گئی۔ ہم قانون کے محافظوں پر کوئی الزام تراشی نہیں کرتے، لیکن چند بنیادی سوالات ہیں جن کی جواب دہی مشکوک ذہنوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔ سوال نمبر ایک یہ ہے۔

بارش میں بھیگتی ہوئی ایک لڑکی اگر کسی قانون کے محافظ سے جا کر یہ فریاد کرے کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور اس کی زندگی خطرے میں ہے تو کیا محافظ کے سینے میں اس کا فرض نہیں جاگنا چاہیے۔ کیا یہ اس پر لازم نہیں کہ محافظ اس کی دادرسی کرے اور اسے بہ حفاظت اس کے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کرے کیا ایسی لڑکی کے لیے قانونی تحفظ ضروری نہیں تھا۔

سوال نمبر دو.....

دردانہ کے قتل کے سلسلے میں اس کے بھائی حفیظ کو گرفتار کیا گیا ہے اور اس پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا ہے۔ پولیس اگر اس کی بدچلنی کا ثبوت پیش کرے اور اعلیٰ حکام اس سلسلے میں کسی جانب داری کے امکان کو نظر انداز نہ کریں۔ اہل محلہ اور دوسرے افراد کو مکمل جانی تحفظ دے کر ان سے درخواست کی جائے کہ وہ دردانہ کے کردار پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

سوال نمبر تین.....

اہل محلہ کے بیان کے مطابق دردانہ ایک شریف الطبع لڑکی تھی اور کہیں ملازمت کرنے جاتی تھی۔ متعلقہ حکام یہ معلوم کریں کہ وہ کہاں ملازمت کرنے جاتی تھی۔ یہ بات اس کی ماں اور بھائی بہ آسانی بتا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکام ان دونوں کی زندگی کو تحفظ فراہم کریں کیوں کہ وہ جنہوں نے خود کو چھپانے کے لیے دردانہ کو قتل کیا ہے۔ دردانہ سے متعلق ہر ثبوت کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال نمبر چار

واقعات کی تفتیش دیانت دار افسروں کے سپرد کی جائے اور ان پر پوری نگاہ رکھی جائے۔ دردانہ کے بھائی حفیظ کے بیان پر خاص طور پر توجہ دی جائے اور اس بارے میں چند باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے مثلاً یہ کہ کیا کسی بدچلن بہن کے قتل کے لیے کوئی سیدھا سادا کم سن نوجوان اتنی گہری پلاننگ کر سکتا ہے۔ کیا دردانہ کو سڑک پر ہلاک کرنے کی کوشش اور وہ بھی اس وقت جب وہ قانونی تحفظ سے ناکام ہو کر واپس آ رہی تھی۔ حفیظ جیسے معمولی انسان کی کوشش قرار دی جا سکتی ہے جو ابھی خود طالب علم ہے اور بہن کی کفالت پر گزارہ کر کے اپنا مستقبل تعمیر کر رہا ہے۔ دردانہ کی ماں اپنے بیٹے کے بارے میں بہتر طور پر بتا سکتی ہے بشرطے کہ وہ اس قابل رہے۔

سوال نمبر پانچ.....

دردانہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اعلیٰ حکام اس رپورٹ کے حصول کے بعد مناسب رائے قائم کر سکتے ہیں اگر ضرورت پیش آئے تو دردانہ کی لاش دوبارہ نکلوا کر اس کی رپورٹ حاصل کی جائے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ قانونی حصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ورثا کی تلاش کے بغیر چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی لاش کو دفنا دیا گیا۔ کیا اسے سرد خانے میں رکھ کر مقتولہ کے ورثا کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ چند معمولی نکتے ہیں لیکن عوام کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پر توجہ دی جائے تاکہ اہل زر اپنی درندہ صفت کارروائیوں کے بعد بھی محفوظ رہ کر من مانی نہ کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان انکشافات کی روشنی میں مقتولہ دردانہ کی تفتیش کو نئے سرے سے شروع کیا جائے تاکہ ہر خاص و عام کے ذہن میں اپنے جان و مال کے تحفظ کا یقین پیدا ہو اور دردانہ جیسی بے بس لڑکیاں کوٹوں کھدروں میں منہ نہ چھپاتی پھریں اور بے شمار گھرانے فاقہ کشی کا شکار ہو کر زندگی سے محروم نہ ہو جائیں۔"

یہ وہ تفصیلی رپورٹ تھی جس کے بارے میں خود رابعہ سلطان کا اندازہ تھا کہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری ڈالی گئی ہے اور نتیجے میں جو دھماکے ہوں گے معمولی نہیں ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی اور اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ سب سے پہلے اس کے پاس آنے والا راجا ناصر ہی تھا، جس کا چہرہ انتہائی خشک ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو وہ بے لگام اونٹ کی مانند اندر گھسا چلا آیا۔ لیکن رابعہ سلطان نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو بالکل تیار رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔"

"اپنی اوقات سے بڑھ کر جسارت کی ہے تم نے، میں نے تمہیں ہمیشہ دوستانہ انداز میں خوش آمدید کہا تھا لیکن اب تمہیں میری دشمنی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔"

"دشمن ہو تو تم جیسا راجا ناصر! جو پہلے سے دشمنی کی اطلاع دے دیتا ہے۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس دشمنی کی ابتدا کیوں کی ہے۔"

"مظلوم دردانہ کی حمایت میں جسے تمہارے تعاون سے قتل کر دیا گیا۔"

"اور میں تمہارے اس خیال کی پہلے بھی تردید کر چکا ہوں۔ میں صرف پولیس انسپکٹر ہوں میرا دائرہ کار محدود ہے۔ تم جانتی ہو جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے سلسلے میں تم نے بہت بڑے لوگوں کی دشمنی مول لی ہے۔"

"کام کی بات کرو راجا ناصر! تم اگر چاہو تو مجھ سے سودا کر سکتے ہو۔"

"تم سے....." وہ حقارت سے بولا۔

"ہاں ظاہر میرے پاس اسی لیے آئے ہو تم۔"

"خوش فہمی سے نکلو محترمہ رابعہ سلطان! تم بھی اس وقت وہاں موجود تھیں۔ جب پولیس نے پہلی بار لاش دیکھی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حادثہ تمہاری ہی گاڑی سے ہوا ہو۔" راجا ناصر نے کہا اور رابعہ ہنس پڑی۔

"بہت پریشان لگ رہے ہو۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اسی پریشانی کے عالم میں کہی جا سکتی ہیں۔"

"مطلب....."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹھو..... بیٹھو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی بڑے آدمی سے پالا پڑا ہے بیٹھو کیا پیو گے۔ بہر حال دشمن ہی سہی گھر پر آئے تو ہو اور پریشان بھی ہو۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔''

''میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں سمجھیں۔'' راجا ناصر طیش میں آ گیا اور رابعہ سلطان کے بھی تیور بدل گئے۔ اس نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولی۔

''مردوں کی سی ایک بھی بات نہیں ہے تمہارے اندر راجا ناصر اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارا ضمیر مجرم ہے۔ عمل کرنے والے صرف دھمکیاں نہیں دیتے عمل کرتے ہیں۔ اگر تم ایسی کوشش کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ لیکن یہ بھی میں تمہیں بتا دوں کہ اس کے نتیجے میں تم اپنے قدموں پر واپس نہیں جا سکتے میں خود تمہیں کسی اسپتال پہنچا دوں گی سمجھے۔ غصے کے مارے راجا ناصر کا برا حال تھا۔ غصے کی انتہا نے اسے نڈھال کر دیا۔ سمجھ دار آدمی تھا اس لیے فوراً ہی اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور رابعہ سلطان کو گھورتے ہوئے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رابعہ سلطان اسے دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے کہا۔

''آخر تم کس بل پر اتنے بڑے اقدامات کر رہی ہو۔ تمہارا لہجہ اتنا ٹھوس کیوں ہے۔ کیا صرف اس اخبار کے بل پر! زندگی اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے رابعہ! زندگی کو یوں گنوا دینا زندگی کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔''

''پھر وہی دھمکیاں..... دیکھو میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں کہ یہ دھمکیاں تمہارے حق میں بہتر نہیں ہیں۔''

''تمہیں میری پہنچ کا اندازہ بہت جلد ہو جائے گا سمجھیں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گی تم، یہ بھی نہیں کہ وہ تھانے آئی تھی اور میں اس بات سے واقف تھا۔''

''میں نے کسی بنیاد پر یہ بات لکھی ہے راجا ناصر۔''

''میں اس بنیاد کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم جو کچھ جاننا چاہتے ہو وہ فی الحال میں تمہیں بتانے سے رہی۔ ہاں عدالت میں اپنی معلومات کا نچوڑ پیش کر دوں گی۔ بات براہ راست چوں کہ تم تک پہنچی ہے اس لیے تم ایسا کرو کہ پولیس کی طرف سے اخبار پر مقدمہ قائم کرو۔''

''یہ بھی ہو جائے گا اور اس سے پہلے اور بھی بہت کچھ، لیکن یقین کرو اس بہت کچھ میں میرا ہاتھ نہیں ہوگا۔''

''چلو پھر یہی بتا دو کہ کس کس کا ہاتھ ہوگا۔'' رابعہ نے کہا اور راجا ناصر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر گردن ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے تم خود بھگتو گی مجھے کیا۔''

''کیا تمہارے یہ کرم فرما تمہارا تحفظ نہیں کریں گے۔'' رابعہ نے سوال کیا۔

''میری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔''

''تب پریشانی کس بات کی ہے۔ تمہارے کرم فرما تم سے ان غلطیوں کی باز پرس ضرور کریں گے

اور تمہیں ایک بار پھر اس کی سزا دیں گے کہ تم نے ذہانت سے کام کیوں نہیں کیا اور یہ اس وقت ہوگا جب میں انہیں عدالت میں بے نقاب کروں گی۔'' راجا ناصر ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ وہ سخت ذہنی ہیجان کا شکار نظر آ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''اس کے علاوہ بھی اور کچھ ہو سکتا ہے۔'' رابعہ سلطان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''تم اپنی ان ذمے داریوں کو ایمانداری سے نبھاؤ۔ جھوٹ کے بجائے سچ کا ساتھ دو، میں تم سے تعاون کروں گی۔ حفیظ کی گردن پھندے سے نکال دو یہ تم کر سکتے ہو۔ مجھے اس کی ماں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کہاں ہے اور مجھے دردانہ کے قاتلوں کے بارے میں بھی بتاؤ۔'' راجا ناصر جھٹکے سے اکھڑ گیا اور کھڑا ہو کر بولا۔

''اب میں اتنا مجبور بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ سمجھیں اور دوبارہ تم سے ملاقات نہیں کروں گا۔''

''خدا حافظ۔'' رابعہ سلطان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

بہر حال یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس نہیں تھا، اسے کسی اور ہی کا انتظار تھا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا چناں چہ اس کی کار سڑکوں پر چکرانے لگی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو وہ صوفی کے گھر کی جانب چل پڑی۔

لیکن وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ صوفی کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن صوفی گھر پر موجود نہیں تھا۔ نتیجے میں سمن خاں کے ہوٹل تک پہنچنا پڑا۔ سمن خاں کے ہوٹل پر اس کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ کیوں کہ اسے صوفی کے ہاں پہلے بھی آتے جاتے دیکھ لیا گیا تھا۔ رابعہ سلطان کو ایک انوکھے منظر کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر شخص اس کی راہ میں بچھا جا رہا تھا لیکن دل چسپ بات یہ تھی کہ کسی کے چہرے پر اس کے لیے کوئی برے تاثرات نہیں تھے۔ اسے بہن، بیٹی اور باجی کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا۔

''میں صوفی صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''گئے ہوئے ہیں، گھر پر نہیں ہیں، یہ نہیں پتا کہ کہاں گئے ہوئے ہیں۔''

''مگر گھر کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''پیاری بہن جس گلی میں تم آئی ہو نا اس میں کسی بھی کھلے دروازے سے تم اندر داخل ہو جاؤ۔ ضروری نہیں ہے کہ گھر کا رہنے والا موجود ہو۔ ہم لوگ گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے، ہر دروازہ کھلا ہی ہوا ہوتا ہے۔''

''یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ صوفی صاحب کہاں ملیں گے۔''

''افسوس یہ نہیں معلوم۔''

رابعہ سلطان وہاں سے واپس چل پڑی تھی۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

ادھر صوفی نے بھی رابعہ سلطان کا تحریر کردہ مضمون پڑھا تھا اور تشویش میں ڈوب گیا تھا۔ اس وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گرین ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل رحیم شاہ ملک سے باہر جا چکا تھا۔ باقی ساری ذمے داریاں صوفی کے کندھوں پر آ پڑی تھیں۔ اس وقت شازیہ، دلاور اور غلام قادر صوفی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام قادر نے کہا۔

''اڑے ماں قسم چھوٹا بابا۔ ابھی تمہارا چہرہ مہرہ اترا ہوا نظر آ رہا ہے ابھی میرے کو سچ سچ بتاؤ کوئی پریشانی ہے تمہارے کو۔ صوفی نے جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کیا۔ ڈبیا نکال کر سامنے رکھی تو شازیہ ہنس کر بول پڑی۔

''چھوٹے بابا کے پاس شاید پان ختم ہو گئے ہیں۔''

''نہیں پانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''تو پھر کیا بات ہے غلام قادر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

''میں آپ کو ایک بات بتاؤں چھوٹے بابا۔ کبھی کبھی ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اور بڑے بابا مل کر صرف ہماری پرورش کر رہے ہیں، ہمارے اخراجات ادا کر رہے ہیں، آپ ہمیں کسی بڑے کام کا موقع ہی نہیں دیتے، آپ نے جس طرح ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ گرین فورس کے ممبروں کی حیثیت سے ہماری ذمے داریاں کچھ اور ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

''درویش تم سب لوگوں کو اپنی پناہ میں رکھیں۔''

''بے شک آپ کی دعائیں بھی ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ چھوٹے بابا لیکن جو احتجاج ہم آپ سے کر رہے ہیں۔ کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

''تن نہیں..... کیوں نہیں..... مم..... مگر، میں.....''

''ہم جانتے ہیں کہ چھوٹے بابا۔ آپ بہت ذہین ہیں، بہت ہی زبردست کردار کے مالک ہیں آپ۔ آپ چٹکی بجا کر سارے مسائل حل کر لیا کرتے ہیں، لیکن چھوٹے بابا ہمیں بھی تو کسی مرض کی دوا سمجھیں۔ کچھ ذمے داریاں دے کر تو دیکھیں۔ آپ کے یہ خادم ذمے داریوں کو پورا کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔''

''کک..... کیوں نہیں، کک..... کیوں نہیں درویشوں کی دعاؤں سے تم ذہین لوگ ہو۔ یہ بات میں جانتا ہوں۔''

''تو پھر ہماری ذہانت کو کبھی آزمایا کیوں نہیں جاتا۔''

''میری پریشانی کی وجہ جاننا چاہتے ہو۔''

''ہاں چھوٹے بابا آپ بتائیے ہمیں۔''

''تو پھر اخبار کا یہ مضمون پڑھو۔'' صوفی نے کہا اور اخبار ان کے سامنے رکھ دیا۔ تینوں اخبار پر جھک گئے تھے۔ یہ سارا مضمون انہوں نے پڑھا اور اس کے بعد سوالیہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھنے لگے تب صوفی نے انہیں رابعہ سلطان کی آمد، وکیل فرقان جلیل کی سفارش اور باقی تمام چیزوں کے بارے میں بتایا پھر بولا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں اس مسئلے میں تمہاری ذہانت کو آواز دیتا ہوں۔ بتاؤ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' تینوں خاموشی سے بیٹھ گئے تھے پھر شازیہ نے کہا۔

''چھوٹے بابا۔ آپ ہم تینوں کو مشاورت کا موقع دیجیے۔''

''میں چلا جاتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ایک پان کھانا چاہتا ہوں۔ پان ختم ہونے سے پہلے آپ لوگوں کو میرے پاس آ جانا چاہیے۔ کیوں کہ میں سنجیدگی سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون جس لڑکی نے لکھا ہے میرا مطلب رابعہ سلطان سے ہے۔ میں جانتا ہوں اس کی زندگی اب خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں تھوڑا سا موقع دیجیے اور اس کے بعد صوفی ایک دوسرے کمرے میں جا بیٹھا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ رابعہ سلطان کی طرف سے پریشان تھا یہ لڑکی جذباتی تھی لیکن پرجوش تھی اور جو کچھ اس نے لکھا تھا وہ بہت ہی خوف ناک تھا۔

♥.....♥.....♥

شازیہ کا انتخاب گرین فورس کے لیے بڑی اہم حیثیت رکھتا تھا۔ اب تک گرین فورس نے جتنے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ ان کے سلسلے میں تمام بیرونی معاملات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی شخصیت شازیہ ہی کی تھی۔ یہ بات ان لوگوں نے بالکل سچ کہی تھی۔ غلام قادر بے شک ایک عام سطح کا انسان تھا، لیکن ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اپنے طور پر وہ بہت ذمے دار آدمی تھا اور کام کرنا جانتا تھا۔ دلاور جرم کی دنیا کا انسان تھا اور بے شک جرائم کرنا بھی معمولی بات نہیں ہوتی۔ پوری پلاننگ کرنی پڑتی ہے۔ عادل اور فیضان اس وقت سردار گڑھ میں تھے۔ وہ گرین فورس کی ٹیم میں ایک طرح سے بس سفارشی حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے آج تک کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ اس کا اندازہ کرنل رحیم شاہ کو بھی تھا، لیکن کرنل رحیم شاہ کا کہنا تھا کہ آخر کار وہ تجربہ حاصل کر لیں گے۔

ان لوگوں نے جو منصوبہ بندی کی تھی بہت شان دار تھی اور تھوڑا ہی وقت گزارنے کے بعد اسے بڑی کامیابی مل گئی تھی۔ اس نے وہ ٹھکانا معلوم کر لیا تھا جہاں دردانہ کی ماں کو رکھا گیا تھا۔ غلام قادر اور دلاور بھرپور طریقے سے شازیہ کی معاونت کر رہے تھے۔ اس وقت سب سے پہلی بات یہ تھی کہ حفیظ کی ماں کو بچانا ضروری تھا۔ یقینی طور پر بوڑھی عورت کو کوئی ایسی بات بھی معلوم ہو سکتی تھی جو انتہائی کارآمد ثابت ہوتی۔ اس وقت وہ دشمنوں کی تحویل میں تھی اور طاقت ور ہاتھ اور نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بہر حال اب اسے بازیاب کرانا تھا۔ چناں چہ شازیہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ پونے گیارہ بجے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑوں کی الماری سے اس نے مخصوص لباس نکالا۔ چند اہم چیزیں پرس میں رکھیں اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اپنے کام کے سلسلے میں وہ ہمیشہ مستعد رہا کرتی تھی اور یہ اس کا مخصوص طریقہ کار تھا اس وقت سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ اکا دکا کاریں رکشا یا موٹر سائیکلیں نظر آ جاتی تھیں۔ تھوڑی دور تک شازیہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ تعاقب کا اندازہ کرتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اس نے کار کا رخ اس مخصوص اسپتال کی جانب کر دیا جس کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ دردانہ اور حفیظ کی ماں کو وہاں رکھا گیا ہے۔ اسپتال کی سفید عمارت روشن تھی۔ کمپاؤنڈ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شعبہ حادثات بھی کھلا ہوا تھا اور لوگ آتے جاتے بھی نظر آ رہے تھے۔ شازیہ نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پارکنگ سائیڈ پر کار روکی اور اسے لاک کر کے نیچے اتر آئی۔ پھر وہ پروقار انداز میں چلتی ہوئی ریسپشن پر پہنچ گئی۔ ایک نوجوان کلرک نرس سے گفتگو میں مصروف تھی۔ شازیہ کی مداخلت پر دونوں خاموش ہو کر شازیہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''کمرہ نمبر ا کیاون میں جانا ہے۔ براہ کرم کیا آپ مجھے گائیڈ کریں گے۔'' شازیہ نے بڑے پروقار انداز میں کہا اور اس کے اثرات نمایاں طور پر محسوس ہوئے۔ مرد نے کہا۔

''پہلی منزل پر بائیں ہاتھ پر مڑ جایئے۔''

''جی.....'' شازیہ اپنا بڑا ہینڈ بیگ سنبھالے ہوئے مطمئن اوپری منزل کی جانب چل پڑی۔ صاف ستھرا اسپتال تھا۔ کشادہ اور روشن راہ داری میں بائیں جانب مڑتے ہی پہلا کمرا نمبر چوالیس تھا۔ اس ترتیب سے آگے بڑھتی رہی۔ اکیاون نمبر دروازے کے سامنے ایک پولیس کانسٹیبل دیوار سے ٹیک آنکھ بند کیے بیٹھا تھا۔ سامنے سے ایک نرس آ رہی تھی۔ شازیہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ نرس نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی تھی جو بے معنی تھی۔ اس وقت چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ شازیہ راہ داری کے آخری سر پر پہنچ گئی۔ وہاں ایک باتھ روم تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور باتھ روم کا دروازہ بند کر کے اس نے جلدی سے اپنے بدن سے مخصوص لباس اتارا۔ نیچے سفید لیس موجود تھی۔ پھر اس نے نرسوں والی ٹوپی کلپ سے پھنسائی اور گاؤن تہ کر کے ہینڈ بیگ میں رکھا اس کے بعد اس نے بیگ سے ایک خاص چیز نکالی اور بیگ دوبارہ بند کر کے باتھ روم سے نکل آئی۔ سنسنان راہ داری اسے مکمل تعاون کا یقین دلا رہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے پولیس کانسٹیبل کے قریب سے گزری اور اس کے ہاتھ میں دبی اسپرے کی بوتل سے سفید رنگ کی پھوار نکل کر کانسٹیبل کے چہرے پر پڑی۔ کانسٹیبل نے ایک لمحے کے لیے دونوں ہاتھ ہلائے اور پھر اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گر گئے۔

شازیہ اس کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ لیکن اس بار وہ زیادہ دور نہیں گئی اور چند ہی قدم چل کر واپس آئی۔ پھر روم نمبر ا کیاون کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر نیلی روشنی تھی۔ ایک مسہری پر دبلے پتلے بدن کی ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ شازیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسپرے کی ہلکی سی دھار اس کے چہرے پر پھینکی اور اس کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اب وہ اس راہ داری کی دوسری طرف جا رہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس اسے مطلوبہ افراد مل گئے۔ یہ دونوں وارڈ بوائے تھے جو تھکے تھکے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک شاید سگریٹ بھرنے میں مصروف تھا۔ شازیہ کو دیکھتے ہی اس نے چرس کی گولی چھپالی۔

''اٹھو.....'' شازیہ کرخت لہجے میں بولی اور شاید اس کا بگڑا ہوا لہجہ کام کر گیا۔ وہ دونوں چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یس..... یس سسٹر۔'' ایک نے بہ مشکل کہا۔

''اسٹریچر لاؤ۔'' شازیہ نے رخ بدل لیا اور سگریٹ بھرنے والا جلدی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ دیوار سے لگا ہوا اسٹریچر گھسیٹ کر شازیہ کے قریب آیا تو شازیہ دوسری طرف مڑ گئی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگے تھے۔ شازیہ انہیں روم نمبر ا کیاون میں لے گئی۔ کانسٹیبل کی کچی نیند اب خوب گہری ہو گئی تھی اور شازیہ کو یقین تھا کہ وہ کئی گھنٹے تک نہیں جاگ سکے گا۔ وارڈ بوائے چوں کہ غلط حرکت کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے اس لیے ان کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ نرس کا غصہ دور کر دیا جائے۔

چناں چہ وہ شازیہ کے اشارے پر تمام تر عمل کر رہے تھے۔ پھر اس دبلی پتلی مریضہ کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا گیا۔

''چلو نیچے لے چلو ایمرجنسی وارڈ کے قریب۔'' شازیہ نے کہا اور انہیں آگے جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ دونوں بلاچوں چرا ں آگے بڑھ گئے۔ شازیہ نے بوڑھی عورت کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا تھا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ اسٹریچر سے جانے کا راستہ ڈھلوان تھا اور دوسری سمت میں تھا جسے شازیہ نہیں جانتی تھی۔ پھر وہ جس جگہ نیچے اترے وہ ایمرجنسی وارڈ کا عقبی حصہ تھا جہاں کار بہ آسانی لائی جا سکتی تھی اور کسی قدر تاریکی بھی تھی۔

''کہاں لے چلنا ہے سسٹر۔'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''اسے پہچانتے ہو۔'' شازیہ نے اسپرے کی بوتل ان کے سامنے کر دی اور وہ دونوں اسے دیکھنے لگے لیکن پھر اچانک ہی پیچھے ہٹے، کیوں کہ اسپرے کی پھوار ان کے چہروں پر پڑی تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ آنکھیں پھاڑتے رہے پھر دونوں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی شازیہ برق رفتاری سے اپنی کار کی جانب بڑھی۔ پارکنگ لاٹ سے کار نکالی اور چکر کاٹ کر ایمرجنسی وارڈ کے عقب میں آ گئی۔ پھر اس نے بزرگ خاتون کو کار کی عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔ کیوں کہ وہ ہلکے پھلکے جسم کی مالک تھی اس لیے اس میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ شازیہ نے برق رفتاری سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

اسپتال کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے اس کو جس قدر خوشی تھی وہ اسے برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ چھوٹے بابا نے پہلا کام اس کے سپرد کیا تھا اور یہ لوگ بڑی خوشی سے اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ اپنے اس کام میں اس نے دلاور اور غلام قادر کو بھی شریک نہیں کیا تھا، لیکن بہر حال ابھی کچھ اور دوسرے مرحلے بھی تھے۔ اسے بہت سارا کام کرنا تھا۔ آخر کار وہ گرین ہاؤس میں داخل ہو گئی۔

دلاور اور غلام قادر جاگ رہے تھے۔ غلام قادر نے اسے دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''ارے ماں قسم کیا یہی ہے وہ۔''

''ہاں۔''

''کمال ہے۔ دلاور! دیکھا تم نے شازیہ بہن کو۔''

''ہاں۔'' دلاور نے آہستہ سے کہا۔

''وہ معمر عورت کو بڑے احترام کے ساتھ اندر لے آئے تھے۔

''کیا ابھی چھوٹے بابا کو بولنا ہے۔''

''نہیں نہیں ابھی نہیں۔ ابھی ذرا ہمیں ان سے بات چیت کرنی ہے۔ وہ بوڑھی عورت کئی گھنٹے کے بعد ہوش میں آئی تھی اور اس کے منہ سے عجیب و غریب الفاظ نکلے تھے۔ وہ لوگ غور سے اسے سننے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بوڑھی عورت کہہ رہی تھی۔

"فرشتے آسمان سے اترتے ہیں زمین پر ان کے پیر پیلے ہو جاتے ہوں گے۔ قالین بچھا دو جبرائیل علیہ السلام بھی فرشتے ہیں۔ دل کو داغ داغ کر دو، سینہ جلا دو ہوشیار طوفان نوح نہ آ جائے۔ گناہوں سے بچو۔ فرشتے آسمان سے اتر آئے ہیں۔ اسے صاف کرو زمین گندی ہے۔" وہ تینوں معمر عورت کو دیکھ رہے تھے۔ لاور نے آہستہ سے کہا۔

"جس قدر صدمات اسے اٹھانے پڑے ہیں ظاہر ہے اس کی یہ حالت ہونی ہی تھی۔"

"اب کیا کیا جائے۔"

"دیکھتے ہیں۔"

"چھوٹے بابا کو بھی نہیں بتانا اس سلسلے میں۔"

"نہیں بتائیں گے لیکن ذرا تھوڑا سا وقت گزرنے دو۔ میں ابھی اور بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"بہرحال شازیہ اپنے طور پر مصروف تھی ادھر رابعہ سلطان مسلسل کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل کے بعد اس نے بھی پتا لگایا تھا کہ دردانہ اور حفیظ کی ماں کہاں ہیں، لیکن جب وہ اسپتال پہنچی تو کام بگڑ چکا تھا۔ اسپتال میں ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اور اس کی تفصیل یہ تھی کہ اسپتال کے کمرے سے ایک مریضہ کو اغوا کر لیا گیا تھا جس پر باقاعدہ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا اور یہی وہ مریضہ تھی جس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے رابعہ سلطان یہاں تک پہنچی تھی۔ اس وقت خاصی رات ہو گئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہو گئی۔

بہرحال کافی دیر تک اسپتال میں قیام کر کے وہ تفصیلات معلوم کرتی رہی۔ ایک رپورٹر کی حیثیت سے ایسے کام اس کے لیے مشکل نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس کے کاغذات اس کے پاس ہی ہوتے تھے۔ بہرحال وہ وہاں سے واپس پلٹی۔ خاصی رات ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر اداسیوں کا حملہ تھا۔ صوفی نے ابھی تک اس سے رابطہ نہیں قائم کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ صوفی کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہو گئی تھی۔ عام لوگ اگر اس بات کو سنتے تو اسے اس کی دیوانگی ہی کہتے، لیکن دل تو کم بخت دل ہی ہوتا ہے۔ پتا نہیں کس وقت کیا کر بیٹھے۔ رابعہ کے ساتھ شاید ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ صوفی جیسا الم ڈھینگ بھلا اس قابل تھا کہ اس سے محبت کی جائے۔ لیکن انسان کے دل کی بناوٹ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں رابعہ کا جی چاہا کہ کسی طرح ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوں اور پھر اس کے ذہن میں دردانہ کے گھر کا تصور آ گیا۔ کیوں نہ گھر کی باریک بینی سے تلاشی لی جائے۔ اس نے سوچا۔

اور پھر اس کی کار اس طرف چل پڑی۔ وہ خاموشی سے علاقے میں داخل ہو گئی۔ پس ماندہ علاقے میں تاریکی کا راج تھا۔ قرب و جوار میں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ وہ دردانہ کے گھر کے پاس پہنچ گئی۔ خالی مکان سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رابعہ سلطان نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچھل کر صحن کی ایک دیوار پکڑ لی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صحن میں کھڑی ہوئی تھی۔ چھوٹا سے بے نور مکان مکینوں کی تباہ حالی پر رو رہا تھا۔ اس کے اکلوتے کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ رابعہ بے آواز چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی، لیکن اچانک ہی وہ ٹھٹھک گئی۔ تالا کھلا ہوا تھا اور کنڈی میں لٹک رہا تھا۔ یقیناً یہ پہلے بند ہو گا اور یہ دروازہ اس وقت مقفل کیا گیا

ہو گا جب گھر کے مکینوں کو اچانک دردانہ کے حادثے کی اطلاع ملی ہو گی، لیکن اس وقت اس کا کھلا ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ مکینوں کی عدم موجودگی میں کسی نے مکان کی تلاشی لی ہے۔ اچانک ہی اندر سے آواز سنائی دی اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں رابعہ کے ذہن نے خطرے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ادھر ادھر دیکھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ابھی وہ چھپنے کے لیے جگہ کوئی تلاش کر رہی تھی کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کوئی پوری قوت سے اس سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی چمکدار چیز بھی اس کی طرف لپکی تھی۔ لیکن بہرحال کچھ تو تقدیر کا ساتھ اور اس کے علاوہ رابعہ کے اپنے شوق اس کے کام آ گئے جو جسم اس سے ٹکرایا تھا رابعہ نے اس کی ٹکر سے ہی فائدہ اٹھایا اور پھرتی سے ایک سمت لڑھک گئی۔ اس طرح وہ اس لمحے چاقو کے وار سے بچ گئی جو اس کی پسلیوں پر کیا گیا تھا۔ نیچے لڑھکنے کے بعد وہ فوراً سنبھل گئی۔ حملہ آور اب یقینی طور پر سامنے سے حملہ کرنا چاہتا تھا اور رابعہ کے دونوں پاؤں اس حملے کو روکنے کے لیے تیار تھے، لیکن صورت حال بدل گئی۔ حملہ آور اس کی اچانک آمد سے بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کے بجائے صحن کے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور بری طرح دروازے سے ٹکرایا لیکن کسی نہ کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"اس کے پیچھے دوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن یہ قصہ کیا تھا۔ حملہ آور کوئی معمولی چور اچکا تھا جو اکیلا گھر دیکھ کر چوری کی نیت سے گھس آیا تھا یا اسے کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ جس انداز میں اس نے پھرتی کے ساتھ چاقو چلایا تھا اس سے اس کی مہارت کا اندازہ ہوتا تھا لہٰذا اسے کوئی معمولی چور اچکا تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رابعہ چند لمحے اسی طرح دم سادھے اسی طرح پڑی رہی پھر وہ کمرے کی طرف بڑھی اور کھلے ہوئے دروازے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ دیوار پر بٹن لگے ہوئے تھے اس نے ایک بٹن روشن کیا اور مدھم سا پیلا بلب مالکان کی حرماں نصیبی کا اعلان کرنے لگا۔

اندر داخل ہو کر رابعہ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ یہ چوری کی واردات نہیں تھی۔ کمرے کا سامان پھیلا ہوا پڑا تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ کر دی گئی تھی۔ وہ چند لمحے جائزہ لیتی رہی۔ اس نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ باہر سے یہ مکان جس قدر معمولی اور لٹا پٹا ہوا نظر آ رہا تھا اندر سے ایسا نہیں تھا۔ بکھرے ہوئے سامان میں بیش قیمت چیزیں بھی تھیں جن کی موجودگی اس افلاس شدہ مکان میں باعث حیرت تھی۔ اچانک ہی باہر سے پھر کچھ آوازیں ابھریں اور اس کے بعد لوگوں نے چور چور کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ رابعہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کیا ہو گیا۔ اگر یہ لوگ اندر گھس آئے اور انہوں نے رابعہ کو پکڑ لیا تو بعد کی باتیں تو بعد میں ہی ہوتیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مکان کے پچھلی طرف سے گھوم کر اوپر کود گئی۔ تنگ سی گلی میں اس کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے، لیکن اس کی پروا کیے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مکان کی پچھلی طرف سے گھوم کر سامنے کے رخ پر آ گئی۔ رات کی تاریکی نے اس کی پردہ پوشی کی تھی۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد دونوں ہی تھے۔ ان کے درمیان ایک شخص اکڑوں بیٹھا کراہ رہا تھا۔ ایک لمحے تک تو صورت حال رابعہ کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ کمال ہو گیا ہے۔ درمیان میں بیٹھا ہوا شخص زخمی تھا، لیکن وہ لوگ اسے اٹھانے کے بجائے اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بگڑ گیا بھیا..... بگڑ گیا یہ محلہ بھی۔ اب تو یہاں رہنا بس اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔"

"مگر ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔"

"ہونا کیا تھا بھائی محلے کا ماحول بگڑ گیا ہے۔ لونڈے جوان ہو کر برے راستوں پر چل پڑے ہیں۔ جوئے اور سنیما کی لت لگ گئی ہے اور اب تو وہ بھی آ گیا ہے کیا کہتے ہیں اسے انٹر..... انٹرویو"..... کسی نے کہا۔

"اماں نہیں وہ جو آ گیا ہے نا۔ وہ جو لونڈے وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ چلاتے ہیں۔"

"انٹرنیٹ۔"

"ہاں ہاں وہی۔ اب بتاؤ یہ حرکتیں نہیں کریں گے تو کیا کریں گے۔"

"یہ محمود ہے نا۔ اسے کیا ہو گیا۔" کسی نے درمیان میں بیٹھے ہوئے زخمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بس ہوا کچھ نہیں۔ یہاں بے چارہ پیشاب کرنے بیٹھا کہ کوئی حفیظ کے گھر سے نکل کر اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو چاقو مار گیا۔"

"ارے کہاں گیا؟ کون تھا؟"

"اپنا نام اور پتا بتا کر نہیں گیا ورنہ تو میں ضرور بتا دیتا۔" سوال کرنے والوں کو تلخی سے جواب دیا گیا۔

"محلے ہی کا کوئی لونڈا ہو گا کسی باہر والے کی کیا مجال ہے کہ ہمارے علاقے میں آ جائے۔ اچھا اسے دفع کرو۔ اسے تو اٹھاؤ بے چارے کو یہ زخمی بیٹھا ہوا ہے کہاں لگا ہے چاقو۔" رابعہ سلطان نے ایک گہری سانس لی۔ اب وہ اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اہل محلہ کو یقین تھا کہ اس مکان میں چوری کی گئی ہے۔

بہر حال وہ وہاں سے نکل آئی اور اپنی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر دیا۔ کیچڑ سے آلودہ جوتے پیروں میں سخت تکلیف دے رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ان سے نجات حاصل کی اور انہیں اتار کر باہر پھینک دیا۔ پھر وہ ننگے پاؤں کار ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی رہائش گاہ تک آ گئی تھی۔

نہ جانے کیوں دل کو ایک شدید اداسی کا احساس ہو رہا تھا اور یہ سوچ رہی تھی وہ کہ کیا اس سلسلے میں واقعی اسے کوئی کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ وہ لوگ حد سے زیادہ چالاک تھے اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس مکان کی تلاشی لینے میں دیر ہو گئی تھی یقیناً وہاں کوئی ایسی چیز موجود تھی جس سے واقعات پر روشنی پڑ سکتی۔ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کاش! کچھ پتا چل سکتا۔

بہر حال اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اخبار کے لیے آرٹیکل دینا ضروری تھا اور یہ اس وقت اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ چناں چہ اس نے آرٹیکل لکھنا شروع کر دیا۔ دردانہ کو اس لیے نظر انداز نہ کیا جائے کہ وہ ایک غریب خاندان کی آبرو تھی۔ معاشرے کا تحفظ قوم کی ذمے داری ہوتی ہے اور جو قوم اپنے معاشرے کا تحفظ نہیں کر پاتی وہ اپنی تہذیب اور ثقافت کو کھو دیتی ہے۔ اس وطن کی لاکھوں بیٹیاں اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں صبح صبح ہی گھروں سے نکل جاتی ہیں۔ وہ اسکولوں، دفتروں، کارخانوں میں نوکریاں کرتی ہیں اور اپنے بوجھل ماحول کو سدھارنے کے لیے بے پناہ محنت کرتی ہیں ان معقول محنت کشوں کے ساتھ۔ اگر ہم کوئی بہتر سلوک نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو ہماری ذمے داری ہے کہ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کریں۔ یہ ہمارا اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے۔ یوں تو یہ فرض ہر انسان پر لاگو ہوتا ہے لیکن انتظامی اداروں کو ان پر

خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ معصوم مقتولہ دردانہ کے کردار پر بدکاری کا ٹھپا لگا کر اس کے بھائی کو گرفتار کیا گیا ہے، لیکن یہ پولیس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اس الزام کو ثابت کرے۔ پریس کو موقع دیا جائے کہ وہ دردانہ کے بھائی سے انٹرویو لے سکے۔ دردانہ کی ماں کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔ اس کے بیان سے عوام کو مطلع کیا جائے۔ دردانہ کا قتل ان محنت کش لڑکیوں کے لیے خوف کی بنیاد رکھتا ہے جو نوکریاں کر کے اپنے خاندانوں کی کفالت کرتی ہیں۔ دردانہ کے قتل کے سلسلے میں ایک ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے اور اس سلسلے میں انتظامیہ کو توجہ دینی چاہیے۔

اسے یہ دکھ تھا وہ اس گھر کی صحیح طور پر تلاشی نہ لے سکی۔ ایک بار پھر اس نے محلے کا رخ کیا تھا اور ان خاتون کے دوسری سمت والے گھر میں جو پورے دنوں سے تھیں چلی گئی تھی۔ یہ خاتون بھی بہت خوش اخلاق تھیں اور انہوں نے بڑا پرتپاک استقبال کیا تھا۔

"اے بی بی! پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اللہ جانے، لیکن خدا لگتی کہتی ہوں کہ ان لوگوں پر آفت آ گئی ہے۔ بس وہ جو کہتے ہیں اللہ سب لوگوں کو مشکل سے بچائے۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ بیٹا شادی ہو گئی تمہاری۔"

"جی ہاں۔ تین بچے ہیں۔" رابعہ سلطان نے گہری سانس لے جواب دیا اور وہ چونک پڑیں۔

"اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ۔" ان کی آواز میں گرم جوشی ختم ہو گئی۔ پھر وہ بولیں۔

"میاں کیا کرتے ہیں۔"

"میاؤں میاؤں کرتے ہیں۔" لفظ میاں سن کر نہ جانے کیوں رابعہ کے ذہن میں میاؤں میاؤں گھومنے لگتی تھی۔ وہ خاتون چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ ان کے چونکنے پر وہ بھی سنبھل گئی۔

"مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"بس جی نکھٹو ہیں گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ میری ہی کمائی پر گزر ہو رہا ہے۔" رابعہ نے جلدی سے بات بنا دی اور بڑی بی افسردہ ہو گئیں۔

"ہاں بیٹی! لڑکیوں کی تقدیر بھی عجیب ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے پلے باندھ دیں بے چاریاں گزارہ کرتی ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں انسان محفوظ نہ ہو تو کہاں جائے۔ بہت چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تمہاری۔ تین بچوں کی ماں تو لگتی ہی نہیں ہو۔ کوئی چھوٹی بہن بھی ہیں تمہاری۔" بڑی بی نے کہا۔

"جی نہیں ساری دنیا میں تنہا ہوں۔ ایک بہن تھی وہ بے چاری بھی حادثے کا شکار ہو گئی۔"

"حادثے کا شکار۔"

"ہاں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کے پڑوس میں وہ بچی دردانہ۔"

"ہاں بیٹی۔ حالانکہ اسے بہت کم دیکھا تھا لیکن بی بی اللہ جنت نصیب کرے جو کچھ اس کے بارے میں اُڑایا گیا ہے سب غلط ہے۔ سارے محلے میں کسی سے پوچھ لو۔ کوئی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"آپ سے زیادہ ان لوگوں کو کون جانتا ہو گا۔ آپ تو اکثر وہاں آتی جاتی ہوں گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں۔فرصت کہاں ملتی ہے۔" بہرحال یہاں سے بھی کوئی بہت بڑی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔

ایک بار پھر اسے صوفی کا خیال آیا اور وہ صوفی کی جانب چل پڑی۔ممن خان کے ہوٹل میں جا کر صوفی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اسے بہت عجیب لگتا تھا،لیکن بعض اوقات یہ سب کچھ بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔البتہ آج صوفی اسے مل گیا تھا۔نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کے لہجے میں اور انداز میں ایک شکایت سی پیدا ہوگئی۔

"صوفی صاحب! مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ اس معاملے میں دل چسپی نہیں لے رہے۔میں تو کتنی ہی بار آپ سے ملنے آ چکی ہوں۔"

"جی..... جی ہاں..... معافی چاہتے ہیں بس اصل میں اتفاق ہوتا ہے۔"

"نہیں میں تو کچھ اور ہی محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہی کہ آپ مجھ سے بھاگ رہے ہیں۔"

"بھاگ رہے ہیں؟" صوفی حیرت سے بولا۔"ہم تو یہیں کھڑے ہیں۔"

"مذاق کر رہے ہیں آپ۔"

"بب..... بہ خدا لڑکیوں سے مذاق کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوتی۔عام طور سے تھپڑ مار دیا کرتی ہیں۔"

"جاہل لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔ویسے صوفی صاحب سچ بتایئے فرقان جلیل صاحب نے جو کچھ کہا تھا آپ اس سلسلے میں دلچسپی نہیں لے رہے نا۔"

"یہ..... یہ بات نہیں ہے۔بس تھوڑی سی معلومات درکار ہوتی ہیں۔آپ اطمینان رکھیں آج کل ذرا مصروف ہیں۔ایک چلہ کریں گے اور ساری حقیقتیں سامنے آ جائیں گی۔"

"چلہ....."

"بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں اگر کوئی خاص عمل نہ کیا جائے..... تو بس ایک چلہ کر لیجیے یوں سمجھ لیجیے کہ ہر مشکل کا حل ایک چلے میں موجود ہے۔"

"چلہ....."

"جج..... جی ہاں،وظیفہ۔آپ اگر کرنا چاہیں تو۔"

"جی نہیں۔میں عملی شخصیت رکھتی ہوں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"حق اللہ۔درویش سب پر رحم کریں۔"

"جی ہاں۔خیر میں بددل ہو کر جا رہی ہوں۔دوبارہ آپ سے ملاقات نہیں کروں گی۔"

"ارے نہیں نہیں۔بب..... بددل نہ ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے تو بددل نہیں ہو رہی البتہ آپ سے بددل ہوں۔"

"اچھا یہ بتایئے آغاز کہاں سے کرنا چاہتی ہیں۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں کہ بس چٹکی بجائیں گے اور سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔"

"ممکن ہے ایسا ہو جائے۔" صوفی نے جواب دیا۔

"مطلب۔"

"میں نے کہا نا آپ حکم کیجیے۔بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مجرم تو ایک چلے کا بھی نہیں ہے۔" رابعہ سلطان کو یہ ساری باتیں اچھی نہیں محسوس ہوئی تھیں۔

صوفی کے بارے میں تو فرقان جلیل نے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی حساس انسان ہے کسی بے گناہ کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔لیکن صوفی کی طرف سے اس کیس میں نہ جانے کیوں کچھ بے اعتنائی برتی جا رہی تھی۔

بہرحال رابعہ سلطان نے اب بھی ہار نہیں مانی تھی۔وہ اپنے طور پر کوششیں کر رہی تھی۔دوسری صبح اسے اپنے اخبار کے ایڈیٹر کا فون ملا۔

"تم خیریت سے تو ہو نا رابعہ!" ایڈیٹر صاحب نے بزرگانہ شفقت سے پوچھا۔

"جی سر! ٹھیک ہوں۔کوئی خاص بات ہے کیا۔"

"ہاں۔ردعمل ہو گیا ہے۔"

"جی۔" رابعہ حیرت سے بولی۔

"تقریباً پندرہ بیس افراد ایک ٹرک میں بیٹھ کر دفتر آئے تھے اور یہاں انہوں نے کافی توڑ پھوڑ کی مجھے بھی مارا پیٹا اور اسٹاف کو بھی کافی چوٹیں آئیں ہیں۔میں ان غنڈوں میں سے چند کی شکلیں دیکھ چکا ہوں لیکن ان کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔"

"اوہ میرے خدا آپ کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔"

"نہیں میری چوٹوں کی فکر نہ کرو۔اپنے بارے میں سوچو۔"

"کیا آپ نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔"

"ہاں اطلاع تو دینی ہی تھی۔خیر میں نے تمہیں فون پر صرف اس لیے اطلاع دی ہے کہ تم اپنا خیال رکھو۔دفتر آ رہی ہو کیا؟"

"جی پہنچ رہی ہوں۔" رابعہ سلطان خاصی پریشان ہو گئی تھی۔اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے یا لکھ رہی ہے۔وہ اس شخص کو متاثر کر رہا ہے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ دفتر پہنچ گئی۔اس واقعے کو رونما ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔کیونکہ اب بھی دفتر کی عمارت کے سامنے لوگ کھڑے ہوئے اس ہنگامے پر تبصرہ کر رہے تھے۔رابعہ اندر داخل ہو گئی۔تمام اسٹاف ایک جگہ جمع تھا۔دفتر کی حالت تباہ تھی۔ایڈیٹر صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ان کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس پہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔چہرے پر بھی خراشیں تھیں اور بایاں ہاتھ ایک رومال سے باندھ کر گردن میں لٹکا دیا گیا تھا۔کمرے میں کچھ دوسرے صحافی بھی موجود تھے۔ایڈیٹر صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔رابعہ بے چینی سے بولی۔

"آپ نے کسی ڈاکٹر کو نہیں فون کیا؟"

"آنے والا ہے۔"

"اس کے بعد ڈاکٹر اور انسپکٹر ساتھ ہی ساتھ آئے تھے۔لیکن انسپکٹر کو دیکھ کر رابعہ سلطان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔اس کے بعد کی کارروائی بس عارضی ہی تھی۔انسپکٹر راجا ناصر تھا اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اس بارے میں تھوڑی سی چھان بین کی تھی۔ البتہ رابعہ سلطان کے پاس وہ خاص طور پر پہنچا تھا۔

''ساری صورت حال میں سمجھ رہی ہوں۔''

''تم یہاں سے نکل کر میرا مطلب ہے جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو بائیں سمت ایک ریسٹورنٹ ہے۔ اس میں آ جانا۔'' رابعہ نے ایک نظر راجا ناصر کو دیکھا اور خاموش ہوگئی۔ کافی دیر تک وہ ایڈیٹر صاحب سے اظہار افسوس کرتی رہی۔ ڈاکٹر بھی آ گیا تھا اور باقی کاغذی کارروائی بھی ہوگئی تھی، پھر راجا ناصر تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا اور کچھ دیر بعد رابعہ سلطان اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی۔ ایک سنسنان سے گوشے میں راجا ناصر بیٹھا ہوا تھا۔ رابعہ کو اس نے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ویٹر کو بلا کر چائے کا آرڈر کر دیا۔

''تو آخر تم نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر ہی لیا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ تم آگ لگا رہی ہو اور اس آگ سے جھلسنے والے جھلسنا شروع ہوگئے ہیں۔ میں تمہاری رپورٹنگ سے واقعی بہت متاثر ہوں۔''

''شکریہ۔'' رابعہ نے طویل سانس لے کر کہا۔

''بہرحال مجھے افسوس ہے۔''

''تمہیں تو ان لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں گی۔'' رابعہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ تو راجا ناصر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے کسی قدر افسردہ لہجے میں کہا۔

''گویا تم ابھی تک میرے خلوص سے مطمئن نہیں ہو۔ حالانکہ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے ضمیر کی آواز سنی تھی اور آواز کی اس زنجیر سے بندھا تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ افسوس تمہارے ذہن میں ابھی تک میرے بارے میں شکوک موجود ہیں۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں رابعہ! ہم لوگ بھی انسان ہیں۔ فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات ہمیں حد سے تجاوز کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہماری مجبوری ہوتی ہے کبھی کبھی ہمارے ہاتھوں کی پہنچ محدود کر دی جاتی ہے۔ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے۔ یہ سلسلہ بھی کچھ اس قسم کا تھا۔''

''دردانہ یاد ہے تمہیں راجا ناصر۔''

''ہاں یاد ہے۔''

''اور اس کی التجائیں بھی یاد ہیں۔''

''ہاں رابعہ۔''

''وہ کہہ رہی تھی سر! میری بات تو سن لیں۔ سر میری زندگی کو خطرہ ہے سر آپ۔''

''خدا کے لیے اب ان الفاظ کو مت دہراؤ۔'' راجا ناصر کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوگئے۔

''ٹھیک ہے اس وقت تمہاری مجبوری تھی لیکن اب ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے دشمنوں کے خلاف کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔'' راجا ناصر بے بسی سے رابعہ سلطان کی صورت دیکھنے لگا پھر طویل سانس لے کر بولا۔

''تم اس معاملے میں واقعی اتنی سنجیدہ ہو۔''

''اب بھی پوچھنے کی گنجائش رہ جاتی ہے نہ صرف میں بلکہ میرے ایڈیٹر صاحب جو اس اخبار کے

مالک بھی ہیں اور اسٹاف۔''

''ٹھیک ہے میں جو کچھ تمہارے لیے کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔''

''راجا ناصر! جب تک دردانہ کی التجائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں گی مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''سنو رابعہ! غور سے سنو شاید تم اس سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکو جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ تم صحافی ہو اور ایک اخبار میں کام کرتی ہو یہ صرف تمہارا شوق ہی نہیں بلکہ تمہاری ضرورت بھی ہے۔''

''بے شک اس میں کیا شک ہے۔''

''بہرحال تم یہ بتاؤ کہ اگر یہ اخبار تمہارے ہاتھ سے نکل جائے تو تمہیں پریشانی ہوگی یا نہیں۔''

''کیوں نہیں ہوگی۔ یہ کوئی سوال ہے۔''

''بس ایسی ہی چند مجبوریاں انسان کے آڑے آ جاتی ہیں اور اسے اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔ دردانہ جب میرے پاس آئی تھی تو میں نے اس پر توجہ دی تھی، لیکن جب اس نے مجھے ایک ایسی شخصیت کا حوالہ دیا جو بڑی پراثر ہے تو میں چونک پڑا۔ میں تمہیں ایک بات اور بھی بتاؤں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہی کیس میرے پاس آ چکا ہے۔'' راجا ناصر کا یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ رابعہ جلدی سے بولی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''تین چار ماہ پہلے کی بات ہے میں دوسرے تھانے میں انچارج تھا۔ یہ بھی ایک رات ہی کا واقعہ ہے۔ میں ایک چوراہے سے گزر رہا تھا کہ بدحواس لڑکی مجھے پولیس یونیفارم میں دیکھ کر میری طرف دوڑی اور مجھ سے پناہ کی درخواست کی۔ اس نے مجھے ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط لہجے میں بتایا کہ وہ ایک ایسے شخص کا شکار ہوئی ہے جو بہت بڑا آدمی ہے، لیکن اس نے اسے جس جگہ بھیجا تھا وہ..... وہ ایک خوف ناک جگہ تھی اور وہاں ایک عجیب و غریب شخصیت موجود تھی۔ اس نے مجھے تفصیل بتائی تھی۔ رابعہ اس نے کہا تھا کہ اس شخصیت کا جسم بڑا عجیب ہے وہ اوپر سے مکمل ہے لیکن اس کے پاؤں سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ باقی اس میں تمام تر انسانی صفات موجود ہیں۔ اس لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔

بہرحال میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور تحقیقات شروع کر دیں۔ لڑکی کو میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا لیکن وہاں پہنچ کر وہ ذہنی طور پر بالکل ہی معطل ہوگئی اور اس کے بعد اس نے کسی کو ایک لفظ بھی نہ بتایا۔ مجبوراً میں نے اس کی تصویریں اخبارات کو دیں اور اس کے سرپرستوں کی تلاش شروع کر دی، لیکن پہلے ہی روز مجھے احکامات ملے کہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی کو نہ بتایا جائے اور اس کیس کی فائل کو اوپر پہنچا دیا جائے۔ ان احکامات کو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ چناں چہ میں نے مجبور ہو کر وہی سب کچھ کیا۔ اسپتال کے انچارج نے اطلاع دی کہ چند لوگوں نے لڑکی کو اسپتال سے اغوا کر لیا ہے اور اس سلسلے میں اسپتال کا انچارج رپورٹ درج کرانا چاہتا ہے۔ میں نے اوپر سے رابطہ قائم کیا تو مجھے اطلاع ملی کہ میں اپنے روزنامچے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لوں اور رپورٹ میں درج کروں کہ لڑکی چوں کہ پاگل تھی اس لیے اسپتال سے فرار ہوگئی۔ میں نے اسپتال کے انچارج کا حوالہ دیا تو کہا گیا کہ میں اپنی طرف سے رپورٹ درج کر لوں۔ اسپتال کا انچارج بھی یہی بیان دے گا مجھے بے فکر رہنا چاہیے اور پھر یہی ہوا۔ دوسرے روز جب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اسپتال کے انچارج سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ اسے غلط فہمی ہوگئی۔ لڑکی اصل میں دیوانگی کی حالت میں فرار ہوئی تھی۔ نہ جانے کس طرح دل پر جبر کر کے میں نے ان سے جھوٹ بولا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس روز دردانہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میری مجبوری تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔" راجا ناصر کرب ناک انداز میں خاموش ہوگیا۔

اس وقت اس کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ رابعہ سلطان کے ذہن میں بہت سے خانے روشن ہوگئے تھے۔ اس نے کہا۔

"تمہارا بہت شکریہ راجا ناصر! میں تمہاری ایک ایک بات کو سچ سمجھتی ہوں لیکن کیا کروں تمہارے ذہن میں یہ احساس نہیں جاگا کہ وہ شخصیت کتنی ہی بڑی ہو تمہارے فرائض کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ انسان اپنے ضمیر کے ہاتھوں تو مجبور ہوتا ہے۔ تم نے اس شخصیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"

"بس بعض اوقات ذمے داریاں انسان کو انسانیت سے بہت دور لے جاتی ہیں اور میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے ایسے بہت سے سورماؤں کو سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے ہوئے دیکھا ہے جنہوں نے ضمیر کی بات مانی تھی۔ لیکن نہ تو وہ اپنے ضمیر کو خوش کر سکے اور نہ ہی اپنے حالات بہتر بنا سکے اور در بہ در ہوگئے۔ رابعہ تم میری ایک بات مانو گی؟"

"ہاں بولو۔"

"اس جھگڑے میں مت پڑو۔"

"نہیں راجا ناصر تم جانتے ہو۔ میں بھی ایک عورت ہوں اور میری بہنیں کسی ایسے انسان کے ہتھے چڑھ رہی ہیں تو کیا میں انہیں چھوڑ دوں گی تم اپنے آپ کو ایک باپ اور بھائی کی حیثیت سے دیکھو اور اس کے بعد اپنے ضمیر سے سوال کرو۔"

"آہ..... کاش۔"

"کاش نہیں..... کاش انسان کو حقیقت سے بہت دور لے جاتا ہے۔ یہ بتاؤ تم میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو۔"

"بولو کیا۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ ہدایت کہاں سے ملتی ہیں؟"

"نہیں رابعہ ایسا کوئی سوال مجھ سے نہ کرو۔"

"وہ فون نمبر ہی بتا دو جس پر تم اس شخصیت کو اطلاع دیتے ہو۔"

"ایک ہی سوال ہے۔"

"مجھے اس لڑکی کے والدین کا پتا بتا سکتے ہو جسے تم نے پہلی مرتبہ پناہ دی تھی۔"

"ہاں یہ کام میں کر سکتا ہوں۔"

"کب کرو گے؟"

"ذرا فائل دیکھ کر میں تمہیں بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"افسوس تمہیں میری شخصیت سے مایوسی ہوئی ہوگی۔"

"ہاں۔ واقعی میں سوچتی تھی کہ شاید ایک اچھے انسان کی حیثیت سے تم میری مدد پر آمادہ ہو جاؤ۔" رابعہ نے جواب دیا اور راجا ناصر مسکرانے لگا، پھر بولا۔

"تمہارے ایڈیٹر صاحب زخمی کر دیے گئے ہیں انہیں بھی تو اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوں گی۔"

"بہر حال اب جو کچھ بھی ہے دیکھوں گی کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد رابعہ سلطان اور راجا ناصر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک طویل وقت گزر چکا تھا۔ رابعہ سلطان کو اس فیلڈ میں کام کرتے ہوئے، لیکن اس بار اسے جو دشواری ہوئی تھی اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے، کیسے ہی نقصانات سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے میں اس شخصیت کو بے نقاب کر کے رہوں گی، جس نے دردانہ جیسی معصوم لڑکی کو قتل کیا ہے..... لیکن صوفی۔

نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کا دل چاہنے لگا۔

فرقان جلیل نے صوفی کا پرجوش استقبال کیا تھا۔

"یہ نہ سمجھیے صوفی صاحب کہ میں نے کھلے منہ آپ کو یہاں آنے کے لیے بلایا۔ اصل میں، میری خواہش تھی کہ....."

"بات ختم ہو جاتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کی خواہش تھی، ہم آ گئے۔" صوفی نے کہا اور جیب سے پان کی ڈبیا اور چھالی تمباکو کا بٹوہ نکال کر میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ فرقان جلیل نے یہ دونوں چیزیں دیکھیں اور ہنس پڑا۔

"کمال ہے صوفی صاحب، پان تو بہت سے لوگ کھاتے ہیں، لیکن یہ نقشین ڈبیا اور کپڑے کا یہ بٹوہ۔ اس میں پڑی ہوئی یہ ڈوری جسے کھینچ کر اس کے الگ الگ خانے کھولے اور بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب اس دور میں کہاں نظر آتے ہیں۔"

"بات کچھ اور ہے عزیزی۔ درویشوں کے کرم سے۔ لوازمہ انسانی زندگی میں ایک مقام رکھتا ہے، لیکن بدنصیبی سے لغت کے صفحات میں اس لفظ کی اہمیت کو بہت کم کر دیا ہے جبکہ یہ زندگی کے ہر عمل سے تعلق رکھتا ہے، جیسے سالن میں نمک، گرم مسالا جس سے سالن مکمل ہوتا ہے یعنی لوازمات، پان کی ایک تاریخ ہے، درویشوں کی دعاؤں سے۔ شرفا کی روایت، یہ چیزیں اس کا لوازمہ ہیں۔ گلوری کی آبرو۔"

"خدا کی قسم! آپ کی شکل میں ماضی کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ صوفی صاحب! ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔"

"ارشاد۔" صوفی نے کہا۔

"کپڑے کے بنے ہوئے اس بٹوے کا رنگ کیا تھا، یعنی جب یہ نوخیز تھا۔" فرقان جلیل نے مزاح انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اوپر سے قرمزی اور نچلا حصہ بنفشی تھا اور یہ پھندنے ہلکے پیلے رنگ کے تھے۔ بڑے سجتے تھے اپنی عمر کے ساتھ۔''

''صوفی صاحب اب آپ اس کے رنگ کو کون سا رنگ کہیں گے۔'' فرقان جلیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دنیا ہی بدرنگی ہوگئی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے آہستہ سے کہا۔

''ارے ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ صوفی صاحب۔ درویشوں کی دعاؤں سے دنیا بدرنگی ہوگئی؟''

''جی۔'' مطلب نکالنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے جب برائیاں اس حد تک بڑھ جائیں تو دل سے دعائیں کب نکلتی ہیں۔ وہ تو پھر بھی بزرگان دین کی نرم دلی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بہتری کے لیے ہی دعائیں کرتے ہیں ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ اس کی گنجائش ختم ہوگئی ہے۔'' صوفی نے عالمانہ انداز میں کہا۔

''صوفی صاحب! آپ یہ بٹوہ بدل کیوں نہیں دیتے۔ میل سے چکٹ رہا ہے۔''

''فرقان جلیل صاحب۔ آپ اسے ہماری مستقل مزاجی کہہ سکتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ بٹوا بڑے اہتمام سے ہمیں ایک ایسی بزرگ خاتون نے بنا کر دیا تھا جو اس دور میں بھی اس کی بناوٹ کے بارے میں جاننے والی تنہا خاتون تھیں، ورنہ اس دور کی خواتین بے چاری دنیا کی ہر چیز بازار سے خریدتی ہیں اور بازار والوں نے بھی ان کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ ان بزرگ خاتون نے یہ بٹوہ ہمیں پیش کیا تھا اور کچھ عرصے کے بعد اس جہان سے رحلت فرما گئیں تھیں۔ بس ان کی یادگار ہے اور یادگاریں تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔'' فرقان جلیل ہنسنے لگا، پھر بولا۔

''بہرحال اس میں بھی آپ کی حسین فطرت کا پہلو جھلکتا ہے۔ خیر چھوڑیئے صوفی صاحب۔ میں نے جو گستاخی کی ہے آپ کو یہاں طلب کرنے کی، اس کا پس منظر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

''جی۔''

''صوفی صاحب رابعہ سلطان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی جی۔'' نفیس خاتون ہیں۔ باشبہ صاحب عزم و ہمت، جس کام کا بیڑا اٹھالیں اسے انجام دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔''

''ایک ایسے خاندان سے تعلق ہے جہاں بہت زیادہ سختیاں تھیں۔ تعلیمی مراحل بڑی مشکل سے طے کیے اور اس کے بعد صحافت کی [illegible] آنے کے لیے نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے، لیکن وہی ہوتا ہے نہ [illegible] مشکلات سے گزر کر اور [illegible] ہی سونا کندن بنتا ہے لیکن اس کندن کے لیے راستے بڑے کٹھن ہوگئے ہیں کیونکہ اس کے پاس [illegible] ہیں جو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کردیتے ہیں مثلاً صحافت کی زندگی میں وہ صحافی بڑے کام یاب [illegible] ن کا کوئی بیک گراؤنڈ ہوتا ہے۔ انہیں بڑے بڑے لوگوں کی مدد حاصل ہوتی [illegible] سب کچھ کرلیتے ہیں لیکن وہ جن کے پاس یہ وسائل نہیں ہوتے کیسی کیسی مشکلوں [illegible] فی صاحب آپ کو اس کے بارے میں ضرور علم ہوگا۔''

''[illegible] وں [illegible] تھوڑی سی معلومات ہیں۔''

''صوفی صاحب، رابعہ سلطان بڑی امید اور آرزو لے کر آپ کے پاس پہنچی تھی لیکن اس کا خیال ہے کہ آپ اس مسئلے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔''

''کک..... کس مسئلے میں؟'' صوفی نے ہکلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہی لڑکی دردانہ جسے ہلاک کردیا گیا تھا۔'' صوفی نے گردن جھکالی۔ کچھ دیر اپنی چگی داڑھی کھجاتا رہا۔ اس کے بعد گردن اٹھا کر بولا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ ایک مظلوم لڑکی تھی جیسا کہ محترمہ رابعہ سلطان نے ہمیں اس کے بارے میں تفصیل بتائی۔ درویشوں کی دعاؤں سے کسی مظلوم کی دادرسی نہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، لیکن بعض اوقات کچھ اس طرح کی رکاوٹیں درمیان میں آجاتی ہیں کہ ان سے نمٹنا مشکل ہوجائے۔ بہرحال درویش رہنمائی کریں گے۔ آپ انہیں سمجھا دیجیے گا۔''

''نہیں صوفی صاحب۔ وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ آپ یقین کریں۔ میں اس کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ اس طرح تڑپ رہی ہے اس لڑکی دردانہ کے لیے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ خاص طور سے اس کی والدہ وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بھی اس کے لیے بڑی تکلیف دہ بات ہے اور ویسے بھی صوفی صاحب جیسا کہ آپ نے ایک بار بتایا کہ آپ کا یہ مشن ہے اور اتنی بڑی شخصیت آپ کے ساتھ ہے یعنی کرنل رحیم شاہ جن کا ایک سنہری ماضی ہے۔ میں اس کی خواہش پر آپ سے یہ سوال کررہا ہوں کہ کیا آپ بھی اس مسئلے کو نظرانداز کردیں گے اور اس معصوم مرحومہ کی دادرسی نہیں کریں گے؟''

''نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ سب کچھ کیا جائے گا۔''

فرقان جلیل کو تفصیل بتانے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد صوفی وہاں سے چل پڑا، لیکن اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے احساسات تھے۔ کسی بھی طرح وہ فرقان جلیل کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ رابعہ سلطان نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے بس سے باہر ہے۔ ایک ماضی ہے اس کا۔ کچھ راز ہیں زندگی کے جو ہر ایک کو نہیں بتائے جاسکتے۔ بہرحال رابعہ سلطان کے بارے میں نہ جانے وہ کیا کیا باتیں سوچتا رہا ہوگا۔

♥......♥......♥

رابعہ کو نہ صرف جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے بے چین کر رکھا تھا بلکہ بڑی شدت سے وہ یہ محسوس کررہی تھی کہ اسے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو اس کی مشکلات کو سمجھ سکے۔ جہاں اس کے راستے رک جاتے ہیں وہاں ایسا کوئی ساتھی ان راستوں کو طے کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اسے ایسی ہی مدد کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں صوفی اسے ایک ایسا ساتھی نظر آیا تھا جو اگر حاصل ہوجائے تو ان تمام خواہشوں کی تکمیل ہوجائے جو دل میں جنم لیتی رہتی تھیں۔ سرپھری ہی تھی ورنہ صوفی کے وجود کو تو اونٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ ایک ایسے اونٹ سے اس طرح کی قربت کا تصور ہی مضحکہ خیز تھا لیکن بات وہی ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا جاسکتا۔ وہ اندر سے پتا ہی نہیں چلتے کہ کیسے ہیں ان کے دل و دماغ میں کون سی کھچڑی پک رہی ہے۔ رابعہ سلطان کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ لوگ اپنے ساتھی کو اپنی پسند کو ایک دلکش رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو چہرے مہرے اور ظاہری حلیے سے بالکل متاثر نہیں کرتے، بلکہ اندر سے اندر تک کا سفر کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھی رابعہ سلطان صوفی کی رہائش گاہ کی جانب جا رہی تھی۔ اس گلی میں داخل ہونا ہی ایک مشکل امر تھا، لیکن اس سے زیادہ مشکل صوفی کی شخصیت تھی۔ وہ فرقان جلیل کے پاس گئی تھی۔ بس ایک عجیب سی بے چینی اس کے سارے وجود میں گردش کر رہی تھی، حالانکہ صورت حال بھیانک دور میں داخل ہو گئی تھی۔ اخبار کے دفتر پر حملہ ایڈیٹر صاحب کی پٹائی۔ یہ چیزیں اس بات کا اظہار کر رہی تھیں کہ صورت حال سنگین ہے۔ اسے اتنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔ بہرطور یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا۔ صوفی کی شخصیت سے دلچسپی اپنی جگہ۔ یہ پاگل لڑکی صوفی کے بارے میں بالکل ہی مختلف انداز سے سوچنے لگی تھی۔ گلی کے لوگوں نے اسے دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھا، لیکن ان نگاہوں میں اس کے لیے کوئی برائی نہیں تھی۔ ممن خان کے ہوٹل پر بے فکرے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ارے وہ بی بی ہیں جو پہلے بھی صوفی صاحب کے گھر آ چکی ہیں۔“

”صوفی تو شاید اندر نہیں ہیں۔“

”ہاں! کچھ کہہ کر گئے ہیں۔“

”بھلا وہ کبھی کسی سے کچھ کہہ کر جاتے ہیں۔ اپنی پھٹپھٹیا پر نکلے ہیں۔ پوری سج دھج کے ساتھ۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی سرکاری کام سے نہیں گئے۔“ وہ لوگ تبصرے کرتے رہے اور رابعہ سلطان صوفی کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس پر پردہ بھی پڑا ہوا تھا۔ رابعہ سلطان نے ادھر ادھر دیکھا اور یہ دیکھ کسی قدر خجل سی ہو گئی کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھی ہوئی ہیں، لیکن کچھ ہی لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو ان سے بے گانہ کر لیا اور دروازہ بجانے لگی۔ اسی وقت ایک پستہ قامت آدمی اس کے پاس پہنچ گیا۔

”سلام خلوص عرض کرتا ہوں۔“ اس نے لکھنوی انداز میں آدھا جھک کر ہاتھ کو پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔

”صوفی صاحب سے ملنے آئی ہوں۔“

”اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔“

”کیوں کیا بات ہے؟“

”فدوی کو بے زار لکھنوی کہتے ہیں۔ شاعری میں کمال حاصل کیا ہے لیکن مشاعروں کے علاوہ کہیں اپنے اشعار سناتا نہیں ہوں۔ ہاں اگر آپ حکم دیں تو دو چار پیش کر دوں۔“

”میں صوفی صاحب سے ملنے آئی ہوں۔“

”ایں جی ہاں! وہی۔ وہی تو عرض کر رہا تھا۔ صوفی صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ میرا مطلب ہے اندر نہیں ہیں۔“

”مگر دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔“

”شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اس گلی میں ہر گھر کے دروازے کھلے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ عرض کیا ہے کہ

چاہیے دل کے دریچوں کو کھلا رہنے دو
عین ممکن ہے کہ آئے کوئی مہمان عزیز

”چنانچہ۔“

”آپ نے تو شعر سنا ہی دیا ہے۔“ رابعہ سلطان کو ایک دم ہنسی آ گئی۔

”ایں۔ سنا دیا؟“ بے زار لکھنوی صاحب چونک کر بولے۔

”کہاں گئے ہیں صوفی صاحب آپ بتا سکتے ہیں۔“

”اللہ جانے اور وہ جانیں، لیکن آپ چاہیں تو انتظار کر سکتی ہیں۔ آ سکتے ہیں کسی بھی لمحے میں۔ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ گئے ہیں۔“ بے زار لکھنوی نے کہا اور رابعہ سلطان بری طرح چونک پڑی۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے بے زار لکھنوی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”زوجہ محترمہ کیا چیز ہوتی ہیں؟“

”اہلیہ..... اہلیہ یعنی بیگم، بیوی، وائف۔“ بے زار لکھنوی نے زوجہ کے بہت سے ترجمے کر ڈالے۔

”مگر وہ تو غیر شادی شدہ ہیں۔“

”محترمہ آپ ایک شاعر سے گفتگو فرما رہی ہیں۔ شادی اور شدہ ان دو الفاظ کی تشریح میں کتابوں کی کتابیں شائع کی جا سکتی ہیں۔ شادی شادمانی کا نام ہے اور شدہ اہل کو کہتے ہیں، یعنی صوفی صاحب مختلف مزاج کے انسان ہیں۔ ویسے یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

کہ جو اہل ہوتے ہیں انہیں ملتی ہے اہلیہ
ہر شخص کے نصیب میں منے کی ماں کہاں

”تو مطلب یہ ہے کہ صوفی صاحب کی اپنی پسند اپنا انتخاب ہے۔ انہوں نے اپنی اہلیت کا ثبوت کسی خاتون کی شکل میں نہیں دیا بلکہ ایک موٹر سائیکل ہے۔ جو عرصہ دراز سے ان کی آغوش میں ہلکورے لے رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ صوفی صاحب کو نوادرات سے دلچسپی ہے اور وہ موٹر سائیکل بھی نوادرات میں سے ایک ہے۔ ناز و نعم سے چلتی ہے۔ عمر کی بہت سی منازل طے کر چکی ہے اس لیے نخرے زیادہ کرتی ہے، مگر بات وہی ہے نا کہ نخرے اٹھانے والا بھی تو چاہیے۔ صوفی صاحب اس کا ہر نخرہ برداشت کرتے ہیں۔ جب بھی موج میں ہوتے ہیں اسے لے کر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔“ رابعہ سلطان جو کچھ لمحوں کے لیے بدحواس سی ہو گئی تھی۔ اس تشریح سے شاید مطمئن ہو گئی اور پھر بے زار لکھنوی صاحب کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔

”تو زوجہ آپ نے اس موٹر سائیکل کو کہا ہے۔“

”جی ہاں۔ بس چند ہی چیزوں سے تو رشتہ ہے صوفی صاحب کا۔ مثلاً پانوں کی ڈبیا، چھالیا اور تمباکو کا بٹوا یا پھر وہ قدیم شیروانی جو اوپر سے شیروانی اور اندر سے پریشانی کے مترادف ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ انہی چند چیزوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ جب فرصت میں ہوں اور کچھ سیر و سیاحت کرنا چاہیں تو اس وقت ان تمام چیزوں سے لیس ہو کر جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا ہے۔“

”پھر تو واپسی جلدی ممکن نہیں ہے۔“

”کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی کچھ لمحوں کے بعد بھی واپسی ہو سکتی ہے۔ اچھا یہ بتایئے۔ آپ انتظار کریں گی ان کا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تھوڑی دیر کیے لیتی ہوں، کیا حرج ہے؟"

"تو اندر تشریف رکھیے گا۔ میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں۔"

"ارے نہیں، کہاں تکلیف کریں گے۔"

"میں نہیں تکلیف کروں گا۔ ممن خاں کا چائے چی تکلیف کرے گا۔"

"چائے چی.....؟"

"جی ہاں۔ باورچی کھانا پکاتے ہیں، چائے چی چائے بناتا ہے۔ یہ خادم کی اختراع ہے۔" بے زار لکھنوی صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور رابعہ سلطان ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ براہ کرم چائے بھجوا دیجیے گا۔" بے زار لکھنوی چلے گئے اور رابعہ سلطان ہنستے ہوئے اندر آ کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اچھا خاصا بڑا گھر تھا۔ لیکن سارے کا سارا برے حالات کا شکار۔ ہر چیز منتشر، سب کچھ تتر بتر، کپڑوں کے غیر استری شدہ ڈھیر، صحن میں بکھرے ہوئے برتن۔ بے ترتیبی ہر شے سے ٹپکتی تھی۔ بہر حال صوفی میں شاید یہی انفرادیت تھی۔ وہ بیٹھی صوفی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بے زار لکھنوی صاحب چائے کے برتن اٹھائے ہوئے اندر آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ چائے صاف ستھرے برتنوں میں لائی گئی تھی۔ بے زار صاحب بے زار نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"ایک بات پوچھ سکتے ہیں آپ سے محترمہ!"

"جی ضرور۔"

"کیا ہم نے آپ کی سمع خراشی کی ہے۔؟"

"کیا؟"

"سمع خراشی۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"یعنی ایسی ناگوار گفتگو کی ہے جو آپ کو پسند نہ آئی ہو۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ممن خاں صاحب کا خیال ہے کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا ہے۔ اب اس نامعقول شخص کو انہوں نے اسی لیے ہمارے ساتھ بھیجا ہے کہ یہ ہمیں یہاں سے پکڑ کر واپس لے جائے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتے ہیں۔ آپ کیا حکم دیتی ہیں، ہم جائیں یا یہاں آپ کے پاس بیٹھ کر انتظار میں آپ کی مدد کریں۔"

"فالتو باتیں مت کرو۔ بے زار صاحب! ممن خاں نے جو کچھ کہا ہے۔ مجھے وہی تم سے کرانا ہے۔ چلو نکلو ادھر سے۔" بے زار صاحب کے ساتھ آنے والے نے کہا۔

"بدتمیزی تو تمہاری عادت ہے۔ چلو چلتے ہیں۔" بے زار لکھنوی نے کہا اور آنے والا شخص انہیں دھکیلتا ہوا باہر نکال لے گیا۔ رابعہ سلطان کو پھر ہنسی آ گئی تھی۔ بہر حال یہ سنہرا ماحول تھا۔ دنیاوی اقدار سے ہٹ کر بالکل اس طرح جیسے کسی سیارے کی کہانی ہو۔ انسانوں نے تو اپنے آپ پر اتنے مصنوعی خول چڑھا لیے ہیں کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ جگہ واقعی کسی سیارے کے مترادف ہے اور دفعتہً رابعہ سلطان کے

ذہن میں خیال آیا ہے کہ کیوں نہ اس بے ترتیبی کو ترتیب میں بدل دیا جائے۔ چائے پی لینا زیادہ اچھا ہے۔ اس نے چائے پی اور اس کے بعد دیوانگی کا شکار ہو گئی۔ یعنی گھر کی صفائی، ستھرائی پر تل گئی اور دو گھنٹے کی شدید محنت کے بعد اس نے گھر کو چمکا کر رکھ دیا اور اس کی محنت بار آور ہو گئی۔ باہر سے اس طرح کی آواز آئی تھی جیسے کوئی ہیلی کاپٹر گلی میں اتر رہا ہو اور کچھ لمحوں کے بعد یہ ہیلی کاپٹر اندر داخل ہو گیا، لیکن وہ ہیلی کاپٹر نہیں بلکہ موٹر سائیکل تھی اور اس موٹر سائیکل پر صوفی صاحب سوار تھے۔ اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ شیروانی، کھلے پائنچے کا پاجامہ اور اس پر جوگر کیا نظر آ رہے تھے۔ اس کی تشریح الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ گھر کو دیکھا اور پھر ہونق ہو کر رہ گئے۔ رابعہ سلطان پر نگاہ پڑی تو بولے۔

"مم..... معافی چاہتے ہیں۔ در در..... درویشوں کے کرم سے، غلط جگہ گھس آئے۔ مم مم..... مگر گھر تو ہمارا ہی جیسا ہے۔" رابعہ سلطان پھر ہنس پڑی اور بہ مشکل تمام اس نے صوفی کے ہونق چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"آپ ہی کا گھر ہے جناب۔"

"ہیں!..... صوفی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"ہاں۔ گھر تو ہمارا ہی ہے۔ سامنے ممن خاں کا ہوٹل بھی ہے، لیکن یہ حلیہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔

"حلیہ ٹھیک کیا گیا ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔"

"اوہ! تو آپ نے یہ بھی کر ڈالا۔"

"ہاں..... اور اکثر کرتی رہوں گی۔ آپ کا دل چاہے جتنا اس گھر کو بگاڑیے۔ میں یہاں آؤں گی اور یہ سب کچھ کر دیا کروں گی۔" نا جانے کیوں رابعہ سلطان کو غصہ سا آ گیا۔ صوفی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"محترمہ! رابعہ سلطان صاحبہ، زندگی اگر بے ترتیب ہو تو کسی شے کی ترتیب اچھی نہیں لگتی۔ اس ترتیب نے انسان سے نہ جانے کیا چھین لیا ہے۔ بے ترتیبی اس رنگ کو کم کرتی ہے۔ سمجھ رہی ہیں آپ۔ بے ترتیبی اگر زندگی کا حصہ بن جائے تو پھر ترتیب اچھی نہیں لگتی۔ بہر حال میری فرقان جلیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ پتا یہ چلا کہ آپ کچھ برگشتہ ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" رابعہ سلطان اس جملے پر ہنس پڑی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"پتا نہیں۔ درویشوں نے کیا عمل کیا ہے کہ آپ ذہن پر ایسے مسلط ہو گئے ہیں۔ کاش وہ عمل مجھے بھی معلوم ہو جائے۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آپ یہ بتائیے کہ دردانہ کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایک نوجوان لڑکا زندگی اور موت کی کش مکش کا شکار ہے۔ صاحب ثروت اور دولت مند لوگ اپنے اختیارات سے کام لے کر ایک زندگی چھیننے کے بعد دو زندگیاں اور چھین رہے ہیں۔ صوفی صاحب کیا ہم بے بسی سے بیٹھ کر یہ انتظار کرتے رہیں گے کہ کب وہ لڑکا پھانسی پر چڑھ جاتا ہے۔

"یہ خدا ایسا نہیں ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا۔

"لیکن آپ تو اس سلسلے میں توجہ ہی نہیں دے رہے۔"

"بہت جلد ہم ایک چلہ کاٹیں گے۔ اس بارے میں متوکل ہماری رہنمائی کریں گے اور اس وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم آپ کو تفصیل بتائیں گے۔"

"یہ صرف ایک مذاق ہے جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔" رابعہ سلطان نے کہا۔

"مذاق تو ہم نے زندگی میں کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کیا۔"

"چلہ کشی سے کہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔"

"بزرگوں سے لَو لگا کر دیکھیے۔ آپ کی اس سے اچھی رہنمائی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"صوفی صاحب میں جا رہی ہوں۔ میرا خیال ہے یہاں پر میں نے غلطی نہیں کی جیسا کہ میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ یہ میں کرتی رہوں گی۔ آپ چاہے کتنے ناراض کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ سنجیدہ ہو جائیں تو براہ کرم یہ ضرور سوچ لیں کہ آپ نے میری دل آزاری کی ہے۔"

"پھر صوفی ارے، ارے، ارے ہی کرتا رہ گیا اور رابعہ سلطان غصے سے دندناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

♥.....♥.....♥

"یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا، لیکن رابعہ کسی بھی قیمت پر اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ مظلوم چہرہ ہمیشہ گھومتا رہتا تھا جو پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور پھر زندگی اس سے چھن گئی تھی۔ راجا ناصر نے اسے کسی اور لڑکی کے بارے میں بھی بتایا تھا، جو اسی طرح کے سنگین حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اس کا پتا بھی راجا ناصر نے آخر بتا دیا تھا، چنانچہ اب رابعہ سلطان نے اسی جانب رُخ کیا تھا۔ یہ بھی ایک پس ماندہ بستی ہی تھی۔ رابعہ نے اس علاقے سے ذرا فاصلے پر رُک کر قرب و جوار سے معلومات حاصل کیں اور پھر اس مکان کی جانب چل پڑی جو کسی ریاض علی نامی شخص کا تھا۔ یہ نام بھی راجا ناصر ہی نے بتایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکانات کا سلسلہ تا حدِ نظر چلا گیا تھا۔ مطلوبہ نمبر کے مکان کے بارے میں بھی رابعہ کو جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ جس شخص نے اسے اس مکان کے بارے میں بتایا تھا وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔

"کس سے ملنا ہے تمہیں بیٹی۔"

"ریاض علی صاحب۔"

"کسی دوسرے شہر سے آئی ہو کیا؟"

"جی، جی ہاں۔"

"کیا تم ان لوگوں کی رشتے دار ہو؟"

"جی ہاں" لیکن بہت عرصے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ آپ یہ سوالات کیوں کر رہے ہیں۔"

رابعہ ان سوالات میں کچھ الجھ سی گئی تھی۔

"بیٹی۔ ریاض علی کو تو مرے ہوئے بھی دو مہینے ہو گئے۔ بے چارہ غربت میں ہی مر گیا تھا۔ دمے کے مریض کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ بڑے غیرت مند لوگ ہیں، لیکن بے چارہ ریاض علی بھی کیا کرتا۔ بیماری ہی پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ مجبوراً بیٹی کو نوکری کے لیے گھر سے نکلنا پڑا، مگر اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا.....؟" رابعہ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"قتل کر دیا تھا بیٹا۔ قتل ہو گئی تھی، بے چاری صائمہ اور اسی کا صدمہ ریاض علی کو بھی لے گیا۔ اب بڑی بی کی جان رہ گئی ہے۔ ابھی تو عدت کے دن گزار رہی ہیں۔ اس کے بعد جب تک جئیں گی لوگوں کے برتن بھانڈے صاف کر کے ہی پیٹ بھریں گی ورنہ ان بے چاروں کے پاس کیا رکھا ہے۔" رابعہ ایک بار پھر بدحواس سی ہو گئی۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ خوشیاں تو تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ اس مکان کے دروازے کو بجانے لگی اور کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اسے اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ چھوٹے سے صحن کے بعد ایک برآمدہ تھا جس میں بچھے ہوئے تخت پر ایک بزرگ خاتون نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بہت لاغر تھیں، چہرے پر غم جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک اور بھاری سی بدن کی خاتون قریب موجود تھیں۔ دونوں کچھ عجیب سے انداز میں رابعہ کو دیکھ رہی تھیں۔ غم زدہ خاتون نے لرزتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔

"بیٹی، کہاں سے آئی ہو، کس سے کام ہے، میں نے تو پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"صائمہ کی والدہ آپ ہی ہیں۔" رابعہ نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹی۔ پتا نہیں کیسے بدنصیب کہوں! اسے یا اپنے آپ کو۔ میں ہی بدنصیب اس بدنصیب کی ماں ہوں، آؤ بیٹھو۔"

"میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" رابعہ قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟"

"اصل میں میرا تعلق ایک رفاہی ادارے سے ہے۔ آپ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

"کہو بیٹی.....؟" صائمہ کی والدہ نے کہا۔

"میں تھوڑی سی تنہائی چاہتی ہوں۔ اگر یہ خاتون برا نہ مانیں۔"

"بیٹی سمجھ لے میں تنہا ہوں۔ یہی لوگ تو میرے ہم درد اور غم گسار ہیں۔ انہی کے سہارے زندگی گزرے گی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے انہی کے سامنے ہی کہہ دو۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔ میں چلتی ہوں۔ کوئی بات نہیں بیٹی۔ تم تنہائی میں ہی بات کر لو۔ ویسے بھی اب مجھے گھر جانا تھا۔ سارا کام ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ دوسری خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا۔ صائمہ کی والدہ کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ بہر حال ان کے جانے کے بعد رابعہ سلطان نے کہا۔

"آپ کے شوہر کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ میں پہلا سوال آپ سے یہ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کی گزر اوقات کا ذریعہ کیا ہو گا؟"

"یہ میں کیا جانوں۔ جو خدا نے مقدر میں لکھ دیا ہو گا؟"

"پھر بھی، آپ نے کچھ تو سوچا ہو گا۔" عمر رسیدہ خاتون کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر انہوں نے کہا۔

"مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اپنے خدا سے کہ اس نے کیوں مجھے زمین پر بوجھ بن کر رہنے دیا ہے۔ موت تو مجھے بھی آ سکتی تھی۔ یہ کیسا امتحان ہے میرا کہ بیٹی اور شوہر کی جدائی زندہ رہ کر برداشت کروں۔ کبھی کبھی تو خدا سے بھی بغاوت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سوچتی ہوں گناہ اور ثواب کو بھول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر خودکشی کرلوں، لیکن خودکشی حرام ہے۔ ایک آس تو ہے کہ موت کے بعد اپنوں کے چہرے دیکھ سکوں گی۔ برائی کر کے مروں گی تو وہ آس بھی جائے گی۔'' ایک ایسا کرب، ایک ایسا غم ان الفاظ میں تھا کہ رابعہ سلطان کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔ وہ خود پر قابو پانا مشکل محسوس کر رہی تھی۔ دلاسا ایسے انسان کو دیا جاتا ہے جو بلک رہا ہو۔ اسے کس طرح دلاسا دیا جائے جو خود اپنے غم کا مذاق بن چکا ہو۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی صائمہ کی والدہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور مدھم لہجے میں بولی۔

''آپ نے کچھ تعلیم حاصل کی ہے۔''

''ہاں، میٹرک تک پڑھا تھا۔''

''صائمہ کی موت کا راز آپ کو معلوم نہیں ہوا۔''

''بڑا عجیب سوال ہے بیٹی۔ کہیں صائمہ جیسی لاوارث لڑکیوں کی موت کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔''

''آپ کے دل میں اس کے انتقام کا جذبہ بھی نہیں ابھرا۔'' صائمہ کی والدہ پھیکے سے انداز میں ہنسیں، پھر بولیں۔

''انتقام کا فیشن بھی تو بڑے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگ تو کسی جاگیردار کی شکارگاہ کے ہرنوں کی مانند ہوتے ہیں جو اپنی دانست میں آزادی سے چوکڑیاں بھرتے ہیں، لیکن کسی بھی وقت انہیں شکار کرلیا جاتا ہے۔ کیا شکاری سے انتقام لیا جاسکتا ہے؟''

''رابعہ سلطان کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ خاتون کے الفاظ تھے کہ زہر میں بجھی ہوئی چھریاں، جو پورے بدن میں اتر رہی تھیں۔ بہ مشکل تمام رابعہ نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''ماں جی، کیا آپ میری مدد کرسکتی ہیں؟''

''مدد۔ میں؟'' خاتون نے نگاہیں اٹھا کر رابعہ کو دیکھا۔

''ہاں۔''

''بولو کیا چاہتی ہو؟''

''مجھے صائمہ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں؟''

''کیا کروگی ان معلومات کا؟''

''بس یوں سمجھ لیں کہ اسی پر میری نوکری کا دارومدار ہے۔'' رابعہ نے عاجزی سے کہا۔

''نوکری۔ تو تم بھی نوکری کرتی ہو۔''

''ہاں ماں جی۔''

''چھوڑ دو نوکری بیٹا، نوکری چھوڑ دو۔ باہر کی دنیا ابھی ہماری بیٹیوں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ کوئی تمہیں بیرون ملک نوکری دلانے کا جھانسا دے گا۔ کوئی کچھ کہے گا، کوئی کچھ کہے گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ نوکری چھوڑ دو۔ جو روکھی سوکھی میسر آئے، اپنے گھر میں بیٹھ کے کھالینا۔ گھروں کا کام کرلینا، بچوں کو پڑھا لینا۔ نوکری مت کرنا۔ وعدہ کرو اب تم نوکری نہیں کروگی۔ بولو، اب تم گھر سے نہیں نکلوگی۔'' بزرگ خاتون پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ رابعہ کے سارے اعصاب کشیدہ ہوئے جا رہے تھے۔ صائمہ کی والدہ کے

انداز نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا اور بہ مشکل تمام بولی۔

''میں، نوکری نہیں کروں گی ماں جی، لیکن صائمہ کا انتقام ضرور لوں گی۔ آپ کو صائمہ ہی کا واسطہ، میری مدد کیجیے۔''

''خدا انتقام لے گا بیٹی، خدا انتقام لے گا۔ جب ہم اس کو مانتے ہیں تو وہ ہماری کیوں نہ سنے گا۔ تم کسی کی عزت ہو، جس گھر کی عزت ہو، اس کی آبرو بن کر رہو۔ مظلوم صائمہ کا انتقام خدا لے گا۔''

''مجھے صرف تھوڑی سی چھوٹی چھوٹی باتیں بتادیں۔ تھوڑی سی۔''

''بولو..... کیا چاہتی ہو؟''

''میں صائمہ کے کاغذات کی تلاشی لینا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا اور کہاں کام کرتی تھی۔ بس اتنا سا پتا چل جائے تو میری مشکل حل ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے، آؤ میں تمہیں اس کی الماری دکھا دوں رابعہ سلطان الماری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کچھ کپڑے وغیرہ تھے اور کچھ کاغذات بھی تھے اور رابعہ بڑے غور سے ان کاغذات کا جائزہ لیتی رہی اور پھر اسے ان کاغذات میں ایک پھٹا ہوا ڈیبٹنگ کارڈ مل گیا جس پر سی۔ بی لمیٹڈ لکھا ہوا تھا۔ سی۔ بی۔ لمیٹڈ۔ وہ عورت اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی تھی۔ بس یہ پتا چلا تھا کہ صائمہ حالات سے مجبور ہو کر نوکری کرنے نکل پڑی تھی۔ یہ نوکری وہ کہاں کر رہی تھی، یہ پتا نہیں چل سکا تھا، لیکن سی۔ بی۔ لمیٹڈ ایک اشارہ تھا اور رابعہ سلطان نے پھٹا ہوا کارڈ اپنے لباس میں رکھ لیا تھا، پھر اس کے بعد وہ دو دن تک سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی تلاش میں نہ جانے کہاں سے کہاں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے بھی اور کچھ صحافیوں نے جن میں اعجاز خان سب سے زیادہ سمجھ دار اور تیز آدمی تھا۔ اس کی مدد کی تھی، لیکن ابھی تک سی۔ بی۔ لمیٹڈ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا، البتہ رابعہ سلطان نے آگے بڑھ کر کام کرنے کے لیے اپنی ایک خاص مہارت سے کام لیا تھا اور یہ مہارت میک اپ کی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر بہت خوب صورت میک اپ کیا تھا اور واقعی اس کی ایک باکمال شخصیت تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ممکن ہے اس سلسلے میں جو ہنگامہ وہ کر رہی ہے کچھ لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع ہوچکی ہو اور اس کی نگرانی کی جائے۔ کسی بھی چیز کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خدشہ راجا ناصر نے بھی ظاہر کیا تھا۔ بہرحال وہ اب بھی سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی تلاش میں مصروف عمل تھی، لیکن ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا تھا، البتہ اسی میک اپ میں اسے ایک دلچسپ واقعے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ایک مضافاتی سڑک سے گزر رہی تھی کہ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ جس سڑک پر وہ جا رہی تھی وہ شہر سے نکل کر پہاڑی راستے سے گزرتے ہوئے کافی دور تک چلی جاتی تھی۔ حدنگاہ سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے بڑی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آخر کار اس جگہ پہنچ گئی جہاں کے لیے نکلی تھی۔ ایک صاف ستھری اور پتلی سڑک مین روڈ سے اتر کر نیچے کوٹھی تک چلی جاتی تھی یہ شاید کسی کا فارم ہاؤس تھا۔ سڑک کے دونوں سمت درختوں کی قطاریں تھیں۔ ذیلی سڑک پر وہ تھوڑی دور تک چلی تھی کہ سڑک کے بیچوں بیچ اسے ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ انتہائی پرانے ماڈل کی موٹر سائیکل سڑک کے درمیان اس طرح کھڑی کی گئی تھی کہ باقی گاڑیوں کا وہاں سے نکلنا مشکل تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور ادھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ادھر نگاہیں دوڑانے لگی۔ دفعتاً اسے دور ایک درخت کے عقب میں ہلکی سی تحریک کا احساس ہوا۔ کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک جوتا تھا جو پاؤں میں پھنسا ہوا تھا اور وہ پاؤں دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گئی، لیکن اس شخص کو کوئی احساس نہیں ہوا۔ درخت کے عقب میں ہلنے والا پاؤں بدستور ہلتا رہا۔ جب کئی بار پاؤں ہٹنے کے باوجود اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا اور اس نے زور سے چیخ کر کہا۔

''کون ہیں آپ اور یہ کیا بدتمیزی ہے، لیکن جواب اب بھی نہیں ملا تھا۔'' رابعہ سلطان کو مزید غصہ آیا تو بولی۔

''اگر تم مر چکے ہو تو تمہاری یہ ٹانگ کیسے ہل رہی ہے۔؟''

''میرے منہ پر سے یہ کپڑا ہٹاؤ تو بتاؤں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' آواز آئی تو رابعہ اچھل پڑی۔ موٹر سائیکل اسے جانی پہچانی تو لگی تھی لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ اس طرح کی ہر موٹر سائیکل صوفی کی ہی ہو، لیکن آواز صوفی کی ہی تھی اور خاص طور سے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس وقت صوفی کا حلیہ بھی ذرا کچھ مختلف تھا۔ گرے کلر کی ٹخنوں سے اونچی پتلون براؤن اور سیاہ رنگ کی چست قمیص جس کا گریبان کھلا ہوا تھا، باقی چہرہ تبدیل کیسے کیا جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ اس وقت منہ میں پان نہیں تھا اور رابعہ سلطان چونکہ میک اپ میں تھی اس لیے صوفی نے ابھی اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ چندھیائی ہوئی نگاہوں سے رابعہ کو دیکھ رہا تھا۔ رابعہ نے بھی ایک دم اپنا انداز تبدیل کر لیا اور غصے کی سی آواز میں بولی۔

''تم زندہ ہو۔''

''فلسفے کی زبان میں بات کر رہی ہو درویشوں کے کرم سے۔''

''لڑکیوں کو دیکھ کر بہت زیادہ اسمارٹ بن رہے ہو؟''

''کسی لاغر بلی کی طرح غرانے کے بجائے انسانوں کی طرح بات کرو تو تمہیں جواب دوں گا درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی اس وقت بالکل ہی مختلف انداز میں نظر آ رہا تھا۔

''میں پوچھ رہی تھی کہ تم زندہ ہو؟''

''کون زندہ ہے؟ اس کائنات میں اگر تم زندگی کی تلاش میں نکلی ہو تو جہاں سے آئی ہو وہیں واپس چلی جاؤ۔ اس کائنات میں زندگی کا وجود باقی نہیں رہا ہے۔ انسان ختم ہو چکا ہے۔ یہ تو چلتے پھرتے سائے ہیں۔ ان میں زندگی کہاں ملے گی۔''

''فلاسفر ہو، یہ سڑک پر موٹر سائیکل کیوں کھڑی کر رکھی ہے؟''

''ہائے۔ اب تو کھڑا ہونا پڑے گا۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''وہ کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، پھر بولا۔

''میں ٹھیک تین بجے یہاں پہنچا تھا۔ سوچا تھا کہ اس کوٹھی کے مالک سے ملاقات کروں گا۔ یہ صاحب جن کا نام شہباز خان ہے، بڑی اہم حیثیت کے مالک ہیں۔''

''تم سے شہباز خان کا کیا تعلق؟'' رابعہ سلطان نے کرخت لہجے میں کہا۔ اسے یہ اندازہ تو ہو گیا

تھا کہ صوفی کے فرشتوں کو بھی یہ شبہ نہیں ہوا ہے کہ یہ رابعہ سلطان ہے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔

''یہ..... شہباز خان کیا تمہارے کوئی عزیز ہیں؟''

''نہیں..... میں ان کا عزیز ہوں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''بہت زیادہ چہک رہے ہو۔''

''کچھ کم کیے دیتا ہوں۔''

''میں کہتی ہوں موٹر سائیکل ہٹاؤ یہاں سے۔''

''ایک بات کا جواب دو گی۔''

''ہاں بولو۔''

''تم مسلمان ہو؟''

''الحمدللہ۔''

''خدا اور رسول پر یقین رکھتی ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر حلفیہ کہو کہ میری موٹر سائیکل ہٹاتے ہی تم فرار تو نہیں ہو جاؤ گی۔''

''کیا مطلب ہے؟ کیا بکواس ہے؟''

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ نہیں فرار ہوں گی۔'' رابعہ نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

''خدا تمہیں دوسری بار خوش رکھے۔ اس نے کہا اور موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اتارتے ہوئے سڑک کے کنارے لے گیا۔''

''اب بولو۔''

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ظاہر ہے شہباز خان کی طرف۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔

''آؤ.....'' رابعہ سلطان نے کہا اور صوفی اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ رابعہ سلطان نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''موٹر سائیکل میں کیا خرابی ہو گئی تھی؟''

''پیٹرولیا کی مریض ہے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''پیٹرولیا.....؟ کیا مطلب؟''

''پیٹ خالی ہو گیا ہے کم بخت کا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں جا کر دھوکا دیتی ہے۔ بس کیا کہوں اب انسانوں کے بعد مشینوں ہی کی بے وفائی برداشت کرنا پڑے گی انسان کو؟

''پیٹرول ختم ہو گیا ہے اس کا.....'' رابعہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں..... سب کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔"

"لیکن..... آپ نے یہاں آتے ہوئے یہ خیال کیوں نہیں رکھا؟"

"میں نے خیال تو رکھا تھا لیکن پیٹرول پمپ والے ادھار نہیں دیتے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"ادھار؟" رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"کیوں؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کیا تمہارے پاس پیسے نہیں تھے؟" پیٹرول بھلا ادھار کہاں سے مل سکتا ہے؟"

"پیسے..... ہر وقت تو نہیں ہوتے۔ ادھار ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمی پیمانے پر ادھار کا کاروبار ہو رہا ہے۔ بس..... بس کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ ادھار کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔"

"تو پھر اب کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں..... موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے وہاں تک لے جاؤں گا یا پھر وہاں پہنچنے کے بعد کچھ تھوڑا سا قرض مانگوں گا۔" شہباز خان صاحب سے میری شناسائی ہے۔ صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان خاموش ہو گئی۔ پھر دونوں اس سامنے والی کوٹھی میں پہنچ گئے جہاں شہباز خان بیٹھا تھا۔ رابعہ سلطان تو ایڈیٹر صاحب کے ایک کام سے یہاں تک آئی تھی، لیکن صوفی یہاں کیوں آیا تھا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہر حال رابعہ سلطان اس بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ آخر کار وہ شہباز خان تک پہنچ گئی۔ دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ شہباز خان کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ ایک سیاست دان تھا۔ کئی بار الیکشن میں حصہ لے چکا تھا، لیکن اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ خود الیکشن میں جیتنا نہیں چاہتا بلکہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے اشارے پر الیکشن کے معاملات کو الجھانے کا کام کرتا ہے اور ٹانگیں اڑا اڑا کر صورت حال کو مشکل بنا دیتا ہے۔ بہر حال شہباز خان آ گیا تھا۔ رابعہ کو پہلی بار ایک عجیب سی الجھن کا احساس ہوا۔ وہ میک اپ میں تھی اور اس نے صوفی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب اگر وہ ایڈیٹر صاحب کا پیغام شہباز خان کو دیتی ہے تو اپنے بارے میں کیا بتائے گی۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ شہباز خان ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ رابعہ سلطان جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ صوفی بھی کھڑا ہو گیا تھا لیکن شہباز خان رابعہ سلطان کی طرف رخ کرنے کے بجائے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بغل گیر ہو گیا۔

"یار کمال ہے صوفی صاحب..... وقت تو جیسے آپ پر ٹھہر گیا ہے۔ جیسے تھے ویسے ہی نظر آتے ہیں۔"

"درویشوں کی دعائیں ہیں، حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔" صوفی نے کہا۔

"کیسا؟"

"یہی کہ انسان یکساں نظر آئے۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ ہر شخص لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ حالات کے تحت۔"

"اتنا میں جانتا ہوں صوفی صاحب کہ حالات آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ بی بی آپ کے ساتھ ہیں؟"

"نہیں۔ راستے میں مل گئی تھیں۔ ساتھ ہی اندر داخل ہوئی ہیں۔"

"جی بی بی..... آپ کون ہیں؟ کیا کام ہے آپ کو؟"

"سر وہ تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"انہیں جانتی ہیں آپ؟" شہباز خان نے صوفی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جی۔ جی۔ جی نہیں۔"

"آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ان کی موجودگی میرے لیے تنہائی ہی ہے۔"

"لیکن وہ..... سر مجھے کسی کا پیغام دینا ہے آپ کو۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ خواتین کا احترام ہمارے لیے ایک معاشرتی ذمے داری ہے۔ میں کچھ لمحوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ آپ ان کی بات سن لیجیے گا۔" صوفی نے کہا۔

"ارے..... ارے..... سنیے تو سہی۔ صوفی صاحب..... سنیے۔ یہ تو بری بات ہے۔ میں انہیں اندرونی کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں سن لوں گا۔ آپ براہ کرم بیٹھیے۔" لیکن صوفی باہر نکل گیا تھا۔ شہباز خان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

"جی بی بی۔" کہیے اور رابعہ سلطان اسے ایڈیٹر صاحب کا پیغام دینے لگی۔

"ٹھیک ہے اور کوئی حکم میرے لیے۔"

"نہیں جناب۔"

"آپ انہیں اطمینان دلا دیجیے۔ میں یہ آرٹیکل انہیں بھجوا دوں گا۔ ان کی خواہش کے مطابق۔"

اس نے کہا۔ مقصد یہ تھا کہ رابعہ فوراً وہاں سے نکل جائے۔ بہر حال رابعہ کا کام اتنا ہی تھا۔ صوفی یہاں کس لیے آیا ہے۔ یہ ذرا سوچنے کی بات تھی، لیکن ظاہر ہے اسے پتا نہیں چل سکتا تھا۔ بہر حال وہ باہر نکل آئی، لیکن واپسی میں بھی اس کا ذہن سوچوں کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ صوفی کے شہباز خان سے اتنے گہرے تعلقات تھے۔ بہر حال وقت نئے نئے انکشافات کر رہا تھا۔ حیرت اسے اپنے آپ پر تھی۔ یہ شخص اس قابل تو نہیں ہے کہ اس کے لیے راتیں حرام کی جائیں۔ اسے اپنے آپ پر جھنجلاہٹ ہونے لگی، لیکن بات وہی آ جاتی ہے۔ پتا نہیں دل یا دماغ کا کون سا حصہ ہے جو اس قسم کی دیوانگی میں مبتلا کر دیتا ہے، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اپنی ایک سانس بھی اپنے قبضے میں نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو نظر انداز کر کے دوسروں کے لیے دل جلایا جائے۔ فرقان جلیل سے ابھی اس سلسلے میں کچھ شکایت سی کی تھی۔ صوفی اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا۔ جب کہ فرقان جلیل نے کہا تھا کہ ان لوگوں کا تو مشن ہی یہ ہے۔ بہر حال اب اس کی اپنی انا بھی جاگ اٹھی تھی۔ اتنا نہیں گرنا چاہیے کسی کے سامنے کہ خود اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگے۔ یہ کم بخت ذہن جو ایک ایسے شخص سے متاثر ہو گیا ہے جس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ رابعہ صوفی کی برائیاں تلاش کرنے لگی۔ بے تکا، غلیظ، احمقانہ باتیں کرنے والا۔ اٹھتے بیٹھتے درویش، ایسے لوگ پریکٹیکل نہیں ہوتے۔ بلاوجہ میں اپنا سر کھپا رہی ہوں۔ فرض کرو، میں اگر اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاؤں تو دنیا میرا مذاق ہی اڑائے گی۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے اور اس کے بعد کوئی تین دن وہ اسی میں مصروف رہی۔ اس دوران نہ تو راجا ناصر سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایسی خبر ملی تھی جس سے اس طرف نشان دہی ہو سکے۔ اس کے علاوہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی۔ ایک دن وہ بیٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی کہ عوامی اشتہارات میں ایک تین سطری اشتہار پر نظر پڑی۔ ایک لیڈی ریسپشنسٹ کی ضرورت تھی۔ خوب صورت اور نوجوان ہونے کی شرط تھی، لیکن ایڈریس سی۔ بی۔ لمیٹڈ لکھا ہوا تھا اور ایک پرانے سے علاقے کی ایک عمارت کے فلیٹ نمبر 30 کا پتا دیا گیا تھا۔ رابعہ سلطان سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا نام پڑھ کر اچھل پڑی۔ اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ وہی مطلوبہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ ہے یا کوئی اور جگہ، لیکن پہلی بار ایک نشان سامنے آیا تھا، اس پر توجہ نہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس خبر کو شیئر کرنے کے لیے کوئی ایسی ہستی ہی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں صوفی سے ایک شکایت کا سا احساس ہوا۔ کیا وہ ان معلومات کا شریک کار نہیں بن سکتا تھا؟ ذہن کو جھٹک کر اداسی کی وہ لہر دور کی جو ذہن میں در آئی تھی اور اس کے بعد اشتہار پڑھنے لگی۔ پھر فیصلہ کیا کہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ تیاریاں کرنے لگی۔ دوسرے دن انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تیار ہو کر چل پڑی۔ اپنی ذہانت سے کام لے کر اس نے ایسا حلیہ اختیار کیا تھا جو ایک درمیانے درجے کے گھرانے کی لڑکی کا تھا۔ وہ عمارت جس علاقے میں تھی وہ ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ سستے اشتہارات میں اس ضرورت کا اشتہار دیا گیا تھا۔ اب پتا نہیں ان تمام باتوں کا پس منظر کیا تھا، لیکن انہیں سوچ کر کم از کم سی۔ بی۔ لمیٹڈ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صائمہ اسی کے سلسلے میں گئی تھی۔ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بہرحال وہ اس علاقے میں پہنچ گئی۔ جس عمارت میں سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا دفتر قائم تھا وہ دفاتر کی عمارت ہی تھی۔ بوسیدہ حال اور کسی قدر غلیظ۔ جس دفتر میں داخل ہوئی وہ بھی بس درمیانے درجے کا ہی تھا۔ تین چار کمرے تھے۔ ایک کمرے کو ویٹنگ روم بنایا گیا تھا اور اس ویٹنگ روم میں اس وقت چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سبھی نے خوب صورت نظر آنے کی کوشش کی تھی، کیونکہ یہ اشتہاری ضرورت کا ایک حصہ تھا۔ پرانے طرز کے صوفے پڑے ہوئے تھے، جو ثابت تو تھے لیکن خاصے خستہ حال۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا جس پر منیجر لکھا ہوا تھا۔ بائیں طرف ایک کمرا تھا جس میں تین چار میزیں پڑی ہوئی تھیں اور میزوں پر لوگ کام بھی کر رہے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ منیجر صاحب آ چکے تھے۔ پہلی لڑکی کو طلب کیا گیا۔ کوئی چھ سات منٹ کے بعد وہ باہر نکلی تو اس کا چہرہ مایوسی سے لٹکا ہوا تھا۔ بہرحال پانچواں نمبر رابعہ سلطان کا ہی تھا۔ اس دوران تین لڑکیاں اور آ چکی تھیں۔ رابعہ سلطان کمرے میں داخل ہو گئی اس دوران وہ سارے ماحول کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ کیا اتنی معمولی سی جگہ اس واقعے سے متعلق ہو سکتی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، لیکن جب اس کی طلبی ہوئی اور وہ اندر پہنچی تو سب سے پہلے منیجر کا چہرہ دیکھ کر ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکے کا احساس ہوا تھا۔ یہ شخص بے شک اچھے سوٹ میں ملبوس تھا۔ لیکن چہرے سے کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی تھی، لیکن لہجہ نرم تھا۔ رابعہ سلطان کو اس نے نگاہیں اٹھائے بغیر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دیکھا۔ منیجر کی میز پر کئی ٹیلیفون رکھے ہوئے تھے۔ بائیں سمت رنگین شیشہ لگا ہوا تھا جس کے دوسری طرف نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ صرف ایک دیوار تھی اور اس دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دروازہ غالباً کسی اور طرف ہوگا۔ منیجر نے مخاطب ہوتے کہا۔

ہے آپ کا؟"

"نوشین ریاض۔"

"کیا تعلیم ہے؟ مس نوشین۔"

"گریجویٹ۔"

"پہلے کہیں ملازمت کی ہے؟"

"نہیں۔"

"اب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

"ضرورت کے تحت۔"

"کتنی تنخواہ درکار ہوگی؟"

"آپ کی خواہش کے مطابق کیونکہ مجھے کام کرنا ہے۔"

"ٹیلی فون اٹینڈ کرنا ہوں گے آپ کو..... اس کے علاوہ تھوڑا سا فائل ورک۔ ڈیوٹی ٹائم نو سے پانچ۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

"ایڈریس دیجیے۔ آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔" منیجر کا انداز بالکل سپاٹ تھا، لیکن اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور منیجر نے جلدی سے فون اٹھا لیا۔ اسے کان سے لگا کر بولا۔

"جی۔ پھر اس کے بعد وہ صرف فون سنتا ہی رہا تھا۔ آخر میں اس نے بغیر کچھ کہے سنے فون بند کر دیا۔ رابعہ سلطان خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ذرا الجھن کا شکار تھی، لیکن نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید وہ صحیح جگہ آ گئی ہے۔ منیجر نے سامنے رکھے ہوئے کاغذات دیکھے اور پھر بولا۔

"دیکھیں بی بی..... ہمارا ایک اصول ہے، جو لوگ ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں ہمارے لیے گھر کے افراد کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں رازداری اور ذمے داری کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ زیادہ بڑا کاروبار بھی نہیں ہے ہمارا، لیکن اپنے ورکرز کو ہم ہمیشہ خوش رکھتے ہیں۔ فی الحال ہم آپ کو آٹھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے سکتے ہیں۔ بہرحال آپ یہ سمجھیے۔ آپ کی ملازمت پکی ہو گئی۔ آپ چاہیں تو آج سے ہی ٹیبل سنبھال سکتی ہیں۔ رابعہ سلطان جو تھوڑے سے ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ ایک دم سنبھل گئی۔ شاید..... تقدیر زور مار رہی ہے۔ ان لوگوں کی کھلی پیش کش اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ بات بن گئی ہے۔ منیجر نے کہا۔

"وہ جو کہا جاتا ہے نہ کہ جو کام کل کرنا ہو وہ آج کرنا چاہیے تو آپ کو آپ کی ٹیبل دکھا دی جائے۔ آپ کسی کو اپنی ملازمت لگ جانے کی اطلاع دینا چاہتی ہیں۔"

"ن..... ن..... نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" منیجر نے کہا اور بیل بجا دی۔ ایک چپڑاسی ٹائپ کا آدمی اندر آیا اور اس نے کہا۔

"میڈم کو سامنے والا کمرہ دکھا دو یہ ہماری نئی ساتھی ہیں۔" رابعہ سلطان بادل نہ خواستہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک میز اسے دے دی گئی تھی۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی کچھ فائل لے کر آیا۔ رابعہ سلطان کو کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتاتے ہوئے بولا۔

''آپ ذرا ان کی ترتیب کر لیجیے۔ معاف کیجیے گا ہمارا دفتر معمولی سا ہے، لیکن اصولوں کے لوگ ہیں یہاں آپ کو کبھی تنخواہ کے حصول میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ پہلی تاریخ کو آپ کا لفافہ آپ کے پاس ہوگا اور نہ ہی کسی اور ذہنی الجھن سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔ رابعہ سلطان بہ ظاہر کاغذات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے اس شخص کو بھی دیکھا تھا جس نے یہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس سے بہتر انداز میں بات چیت کی تھی، لیکن اس چہرے کا کیا کیا جاتا جس پر شرافت کا کوئی نشان نہیں تھا اور پھر ایک اور شبہ جو اس کے ذہن میں تھا وہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہ ٹیلی فون جو مینیجر کو ملا تھا اور مینیجر کا رویہ فوراً تبدیل ہوگیا تھا۔ یقینی طور پر وہ رابعہ سلطان ہی کے بارے میں تھا اور شاید اسی پر رابعہ سلطان کو ملازمت دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بہرحال سی۔ پی۔ لمیٹڈ تک پہنچ گئی تھی۔ صائمہ کے گھر سے سی۔ پی۔ لمیٹڈ کا بس ایک کارڈ ملا تھا جسے پھاڑ دیا گیا تھا لیکن یہ ایک اشارہ تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہرحال دوسرے دن سے وہ باقاعدگی کے ساتھ آفس جانا شروع ہوگئی۔ پہلے دن اس نے اپنی میز پر بیٹھ کے کام کیا تھا اور یہ کام ہر لحاظ سے فرم سے متعلق تھا البتہ رات کو جب وہ گھر واپس آئی تھی تو اس نے بڑی بے کلی محسوس کی تھی۔ کسے بتاؤں اپنی اس کارکردگی کے بارے میں، راجانا صر ذہن میں آیا تھا لیکن راجانا صر کا کردار اس کی نگاہوں میں بہتر نہیں تھا۔ راجانا صر کسی بھی لمحے اپنی ملازمت کے ہاتھوں شکار ہوسکتا ہے۔ یہ رسک نہیں لیا جاسکتا۔ صوفی۔ دل میں یہ خیال آیا لیکن وہ دل مسوس کر رہ گئی اور بہت دیر تک اپنے آپ پر نفرین بھیجتی رہی۔ ایک ایسی شخصیت جسے کوئی بھی پسند نہ کرے خواہ مخواہ اسے اپنے ذہن پر سوار کر رہی ہے۔ نہیں..... ہرگز نہیں بہرحال دوسرا دن بھی برا نہیں گزرا تھا، البتہ جب وہ واپس پلٹی تو اس نے پیلے رنگ کی اس کار کو دیکھا جو اس کا تعاقب کر رہی تھی اور اسے یاد آیا کہ پچھلے دن بھی یہ کار اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے ذہن میں چھنا کا ہوا تھا۔ یہ تعاقب..... یہ تعاقب..... یہ تعاقب۔

♥.....♥.....♥

صوفی گرین ہاؤس میں داخل ہوگیا۔ شازیہ لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''کیا ہے چھوٹے بابا۔ اتنی بوریت ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ نہ کوئی کام نہ دھندا، بس گھر میں بیٹھے رہو۔ کیا مجرموں نے جرائم کرنا چھوڑ دیے ہیں؟ یا آپ نے ان پر توجہ دینا ترک کر دی ہے۔ بتایئے نا چھوٹے بابا۔''

''درویش ہم سب پر رحم کریں۔ واقعی چل تو خاموشی ہی رہی ہے۔ تم ایسا کرو شازیہ میں ایک وظیفہ بتائے دیتا ہوں۔ چالیس دن تک پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔ چالیس دن تو گزر ہی جائیں گے۔ درویشوں کی دعاؤں سے اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' شازیہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

''اور اس سے حاصل کیا ہوگا؟''

''چالیس دن کی مصروفیت۔'' صوفی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں غلام قادر آ گیا۔

''اڑے ماں قسم ابھی تمہارے کو یاد کیا وڑی کدھر مر گیا تم چھوٹا بابا۔''

''ان سب کے لیے کوئی ایسا مشغلہ تلاش کرنا پڑے گا جیسا اس عامل نے اپنے جن کے لیے کیا تھا۔ صوفی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''وڑی میرے کو تو معلوم نہیں۔ جن نے، عامل کو کیا کیا تھا۔'' غلام قادر بولا۔

''جن نے نہیں بلکہ عامل نے جن کے ساتھ کیا تھا۔ جن کو کوئی کام بتانا تھا۔ وہ ہر وقت کہتا رہتا تھا کہ مجھے کوئی کام بتایئے۔ عامل نے اسے ایک چھلنی دیتے ہوئے کہا کہ اس چھلنی میں پانی بھر لاؤ۔ جن چھلنی میں پانی بھرتا وہ گر جاتا۔ بس اسی پریشانی میں اس کا وقت گزرنے لگا۔''

''ارے خدا قسم، وہ جن تھا یا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا کلرک جس سے کوئی کام ہی نہیں بنتا پڑا۔ ابھی اگر جن تھا وہ تو اس کے لیے چھلنی میں پانی لانا کون سا مشکل تھا۔ بات کرتا ہے۔'' غلام قادر نے گردن ٹیڑھی کر کے اور منہ بنا کر کہا۔

صوفی ان لوگوں کے ساتھ داخل ہوگیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور بالکل اتفاقی طور پر صوفی کا گزر بھی ادھر سے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ لوگ شکایت کر رہے تھے لیکن فیضان اور عادل کو اس نے کام سے لگایا ہوا تھا اور اس وقت وہ انہی کو فون کر کے وہ گرین ہاؤس پہنچا تھا اور اس کے اہل خاندان، شازیہ اس کی والدہ اور بہن سب کے سب یہاں خوش تھے۔ ان کا اپنا ایک خاندان بن چکا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے، عیش و آرام کی زندگی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے ان کے لیے ہر ضروری سہولت مہیا کر دی تھی۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد عادل اور فیضان وہاں پہنچ گئے۔ دونوں کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں اور پھر وہ صوفی کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے صوفی کو سلام کیا تو صوفی نے کہا۔

''ہاں۔''

''آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا چھوٹے بابا! رابعہ سلطان کا تعاقب کل بھی کیا گیا تھا اور آج بھی کیا گیا ہے۔ تعاقب کرنے والا ایک مقامی غنڈہ فیروز ہے۔ فیروز ایک پیلے رنگ کی گاڑی میں مسلسل پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہم نے ابھی اسے پکڑا نہیں کیا، لیکن اس کی رہائش گاہ وغیرہ کا ہمیں پتا ہے۔ کل بھی جب رابعہ سلطان دفتر سے نکلی تھیں تو فیروز ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ ایک آٹو رکشا میں اپنے گھر پہنچی تھیں۔ آج بھی وہ صبح ہی صبح اس کے گھر پر پہنچ گیا۔ وہاں سے ان کا تعاقب کرتا ہوا دفتر تک آیا۔ دفتر سے تعاقب کرتا ہوا گھر تک۔ رابعہ سلطان نے کہیں اور کا رخ نہیں کیا۔ بس گھر اور دفتر، دفتر اور گھر۔ اب اس وقت وہ اپنے گھر پر ہیں۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے کہا۔

''کس پر۔'' شازیہ نے سوال کر ڈالا اور صوفی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''کل تیسرا دن ہے۔ کل صورت حال کا مزید جائزہ لو اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہو مجھے بتانا۔''

''جی۔'' عادل نے کہا، پھر اس کے بعد صوفی ان لوگوں سے دوسرے موضوعات پر باتیں کر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کی واپسی کا ابھی کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

♥.....♥.....♥

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''فیروز بیگ نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر پیلے رنگ کی وہ کار ایک مکان کی آڑ میں روک دی۔ یہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ نیچے اترا اور سیٹی بجاتا ہوا اس عالی شان کوٹھی کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا، جو جلال الدین شاہ کی کوٹھی تھی۔ جلال الدین شاہ ایک بہت بڑا صنعت کار تھا۔ وہ نامی گرامی شخص تھا اس کی بہت سی فیکٹریاں اور شوروم شہر میں موجود تھے۔ کوئی تین سال قبل اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اب اس کی بیوہ ناظمہ جلال سارے امور سنبھالے ہوئے تھی۔ ناظمہ جلال ایک سخت گیر عورت تھی۔ بھاری بدن، بھاری جبڑے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بھینچے ہوئے ہونٹ اس کی سنگ دلی کا پتا دیتے تھے۔ بہت کم بولتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک کرختگی سی چھائی رہتی تھی۔ پیشانی شکن آلود ہوتی تھی۔ لہجہ مدھم لیکن ٹھوس۔ ایک عجیب وغریب کردار تھا اس کا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ بہر حال اس کی زندگی سے کون سی کہانی وابستہ تھی یہ تو ابھی صیغہ راز میں ہی تھا۔ فیروز بیگ کوٹھی سے اندر داخل ہو گیا۔ ملازموں نے اسے ایک مخصوص کمرے میں پہنچا دیا جو ڈرائنگ روم نہیں تھا بلکہ ہلکے پھلکے فرنیچر سے آراستہ ایک عام سی نشست گاہ تھی۔ یہاں وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ سامنے کا پردہ ہٹا اور بھاری بدن کی مالکہ ناظمہ جلال سفید سلک کے خاص انداز کے لباس میں اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں غنودگی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے فیروز بیگ کو دیکھا جو اس کے آتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر وہ خود ایک صوفے پر بیٹھی اور اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''بیٹھو۔'' فیروز بیگ مودبانہ انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''میڈم آپ کی واپسی کب ہوئی؟''

''اب سے تھوڑی دیر پہلے، لیکن میں شہر پر سوں ہی واپس آ گئی تھی۔''

''آپ نے مجھے طلب نہیں کیا، اس لیے میں پوچھ رہا تھا میڈم۔''

''ضرورت کے بغیر نہ تو اس طرف آنے کی کوشش کرنا اور نہ ہی میں تمہیں بلاؤں گی۔ ہمیں خیال رکھنا ہے۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ ان باتوں کا تو میں خاص طور سے خیال رکھتا ہوں۔''

''ہوں۔ کیا رپورٹ ہے؟''

''میڈم! آپ مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی ہیں یہ بات تو خیر طے ہے کہ یہ وہی اخباری رپورٹر ہے جو ہمارے خلاف زہر اگلتی رہی ہے۔ بہت زیادہ ہم درد اور انسان دوست بننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ راجا ناصر نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ راجا ناصر اب بھی ہمارا ہی وفادار ہے، لیکن یہ خود کافی تیز معلوم ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ ریاض علی کے گھر بھی پہنچ گئی تھی۔ لازمی بات ہے کہ ریاض علی کی بیٹی صائمہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پہنچی تھی جس کی چھٹی کر دی تھی ان لوگوں نے۔''

''ہاں وہ مجھے معلوم ہے لیکن تم پورے اعتماد کے ساتھ کیسے کہتے ہو کہ یہ وہی ہے؟''

''میڈم! ایسی باتیں بلاوجہ تو نہیں کہی جا سکتیں۔''

''دفتر کی کیا کیفیت ہے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہے کہ میرے اشارے پر اسے رکھا ہے۔ منیجر

سمجھتا ہے کہ میں نے اسے کسی اور مقصد کے لیے رکھا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ بڑی خطرناک لڑکی ہے۔ اس طرح کی جذباتی لڑکیاں عام طور سے مشکل کا باعث بن جاتی ہیں۔ ہم ایسی کسی لڑکی کو کسی طرح بھی موقع نہیں دے سکتے۔''

''جی میڈم! میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک۔ اچھا اب بتاؤ، کرنا کیا ہے؟''

''میڈم جو بھی حکم دیں۔''

''میرا خیال ہے خطرے کو زیادہ قریب نہیں آنے دینا چاہیے۔ تم آج اسے اٹھا لو۔ کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے میڈم۔ میں خود بھی آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ خطرے کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہیے۔ اسے اٹھا لینا بہت مناسب ہے۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی تو دفتر سے جا چکی ہے، لیکن کسی کام سے گھر سے باہر نکلے گی تو میں اسے اٹھا لاؤں گا۔''

''گھر میں گھس کر اٹھا لاؤ۔ کون کون ہوتا ہے اس کے ساتھ؟''

''میرا خیال ہے میڈم کوئی بھی نہیں۔''

''تو پھر کیا مشکل ہے؟''

''ٹھیک ہے وہ پہنچ جائے گی۔'' فیروز نے جواب دیا۔

♥.....♥.....♥

رابعہ واقعی بد دل ہو گئی تھی۔ صوفی کی بے اعتنائی نے اسے ایک دکھ دیا تھا۔ دل پھینک لڑکی نہیں تھی۔ زندگی کو بہت تلخ انداز میں گزارا تھا اس نے۔ حسن وعشق بے شک زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں لیکن بعض کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس حد تک پہنچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ وہ زندگی سے اس طرح جنگ کرتے رہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں اس قسم کا گداز پیدا نہیں ہو پاتا۔ رابعہ بھی انہی لوگوں میں سے تھی اور شاید اس کی فطرت کی یہی انفرادیت تھی کہ اس نے صوفی جیسے آدمی کو اپنا مرکز نگاہ بنا لیا تھا۔ یہ ایک جذباتی عمل ہی تھا اور اس کے شناساؤں کے لیے یقیناً حیران کن ہوتا اگر وہ اس بارے میں جان پاتے۔ خود اس کے دفتر میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اس کی جانب قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن رابعہ جیسی اسٹریٹ فارورڈ لڑکی اس طرح کسی سڑک چھاپ سے عشق نہیں لڑا سکتی تھی۔ اس نے بڑے پیار بڑی محبت سے ان سے اپنے رشتے قائم کر لیے تھے اور وہ سب شرمندہ ہو گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب بھی رابعہ کے کردار سے بہت متاثر تھے، لیکن ان دنوں رابعہ مشکل کا شکار تھی۔ وہ اونٹ کا بچہ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی اس طرح اس کے دل کو بھا گیا تھا کہ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ بہر حال بہت الجھنوں کا شکار تھی وہ۔ سی بی لمیٹڈ میں کام کرتے ہوئے اسے تین دن گزر چکے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جو مشکوک ہوتی۔ نہ ہی کوئی ایسا کردار اسے ملا تھا اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ سی بی لمیٹڈ صرف ایک اتفاق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا اور صائمہ بے چاری جو ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی، کہیں سے سی بی لمیٹڈ کی کسی اشتہار وغیرہ سے متاثر ہوئی ہو اور اس سلسلے میں اس نے وہ کارڈ حاصل کیا ہو جو اس کے پاس موجود تھا۔ ملازمت نہ ملنے پر اس نے وہ کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا، چنانچہ وہ کسی حد تک بد دل سی ہو گئی تھی۔ اب نوکری تو کرنی نہیں تھی اس نے اخبار کے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ایڈیٹر صاحب اکثر اسے فون کرتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی اس کے مشن سے متاثر تھے۔ ادھر فرقان جلیل بھی کئی بار اس سے پوچھ چکا تھا لیکن رابعہ نے اسے اپنی ذہنی کیفیت نہیں بتائی تھی اور فرقان جلیل کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ خود اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ صوفی صاحب شاید مصروف ہیں، اس لیے اسے وقت نہیں دے پا رہے۔ بہر حال اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے ایڈیٹر صاحب کا فون موصول ہوا۔

''جی سر! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

''میں تو ٹھیک ہوں رابعہ۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''سر ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ ٹھیک رہتے ہیں۔'' رابعہ نے جواب دیا۔

''میں نہیں مانتا۔'' ایڈیٹر صاحب بولے۔

''کیوں سر؟''

''تم حد سے زیادہ جذباتی ہو رابعہ۔ خیر جذبات زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ جذبات تو جانوروں میں بھی ملتے ہیں۔ یہی جان داروں اور بے جانوں کے درمیان تفریق ہوتے ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ غیر جذباتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے یا پھر وہ انسانوں سے الگ کوئی چیز ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جذباتی ہونا تو کوئی بری بات نہیں ہے لیکن رابعہ میری اور تمہاری عمر کے درمیان جو تفریق ہے اس کا سہارا لے کر میں بزرگ کی حیثیت سے سمجھاتا ہوں کہ ضرورت سے زیادہ جذباتیت بڑے نقصان کی چیز ہے۔ وہ لوگ جو کسی چیز سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے، بہت اچھی زندگی گزارتے ہیں اور میں اس وقت خاص طور سے یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دو لڑکیوں کی موت نے تمہیں دیوانہ بنا دیا ہے۔ تم زندگی کا خطرہ مول لے رہی ہو۔ دیکھو۔ مجرم جب جرم کرتا ہے تو اس کی اپنی ایک پلاننگ ہوتی ہے۔ وہ اس پر بہت غور کرتا ہے، بہت سوچتا ہے اور سوچنے سمجھنے کے بعد وہ جرم کرتا ہے اور پھر اس جرم کی تفتیش کرنے والے ظاہر ہے صرف چھوٹے چھوٹے پوائنٹس تلاش کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی باقاعدہ سڑک نہیں ہوتی جو جرم کے گھر پر جا کر ختم ہو جائے، جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اتنے منظم لوگ ہوں گے کہ ان تک پہنچنا آسان کام نہیں ہوگا۔ تم بے شک جو کوشش کر رہی ہو وہ قابل ستائش ہے، لیکن رابعہ اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہ کرو۔ جاری رکھو اپنا یہ عمل، کوشش کرتی رہو، لیکن تم جس طرح جذباتی ہو رہی ہو اور جس طرح یہ چاہتی ہو کہ یہ کیس فوراً ختم ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ مشکل ہے۔''

''سر! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ کوئی تیسری لڑکی اس طرح ظلم کا شکار نہ ہو۔''

''بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیاں اس درندگی کی بھینٹ چڑھ چکی ہوں گی۔ بات علم میں آ جانے والی ہے، اگر اس شام تم راجا ناصر کے دفتر میں نہ

بیٹھی ہوتیں تو اس لڑکی کے بارے میں تمہیں کچھ نہ معلوم ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اخبار کو یہ خبر ملتی کہ ایک لڑکی حادثے کا شکار ہو گئی اور اس کی لاش ایک گلی میں پائی گئی۔ بس اس کے بعد تم پولیس کی تفتیش پر انحصار کرتیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تیسری لڑکی کی بات نہ کرو۔''

''سر۔ چلیے ٹھیک ہے وہ تیسری نہ سہی بیسویں، پچیسویں یا پچاسویں لڑکی ہے۔ اگر وہ پچاسویں ہے تو میں اکیانویں لڑکی کو بچانا چاہتی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔

''تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ۔ گھر پر ہوں۔ تم سے باتیں کروں گا۔ دل چاہ رہا ہے۔ ویسے بھی کئی دن سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔'' رابعہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

''میں آ رہی ہوں سر۔ آتی ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔''

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' ایڈیٹر صاحب نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایڈیٹر صاحب ایک مشفق اور بہت ہی اچھے انسان تھے۔ رابعہ صرف اس لیے ان کی عزت نہیں کرتی تھی کہ وہ اس کے اخبار کے ایڈیٹر تھے بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے بھی وہ ان سے متاثر تھی۔ ان کی طلبی پر وہ فوراً ان کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ویسے بھی گھر میں اس وقت بے کار تھی اور یہ غور کر رہی تھی کہ اب وہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی ملازمت کو جاری رکھے یا نہ رکھے۔ وہاں سے اسے ابھی تک کچھ نہیں حاصل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایڈیٹر صاحب سے مشورہ کر لینا بھی مناسب ہوگا۔ اس نے سوچا اور لباس تبدیل کرنے لگی پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکلی آئی۔ اپنے خاص اصولوں کے تحت اس نے اپنے آپ کو ایک حد تک محدود رکھا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک آٹو رکشا مل گیا تو وہ اس میں بیٹھ گئی اور آٹو رکشا کے ڈرائیور کو اس نے اس علاقے کا پتا بتا دیا۔ شام رات کی دھندلاہٹوں میں ڈوب چکی تھی اور اندھیرا فضاؤں پر تیزی سے مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ جس علاقے میں رہتی تھی وہاں سے تقریباً کوئی تین میل تک راستے سنسان ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی یہ کوئی مصروف گزرگاہ نہیں تھی۔ درمیانے درجے کا علاقہ تھا۔ رکشا ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ نیلے رنگ کی ایک پرانی کار نے اس کا راستہ روک لیا۔ رکشا ڈرائیور نے بریک لگائے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ غالباً وہ کار والے کو گالیاں دے رہا تھا۔ کار سے تین چار آدمی نیچے اتر آئے۔ رکشے والا انہیں برا بھلا کہنے لگا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ اس طرح گاڑی آگے لگائی، اگر میں پورے بریک نہ لگا دیتا۔'' لیکن دو آدمیوں نے رکشے والے کا گریبان پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے نیچے کھینچ لیا۔ رکشے والے کے منہ سے ارے ارے ہی نکلا تھا کہ ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ ایک طرف لڑھکا تو دوسرے آدمی نے اس کے سر پر کسی چیز سے ضرب لگا دی۔ رابعہ سلطان گھبرا کر رکشے سے نیچے اتر آئی تھی۔ رکشا ڈرائیور لہرانے لگا اور اس کے بعد وہیں سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ رابعہ سلطان جیسے ہی نیچے اتری، کار سے اترنے والے دو آدمیوں نے ریوالور کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔

''چلو کار میں بیٹھو۔''

''کک..... کیا..... کیا بدتمیزی ہے؟'' رابعہ سلطان کے منہ سے ہکلائی ہوئی آواز نکلی، لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے ہی لمحے ان میں سے ایک نے اس کی گردن دبوچی اور کار کے کھلے دروازے سے اندر دھکا دے دیا، پھر وہ دونوں پھرتی سے اس کے دائیں بائیں آ بیٹھے۔ باقی دو افراد میں سے ایک نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور دوسرا اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کار برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔

اس قسم کے واقعات کی رپورٹنگ تو رابعہ نے بہت سی بار کی تھی خود کسی ایسے واقعے سے دوچار ہونے کا تجربہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا اور وہ کچھ دیر کے لیے بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برابر بیٹھنے والوں نے دونوں طرف سے ریوالور کی نالیں اس کی پسلیوں سے لگائی ہوئی تھیں۔ کار کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ رابعہ کو ایک لمحے کے اندر اندازہ ہو گیا کہ اس کے لیے ان لوگوں کے چنگل سے بچنا مشکل ہے، وہ کسی سنگین حادثے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔

حالات جس طرح اچانک پیش آئے تھے۔ ان میں عقل کا باقی رہ جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ راستوں کو بھی ذہن میں نہیں رکھ سکی اور غش کی سی کیفیت میں کار کا یہ سفر طے ہوا پھر وہ کون سے علاقے میں آئی۔ کون سی عمارت میں جا کر رکی۔ رابعہ سلطان کو اس کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف بیٹھے ہوئے افراد دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے اور پھر انہی میں سے ایک نے ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو نیچے اترو، بیگم صاحبہ کار آپ کو لے کر کسی اور شہر نہیں جائے گی۔ اترو۔'' وہ غرایا تو رابعہ نے سیٹ پر ہاتھ ٹکائے اور اپنے جسم کو جنبش دے کر دروازے کی طرف کھسکایا، پھر نیچے اتر گئی۔ پاؤں لرز رہے تھے۔ بے حد کوشش کر رہی تھی کہ خود کو سنبھال سکے، لیکن بس اعصابی کمزوری اس طرح سوار تھی کہ اگر کار کا سہارا نہ لیتی تو شاید گر پڑتی۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔ رابعہ نے اس سے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''شرافت سے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کسی عورت کی بے عزتی کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اگر تمہیں اس کا شوق ہے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس نے رابعہ کو کندھے سے پکڑ کر دھکا دیا۔ رابعہ گرتے گرتے بچی۔ یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ اب ان کی ہدایت پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

عالی شان عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچنے کے بعد وہ اسے لیے ہوئے ڈرائنگ روم سے بھی آگے بڑھ گئے اور پھر شاید یہ کوئی مخصوص نشست گاہ تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے کئی راہ داریاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ اس کے بعد اسے لانے والوں نے ایک بند دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ ان کے انداز میں بڑی جارحیت تھی اور رابعہ محسوس کر رہی تھی کہ خاصا مشکل وقت آ پڑا ہے اور ہو سکتا ہے یہ لمحات اس کے لیے زندگی اور موت کے لمحات بن جائیں۔ بڑے سے کمرے میں پہنچ کر وہ رک گئی۔ اسے لانے والے اسے وہاں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ رابعہ احمق نہیں تھی کہ یہ سوچتی کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئے ہوں گے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لازمی امر تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دیا ہوگا۔

وہ وحشت زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کا ایک اندرونی دروازہ بھی تھا جس پر پردہ جھول رہا تھا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ پردے کے عقب سے ایک دراز قامت عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے سفید سلک کا مخصوص طرز کا عربی لبادہ پہنا ہوا تھا۔ چہرے سے خاصی بارعب نظر آ رہی تھی۔ چال میں

بھی ایک وقار تھا۔ اندر داخل ہوئی۔ سرد نگاہوں سے رابعہ سلطان کو دیکھا۔ ایک صوفے پر جا بیٹھی اور رابعہ سلطان سے بولی۔

''بیٹھو۔ رابعہ سلطان کے قدم خود بھی بے جان سے ہو رہے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ آگے بڑھی اور عورت کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''رابعہ سلطان!'' اس نے رابعہ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا اور پھر رابعہ کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''میں..... ناظمہ جلال ہوں۔ میرے شوہر جلال الدین ملک کے بہت بڑے صنعت کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن ان کا چھوڑا ہوا کاروبار اب بھی بہت وسیع ہے اور باہر کے کئی ملکوں میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس ملک کے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سرکاری طور پر بھی ہماری بڑی عزت ہے۔ اعلیٰ حکام سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں جس کی بنا پر ہمارا کوئی کام بھی رکتا نہیں ہے اور ہم لوگ ہر مشکل کا حل یہ آسانی تلاش کر لیتے ہیں۔ رابعہ سلطان! تم نے اگر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش ہے تو بے شک تم دنیا کی نگاہوں سے چھپ سکتی ہو، لیکن ہماری نگاہوں سے نہیں۔ سمجھ رہی ہو نا تم۔ تم اخبار میں کام کرتی ہو اور تم ہی وہ لڑکی جوان لڑکیوں کے قتل کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ لکھ رہی ہو۔ جب کہ دوسرے اخبارات اس بارے میں زیادہ شور نہیں مچا رہے۔ کیا سمجھیں؟ تمہارے اخبار کے ایڈیٹر صاحب کو وارننگ دی گئی لیکن پتا یہ چلا کہ تم اس سلسلے میں خاصی جذباتی ہو اور شاید اپنے ایڈیٹر صاحب کے احکامات بھی قبول نہیں کرتیں۔ رابعہ سلطان بعض اوقات کچھ معاملات انسان کی مجبوری بن جاتے ہیں اور وہ مجبوری کے آگے اس طرح بے بس ہو جاتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں تمہیں بتاؤں قدرت نے ویسے تو انسان کو بہت سے جذبوں سے نوازا ہے لیکن ان میں ایک جذبہ جو ہے وہ بڑی انفرادیت رکھتا ہے اور وہ ہے جذبہ محبت۔ ایسی تکلیف دہ کیفیت ہوتی ہے یہ کہ بس..... بیان سے باہر ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ الفاظ میں اس کی تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔ رابعہ سلطان..... تھوڑا سا اپنے بارے میں بتاؤں تمہیں، ایک اچھے خاصے گھرانے کی شریف زادی تھی میں۔ یہاں میں لفظ ''تھی'' استعمال کر رہی ہوں، کیونکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ کوئی اچھا عمل نہیں ہے۔ سوفی صدی مجرمانہ کارروائی ہے وہ۔ زندگیاں گئی ہیں۔ اس لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے میں اپنے آپ کو کوئی اچھی شخصیت نہیں کہہ سکتی، لیکن بات وہی ہے یہ لفظ مجبوری بہت سے عیبوں کی پردہ پوشی کر لیتا ہے۔ خیر میں اس لیے اتنی باتیں کر رہی ہوں کہ تمہارا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ تم ایک صحافی ہو، لیکن میری مجبوریاں مجھے تم سے دشمنی پر آمادہ کرتی ہیں اور تم اس بات میں حق بہ جانب ہو کہ مجھے ایک بدترین دشمن کی نگاہ سے دیکھو۔ اب یہاں پر سوال یہ آ جاتا ہے کہ دو دشمنوں کے درمیان جب طاقت آزمائی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک کو شکست کھانی پڑتی ہے۔ تمہیں منع کیا گیا تمہارے ایڈیٹر صاحب کے ذریعے کہ بی بی مت پڑو ان چکروں میں۔ وہ لڑکیاں جو ہلاک کی گئیں حالات سے سمجھوتہ کرنا نہیں جانتی تھیں۔ بلاوجہ عزت آبرو کا ڈھونگ رچا کر زندگی سے لڑیں اور موت کا شکار ہو گئیں۔ مجبوری تھی ہم اپنے آپ کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتے تھے۔ بہت سے سوالات تمہارے ذہن میں آ رہے ہوں گے۔ بتا رہی ہوں تمہیں، تمہارے ہر سوال کا جواب دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار پر لگے ہوئے ایک سوئچ کو دبا دیا۔ سامنے کی دیوار کا ایک حصہ اس طرح سرکنے لگا جیسے سلائیڈنگ ڈور ہوتے ہیں۔ اس کے عقب میں انتہائی شفاف شیشہ لگا ہوا تھا اور وہ دیوار جو بہ ظاہر دیوار نظر آتی تھی، دیوار نہیں تھی بلکہ کوئی اور چیز تھی جو فولڈ ہو سکتی تھی اور پھر شیشے کے دوسری طرف ایک انتہائی بدنما مخلوق نظر آئی۔ اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن ایک جوان شخص کا چہرہ تھا۔ کوئی ایک فٹ لمبا چہرہ، پچکے ہوئے گال، پھیلی ہوئی آنکھیں، ضرورت سے زیادہ چوڑی ٹھوڑی، کسی پہلوان جیسی گردن، اسی مناسبت سے جسم بھی تھا۔ قد تقریباً چھ فٹ لیکن اوپر کا دھڑ بلا مبالغہ پانچ فٹ سے کم نہیں تھا اور ٹانگیں صرف ایک فٹ گول گول، موٹی پنڈلیاں، ایک عجیب و غریب مخلوق تھی۔ لوگوں کے جسم بدنما ہوتے ہیں موٹے اور بھدے بھی ہوتے ہیں لیکن اس جسم کی بناوٹ اتنی عجیب تھی کہ آنکھوں کو یقین نہ آئے۔ وہ کسی پنجرے میں بند چیتے کی طرح پورے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جسمانی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ فولاد ہے۔ سلائیڈنگ دیوار ہٹتے ہی اس نے شیشے سے اس طرف دیکھا۔ پہلے اس کی نگاہ ناظمہ جلال پر پڑی اور اس کے بعد رابعہ سلطان پر۔ دوسرے لمحے اس نے چھلانگ لگائی اور شیشے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اب وہ تیز چمک دار آنکھوں سے رابعہ سلطان کو دیکھ رہا تھا اور اس کے منہ سے کتے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ عجیب سے انداز میں کراہ رہا تھا اور اس کے چہرے پر نحوست پھیلتی جا رہی تھی۔ رابعہ سلطان کا پورا جسم لرز کر رہ گیا۔ بدنما مخلوق اسے دیکھتی رہی، تب اس کی پھٹی پھٹی آواز ابھری۔

''ماما..... ماما..... اسے اندر بھیج دو۔ دروازہ کھول دو ماما۔ بھیج دو اسے اندر۔ ماما پلیز۔ اسے اندر بھیج دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔''

''انتظار کرو۔'' ناظمہ جلال کی سپاٹ آواز ابھری اور وہ بچوں کی طرح مچلنے لگا۔

''جلدی بھیج دو ماما۔ ماما پلیز۔'' عورت نے دیوار کے پاس جا کر بٹن دبایا اور سلائیڈنگ وال اپنی جگہ برابر ہوگئی۔ وہ پھر صوفے پر آ بیٹھی اور بولی۔

''یہ گل ہے جسے تم نے دیکھا۔ میرا بیٹا۔ میں نے اس کا نام گل رکھا ہے یعنی پھول۔ ماں تو نہیں ہو نا تم۔ تم غیر شادی شدہ ہو۔ وہ بادشاہ والی کہانی بھی سنی ہوگی تم نے، جس نے بچوں کے حسن کا انتخاب ایک ماں کے سپرد کر دیا تھا۔ ہزاروں خوب صورت بچوں میں سے ماں نے اپنے کالے کلوٹے بچے کو اول حسین بچہ قرار دیا تھا۔ قدرت نے ماں کی نگاہ ایسی ہی پیدا کی ہے۔ کسی ماں کو اس کی کل کائنات میں سمیٹنا ہو تو اس کا بچہ اس کے سامنے کر دو۔ میرے لیے بھی یہ گل ہی ہے۔ ایک نازک پھول، حالانکہ یہ اپنے مضبوط ہاتھوں سے لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں موڑ سکتا ہے۔ ایک گھونسا مار کر کسی بھی انسان کا بھیجا باہر نکال سکتا ہے، لیکن میرے لیے وہ گل ہے۔ سولہ سال ہو گئے تھے۔ میں اولاد کے لیے تڑپ رہی تھی۔ تقدیر کا کھیل ہے، شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ جس وقت میری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن ذہنی طور پر میں بہت معصوم تھی۔ میں نے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ شادی کے بعد چھوٹے چھوٹے بچے دنیا میں آ جاتے ہیں۔ بچے مجھے اتنے پسند تھے کہ بتا نہیں سکتی۔ دوسروں کے بچوں کو گود میں لے کر کھلایا کرتی تھی، لیکن پھر بچوں کی مائیں معذرت کر کے انہیں میری گود سے لے کر چلی جاتی تھیں اور میں مچلتی رہ جاتی تھی۔

میرے دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ کاش یہ بچہ میری ملکیت ہوتا۔ کوئی اسے میرے پاس سے نہ لے جاتا۔ میں شادی کے لیے صرف اس لیے تیار ہوگئی کہ اس کے بعد میرے اپنے بچے ہوں گے اور میں ان کی مالک ہوں گی۔ جلال دین بہت اچھے آدمی تھے۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے تھے۔ بے انتہا دولت مند کاروباری امور میں دن رات پھنسے ہوئے لیکن تقدیر نے مجھ پر وہ مہربانی نہیں کی۔ شادی کا پہلا سال، دوسرا سال، تیسرا سال اور اس کے بعد بہت سے سال گزر گئے، لیکن ہمارے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ میری ذہنی کیفیت خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کائنات سے نفرت ہوگئی تھی مجھے۔ میں ماں نہیں بن سکی تھی۔ ہزاروں علاج، دعائیں، منتیں لیکن اولاد سے محروم رہی۔ میں ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ سولہ سال، پورے سولہ سال میں نے کرب میں گزارے، لیکن پھر اچانک قدرت مجھ پر مہربان ہوئی اور آخر کار میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا، لیکن نہ جانے کیوں، تقدیر میرے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میرا بچہ اپاہج نہیں تھا، لیکن عجیب الخلقت تھا۔ جسم دیکھ چکی ہو اس وقت اس کے پاؤں چار انچ یا تین سے انچ سے زیادہ نہیں تھے۔ جب وہ اس دنیا میں آیا جب کہ اس کا دھڑ یعنی اوپر کا بدن بہت لمبا تھا۔ جلال الدین تو اسی وقت شدید بددل ہوگئے تھے۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا تھا کہ ناظمہ اولاد ہماری تقدیر میں نہیں ہے۔ دکھی تو میں بھی تھی لیکن ماں اور باپ میں فرق ہوتا ہے۔ باپ کو اس کی ظاہری کیفیت سے دکھ ہوا تھا، لیکن مجھے وہ ہر حال میں عزیز تھا۔ میں نے اس کا نام گل رکھا۔ جلال الدین نے کبھی اسے باپ کی محبت نہیں دی۔ وہ ویسے تو نارمل تھا، لیکن جب عمر کی اس منزل میں آیا جہاں شعور جاگ اٹھتا ہے تو اسے احساس ہوا کہ لوگ اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ زیادہ تر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس کی جسمانی معذوری کو مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کے اندر جھنجلاہٹیں بے دار ہوگئیں اور جب اس نے اپنے کالج کی ایک لڑکی سے اظہار عشق کیا اور اس لڑکی نے اسے تھپڑ مار دیا تو اس پر جنون طاری ہوگیا۔ اس نے اس لڑکی کو اغوا کیا اور اپنی خلوت میں لانے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن دبا دی۔ وہاں وہ بالکل جنونی ہوگیا اور اس عالم میں آ گیا۔ اس کی ذہنی رو بھٹکتی رہی اور پھر ایک دن جلال الدین کو اس کی اس حرکت کے بارے میں معلوم ہوگیا۔ میں تو اپنے بچے کے جنون کو ختم کرنے کے لیے اس کی ہر طرح سے معاونت کرتی تھی، لیکن جلال الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ میرے بچے کی زندگی لینے پر تل گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دے دیں گے۔ میں نے کہا جلال اس کا علاج کراؤ۔ کہنے لگے کیا علاج کراؤں۔ آدھا دھڑ کٹوا کر ٹانگیں لگوا دوں اس کے جسم میں۔ کیا کروں؟''

''تو پولیس کے ذریعے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اس کے جنون کو انسان کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

مختصر یہ کہ جلال الدین ہر قیمت پر میرے بچے کو نقصان پہنچانے پر تل گئے۔ تب مجھے مجبوراً انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ میں نے انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ مجھے اپنے بچے سے اتنا ہی پیار تھا۔ سولہ سال کے بعد تو میری زندگی میں بہار آئی تھی۔ اب یہ تو قدرت کا عمل تھا میرے بچے کا قصور تو نہیں تھا۔ جلال الدین ختم ہوگئے۔ میں نے کسی کو اس بات کا پتا چلنے نہیں دیا تھا کہ میں نے جلال الدین کو ہلاک کیا ہے۔ اب اس کے بعد صورت حال یہ تھی کہ میں نے گل کو اس جگہ قید کر دیا تھا۔ اسے ہر وقت حسین لڑکیوں کی خواہش رہتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتی تھی، کیونکہ میں جانتی تھی کہ کہیں کسی بھی جگہ وہ زندگی کھو بیٹھے گا۔ میں اس کی فرمائشیں پوری کرتی ہوں اور میں نے اس کے لیے طریقہ کار منتخب کیا ہوا ہے۔ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کے نام سے میں نے ایک پس ماندہ علاقے میں ایک ادارہ بنا دیا ہے۔ یہاں میرے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لیے اشتہار دیا کرتے ہیں۔ اصل میں یہ ادارہ میں نے پس ماندہ علاقے میں اس لیے قائم کیا ہے کہ لوگوں کے لیے باعث دلچسپی نہ ہو۔ ایک معمولی سا کاروبار وہاں کیا جائے، پھر یہ کہ ملازمت کی متلاشی لڑکیاں جن کا نچلے طبقے سے تعلق ہو۔ وہاں ملازمت کے حصول کے لیے پہنچیں۔ میں انہیں بہترین پیش کش کرتی ہوں، لیکن وہ دیوانیاں نہ جانے کیسے کیسے احساسات کا شکار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اعلیٰ مستقبل کی خواہش مند ہوتی ہے اور سوچتی ہیں کہ ان کے خوابوں کا شہزادہ پرستان سے گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہی ہوگا۔ جب کہ تم جانتی ہو رابعہ سلطان کہ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک دماغی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو مان جاتی ہیں میں انہیں بہت کچھ دے دیتی ہوں اور جو پھر جاتی ہیں، مجبوراً ان کی زندگی چھیننا پڑتی ہے کہ کہیں وہ میرے بچے کو مشکل میں نہ ڈال دیں۔ میرا خیال ہے تمہارے ہر سوال کی وضاحت ہوگئی ہے۔ تم نے خواہ مخواہ آگ میں ہاتھ ڈالا ہے۔ بیسیوں قتل ہوتے ہیں روزانہ، ہزاروں حادثے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر حادثے کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ رابعہ سلطان، سمجھایا تھا تمہیں مختلف طرح سے نہیں مانی، کوئی کیا کر سکتا ہے۔

''تم جیسی عورت کا روئے زمین پر وجود کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بالکل تعجب کی بات نہیں ہے۔'' ناظمہ جلال ہنس پڑی۔ ایک بار پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے دیوار پر لگا ہوا ایک اور سوئچ دبایا۔ اس سے دو عمل ہوئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ دروازے پر اسٹیل کی ایک شیلڈ آ گری تھی اور وہ دروازہ لاک ہو گیا تھا۔ دوسری وہ دیوار ایک بار پھر نمایاں ہوگئی تھی۔ رابعہ سلطان اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کیونکہ اب وہ شیشے کی دیوار کو بھی سرکتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور وہ خوف ناک وجود پھر اس طرف متوجہ ہو گیا تھا ناظمہ جلال نے کہا۔

''ہم ماں بیٹوں کے درمیان بڑی گہری دوستی ہے۔ میں اس لیے اس کے قریب رہتی ہوں کہ کہیں کوئی لڑکی میرے بچے کو زخمی نہ کر دے۔'' خوف ناک وجود بھاڑ جیسا منہ کھولے قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک قدم آٹھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بہت بھیانک لگ رہا تھا وہ اس وقت۔ رابعہ سلطان صوفے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس شخص کی جسمانی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ واقعی فولاد کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا اور اس کے چہرے کی وحشت بتاتی تھی کہ وہ بالکل غیر انسانی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت بالکل ٹھیک نہیں تھی اور رابعہ سلطان نے وحشت زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو ناظمہ جلال نے کہا۔

''ضروری نہیں تھا کہ میں تمہیں اس طرح بلا لیتی لیکن کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے، تم بہت زیادہ جذباتی ہوگئی تھیں۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میرا بچہ منظر عام پر آئے اور حکومت اسے گرفتار کر کے نقصان پہنچانے پر مجبور کر دے۔ کاش تم مجھ سے ملتیں۔ ہم کتوں کا پیٹ اچھی طرح بھر دیتے ہیں۔ جس کے لیے میں نے اپنے شوہر کو ہلاک کر دیا۔ اسے میں بھلا دوسروں کے ہاتھوں کیسے نقصان پہنچنے دے سکتی ہوں۔''

''لیکن آپ نے ان کا علاج کیوں نہیں کرایا؟''

''بس..... علاج ہی تو کر رہی ہوں اب..... شیر گوشت کھانے کا عادی ہو جاتا ہے تو اسے گوشت

ہی کھلایا جاتا ہے۔ یہی اس کا علاج ہے۔ میں اسے زندہ رکھنا چاہتی ہوں، اس لیے کہ ماں ہوں۔ ناظمہ جلال نے کہا۔ ہول ناک وجود آہستہ آہستہ رابعہ سلطان کے قریب آ رہا تھا کہ اچانک ہی کمرے سے ملحق واش روم سے دروازہ کھول کر کوئی اندر گھس آیا اور ناظمہ جلال چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں میں شدید وحشت اور حیرت کے آثار پھیل گئے تھے اور رابعہ سلطان سکتے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ کیونکہ آنے والا صوفی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ صوفی کہنے لگا۔

''میں ایک بے اولاد باپ ہوں۔ درویشوں کے کرم سے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے شادی ہی نہیں کی۔ ویسے میں بہت سارے امراض کا علاج کرتا ہوں۔ حکیم کالینوس جو جالینوس کے تایا زاد تھے۔ میرے ماموں زاد چچا تھے۔ ان سے میں نے حکمت سیکھی۔ آپ اس کا علاج چاہتی ہیں نا۔ آپ یقین کریں میں اس کا بہترین علاج کر دوں گا۔'' صوفی کی یہاں آمد ایک جادوئی عمل کی طرح سے تھی، جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ ناظمہ جلال بھی شاید اسی لیے حیران تھی وہ خوف ناک وجود اس طرح ساکت ہو گیا تھا جیسے کوئی روبوٹ چلتے چلتے رک جائے۔ ناظمہ جلال نے سوال کر ڈالا۔

''تم کون ہو اور یہاں تک کیسے آئے۔''

''بس..... آپ ہی لوگوں کی مہربانی ہے۔ اصل میں یہ گٹر لائن جو ہوتی ہے نا بعض جگہ بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ بڑے لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے۔ سارے کام ملازموں پر چھوڑ دینا اچھی بات نہیں ہے۔ آپ کے اس واش روم کے بالکل پچھلے حصے میں گٹر کی مین لائن ہے اور واش روم میں لگی ہوئی کھڑکی اتنی مضبوط نہیں کہ اسے اکھاڑا نہ جا سکے۔ بس یہی جگہیں ہماری یہاں آمد کا راستہ بنی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور پھر کسی بھی سلسلے میں آپ درویشوں سے امداد طلب کر لیں۔ سمجھ لیں بیڑا پار ہو گیا۔ حق اللہ.....'' صوفی نے درویشانہ شان سے کہا، لیکن ناظمہ جلال شاید اسے باتوں میں الجھا کر کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے قریب رکھے ہوئے پرس سے ریوالور نکالنا چاہا، لیکن صوفی ہوشیار تھا۔ اچانک ہی صوفی نے چھلانگ لگائی اور ناظمہ جلال کی کمر پر ایک لات رسید کی۔ ناظمہ جلال صوفے سے اٹھ کر اوندھے منہ نیچے جا پڑی۔

''یہ لات جائز ہے، کیونکہ ابھی ایک شریف زادی کی آبرو خطرے میں تھی اور یہ دوسری لات۔'' صوفی نے گری ہوئی ناظمہ جلال کے ایک اور لات ماری جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ناظمہ جلال کئی لڑھکنیاں کھا گئی۔ صوفی نے کہا۔

''آپ نے..... بہ قول آپ کے کتوں کا پیٹ بھر کے ان لڑکیوں کا قتل کرا دیا لیکن آپ دوسری ماؤں کو بھول گئیں جنہیں خود بھی اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت تھی۔'' صوفی کا چہرہ اس وقت بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ رابعہ سلطان ایک دیوار سے کمر لگا کر کھڑی ہوگئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے صوفی کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً ہی وہ خوف ناک وجود متحرک ہو گیا۔ اس نے ایک بہت وزنی صوفہ اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ کاغذ کا بنا ہوا ہو اور پھر وہ صوفہ اس نے صوفی پر اچھال دیا۔ صوفی بڑے پروقار انداز میں ایک طرف ہٹ گیا تھا۔

''اس کا کوئی علاج نہیں ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کہا میں اس کا علاج کیے دیتا ہوں۔ یہ دنیا کے لیے خطرہ ہے اور بہ قول آپ کے کئی لڑکیاں اس کی وحشت کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں، چنانچہ اس کا دنیا میں رہنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مناسب نہیں ہے۔ جلال الدین ٹھیک کرتے تھے کہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ کوئی اپاہج قابل نفرت نہیں ہوتا لیکن اگر تم جیسی ذلیل عورتیں اپنے جنون کا شکار ہو کر اسے درندہ بنا دیں تو پھر درندوں کی تو ہلاکت بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ درندوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا ناظمہ جلال! کیوں کہ تم خود ایک بدنما عورت ہو، لیکن افسوس میں تمہاری اس وحشت کو ختم کر رہا ہوں۔'' صوفی آگے بڑھا، اچانک خوف ناک وجود نے بڑی برق رفتاری سے صوفی کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور اسے کمر سے پکڑ لیا تھا۔ ناظمہ جلال کے حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہو گیا۔

''اونٹ کی نسل کے فرد تو جو کوئی بھی ہے میں نہیں جانتی، لیکن جو بھی میرے بچے کے مخالف ہوتا ہے میں اس کے خون کی پیاسی ہوتی ہوں۔ اب بچ۔ احمق یہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ اب تو اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد کرا کے دکھا لے۔ میں تجھے انعام دوں گی۔ یہ وہ ہے جو لوہے کو اپنے ہاتھوں سے موڑ کر موم کی طرح رکھ دیتا ہے۔ اچانک ہی ناظمہ جلال کی آواز بند ہو گئی۔ خوف ناک وجود کے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی اور وہ صوفی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ نہ جانے صوفی نے کیا عمل کیا تھا؟ پھر وہ رابعہ سلطان کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

''یہ ایک افسوس ناک عمل ہوگا رابعہ، لیکن مجبوری ہے۔ بہ قول محترمہ ناظمہ جلال کے وہ اس کے لیے زندگی مہیا کرتی ہیں، لیکن اس کی زندگی دوسروں کے لیے موت کے مترادف ہے۔ موت کو آزادی تو نہیں دی جا سکتی۔ معافی چاہتا ہوں محترمہ! ناظمہ جلال، درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ صرف اپنے بچے کی زندگی کے لیے بہت سی زندگیاں نہیں چھین سکتیں۔ جو کچھ اب تک آپ کر چکی ہیں۔ کاش وہ بھی روکا جا سکتا، لیکن بے ضمیروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ بے ضمیر صرف اپنے تھوڑے سے مفاد کے لیے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں آپ سے محترمہ ناظمہ جلال! آپ کی زندگی کے سب سے بڑے مقصد کو ختم کر رہا ہوں۔ یہ جو بہ قول آپ کے اسٹیل مین ہے، بس اتنی ہی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ آپ خود اس کی موت کا سبب بن گئیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر صوفی نے وہ ریوالور اٹھا لیا جو ناظمہ جلال کے ہاتھ سے گرا تھا اور اس وقت صوفی کے پیروں کے نزدیک ہی پڑا ہوا تھا۔ ناظمہ جلال کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''یہ..... یہ..... یہ..... کیا بدتمیزی ہے؟ یہ کیا..... ارے اوہ پاگل..... لیکن صوفی کی پستول سے نکلی ہوئی گولی اس جانور کی پیشانی پر پڑی تھی جو انسانوں جیسی شکل رکھتا تھا لیکن جانوروں سے بدتر تھا۔ ناظمہ جلال نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور اس عجیب الخلقت وجود کی جانب لپکی، لیکن صوفی کی پستول سے نکلی ہوئی دوسری گولی نے ناظمہ جلال کی گردن سے گزر کر اس عجیب الخلقت وجود کے سینے کو نشانہ بنایا تھا اور دوسری گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔ جبکہ ناظمہ جلال ایک دم رک گئی تھی اور پھر وہ کسی ستون کی طرح ہی نیچے آ رہی تھی۔ اس کا خاتمہ ایک لمحے کے اندر ہو گیا تھا۔ ادھر وہ عجیب الخلقت وجود زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں اور وہ بھی چند ہی لمحوں میں زندگی کھونے والا تھا۔ رابعہ سلطان کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صوفی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسا بے ضرر اور مرنجان مرنج شخص

جو بالکل کسی مٹی میں رینگتے ہوئے کینچوے کی مانند نظر آتا تھا۔ اس نے اتنی وحشت خیزی کے ساتھ دو انسانی زندگی ختم کر دی تھیں۔ رابعہ سلطان کو اس حد تک امید نہیں تھی، لیکن بہر حال اب اسے یاد آ رہا تھا کہ فرقان جلیل نے صوفی کے بارے میں بہت ہی پر اعتماد لہجے میں کہا تھا کہ اگر وہ رابعہ سلطان کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جائے تو سمجھ لو کہ مشکل حل ہو جائے گی۔ بڑے سنسنی خیز حالات و واقعات تھے۔ صوفی اچانک ہی اس کمرے میں بروقت نمودار ہوا تھا جہاں یہ سارا ڈرامہ ہو رہا تھا اور یہ ایک بہت بڑا سچ تھا کہ اگر صوفی اس وقت یہاں نہ آتا تو رابعہ سلطان بہت ہی مشکل حالات کا شکار ہو گئی ہوتی۔ یہ وحشی ماں بیٹے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے اس کا تصور بھی انتہائی ہول ناک تھا۔ رابعہ سلطان ایک دم صوفی کی ممنون کرم ہو گئی تھی اور اس کے انداز میں تشکر پیدا ہو گیا تھا۔ صوفی اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آیئے، یہاں سے نکل جانا بہت ضروری ہے۔ ہم بھیڑیوں کی کچھار میں ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے، ہم..... میرا مطلب ہے کہ جگہ بڑی خطرناک ہے۔ باہر بہت سے لوگ موجود ہیں جو ان دونوں وحشی ماں بیٹوں کے مددگار ہوں گے۔ ہمیں فوراً نکل چلنا چاہیے۔ صوفی نے بے اختیار رابعہ سلطان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر واش روم میں داخل ہو گیا۔

''ہمارا پہلا سفر جس جگہ سے شروع ہوگا وہ بڑی عجیب ہے لیکن مجبوری ہے۔'' رابعہ سلطان نے دیکھا کہ انتہائی حسین واش روم کی ایک کھڑکی غائب ہے اور اس سے بہ آسانی گزرا جا سکتا ہے۔ صوفی نے اس کھڑکی کے دوسری طرف پہنچ کر رابعہ سلطان سے کہا۔

''آ جایئے محترمہ! مطلع صاف ہے۔'' رابعہ سلطان کھڑکی کے ذریعے نیچے پہنچی۔ کھڑکی کے فریم کو اس نے کھڑکی سے لگا ہوا دیکھا تھا۔ کوئی چار گز کے فاصلے پر ایک گٹر کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ صوفی نے کہا۔

''اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار نہیں ہے۔ ویسے یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہے اور انسان کو ہر طرح کے حالات سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کون جانے زندگی میں کب آپ کو پھر کسی ایسے گٹر میں سفر کرنے کا مسئلہ درپیش ہو۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ آ جایئے۔'' رابعہ سلطان بادل نخواستہ اس گٹر میں اتر گئی تھی۔ صوفی نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا تھا۔ گٹر تو گٹر ہی ہوتا ہے، غلاظت سے بھرپور رابعہ سلطان اس قیمتی کمرے کے قالین کو پہلے بھی کالی کیچڑ سے بدنما دیکھ چکی تھی، جس کے واش روم سے صوفی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ واش روم میں خود اس کے پیروں کے کالے نشانات موجود تھے۔ اس کا دماغ بدبو سے پھٹا جا رہا تھا لیکن صوفی اس کے ہاتھ پکڑے آگے کا سفر کر رہا تھا جیسے ساری زندگی گٹر میں ہی گزاری ہو، البتہ فاصلہ اتنا زیادہ طے نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس عالی شان کوٹھی سے کوئی پچاس گز دور نکلنے کے بعد گٹر کا دوسرا ہول آتا تھا۔ یہاں کا ڈھکن بھی ہٹا ہوا تھا اور اس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ پہلے صوفی نے گردن نکال کر دیکھا اور اس کے بعد رابعہ سلطان کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

''تشریف لایئے۔'' وہ اس طرح بولا جیسے اسے اپنے خوب صورت ڈرائنگ روم میں آنے کے لیے کہہ رہا ہو۔

♥.....♥.....♥

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راجا ناصر دوبار اخبار کے دفتر پہنچا تھا اور دو ہی بار رابعہ سلطان کے گھر پھر یہ مشکل تمام اس نے رابعہ سلطان کو اخبار کے دفتر میں ہی جا پکڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں سے آئی تھی اور دفتر کی عمارت میں داخل ہونے والی تھی۔ راجا ناصر اسے نیچے ہی مل گیا اور رابعہ سلطان کے پاس جا کر بولا۔

''تمہیں میرے آنے کی اطلاع نہیں ملی، حالانکہ میں گھر پر بھی اپنا کارڈ پھینک کر آیا تھا اور دفتر میں ایڈیٹر صاحب سے بھی دو دفعہ درخواست کر کے گیا تھا کہ جیسے ہی تم آؤ۔ مجھے فون کر لو۔''

''دفتر میں تیسرے دن آئی ہوں۔ دو دن سے نہیں آ رہی تھی۔ گھر پر بھی نہیں تھی۔''

''تو کہاں مصروف تھیں۔''

''بس ایسے ہی، دماغی بحران کا شکار تھی۔''

''مجھے شبہ تھا اس بات کا۔'' راجا ناصر نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کس بات کا۔'' رابعہ سلطان اجنبی بن کر بولی۔

''آؤ، دو دن سے دفتر نہیں آئیں تو دو گھنٹے کے لیے میرے ساتھ آ جاؤ۔ دو گھنٹے کے بعد دفتر چلی جانا۔''

''چلو۔'' رابعہ سلطان نے کہا اور راجا ناصر کی کار میں بیٹھ کر چل پڑی۔ زیادہ فاصلہ نہیں طے کیا تھا۔ ایک چھوٹے سے خوب صورت ریستوران میں راجا ناصر اسے لے کر پہنچ گیا اور پھر ایک میز کے گرد دونوں بیٹھ گئے۔ راجا ناصر اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے نہیں بتاؤ گی رابعہ!''

''کیا۔'' رابعہ سلطان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''انہیں کس نے ہلاک کیا؟'' اچانک رابعہ سلطان کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ اسی دوران ویٹر آ گیا تھا۔ راجا ناصر نے اسے کافی اور اس کے ساتھ کچھ لوازمات لانے کے لیے کہا، لیکن رابعہ سلطان کے چہرے پر ایک کھچاوٹ سی پیدا ہو گئی تھی، جسے راجا ناصر نے بھی محسوس کر لیا۔

''پلیز رابعہ، مجھے غیر مت سمجھو، مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

''اگر کسی دماغی تکلیف میں مبتلا ہو تو مجھے تم سے ہمدردی ہے بلکہ یہ بھی مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں اور اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر مجھے بتاؤ کہ کیا پوچھ رہے ہو؟

''رابعہ پلیز، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زندگی بھر اس مسئلے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولوں گا۔ مجھے بتاؤ۔ ان ماں بیٹوں کو کس نے ہلاک کیا؟''

''گڈ۔'' رابعہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

''یعنی تم کوئی جاسوسی ڈراما اسٹیج کر رہے ہو۔؟''

''تو مجھے نہیں بتاؤ گی تم اس بارے میں!''

''اگر تم نے اس کے بعد اس طرح کے احمقانہ الفاظ ادا کیے تو میں ایک لمحہ انتظار کیے بغیر یہاں سے اٹھ جاؤں گی۔''

''رابعہ! ناظمہ جلال اور اس کے بیٹے گل جلال کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انہوں نے میرا

مطلب ہے ہلاک کرنے والوں نے دونوں ماں بیٹوں کو ناظمہ جلال ہی کے ریوالور سے ہلاک کیا ہے اور اس کے بعد واش روم کے راستے ایک گٹر کے ذریعے باہر نکل گئے ہیں۔''

''یہ ناظمہ جلال اور گل جلال کیا..... تمہارے خاندان کے افراد ہیں۔'' رابعہ کے لہجے میں ایک تیکھا پن پیدا ہو گیا۔

''بتاتا ہوں میں تمہیں۔ گل جلال ایک بہت بڑے صنعت کار جلال الدین کا بیٹا تھا۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد ان کے ہاں اولاد پیدا ہوئی تھی۔ بے چارے جلال الدین صاحب تو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے، لیکن ناظمہ جلال اپنے بیٹے کی پرورش کر رہی تھی اور یہ بیٹا..... یہ بیٹا نارمل نہیں تھا۔ وہ جنسی جنون کا شکار تھا اور ناظمہ جلال اس کے لیے غریب گھرانوں کی لڑکیاں مہیا کرتی تھی۔ وہ انہیں دھوکے سے سی۔ بی۔ لمیٹڈ نامی ایک فرم میں بلاتی تھی۔ اس کے اہل کار ان لڑکیوں کا انٹرویو کرتے تھے اور یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ ان کا پس منظر کیا ہے۔ کوئی ان کے لیے لڑنے والا تو نہیں ہے اور جب انہیں اس بات کا یقین ہو جاتا تھا تو لڑکی گل جلال کی خلوت میں پہنچ جاتی تھی اور وہ وحشی درندہ اسے پامال کر دیتا تھا۔ اگر لڑکی نے احتجاج کیا تو اسے ہلاک کر دیا گیا اور اگر وہ خاموش رہی تو اسے معقول معاوضہ دے کر زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ وہ لڑکی دردانہ اسی وجہ سے قتل ہوئی اور اب صورت حال یہ ہے کہ کسی نے ان دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تمہیں وہاں دیکھا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ تم وہاں تک پہنچائی گئی تھیں۔ رابعہ سلطان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے راجا ناصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیر، میں نہ تو وہاں گئی نہ مجھے کسی ذریعے سے وہاں تک پہنچایا گیا، لیکن یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم ناظمہ جلال دست راست تھے۔ ورنہ تمہیں اس حد تک تفصیل نہ معلوم ہوتی۔ جہاں تک ان دونوں کے قتل کے کا معاملہ ہے تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ کوئی نہ کوئی دل والا یہ سب کچھ کر سکتا تھا، لیکن مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم جیسے بے غیرت لوگ بھی ایسے لوگوں کے آلہ کار ہوتے ہیں۔

''رابعہ! دوست ہو تم میری، بڑا ربط و تعاون رہا ہے میرے اور تمہارے درمیان، لیکن جو کچھ تم کہہ رہی ہو، میں تم سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا تم ہوش میں ہو؟''

''ہاں۔ میں ہوش میں ہوں راجا ناصر۔ اتنی تفصیل جانتے تھے تم اور تم نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ مجھ سے بھی مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ وحدہٗ لاشریک کی قسم، میں نے انہیں قتل نہیں کیا، لیکن ان کے قتل سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے میں بتا نہیں سکتی اور تم، تمہارے ساتھ میں ایک لمحہ بیٹھنا بلکہ تمہاری طرف رخ کر کے تھوکنا پسند نہیں کرتی۔ تم جیسے بدکردار لوگوں سے جس قدر نفرت کی جائے کم ہے۔ جا رہی ہوں۔ تم پولیس آفیسر ہو۔ چیلنج کر کے جا رہی ہوں تم جب چاہو میرے خلاف کارروائی کر سکتے ہو۔ میں تمہیں اس طرح نیچا دکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔''

''رابعہ! میں اگر چاہوں تو یہیں اسی جگہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا سکتا ہوں۔''

''اگر تم نے مجھے یہاں ہتھکڑیاں لگا دیں تو میں تمہیں چیلنج کر رہی ہوں کہ تمہیں کتے کی موت مار دوں گی اور تمہاری لاش کسی کوڑے دان میں پڑی پائی جائے گی۔ مرد ہو، پولیس آفیسر ہو، جاؤ ایک معمولی سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صحافی لڑکی کا چیلنج قبول کرو۔" رابعہ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے تک انتظار کرتی رہی۔ راجا ناصر سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ رابعہ پاؤں پٹختے ہوئے ریستوران سے باہر نکل گئی۔ اسی وقت ویٹر راجا ناصر کی مطلوبہ اشیاء لے آیا تھا۔

♥.....♥.....♥

رابعہ سلطان اس گلی میں داخل ہوگئی جہاں صوفی کا مکان تھا۔ اس وقت بھی ممن خان کا ہوٹل کھلا ہوا تھا اور مستقل گاہک وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سے ہی بے زار لکھنوی صاحب نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

"آ گئیں۔"

"کون؟" برابر بیٹھے ہوئے رحمت خاں نے پوچھا۔

"اماں..... وہ دیکھو سامنے خراماں خراماں..... معطر معطر۔"

"صوفی صاحب کے پاس آئی ہیں۔"

"میں جا کر ذرا اطلاع دے دوں۔ بے زار لکھنوی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تو رحمت خان نے ان کے کندھے پکڑ کر انہیں دبوچ لیا۔"

"اماں بے زار صاحب! چر ہوگئے کیا؟ صوفی صاحب کے ہاتھ سے پٹو گے۔"

"کیوں..... کیوں..... کیوں۔"

"بیٹھو..... صوفی صاحب گھر میں موجود ہیں اس وقت۔ تم کیوں دوڑے جا رہے ہو؟"

"اماں کندھے تو چھوڑو۔ مہمان کا استقبال تو ہماری خاندانی روایات ہیں۔"

"اور بات نہ ماننے والے کی ہڈیاں توڑ دینا میری خاندانی روایت۔" رحمت خان نے کہا۔

"دیکھو..... اسے کہتے ہیں عورت۔ اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں موجودہ سیاست پر کہ عورت بیچ میں آ گئی اور پھڈا شروع ہوگیا۔" رابعہ سلطان اس دوران صوفی کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ پراسرار نگاہوں سے اس نے ممن خاں کے ہوٹل کی طرف دیکھا تو بے زار لکھنوی جلدی سے بولے۔

"جی ہاں..... جی ہاں..... چلی جایئے اندر۔ موجود ہیں اندر۔" ایک بار پھر انہوں نے اس طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی، لیکن رحمت خان پشاوری پٹھان تھا اور خاصا طاقت ور بھی، چنانچہ بے زار لکھنوی اٹھ نہ پائے اور رابعہ سلطان اندر داخل ہوگئی۔ صوفی سرخ رنگ کا ایک پنڈلیوں تک تہبند باندھے پان کی گلوری منہ میں دبائے گھر کی صفائی کر رہا تھا۔ رابعہ سلطان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ تو صوفی اچھل پڑا۔ پھر رابعہ سلطان کو دیکھ کر اس نے جو چھلانگ لگائی تو چھ فٹ لمبی چارپائی عبور کر گیا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ رابعہ سلطان بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی اندر سے برآمد ہوا تو اس نے کرتا پہنا ہوا تھا، البتہ سرخ رنگ کی لنگی جوں کی توں تھی۔

"مم..... معافی چاہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"معاف کیا۔"

"امید نہیں تھی کہ کوئی اس طرح داخل ہو جائے گا۔"

"امید رکھنی چاہیے۔"

"غلطی ہوگئی۔"

"میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا۔"

"نہیں۔"

"بھلا مہمانوں کی آمد سے کوئی ناگواری محسوس کرتا ہے۔ تشریف رکھیے اس خانہ بے تکلف میں۔ آپ کی پذیرائی کے لیے یہاں اندر فرنیچر تو موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے حاضر ہے۔" رابعہ نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

"کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا۔"

"یہی کہ بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی۔"

"آپ نے صفائی ہی ایسی کی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ابھی آہستہ آہستہ سب کچھ ہوگا۔ مم..... میرا مطلب ہے۔"

"میں نے کہہ دیا کہ یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔" اسی وقت بے زار لکھنوی اندر داخل ہوئے۔ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اور اس پر بسکٹ وغیرہ کی پلیٹ سجی ہوئی تھی۔ صوفی نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا تو بولے۔

"رکھیے اور جایئے۔"

"بیٹھنے کو نہ کہیں گے صوفی صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں ٹرے میں تین پیالیاں رکھی ہوئی ہیں۔"

"بے زار صاحب جایئے ایک پیالی اٹھا کر لے جایئے۔" صوفی نے خالی پیالی اٹھائی اور بے زار صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ پیالی اور پرچ بجاتے ہوئے بار بار ان دونوں کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

صوفی نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور چائے ڈالنے کے لیے آگے بڑھا تو رابعہ سلطان جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ یہ کام مجھے کرنے دیجیے۔ ٹھیک ہے آپ کے قریب آنے کی اجازت تو نہیں ہے، لیکن میری عقیدت تو آپ مجھ سے نہیں چھین سکتے۔"

"حق اللہ۔ حق اللہ۔" صوفی نے کہا۔

"صوفی صاحب۔ کیا آپ اپنے ذہن کو اور اپنی شخصیت کو وہ مستقل رنگ نہیں دے سکتے جو میں نے ناظمہ جلال کے گھر میں دیکھا تھا۔"

"بس۔ یوں سمجھیے کہ یہ وحشت کبھی کبھی ہی ابھرتی ہے۔"

"آہ! اس کیفیت کو آپ وحشت نہ کہیں۔ صوفی صاحب میں بہت متاثر ہوں آپ سے خیر چھوڑیے۔ ایک الجھن پیش آ گئی ہے۔"

"ارشاد..... ارشاد۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ چائے لیجیے۔"

"شکریہ۔" صوفی نے چائے کی پیالی رابعہ سلطان کے ہاتھ سے لے لی اور بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

"دیکھیے۔ نفاست، اقدار سب کچھ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن پاسبان عقل کو کبھی کبھی شخصیت سے دور رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوتا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس لیے یہ بسکٹ بھی نوش فرمایئے۔"

"میں نے منع کب کیا تھا؟" رابعہ نے مسکراتے ہوئے ایک بسکٹ ہاتھ میں اٹھالیا۔ صوفی خوش ہوگیا تھا اس نے خود بھی پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھایا اور اسے چائے میں ڈبو دیا۔

"ارے..... ارے..... یہ کیا؟"

"کب..... کہاں.....؟" صوفی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ اس دوران بھیگا ہوا بسکٹ ٹوٹ کر چائے میں گر پڑا تھا۔

رابعہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"اب کیا کریں گے؟"

"نیچے بیٹھ جائے گا۔ آخر میں کھایا جاسکتا ہے۔ یہ بے وقوف چمچہ کبھی ساتھ نہیں لاتا۔" صوفی نے جواب دیا اور چائے کا ایک سپ لیا۔ رابعہ بری طرح ہنس رہی تھی۔

"خدا کی قسم، بڑے کمال کے آدمی ہیں آپ، لیکن اب مجھے بھی یہ لگتا ہے کہ یہی سب کچھ زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا۔ پھر بولا۔

"آپ کچھ بتانے جارہی تھیں۔"

"ہاں۔" کچھ مسائل ہیں۔ مجھے بڑی زبردست دھمکی ملی ہے اور اس سلسلے میں مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے کہا اور سُڑپ سُڑپ کر کے چائے پینے لگا۔

پتا نہیں رابعہ سلطان پر کیا جنون سوار ہوا تھا۔ بہ ذات خود وہ اچھی خاصی لڑکی تھی۔ خوش شکل، خوش مزاج، تعلیم یافتہ، ہر لحاظ سے ایک موزوں شخصیت کی مالک اور اس کے مدمقابل صوفی تھا۔ ویسے تو از راہ مذاق بہت سی باتیں کرلی جاتی ہیں، لیکن صوفی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو وہ غلط نہیں ہوگا کہ وہ ماضی کا اونٹ اور حال کا صوفی تھا۔ ساری حرکتیں عجیب وغریب دنیا سے بے گانہ، لیکن رابعہ سلطان اس پر مرمٹی تھی۔ صوفی کی طرف سے ایک بار بھی پذیرائی نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ بار بار صوفی تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ بات ابھی تک اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے صوفی کے دل میں بھی کوئی کونپل کھلائی ہے یا نہیں بہر حال وہ اپنا کام کر رہی تھی۔ راجا ناصر سے جس طرح جھگڑا ہوا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ رابعہ کے اپنے اتنے اختیارات نہیں تھے کہ وہ راجا ناصر سے لڑسکتی، لیکن طبیعت میں تیزی اور تندی تھی۔ راجا ناصر کو چیلنج کر آئی تھی خوف زدہ وہ اب بھی نہیں تھی لیکن بہر حال صوفی تک پہنچ گئی تھی۔

"آپ نے صوفی صاحب بڑے صبر وسکون سے یہ سن لیا کہ مجھے بڑی زبردست دھمکی ملی ہے۔ یہ نہیں پوچھا آپ نے کہ دھمکی دینے والا کون ہے اور آپ اس کے خلاف کیا کریں گے یہ کہہ کر رابعہ سلطان نے صوفی کے چہرے پر نظریں جمادیں، لیکن اس چہرے پر کوئی تغیر نظر آجاتا تو نام پھر صوفی نہ ہوتا۔ صوفی نے چائے کی پیالی میں بچی ہوئی چائے کو دائرے کی شکل میں ہلایا اور تہ میں پڑا ہوا بسکٹ جواب آٹے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ باریک پتی کے ساتھ شامل ہو کر چائے میں ابھر آیا۔ صوفی نے اسے حلق میں انڈیل لیا اور ہونٹ صاف کر کے پیالی نیچے رکھ دی۔ رابعہ سلطان نے ایک بار پھر پیالی میں جھانکا اور ہنس پڑی۔

"غائب۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"توبہ توبہ درویش بھی پریشان ہوگئے ہوں گے آپ سے تو۔"

"نہیں ابھی آپ نے صبر وسکون کی بات کہی تھی ہمارا صبر ہی سکون دیتا ہے۔ بڑی اچھی بات کی۔ ویسے دھمکی کس نے دی ہے آپ کو؟"

"صوفی صاحب میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ راجا ناصر کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اپنے آپ کو پولیس ڈپارٹمنٹ میں سب سے زیادہ تیز طرار سمجھتا ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میرا اس سے تعلق صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک صحافی کا پولیس آفیسر سے ہوسکتا ہے۔ تھوڑا سا بے تکلف ہوگیا ہے مجھ سے جذباتی ہوا تھا اور لڑکی کے سلسلے میں تھوڑی بہت مدد کی تھی اس نے، لیکن صوفی صاحب یہ کم بخت کاغذ کے ٹکڑے یا اس سے متعلق دوسری چیزیں انسان کو انسانیت سے کتنا دور لے گئے ہیں۔ وہ پتا نہیں کس دباؤ میں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان دونوں ماں بیٹوں کے قتل کے بعد بھی کوئی ایسی شخصیت ہے جو اسے اس بات پر اکسا رہی ہے کہ ان کے قاتلوں کا پتا چلائے۔ سیدھی سیدھی بات کہ اسے کوئی آفر کی گئی ہوگی۔"

"آپ سے کیا بات ہوئی۔" صوفی نے سوال کیا۔

"بس وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ گل جلال اور اس کی ماں ناظمہ جلال کو قتل کس نے کیا اور اس نے سیدھا سیدھا یہ الزام لگایا کہ مجھے وہاں پہنچایا گیا اور میں نے اگر ان دونوں کو قتل نہیں کیا تو بہر حال قاتلوں سے واقف ہوں۔ مجھے یہ دھمکی دے رہا تھا کہ میں اسے قاتل کا نام بتادوں۔ بس میں بھی ذرا جذباتی ہوگئی۔"

"حق اللہ، آپ نے کس قسم کے جذبات کا مظاہرہ کیا۔" صوفی نے سوال کیا۔

"بس جب اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اسی جگہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا سکتا ہوں تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں اسے کتے کی موت ماروں گی اور اس کی لاش کسی کوڑے دان میں پڑی پائی جائے گی۔"

"درویش رحم کریں۔ پھر اب۔"

"نہیں کچھ نہیں..... بات آپ کے کانوں تک لے آئی ہوں۔ آپ اس وقت متحرک ہوتے ہیں جب پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے۔ خیر اطلاع دے دی ہے آپ کو اگر کہیں کچھ ہوجائے تو ذرا راجا ناصر کو ٹٹول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیجیے گا۔" رابعہ پھر جذباتی ہوگئی۔

"ارے نہیں...... نہیں...... کچھ نہیں ہوگا آپ کو، وہ قانون کا رکھوالا ہے قانون کے خلاف تو کچھ نہیں کرپائے گا۔" رابعہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"صوفی صاحب بات کچھ بھی نہیں ہے۔ زندگی ایسے الٹ پھیر سے دوچار ہوئی ہے کہ ہم دردوں کا تصور کھو بیٹھی ہوں، بے چاری دردانہ یاد آتی ہے۔ گھر سے باہر نکلی تھی اپنے گھر کے حالات سدھارنے کے لیے شکار ہوگئی۔ میرا خیال ہے ہر لڑکی تھوڑی بہت دردانہ ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے آپ کو ان ہی میں شمار کرتی ہوں۔ آپ سے نہ ہمدردی کی بھیک مانگ رہی ہوں اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے لیے سرگرداں ہوں، بس کم بخت عقل کبھی کبھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ سوری آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں۔" رابعہ سلطان خود بھی کافی جذباتی لڑکی تھی۔ کچھ اس طرح جذبات میں ڈوبی کہ کچھ دیر پہلے کا خوش گوار موڈ ختم ہوگیا اور اس نے انتظار نہیں کیا تھا اور صوفی کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ صوفی منہ کھول کر رہ گیا تھا۔ دل چاہا کہ رابعہ کو آواز دے کر روک لے، لیکن یہی اس کی خوبی تھی کہ کبھی دل کی باتوں میں نہیں آتا تھا، البتہ جب پان کی گلوری منہ میں منتقل ہوگئی تو زعفران کی خوشبو دماغ کو معطر کرنے لگی۔ چھالیہ اور تمباکو منہ میں حل ہونے لگے تو دماغ کی ساری رگیں کھل گئیں۔ راجا ناصر، اس کے ذہن نے آواز لگائی اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس وقت شیروانی نہیں پہنی تھی بلکہ پتلون اور قمیص استعمال کی تھی اور پھر تاریخی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر چل پڑا۔ راجا ناصر سے ملاقات ہو چکی تھی۔ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تو پتا چلا کہ راجا ناصر اندر موجود ہے۔

موٹر سائیکل کھڑی کر کے اندر چلا گیا۔ راجا ناصر نے ایک لمحے تک اسے پہچاننے کی کوشش کی اور پھر اس کے منہ سے طنزیہ آواز نکلی۔

"آ خاہ...... غالباً صوفی صاحب کہلاتے ہیں آپ۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔ صوفی نے تھانے کے احاطے میں منہ کی غلاظت اگل دی تھی اس لیے منہ ابھی صاف تھا۔" آئیے تشریف رکھیے۔ فرمائیے کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"آپ سے اپنا تعارف کروانا چاہتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"تعارف۔"

"ہاں۔"

"میرا خیال ہے ہمارا تعارف ہے۔"

"یہ بات آپ کو معلوم نہیں کہ ماضی میں ہم بھی انسپکٹر کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔"

"معلوم ہے...... معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی تنزلی ہوتی رہتی تھی۔ نااہلیت کی بنیاد پر اور آخرکار آپ کو محکمہ پولیس سے نکال دیا گیا۔"

"آداب...... آداب......" صوفی نے جھک کر کہا۔

"خیر مسخرہ پن نہ کریں۔ آپ ماضی کے انسپکٹر تھے، حال میں آپ کچھ بھی نہیں۔ یہاں کیسے آنا ہوا۔"

"وہ جناب عالی! دست بستہ گزارش ہے کہ رابعہ سلطان ہمارے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے کچھ

گزارشات کی ہیں۔"

"ایک بات بتائیے صوفی صاحب! رابعہ سلطان سے آپ کا کیا تعلق ہوگیا۔ مطلب یہ کہ معاف کیجیے گا کہ اس قابل تو آپ ہیں نہیں کہ کوئی لڑکی آپ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔"

"درویشوں کی دعا ہے۔" صوفی نے مستانہ وار کہا۔

"یہ بھی درویشوں کی دعا ہے۔"

"درویشوں کی شان میں گستاخی نہ فرمائیے گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس کائنات کے دو نظام چل رہے ہیں۔ ایک وہ جو سرکاری اہل کاروں اور وزارتوں پر مشتمل ہے اور ایک وہ جو روحانیت کا نظام ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں راجا ناصر صاحب! ہر شہر، ہر قریے، ہر علاقے میں بزرگوں کا ایک نظام موجود ہے۔ دنیا کے بارے میں کچھ فیصلے ہوتے ہیں۔ عہدے داری ہے۔ قطب ابدال ہیں مجذوب درویش ہیں ولی ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ انہیں نہ چھیڑیے گا، کیونکہ اس کے بعد دنیاوی سازشیں تو زندگی بچالیتی ہیں لیکن روحانیت کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہوسکتی۔"

"آپ یہی بتانے آئے تھے میرے پاس۔ یہ تھانہ ہے جناب! اور یہاں ہماری بادشاہت ہوتی ہے۔ بس آپ یہ سمجھیں کہ ہم اس تھانے کے ابدال ہیں۔"

"توبہ فرمائیے...... توبہ گستاخی فرما رہے ہیں آپ، درویشوں کی دعاؤں سے۔" راجا ناصر بے اختیار ہنس پڑا۔

"جب گستاخی بھی ہم درویشوں کی دعاؤں سے فرما رہے ہیں تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔ اچھا چھوڑیے آپ ان باتوں کو، ہاں۔ رابعہ سلطان کے بارے میں آپ کچھ کہہ رہے تھے۔"

"کچھ دھمکیاں وغیرہ ہوئی ہیں آپ دونوں کے درمیان۔"

"اوہو...... اوہو...... اوہو...... اب راجا ناصر کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

"تو پھر آپ کو بھی شامل تفتیش کیا جائے گا۔ اچھا ایک بات بتائیے بیناظمہ جلال کا کیا قصہ ہے؟" "اور......"

"میرا مطلب ہے کہ کیا آپ نے ان دونوں ماں بیٹوں کے قتل کے سلسلے میں رابعہ سلطان کی معاونت کی ہے۔ ویسے رابعہ سلطان مجھے جو دھمکیاں دے کر گئی ہے اس لیے میں کہنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صوفی صاحب آپ تو خود پولیس والے رہ چکے ہیں جن لوگوں پر ہمیں شبہ ہو جاتا ہے ان کے لیے کوشش تو یہ کرتے ہیں کہ انہیں ثبوتوں کی بنیاد پر پکڑیں، لیکن بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں پکڑنے کے بعد ثبوت حاصل کیے جاتے ہیں۔ میں بہت جلد رابعہ سلطان پر ہاتھ ڈال دوں گا۔ ذرا اس کے ہمدردوں کی تلاش میں ہوں تاکہ انہیں بھی ساتھ ہی ساتھ ملوث کروں۔ ان میں ایک آپ بھی ہوسکتے ہیں۔ ذرا پتا لکھوائیے اپنا۔" صوفی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"لکھ لیجیے گا ٹیلی فون نمبر بھی لکھ لیجیے گا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل......"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہمیں چھیڑ دیا اور اب ہم چھِڑ گئے درویشوں کے کرم سے، اب ہمارے اور آپ کے درمیان اچھی خاصی چھیڑ خانی چلے گی۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے صوفی صاحب کہ میں آپ کو یہیں بند کر دوں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو دکھ ہو گا۔ ایسا کریں کہ آپ رابعہ سلطان سے میرے بارے میں تذکرہ کر کے یہ کہہ دیں کہ خود میرے پاس آ جائے اور ساری حقیقتیں اگل دے، ورنہ صوفی صاحب میں آپ کو اس پتے سے اٹھالوں گا اور سیدھی سی بات ہے کہ تھانوں میں جس طرح سے مہمانوں کی پذیرائی ہوتی ہے اسی طرح آپ کی پذیرائی کر کے آپ سے حقیقت معلوم کر لی جائے گی۔ جائیے۔ بس اس کے بعد اٹھ جائیے، بجائے اس کے کہ میں ابھی کانسٹیبلوں کو بلوا کر تمہیں ابھی بند کر دوں دفعہ ہو جاؤ یہاں سے، اٹھو۔'' راجا ناصر نے سامنے رکھا ہوا رولر اٹھایا اور میز پر زور سے مارا۔ صوفی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے راجا ناصر پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالی اور اس کے منہ سے نکلا......''

''درویش رحم کریں۔'' پھر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔

♥......♥......♥

راجا ناصر اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک غصے سے کھولتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا۔ جانے کیوں اسے صوفی سے ایک نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رابعہ سے انتقام لے۔ گہرائیاں تاریک تھیں۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دل میں یہ جذبہ کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ بہرحال اسی شام پانچ بجے کے قریب وہ رابعہ سے ملا۔ رابعہ آفس سے نکل رہی تھی۔ اس نے اپنی جیپ رابعہ کے سامنے روک لی اور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہیلو رابعہ۔''

''ہیلو۔ پولیس والے بھی اب لچے لفنگوں کی طرح لڑکیوں کا راستہ روکنے لگے ہیں۔''

''رابعہ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ ٹھیک ہے ہم لوگوں کے درمیان کوئی اور رابطہ اور رشتہ نہیں ہے، لیکن ہم لڑتے کیوں رہتے ہیں۔ آؤ چائے پینے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔''

''نہیں مسٹر راجا ناصر، اب میرے اور آپ کے درمیان یہ تعلق نہیں رہا کہ ہم دونوں ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پئیں۔''

''نہ سہی، لیکن تمہیں اپنی رپورٹنگ کے لیے میری ضرورت تو پیش آئے گی۔''

''کارڈ پیش کروں گی اور اصولوں کی بنیاد پر آپ کو مجبور کروں گی اور اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو پھر میرا اخبار آپ کے خلاف لکھے گا۔''

''بابا آؤ تو سہی، چلو تھانے ہی چلو۔ روزنامچے میں کئی نئی خبریں درج ہیں۔ آ جاؤ۔''

''آپ چلیے۔ میں آ رہی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا اور راجا ناصر اسے گھورنے لگا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ تھانے پہنچ گیا۔ رابعہ کو بہرحال وہاں بہت دیر لگی تھی۔ راجا ناصر اندر ہی اندر سلگ رہا تھا مگر اس نے رابعہ کے استقبال میں مسکراتے ہوئے

''اور آپ میری چائے نہیں پئیں گی۔''

''شکریہ راجا ناصر۔''

''یہ اور بتا دیجیے اور کتنے دن تک آپ ایسا کریں گی، کیونکہ لڑائی تو ہمارے درمیان ہوتی ہی رہتی ہے۔ پھر کوئی واقعہ صلح کرا دیتا ہے۔''

''نہ لڑائی ہے نہ صلح، آپ نے کچھ بدتمیزیاں کی تھیں۔ میں نے ان کا جواب دے دیا آپ کو اب بھی میں کہے دیتی ہوں کہ آپ کا تھانہ ہے تا یہ مجھے لاک اپ میں ڈال کر دکھا دیجیے۔''

''توبہ...... توبہ...... توبہ، کس دل سے آپ کو لاک اپ میں ڈالوں گا محترمہ رابعہ سلطان۔'' راجا ناصر نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

''اب تنہا بھی چائے نہیں پی سکتا حالانکہ بڑا دل چاہ رہا ہے۔ اچھا چلیں چھوڑیے۔ او! شہزاد علی وہ ذرا روزنامچے میں سے کچھ خبریں رابعہ سلطان کو دے دیجیے۔ وہ جو اسمگلروں کی آپس کی جنگ کے بارے میں خبریں ہیں۔ رابعہ آپ ایسا کریں کہ جب آپ یہاں سے جائیں تو شہزاد علی سے یہ خبریں لیتی جائیں۔ اچھی خبریں ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ اس تعاون کا۔''

''اور کوئی خدمت میرے لیے۔''

''خدمت نہیں کچھ سوالات ذہن میں مچل رہے ہیں۔ وہ جو اپنے صوفی صاحب ہیں، کیا تم نے ان سے شکایت کی ہے میری۔''

''صوفی صاحب دوست ہیں میرے، مددگار ہیں۔ انہوں نے بہت سے معاملات میں میری مدد کی ہے بات تو بتانی ہی پڑتی ہے ناں۔''

''گویا وہ ہم سے زیادہ صاحب اقتدار ہیں۔'' راجا ناصر نے کہا۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے ہر انسان کے اپنے ذاتی معاملات ہوتے ہیں مگر ایک سوال رابعہ میرے ذہن میں بار بار گردش کرنے لگتا ہے۔ ظاہر تم یہ نہیں کہو گی کہ پوچھیے کیا سوال ہے؟ لیکن میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ کیا کسی بھی لحاظ سے یہ شخص تمہارے قابل ہے؟''

''آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟''

''نہیں رابعہ بات دراصل یہ ہے کہ ساری باتیں اپنی جگہ تمہاری طبیعت میں نفاست بھی ہے۔ ذہانت بھی ہے، سب کچھ ہے اور جانے کیوں عام پریس رپورٹر سے ہٹ کر میں تمہارے لیے اپنے دل میں ایک جگہ سی محسوس کرتا ہوں۔ اچھے اور صاف ستھرے لوگ شگفتہ طبیعتوں کے مالک بہرحال اہمیت تو رکھتے ہیں تم ان میں سے ایک ہو اور میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ بے پناہ عزت۔ پھر صوفی میں تمہیں کیا نظر آیا۔ انتہائی گندہ، گھٹیا اور لغو آدمی آیا تھا میرے پاس، تمہارے ہی سلسلے میں۔ میں نے برا بھلا کہہ کر بھگا دیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ آئندہ وہ میری طرف کا رخ نہ کرے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔''

''ویری گڈ...... کمال کر دیا راجا ناصر آپ نے واقعی کمال کر دیا۔ اتنے بڑے آدمی کو دھتکار دینا کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بڑا آدمی۔'' راجا ناصر نے حقارت سے کہا۔

''اوں..... ہوں..... اب یہ الگ بات ہے کہ بڑے چھوٹے کی پہچان ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔'' رابعہ طنزیہ انداز میں مسکرا کے بولی۔

''خیر ہمیں ایک دوسرے پر طنز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اچھے دوست رہ چکے ہیں افسوس تو مجھے یہی ہے کہ ہماری دوستی میں ایک شخص نے رخنہ اندازی کر دی ہے۔''

''میں واقعی حیران ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم اس کے مقابلے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو۔''

''برا نہیں مانوں گا تمہاری باتوں کا، جو دل میں آئے کہتی رہو۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میرا اصل مسئلہ جو ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے ناظمہ جلال اور اس کے بیٹوں کے قاتلوں کا پتا چل جائے۔''

''بڑے وفادار ہو تم ان کے۔ خیر ہوتا ہے انسان اور کتے میں تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہے۔''

راجا ناصر رابعہ سلطان کے ان الفاظ پر تلملا گیا لیکن اس نے برداشت کیا، البتہ اس کی آنکھوں کی شیطانی چمک رابعہ سلطان نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس نے کہا۔

''ساڑھے سات بجے بلکہ آٹھ بجے میں اپنے آخری مشن پر نکلوں گا اور اس آخری مشن سے میں ناظمہ جلال کے قاتلوں کا پتا لگا لوں گا اور اس کے بعد محترمہ رابعہ سلطان میرا فرض ہوگا کہ میں ان قاتلوں کو منظر عام پر پیش کروں۔ ہاں آپ سے سودے بازی کی جا سکتی ہے۔''

''مجھ سے۔''

''ارے ارے کیا بے ہودہ الفاظ نکل گئے میری زبان سے۔ چمڑے کی زبان ہے پھسل ہی جاتی ہے۔ مجھے کتنی بے چینی سے رات کے آٹھ بجنے کا انتظار ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔''

''نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔ پھر بولی۔

''میرے لائق اور کوئی خدمت۔''

''ابھی نہیں جب آپ کے لائق خدمت کا موقع آئے گا تو محترمہ ہم آپ سے وہ خدمت بھی لے ہی لیں گے۔ اچھا ٹھیک ہے تو آپ جانا چاہتی ہیں شاید۔''

''ہاں۔''

''شہزاد علی سے خبریں لیتی جائیے۔''

''شکریہ۔'' رابعہ سلطان نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

♥.....♥.....♥

بڑا تجسس تھا اس کے ذہن میں۔ رات کو آٹھ بجے راجا ناصر آخر کیا کرنے جا رہا ہے، پتا تو چلے۔ پتا چلنا چاہیے اور اس کے لیے اس نے اپنا منصوبہ مکمل کر لیا۔ راجا ناصر کے بارے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے تھانے ہی میں ہے جہاں سے اسے راجا ناصر پر نگاہ رکھنی تھی۔ ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر راجا ناصر تھانے کی عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی۔ رابعہ سلطان نے اس موقع کے لیے رینٹ

اے کار سے ایک گاڑی حاصل کر لی تھی اور اسے خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی راجا ناصر تھانے کی عمارت سے باہر نکل کر چلا رابعہ سلطان نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ راجا ناصر مختلف راستوں سے ہوتا ہوا آخر کار سائٹ ایریا پہنچ گیا۔ رابعہ سلطان کو شدید تجسس تھا۔ کون سا ایسا ذریعہ اسے حاصل ہوا ہے جس سے وہ ناظمہ جلال اور اس کے بیٹے کے قتل کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ کیا واقعی اسے کوئی ایسی چیز حاصل ہو گئی ہے۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ راجا ناصر کا تعاقب کرتی رہی۔ سائٹ ایریا سے آگے بڑھ کر راجا ناصر شیر شاہ کے علاقے میں پہنچا پھر گل بائی اور اس کے بعد وہ ہاکس بے روڈ پر چل پڑا۔

رابعہ سلطان انتہائی مہارت کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ آخر کار سمندروں کی بستی ہاکس بے سامنے آ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد راجا ناصر نے اپنی جیپ ایک خوب صورت ہٹ کے عقبی حصے میں روک دی۔ تا حد نگاہ سنسان نظر آ رہی تھیں۔ ان سے کافی فاصلے پر سمندر اپنی پرسکون آوازیں نشر کر رہا تھا۔ لہروں کی سفیدی ایک پراسرار منظر پیش کر رہی تھی۔ تا حد نگاہ پانی نظر آ رہا تھا اور اس کے پیش منظر میں راجا ناصر اپنی جیپ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

رابعہ سلطان نے ہٹ کے عقب میں اپنی گاڑی روکی اور پھرتی سے نیچے اتر آئی۔ راجا ناصر نے جیپ کے ڈیش بورڈ سے ایک ٹارچ نکالی جس کا شیشہ گرین کلر کا تھا۔ اس نے ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کر کے تین مرتبہ ہلایا اور اس کے بعد اسے واپس جیپ میں رکھا۔ پھر شاید اس نے ہٹ کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ رابعہ سلطان کو اس کی یہ تمام حرکات انتہائی پراسرار لگ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے سانس روکے کھڑی رہی اور اس کے بعد اس نے برق رفتاری سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہٹ کے عقبی حصے میں پہنچ گئی۔ ہٹ کے اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنریٹر چلنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ گویا راجا ناصر نے یہاں جنریٹر آن کر دیا تھا۔ رابعہ سلطان کھڑکی کا رخنہ تلاش کرنے لگی جہاں سے وہ اندر کا منظر دیکھ سکے لیکن ہٹ کی تمام کھڑکیاں مضبوطی کے ساتھ بند تھیں اور پراسرار سناٹے میں رابعہ سلطان نہیں چاہتی تھی کہ کوئی آہٹ ہو۔

آخر کار وہ ہٹ کے دروازے پر آ گئی۔ تین مرتبہ ٹارچ روشن کرنے کا مطلب یہ تھا کہ راجا ناصر نے کسی کو اپنی یہاں آمد کی اطلاع دی ہے اس لیے وہ فوراً ہی اندر داخل نہیں ہوئی۔ ہاں کچھ دیر کے بعد جب اور کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو وہ آگے بڑھی اور ہٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا کوریڈور اور اس کے بعد وسیع و عریض کمرہ برابر میں دو بیڈ روم، کچن وغیرہ۔ ایک وسیع و عریض کمرے میں راجا ناصر ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ دفعتاً اس کی آواز ابھری۔

''آ جاؤ..... اندر آ جاؤ..... میں تم سے مخاطب ہو رابعہ سلطان۔ اندر آ جاؤ۔'' رابعہ کے پورے بدن نے ایک دم پسینہ چھوڑ دیا۔ راجا ناصر کو اس کی آمد کی خبر ہے۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ پلٹ کر واپس بھاگ جائے لیکن یہ بڑی بزدلی تھی چنانچہ اس نے ہمت کی اور اندر داخل ہو گئی۔ راجا ناصر بڑے سکون کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''آؤ رابعہ۔ بہت دیر لگا دی اندر آنے میں۔ میں تو شروع ہی سے تمہاری آمد سے واقف تھا۔ خیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہو کیسے مزاج ہیں۔"

"تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ تم قاتلوں کا سراغ کیسے لگا رہے ہو؟"

"قاتلوں کا سراغ..... مجھے کیا پڑی ہے۔ رابعہ سلطان۔ مرنے والے مر گئے مجھے کوئی معاوضہ تو نہیں ملا۔ میرے ذہن میں تو صرف ایک تجسس تھا جسے میں رفع کرنا چاہتا تھا اور پھر تم نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ چیلنج کیا تھا مجھے۔ راجانا صر کو۔ رابعہ بات یہ نہیں ہے، میں ایک پولیس والا ضرور ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک غیور مرد بھی ہوں اور مردوں کی مردانگی کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔ افسوس میرا یہ پیغام تم دوسری عورتوں کو نہیں دے سکتیں۔ لیکن کاش کوئی تمہیں یہ بتا دیتا کہ دنیا کا ہر کام کرو لیکن کبھی کسی مرد کو اس طرح چیلنج نہ کرو، ہیں۔ نقصان اٹھالیا نا تم نے رابعہ! بہرحال انسان غلطی کرتا ہے، اس کی سزا پاتا ہے۔ تم اس اونٹ کے بچے پر انحصار کرنے لگی تھیں جو کچھ بھی نہیں ہے۔ بے اوقات سا شخص جو کسی قابل نہیں ہے اور تم اس پر بھروسا کر رہی تھیں۔ میرا نام راجانا صر ہے۔ ذاتی طور پر مختلف مزاج کا انسان ہوں اور شاید یہی مزاج مجھے پولیس کی نوکری میں لے آیا ہے غلطی کی تم نے اب غلطی کی سزا بھگتو۔ کیا سمجھیں؟"

"بکواس کر رہے ہو تم۔ عادی ہو تم بکواس کرنے کے۔"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ بہرحال مجھے افسوس ہے رابعہ بہت اچھی دوست تھیں تم میری۔ میرے مزاج کو تم جانتی ہو۔ دردانہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ لیکن اس کا قتل ہو جانا ضروری تھا۔ کیوں کہ اس طرح وہ ناظمہ جلال کی رسوائی کا باعث بنتی۔ اب تم دیکھو نا ہر شخص اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ کچھ لوگ صرف دوسروں کے کام آنے کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے کام دوسرے آتے ہیں۔ دردانہ کا یہی مصرف تھا لیکن تم لوگ جذباتی ہو گئے۔ تم نے ناظمہ جلال کو قتل کر دیا۔ خیر ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا اگر تم اس سلسلے میں تعاون کر لیتیں تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ذمے داری میری تو نہیں تھی، نہ میرا ان لوگوں سے کوئی رشتہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی رابعہ سلطان کہ اس اعتراف کے بعد میں تمہیں اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا۔ تم اتنی اتنی بڑی باتیں کر گئیں کہ بات میرے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔"

"او کے۔ تمہاری بکواس سن لی۔ جا رہی ہوں میں اور اس کے بعد یاد رکھنا کہ رابعہ سلطان نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی راجانا صر اسپرنگ کے گڈے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور رابعہ سلطان پر آ پڑا۔ رابعہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ مگر رابعہ سلطان اس کو اس قدر بدکردار نہیں سمجھتی تھی۔ راجانا صر نے جیب سے ایک چھوٹی سی چپٹی شیشی نکالی۔ پرفیوم جیسے خوش بو تھی اس میں۔ رابعہ سلطان کے چہرے پر ایک ہلکی سی پھوار ماردی اور پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چہرے سے اس وقت وہ بالکل شیطان لگ رہا تھا۔ رابعہ سلطان کو یوں لگا جیسے اس کا سانس بند ہو گیا ہو۔ راجانا صر اسے وحشی کتے کی طرح گھور رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور پھر اس کے ہاتھ اس کے لباس کی جانب بڑھ گئے۔

♥.....♥.....♥

صوفی کو یہ فون اس کے گھر پر ہی موصول ہوا تھا۔ اس وقت کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ فون اٹھا کر اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

"ہیلو صوفی صاحب! انسپکٹر راجانا صر بول رہا ہوں۔"

"حکم فرمایئے جناب عالی! درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

"جو کچھ تم نے کہا ہے وہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔"

"ارشاد..... ارشاد....."

"ہاکس بے پہنچ جاؤ۔ بلیو لائن والی سڑک کے اختتام پر ایک ہٹ جس کے پیچھے جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں میں رابعہ سلطان کی لاش موجود ہے۔ اس کی آبروریزی کی گئی ہے اور اس کے بعد گلا دبا کر اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ تمہاری دوست ہے، تم پر اس کی آخری رسومات کا فرض عائد ہوتا ہے۔" صوفی ایک لمحے سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"اچھا مذاق فرما لیتے ہیں آپ درویشوں کے کرم سے۔"

"ہاں..... واقعی میں بہت اچھا مذاق کر لیتا ہوں۔ میں نے تمہیں اطلاع دے دی ہے۔ اس سے پہلے کہ آوارہ کتے رات بھر میں اسے چیر پھاڑ کر اس کی لاش مسخ کر دیں اگر تم پسند کرو تو اسے وہاں سے اٹھوا لو۔"

"کس نے قتل کیا ہے اسے؟" صوفی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میں نے۔" راجانا صر نے جواب دیا۔

"وجہ؟"

"حد سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش، میری توہین کرنے کی کوشش، مجھے چیلنج کیا تھا اس نے اور مجھے ابھی زندگی کا طویل عرصہ گزارنا ہے۔ اگر ایک چیلنج پر شکست قبول کر لیتا تو زندگی میں شکست کا آغاز ہو جاتا، جو مجھے ناپسند ہے۔"

"راجانا صر تم سنجیدہ ہو۔" صوفی نے سوال کیا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صوفی بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا، لیکن بہرحال اس اطلاع کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحے خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے گرین ہاؤس فون کیا۔ فون شازیہ نے اٹھایا تھا۔

"جی چھوٹے بابا۔"

"عادل اور فیضان آئے ہوئے تھے، ہیں یا چلے گئے۔"

"نہیں چھوٹے بابا ہیں۔"

"فون پر بلاؤ۔" فون پر فیضان آیا تھا۔

"جی صوفی صاحب!"

"تیار ہو جاؤ اور گاڑی لے لینا۔ تم دونوں کو ہاکس بے بلیو لائن پہنچنا ہے۔ بلیو لائن سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے زیرو پوائنٹ پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ابھی آ رہا ہوں۔" صوفی نے یہ کہہ کر فون بند کیا اور اس کے بعد تیار ہو گیا۔ اب اس وقت موٹر سائیکل سے کام نہیں چل سکتا تھا چنانچہ اس نے گاڑی نکالی جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھوڑے فاصلے پر بند رہتی تھی۔ لیکن بالکل تیار اور اس کے بعد اس کی کار برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اگر واقعی راجا ناصر نے رابعہ سلطان کو قتل کر دیا ہے تو یہ انتہائی غم ناک المیہ ہوگا۔ خون اگر کسی اور کا ہے تب بھی صوفی بہرحال ہوشیار رہے۔ پھر وہ عادل اور فیضان سے پہلے ہی زیرو پوائنٹ پہنچ گیا تھا یہاں کیونکہ ان دونوں کی گاڑی موجود نہیں تھیں اس لیے اس نے انتظار کیا اور چند ہی منٹ بعد اسے کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ عادل اور فیضان وہاں پہنچ گئے تھے۔"

"آؤ ہوشیار رہنا، ہمارے اوپر فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔" صوفی نے کہا۔

"جی سر! اور پھر جھاڑیوں میں رابعہ سلطان کی لاش مل گئی تھی۔ اطلاع بالکل ٹھیک تھی۔ صوفی کچھ دیر اس لاش کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر عادل اور فیضان سے کہا۔

"لاش اٹھا کر میری گاڑی میں ڈال دو۔"

"جی سر، لیکن یہ..... عادل نے کچھ کہنا چاہا لیکن صوفی کا چہرہ اس وقت بالکل اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا ہی نہیں جس پر یتیمی برستی رہتی تھی۔ اس وقت ان آنکھوں میں اتنی سفاکی نظر آ رہی تھی جسے ناقابل یقین کہا جا سکتا تھا۔ لاش اٹھا کر صوفی کی گاڑی کے عقبی حصے میں ڈال دی گئی اور صوفی نے کہا۔

"تھوڑا فاصلہ دے کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" اور اس کے بعد اس نے کار وہاں سے واپس موڑ دی۔ وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ذہن سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر کار ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے اس نے کار روکی۔ فیضان اور عادل بھی اب قریب آ گئے تھے۔

"اسے احتیاط سے اٹھا کر اسپتال کے عقبی حصے میں ڈال دو۔ چوکیدار گردش کر رہا ہے خیال رکھنا دیکھنے نہ پائے۔ میں نگرانی کر رہا ہوں۔" اور عادل اور فیضان نے صوفی کی ہدایت پر عمل کیا۔ لاش ایسی جگہ ڈال دی گئی جہاں سے وہ فوری طور پر نگاہوں میں آ سکتی تھی۔

اس کے بعد صوفی نے آہستہ سے کہا۔

"رابعہ سلطان برا ہوا ہے تمہارے ساتھ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم حق کی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوئی ہو۔ میں نے تمہارا ساتھ دیا تھا اور اب بھی....." یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔ عادل اور فیضان کو اس نے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"سر! یہ لڑکی رابعہ سلطان ہی تھی نا۔" فیضان نے کہا۔

"ہاں۔"

"لیکن آپ کو اس لاش کا علم کیسے ہوا؟"

"قاتل نے مجھے فون کیا تھا۔"

"قاتل نے۔"

"ہاں۔"

"ہم سمجھے نہیں جناب۔"

"اس نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ اس نے رابعہ سلطان کو قتل کر دیا اور اس کی لاش بلیو لائن کے آخری سرے کی ہٹ کے پاس پڑی ہوئی ہے۔"

"مگر اس کا قاتل کون تھا؟"

"انسپکٹر راجا ناصر۔" صوفی نے جواب دیا۔ عادل اور فیضان چند لمحے سکتے کے عالم میں رہے پھر فیضان ہی نے سوال کیا۔

"لیکن سر ایک بات بتائیے۔ آپ نے رابعہ سلطان کی تلاشی بھی نہیں کی۔"

"قتل ایک انسپکٹر نے کیا ہے اور اس کی وجہ میں جانتا ہوں۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو کسی غلطی کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن انسپکٹر نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی ہوگی جس سے وہ کسی شکنجے میں جکڑا جا سکے۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥.....♥.....♥

واقعی کچھ تبدیلی تو ضرور تھی۔ شازیہ، دلاور، غلام قادر وغیرہ کسی قدر حیران تھے۔ تینوں کے درمیان صوفی ہی موضع بنا رہتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے پیغام آتے رہتے تھے۔ باہر کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہو گئی تھی البتہ وہ یہ سوال ضرور کرتا تھا کہ انہیں اس کی فوری ضرورت تو نہیں ہے۔ اس وقت بھی وہ تینوں بیٹھے ہوئے اس موضع پر گفتگو کر رہے تھے۔ غلام قادر نے کہا۔

"اڑے ماں قسم! میرے دل کو تو ایک خیال آتا پڑا ہے۔ بڑا بابا کو بلا لو اس کو بولو کہ چھوٹا بابا خراب ہو گیا ایں۔"

"تو بڑے بابا آتے ہی کیا کر لیں گے اور پھر خرابی صرف اتنی ہو گئی ہے کہ آج کل چھوٹے بابا کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ نہ تو وہ درویشوں کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے انداز میں کوئی نرمی پائی جاتی ہے۔"

"خدا قسم ڑے! میرے کو تو ایسا لگتا پڑا ہے۔ جیسے چھوٹا بابا چھوٹا بابا رہا ہی نہ ہو۔" واقعی رابعہ سلطان کے قتل نے صوفی کے ذہن پر کوئی بڑا اثر ہی ڈالا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دنوں اس نے پان کھانا بھی چھوڑ دیے تھے۔ پان شاید اس کی طبیعت میں نرمی پیدا کرتا تھا، لیکن ان دنوں وہ پان نہیں کھا رہا تھا۔ محمد خان نے پوچھا بھی تھا کہ

"اماں صوفی صاحب کیا پان چھوڑ دیا؟"

"نہیں خان صاحب اتنے عرصے کی رفاقت اتنی آسانی سے تو ختم نہیں ہوتی۔ بس آج کل کچھ دل نہیں لگ رہا۔ مزہ نہیں آ رہا۔ آئیں گے ذرا آرام سے کھائیں گے۔" محمد خان کے ہوٹل پر دو افراد کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ صوفی تو اس وقت قہوہ خانے ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی تو صوفی نے آگے بڑھ کر ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک تو مان گیا لیکن دوسرے نے صوفی کے منع کرنے کے باوجود ماننے والے کی پٹائی شروع کر دی۔ نتیجے میں صوفی نے اس کی گردن پکڑی اور پھر ایک ایسا زوردار تھ جبڑے پر رسید کیا کہ اس کے تین دانت ٹوٹ گئے اور پھر وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس سے کہنا کہ پولیس اسٹیشن جا کر ہماری رپورٹ درج کروادے۔'' صوفی نے کہا اور ہوٹل سے اپنے گھر آ گیا۔ پٹنے والا پرانا آدمی تھا۔ اسی محلے کا۔ علاج کرانے بے شک چلا گیا لیکن تھانے دانے نہیں گیا۔ صوفی کے اس رویے کے بارے میں یہاں بھی خوب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لیکن اس کے بعد ایک دوسرے واقعے نے صورت حال کو ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ صوفی وہ نہیں رہا تھا۔ گلاب نامی نوجوان محلے کا اوباش نوجوان تھا۔ پڑوس کی ایک لڑکی پر نگاہ رکھتا تھا۔ لڑکی اس سے متاثر نہیں تھی۔ تھا بھی بدچلن اور آوارہ۔ لڑکی کے ماں باپ سے رشتے کی بات کی تو باپ نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ تو ہے کس قابل، پہلے کسی قابل بن اس کے بعد مجھ سے بات کرنا۔ نتیجے میں یہ نوجوان گھر سے غائب ہو گیا۔ کوئی سوا دو سال کے بعد اس دن وہ اچانک واپس آ گیا۔ اس نے آخر لڑکی کے باپ سے ملاقات کی اور بتایا کہ وہ اس کی خواہش پوری کرنے دوبئی چلا گیا تھا۔ وہ بتائے کہ اب وہ اس سے کیا چاہتا ہے، تو لڑکی کے باپ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کی تو میں نے شادی کر دی۔ کیا تو مجھ سے کہہ کر گیا تھا۔'' نوجوان نے اس بات کے جواب میں ایک زوردار تھپڑ لڑکی کے باپ کے منہ پر رسید کیا اور بولا۔

''حرام زادے مجھ سے تو نے کہا تھا کہ میں کسی قابل بنوں۔ کچھ کر کے دکھاؤں اور پھر تجھ سے شادی کی بات کروں۔''

اس گلی میں اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑکی کے گھر کے آس پاس جمع ہو گئے تھے لیکن لڑکی کے عاشق نے ایک لمبا چھرا نکال لیا تھا۔ اس نے یہ چھرا لوگوں کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔

''زندگی اور موت کی بات ہے۔ قسم اولاد کی کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میرے اوپر خون سوار ہے۔ انتڑیاں نکال کر باہر پھینک دوں گا۔ خبردار..... خبردار کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرے۔ تمام لوگ دم بہ خود تھے۔ لڑکی کا باپ سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا کہ صوفی کی موٹر سائیکل کی پھٹا پھٹ سنائی دی۔ کہیں سے آ رہا تھا۔ موٹر سائیکل مجمع سے ہٹا کر روک دی اور صورت حال معلوم کرتا ہوا قریب آ گیا۔ پھر اس نے یہ منظر دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''عزیزم بات سنو! زمانہ حال کی حکومت نے اس سلسلے میں کافی نرمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اگر لڑکے اور لڑکی کی مرضی ہو تو پھر اسے یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کر لیں درویشوں کی دعاؤں سے قانون ان کا مددگار ہوتا ہے۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے ہیں کیا وہ بھی آپ کو اتنا ہی چاہتی ہے؟''

''صوفی صاحب! بڑی عزت کرتا ہوں آپ کی۔ راستے سے ہٹ جائیے۔ اس وقت میرا راستہ جو بھی روکنے کی کوشش کرے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ چھرا مار دوں گا اسے۔''

''ہم نے کچھ اور عرض کیا تھا آپ سے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کوئی درویش نہیں، میں اس لڑکی کو لیے جا رہا ہوں، تم لوگوں سے جو کچھ کیا جائے وہ کر لینا۔''

''ارے..... ارے..... ارے اب ایسا بھی کیا ہم ہیں ناں..... ہاں لڑکی اگر تیار ہے تو ہم

درخواست کریں گے اس کے والد صاحب قبلہ سے کہ جھگڑا نہ بڑھائیں، نکاح کر دیں۔''

''وہ تیار نہیں ہے صوفی صاحب، وہ تو زار و قطار رو رہی ہے آپ اس سے خود پوچھ لیں۔''

''تو پھر میاں جائیے ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جائیے زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اسے کھونا اچھی بات نہیں ہے۔'' صوفی آگے بڑھا تو اس شخص نے چھرا تان لیا۔

''میں کہتا ہوں ہٹ جاؤ راستے سے۔''

''آپ کے کہنے کی کوئی وقعت نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور پھرتی سے ایک پاؤں کی ٹھوکر اس شخص کی پنڈلی پر ماری۔ اس کے حلق سے ایک کراہ بے شک نکلی لیکن اس نے بجلی کی سی رفتار کے ساتھ صوفی پر چھرے کے یکے بعد دیگرے وار کرنا شروع کر دیے۔ لوگوں کے حلق سے دہشت بھری چیخیں نکل گئیں، لیکن انہوں نے صوفی کی پھرتی بھی دیکھی۔ صوفی جھکائیاں دے دے کر اپنے آپ کو بچاتا رہا اور آخر کار اس نے زوردار لات موقع ملتے ہی اس شخص کی بغل میں ماری اور چھرا اس کے ہاتھ نکل کر فضا میں بلند ہو گیا۔ چھرا تو نیچے گرا ہی تھا لیکن وہ شخص بھی مرنے مارنے پر ہی آمادہ تھا۔ اس نے صوفی پر چھلانگ لگائی تو صوفی نے اسے بازوؤں میں لپک لیا۔ حالانکہ وہ بھی اچھا خاصا تن درست آدمی تھا۔ لیکن صوفی نے اسے اس طرح دبوچا کہ اس کی ہر حرکت ناکام ہو گئی۔ صوفی نے اسے آہستہ سے زمین پر رکھا اور بولا۔

''اب عقل ٹھکانے آئی۔'' لیکن اس شخص نے اچانک ہی صوفی کے منہ پر ٹکر ماری۔ صوفی پیچھے ہٹ گیا اور پھر اس کے بعد لوگوں نے انتہائی وحشیانہ تماشا دیکھا تھا۔ صوفی نے اسے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا۔ توانا نوجوان بار بار گرتا تھا لیکن صوفی اسے اٹھا کر مار رہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ کئی جگہ سے خون بہ رہا تھا۔ لوگ ساکت کھڑے تھے۔ صوفی نے اسے مارا تھا وہ انتہائی وحشت کا مظاہرہ تھا۔ لوگوں نے صوفی کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

''اس کو اٹھوا کر کسی گندے نالے میں پھنکوا دو۔ کوئی بھی مسئلہ ہو ہمیں آگے کیا جائے۔'' یہ کہہ کر صوفی آگے بڑھ گیا۔ محمد خان گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ بندہ تو ہمارے لیے ہمیشہ ہی ڈھال بنا رہا ہے لیکن اس وقت اس نے جو کام کیا ہے اس سے پہلے اس کا یہ مزاج نہیں تھا۔ اماں یاد ہے تمہیں بندے علی خاں! ایک مرتبہ صوفی صاحب نے ایک بدمعاش کو مارا تھا لیکن بڑے پیار سے اور پھر ہلدی چونا بھی خود ہی لگایا تھا لیکن اس وقت ان کے ٹور دیکھنے کے قابل تھے۔ لگ رہا تھا کہ ختم ہی کر ڈالیں گے سسرے کو۔ تھا تو وہ بھی اسی قابل مگر اب دیکھو بعد میں کیا ہوتا ہے۔ کسی نے اس شخص کو اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا۔ صوفی کی تبدیلیوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ واقعی صوفی خاصا مختلف نظر آ رہا تھا۔ ان دنوں شازیہ، دلاور، غلام قادر، فیضان اور عادل بھی یہ بات کہہ رہے تھے کہ اچانک ہی چھوٹے بابا کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ رابعہ سلطان کے قتل کے چودہ دن بعد صوفی نے شازیہ سے کہا۔

''شازیہ ہم تمہیں کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہم کام کر رہے ہیں۔ تمہاری ضرورت پیش آ گئی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"حکم چھوٹے بابا میری ضرورت پیش آ گئی ہے تو بھلا میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔"

"رابعہ سلطان ایک صحافی لڑکی تھی۔ دل میں انسانیت کے لیے ہم دردی رکھتی تھی۔ بے چاری معمولی سے گھرانے کی فرد تھی لیکن جذبوں سے مالا مال تھی۔ قتل کر دیا گیا اسے آبرو ریزی کے بعد۔ صوفی شازیہ کو تمام تفصیلات بتانے لگا۔ شازیہ کا چہرہ غم میں ڈوب گیا تھا۔

"اور بات کچھ اور نہیں ہے شازیہ۔ ظاہر ہے ہر شخص رشتے دار نہیں ہوتا۔ ہم اگر رشتے داروں کے لیے اپنے سینے میں غم پالیں تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا اور پھر انسانیت کا رشتہ تو ہر ایک سے ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔ راجا ناصر کو آزاد نہیں رہنا چاہیے، اسے سزا تو ملنی چاہیے۔"

"سو فی صدی ملنی چاہیے چھوٹے بابا۔"

"ایک عزیزہ ہے نگینہ نام ہے۔ کچھ مشکوک کردار کی مالک ہے۔ راجا ناصر آج کل اس سے التفات بڑھا رہا ہے۔ ہمیں ایک جگہ چاہیے۔ میں تمہاری ملاقات نگینہ سے کرا سکتا ہوں۔ ذرا سا اس کی آواز کی نقل کر لو۔"

"ہو جائے گا بابا صاحب۔"

"بس تو اتنا کر لو اس کے بعد آگے کا عمل کیا جائے گا۔"

"آپ مجھے نگینہ کا پتا بتا دیجیے۔" اور دوسرے ہی دن شان دار صلاحیتوں کی مالک شازیہ نے بدلی ہوئی آواز میں صوفی سے گفتگو کی تو صوفی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ نگینہ کی آواز ہے چھوٹے بابا۔"

"خیر تمہارے کمالات پر تو ہمیں ویسے بھی یقین ہے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ نگینہ کو ذرا ایک دو دن کے لیے غائب کر کے ادھر لے آنا ہے۔ یہ کام غلام قادر اور دلاور کر لیں گے۔" اور پھر منصوبے کے تحت نگینہ کا تعاقب کیا گیا اور ایک جگہ دلاور نے اسے اٹھا کر کار میں ڈال لیا اور وہ گرین ہاؤس منتقل ہو گئی۔ پھر شازیہ نے راجا ناصر کو فون کیا۔ آواز نگینہ ہی کی تھی۔

"ہیلو..... کیا راجا ناصر صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔؟"

"اتنی خوب صورت آواز سن کر بھلا کون کافر اس سے انکار کر سکتا ہے۔ میں راجا ناصر ہی بول رہا ہوں۔"

"کہاں غائب ہیں آپ؟"

"ارے پچھلی ہی رات تو ہم نے ایک ساتھ ڈنر کیا ہے۔"

"پچھلی ہی رات۔" شازیہ نے دل نوازی سے کہا۔ "اس کے بعد جناب پوری رات گزری ہے اور اب یہ اتنا دن گزر گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دن وے ٹریفک چل رہا ہے۔" راجا ناصر ہنسنے لگا پھر بولا۔

"بس حکم کا انتظار رہتا ہے ابھی آ جاؤں۔"

"تو فون کس لیے کیا ہے؟"

"پہنچا۔ فون بند کر دو تا کہ دیر نہ ہو جائے۔" راجا ناصر نے کہا اور خود فون بند کر دیا۔

صوفی خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا آنکھیں بند کیے کسی سوچ میں گم تھا۔ لیکن اس کے کان

شازیہ کی آواز پر لگے ہوئے تھے پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات تھے۔

"آ رہا ہے۔"

"جی چھوٹے بابا۔"

"صحیح ہے۔ ظاہر ہے تنہا آئے گا۔ کسی جگہ پر چھاپا مارنے نہیں جا رہا، بلکہ....." صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شازیہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"اب میں کیا کروں؟"

"جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ ہم نگینہ بن کر اس کا استقبال کر لیں گے۔" صوفی نے کہا اور شازیہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

"نہیں ساتھ ہی چلیں گے چھوٹے بابا۔"

"ہوں..... اندر کے کمرے میں چلی جاؤ۔ اگر آواز دے تو بول کر اسے اندر ہی بلا لینا۔ وہ کمرا محفوظ ہے۔" تقریباً بیس منٹ کے بعد دروازے کی بیل بجی۔ انٹر کام لگا ہوا تھا۔ شازیہ نے نگینہ کی آواز میں پوچھا۔

"کون؟"

"کون ہو سکتا ہے۔" شازیہ نے بٹن دبا کر دروازہ کھول دیا۔ تالا آٹومیٹک تھا۔ راجا ناصر کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پھر اس کی آواز ابھری۔

"کہاں ہو؟"

"تلاش کر لو۔" شازیہ نے بے خوفی سے کہا اور راجا ناصر مسکراتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ شازیہ سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ "کر لیا نا تلاش۔" وہ بولا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شازیہ کو دیکھنے لگا پھر اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا۔

"آپ..... آپ کون ہیں؟"

"ارے کیا ہو گیا تمہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"اداکاری کر رہے ہو۔" شازیہ نے کہا۔

"مگر..... میں..... یہ..... آپ۔"

"گڈ۔ اس وقت تو تم کسی اسکول کے طالب علم ہو رہے ہو۔"

"مم..... میں..... یہ۔ آپ یہ سب کیا ہے؟ کون ہیں آپ؟" راجا ناصر بولا۔

"اچھا جناب اب ہم کون ہو گئے۔" شازیہ بہ دستور نگینہ کی آواز میں بول رہی تھی۔

"خدا کی قسم تمہارا چہرہ..... میں نے نشہ بھی نہیں کیا۔" راجا ناصر بولا۔

"جناب راجا ناصر صاحب بغیر نشے ہی کے آپ کی یہ حالت ہو گئی۔"

"میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟ کیا تم نے میک اپ کیا ہوا ہے؟"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔ عقب میں صوفی کی آواز سنائی دی۔ راجا ناصر کچھ اس طرح الجھ گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ اس نے عقب پر غور بھی نہیں کیا۔ صوفی نے دروازے سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا تھا اور اس کے بعد آہستہ سے چلتا ہوا راجا ناصر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اپنے پہلے جملے کے ساتھ ہی اس نے راجا ناصر کے ہولسٹر پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک انسپکٹر جانتا تھا کہ پستول کس طرح ہولسٹر سے باہر آتا ہے۔ راجا ناصر نے یہ آواز سنی اور اس کا پستول ہولسٹر سے نکل گیا۔ وہ گھبرا کر پلٹا تو صوفی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''کیسے مزاج ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' راجا ناصر کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ آنکھیں پھاڑے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی صوفی پر اور کبھی اپنے ریوالور پر اٹھ جاتیں جو صوفی کے ہاتھ میں تھا، پھر اس نے پلٹ کر شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

''شٹ..... تو..... یہ کوئی جال ہے۔''

''صوفی صدی۔''

''تم لوگ..... تمہارے خیال میں تمہارے علاوہ کوئی دوسرا شکاری ہو بھی نہیں سکتا۔'' راجا ناصر چند لمحے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔

''نگینہ کہاں ہے؟''

''انگوٹھی میں۔'' شازیہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

''تم کون ہو؟''

''انگوٹھی۔'' شازیہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''صوفی صاحب کیوں بلایا ہے مجھے اس طرح یہاں اور نگینہ کو کہاں غائب کر دیا ہے آپ لوگوں نے۔ مجھے نہیں جانتے آپ۔''

''جانتے ہیں۔ تم نے رابعہ سلطان کو قتل کیوں کر دیا؟''

''میری مرضی..... آپ اس کے بھائی لگتے ہیں؟''

''ہم اس کے کیا لگتے ہیں یا نہیں لگتے۔ اس بات کو چھوڑ دو۔ تم نے اسے صرف اس لیے قتل کیا کہ۔''

''نہیں..... نہیں میں نے آپ کو تفصیل تو بتائی تھی۔ وہ میری پسندیدہ عورت تھی لیکن وہ مجھے پسند نہیں کر رہی تھی اور پھر اس نے حد سے اونچی پرواز شروع کر دی تھی۔ میں نے اس کی چھٹی کر دی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ منسلک ہو گئی تھی۔''

''یہی تو اس نے سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ صوفی صاحب لائیں ریوالور مجھے دیں اور ہوش کی دوا کریں۔ آپ کے ساتھ جو کچھ کروں گا آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''صوفی نے شازیہ کو آواز دی اور کہا۔

''شازیہ اسے سنبھالو۔'' یہ کہہ کر اس نے ریوالور شازیہ کی طرف اچھال دیا۔ راجا ناصر نے اسے لپک کر پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے صوفی کی لات پیچھے سے اس کی کمر پر پڑی اور وہ کئی فٹ اونچا اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ صوفی نے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔''

''ویسے تو خاصا شور شرابا ہو سکتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ لیکن ہم کرنا نہیں چاہتے چنانچہ پہلی

بسم اللہ۔'' یہ کہہ کر صوفی نے اس کی پنڈلی پر اپنا پاؤں رکھا اور اس کے بعد شازیہ نے جو دہاڑ سنی۔ اس نے اس کے کان سنسنا کر رکھ دیے۔ راجا ناصر کی ٹانگ پنڈلی کے پاس سے ٹوٹ گئی تھی اور وہ پورے کمرے میں تڑپتا پھر رہا تھا۔ صوفی چند لمحے اسے کمرے میں لوٹ لگاتے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے اس کی اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پاؤں رکھ دیا۔

''مر گیا..... مر جاؤں گا۔ مر گیا..... مر جاؤں گا۔''

''کمال ہے اردو بھی ٹھیک نہیں ہے تمہاری۔ پہلے کہتے ہو مر گیا، پھر کہتے ہو مر جاؤں گا تو یہ ایک ہوئی دوسری ٹانگ بھی تو باقی ہے تمہاری، مگر ایسے نہیں صوفی نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر اٹھا کر دوسری ٹانگ رکھی اور ایک بار پھر اس نے پوری قوت سے اس پر پاؤں مارا۔ دوسری پنڈلی بھی جھول گئی تھی اور اس طرح جھولی تھی کہ دونوں ٹانگیں مڑ کر لٹکی ہوئی کھال کے ساتھ منسلک رہ گئی تھی۔ صوفی نے بڑی سفاکی کے ساتھ اس کی ران پر پاؤں مارا اور شاید ران کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے اس کے دونوں ہاتھ توڑے اور پھر جیب سے ایک چھوٹا چاقو نکالا اور بولا۔

''لڑکی رابعہ سلطان بے سہارا تھی۔ تم بہت بڑے آدمی تھے۔ تم نے اسے دھوکے سے بلایا۔ قتل کر دیا۔ ویسے تو میں تمہیں مہلت دے سکتا ہوں لیکن دینا نہیں چاہتا۔ اب میں تمہاری زبان کاٹوں گا اور اس کے بعد تمہارے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں۔ تم اس قدر بے بس ہو جاؤ گے کہ اپنے لیے کچھ کر بھی نہ سکو گے راجا ناصر! اگر زندہ بچ جاؤ تو بس اس بات پر افسوس کرنا کہ تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہو۔ یہ افسوس تمہیں زندگی بھر رہے گا۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ تم میرے خلاف جو چاہو کر سکتے ہو۔''

شازیہ بہت بہادر ہو گئی تھی اور پھر جنگ و جدال کے ماحول سے اچھی خاصی روشناس بھی لیکن اس وقت درحقیقت اس کا ذہن قابو میں نہیں رہ سکا۔ جب صوفی نے راجا ناصر کی دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں کاٹ لیں اور اس کے بعد انتہائی وحشیانہ انداز میں اس کا منہ کھول کر اس کی زبان..... شازیہ نے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور اس کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

یہ تمام کارروائی کرنے کے بعد صوفی تھوڑی دیر تک ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ راجا ناصر واقعی بہت طاقت ور تھا کہ اتنی شدید اذیت کے بعد بھی ہوش میں رہا تھا لیکن جو ہو گیا تھا اگر واقعی زندہ بچ گیا تو اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو اسے کرنا پڑتا۔ کچھ لمحوں کے بعد صوفی باہر نکل آیا اور پھر شازیہ کو لے کر وہاں سے چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد گرین ہاؤس پہنچ گئے۔ نگینہ کو اس طرح یہاں قید کیا گیا تھا کہ وہ نہ تو کسی عمارت کو پہچان سکے اور نہ کسی آدمی کو۔ بس اسے زندہ رکھنا مقصود تھا کیونکہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ شازیہ کی حالت ابھی تک خراب تھی۔ تھوڑی دیر تک یہ لوگ کھاتے پیتے رہے۔ باقی لوگوں کو صورت حال کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی شازیہ بتانے کی پوزیشن میں تھی، لیکن اس نے اتنا ضرور کہا۔

''چھوٹے بابا جب آپ کو اس کی یہ حالت کرنا تھی تو میرے خیال میں آپ کو اسے مار دینا چاہیے تھا۔''

''تم شاید وہاں سے نکل آئی تھیں۔'' شازیہ جب میں نے اسے کہا تھا کہ میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس نے رابعہ سلطان کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر جب تک زندہ رہے افسوس کرتا رہے۔ مر جانے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی فائدہ نہیں ہوتا مگر تم کیوں ایسا کہہ رہی ہو۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ اس اذیت سے گزر رہا ہوگا۔"

"نہیں چھوٹے بابا۔ جو کچھ اس نے کیا ہے اس کی تو اسے سزا ملنی ہی چاہیے تھی لیکن کیا وہ آپ کی نشان دہی نہیں کردے گا؟"

"مزہ آئے گا نا۔"

"میں تو اس وقت ملک میں ہوں ہی نہیں۔ سارے کام کر چکا ہوں۔ ایک فلائٹ سے ملک سے باہر بھی جا چکا ہوں۔ لوگ تصدیق کریں گے کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔ کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔"

"اوہ۔ چھوٹے بابا، میری سوچ بھی بہت چھوٹی ہے۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کام آپ نے کیا ہے۔" شازیہ نے جواب دیا۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

بعد میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ نگینہ نے بیانات دیے تھے اور اخبارات راجا ناصر کے بارے میں بہت کچھ لکھتے رہے تھے اور بے شمار قیاس آرائیاں کی گئی تھیں اور یہ کہا گیا تھا کہ راجا ناصر کو کسی خاص دشمنی کی بنیاد پر قتل کیا گیا ہے پھر ایس پی جمشید مرزا نے صوفی سے ملاقات کی تھی۔ نہ جانے کہاں سے اسے کچھ بھنک لگ گئی تھی۔ ایک تجربے کار پولیس آفیسر تھا۔ صوفی کو اس نے اپنے آفس میں طلب کیا تھا اور صوفی وہاں پہنچ گیا تھا اور وہ زندہ در گور تھا۔ ادھر شازیہ اینڈ کمپنی یعنی گرین فورس اس بات پر مصر تھی کہ چھوٹے بابا بدل گیا ہے۔ اس کی فطرت میں ایک وحشت اور ایک درندگی آ گئی ہے۔ چالاک لوگ تھے، احمق نہیں تھے۔ رابعہ سلطان کے بارے میں انہیں ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی اور یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ صوفی کی زندگی میں چند لمحوں کے لیے پر بہار ہواؤں کا ایک جھونکا آیا تھا اور اس کے بعد فضاؤں میں تلیل ہو گیا، لیکن صوفی کی زندگی میں ایک کرخت گیرختی دے گیا تھا۔ پھر کرنل رحیم شاہ بھی آ گیا۔ گرین ہاؤس پہنچا تو صوفی کے علاوہ سب سے ملاقات ہوئی۔ شازیہ بہرحال لڑکی تھی۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی اور صوفی کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔ کہنے لگی۔

"چھوٹے بابا تو اس طرح تبدیل ہو گئے ہیں کہ آپ ملیں گے تو یقین نہیں کر پائیں گے۔ ویسے بڑے بابا میں آپ سے ایک بات کہوں۔ وہ رابعہ سلطان سے عشق کرنے لگے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر عشق کے جراثیم موجود ہیں۔"

بیٹا یہ تحقیق تو آپ ہی کر سکتی ہو۔ ہم تو ناتجربے کار آدمی ہیں اس معاملے میں۔" کرنل رحیم شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں، اگر انہیں تھوڑی سی زندگی تبدیل کرنے کا موقع مل جائے تو چھوٹے بابا بہت اچھے بن سکتے ہیں۔"

"برے تو وہ اب بھی نہیں ہیں۔ کوئی تجویز ان کے لیے تمہارے ذہن میں ہے۔"

"پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتا دوں بڑے بابا کہ جمشید مرزا نامی پولیس آفیسر آج کل چھوٹے بابا

کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ راجا ناصر کے عزیز ہیں اور چھوٹے بابا کو راجا ناصر کے قتل کا ذمے دار قرار دینا چاہتے ہیں۔ ثبوت کوئی نہیں ہے ان کے پاس کیونکہ چھوٹے بابا نے تحفظ کا معقول بندوبست کر لیا تھا۔ کاغذات پر ہر جگہ یہ بات موجود ہے کہ وہ ان دنوں ملک میں تھے ہی نہیں۔ یہ کام انہوں نے اپنے لیے خود کر لیا تھا۔ مزاج اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ذرا بھی کوئی تلخ ہو جائے تو اس کی پٹائی کر دیتے ہیں۔"

"پان کھا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ باقی سب وہی کا وہی ہے۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے بڑے بابا۔ آپ بھی سوچیں گے کہ کیسی لڑکی ہے؟"

"نہیں بھئی میں کیوں سوچوں گا۔ کیا تجویز ہے؟"

"چھوٹے بابا کو اس جگہ سے نکال لیا جائے جہاں وہ رہتے ہیں۔ ایک اچھا سا گھر انہیں دے دیا جائے۔ یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے گرین ہاؤس میں سب لوگوں کا جمع ہو جانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن چھوٹے بابا کے لیے خاص طور سے ایک گھر الگ درکار ہوگا۔ وہاں ان کی شخصیت میں تبدیلی ضرور پیدا ہوگی۔ ہم لوگ بھی کوشش کریں گے۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتے ہیں اگر ہم وہاں جا کر کچھ کریں تو آپ یقین کریں کہ ان کے دو سو مددگار آ جائیں گے جو کہیں گے کہ صوفی کو صوفی ہی رہنے دیں۔" کرنل رحیم شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"بات تم لوگوں کی بالکل ٹھیک ہے۔ کسی نئے گھر کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ کوئی چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ جو صوفی کے لیے کافی ہو۔ البتہ ہم صوفی کو یہ اجازت ضرور دے دیں گے کہ وہ اپنے پرانے گھر سے بھی رابطہ رکھیں۔ کچھ ایسا چکر چلائیں گے جس کے مطابق یہ کہا جائے کہ یہ نیا گھر گرین ہاؤس کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر صوفی کو اس پر آمادہ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔"

"خیر میں ہی کوئی ترکیب کروں گا ویسے ایک تحفہ میں صوفی کو ضرور دوں گا۔"

"وہ کیا؟"

"حسینہ۔"

"یہ کون ہیں؟"

"ہمارا ایک ملازم ہے الیاس خاں۔ الیاس خاں کی بہن ہے کیا سرپھری خاتون ہیں۔ یہ سمجھ لو ابھی تھوڑے دن ہوئے ہمارے گھر آئی ہیں۔ لیکن پورے گھر کے حالات درست کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بچے خاصے خلاف ہو چکے ہیں ان کے، میرا خیال ہے انہیں صوفی صاحب کی تربیت پر مامور کر دیا جائے۔"

"ارے واقعی لطف آ جائے گا۔" شازیہ ہنس کر بولی۔

"کرتا ہوں بندوبست۔ ویسے وہ خاتون ایک حادثے کا شکار ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ سات سال تک ایک شخص سے منگنی رہی اور اس کے بعد وہ مشرق وسطیٰ سے واپس آیا تو بیوی اور تین بچوں کے ساتھ تھا۔ بس محترمہ حسینہ کی ذہنی کیفیت کا آپ لوگ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خیر جمشید مرزا کا پورا قصہ کیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’بس چھوٹے بابا کے پیچھے لگا ہوا ہے اور انہیں چیلنج کیا ہے۔ وہ ایک باقاعدہ پولیس آفیسر ہیں، شخصیت بھی اچھی خاصی ہے۔‘‘

’’ویسے اب تم لوگوں نے مجھے ایک بڑی عجیب بات بتائی ہے۔ ویسے میں محترمہ ناظمہ جلال کو بھی جانتا تھا لیکن جو کہانی ان سے منسوب ہوئی ہے بڑی کمال کی کہانی ہے۔ خیر میں صوفی صاحب سے ملاقات کروں گا اور پھر کرنل رحیم شاہ خود ہی صوفی کے گھر پہنچ گیا۔ اس درویشانہ ماحول سے اسے خود بھی کافی رغبت تھی۔ یہاں اس نے کئی گھنٹے بڑے اچھے گزارے۔ سادہ دل لوگوں کی سادہ دل بستی میں جو محبتیں ملتی ہیں وہ واقعی کسی عالی شان محل میں بھی نہیں مل سکتیں۔ محمد خان اور دوسرے تمام حضرات خاطر مدارات میں لگ گئے۔ صوفی بچھا جا رہا تھا۔ بہرحال جب بڑی مشکل سے فراغت ملی تو کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

’’صوفی صاحب دیارِ غیر سے ایک انتہائی سنسنی خیز منصوبہ لے کر آیا ہوں۔ بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن وہی کہتے ہیں نا کہ جب تک اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا کی ہے۔ وطنِ عزیز کے لیے وطنِ عزیز میں رہنے والوں کے لیے جو بھی کاوشیں کی جا سکیں وہ سرمایہ زندگی ہوتی ہیں۔‘‘

’’بخدا القظ بہ لفظ صحیح فرمایا آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

’’صوفی صاحب فتنہ اسرائیل آپ کو پتا ہے کہ یہودی کسی ایک محاذ پر کام نہیں کر رہے اگر ان کا ایک محاذ ہو تو ہم ان پر پوری طرح نگاہ رکھیں۔ وہ ہمارے خلاف ہر وہ عمل کر رہے ہیں جو وہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رکھے ہیں۔ دہشت گردی، بم دھماکے، ریلوے لائنوں کی تباہی، معاشی حملے، یہ سب کچھ کیے جا رہے ہیں اور اس کے روحِ رواں وہی ہیں۔ صوفی صاحب بات کچھ آگے بڑھنا چاہیے۔ ہم لوگ اندرونی اور بیرونی معاملات پر بھرپور نگاہ رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ آپ سے ایک درخواست ہے میری۔‘‘

’’ارشاد...... ارشاد‘‘ صوفی نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

’’میں چاہتا ہوں گرین ہاؤس کے علاوہ ایک اور گھر بھی آپ کے پاس ہو جہاں میں اور آپ دونوں ہر طرح کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ یہ گھر آپ اپنا قائم رکھیے لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اسے اپنا مرکز نہ بنائیے کیونکہ اس مرکز کی بڑی شہرت ہو چکی ہے۔ ایک ایسا خفیہ گھر جہاں بہت کم افراد اس بات سے واقف ہوں کہ آپ وہاں رہتے ہیں۔ آپ کی دیکھ بھال کے لیے ایک خاتون فراہم کر دی جائیں گی۔ یہ ہمارے پروگرام کا پہلا حصہ ہوگا۔‘‘

’’میں حاضر ہوں۔‘‘ صوفی نے سادگی سے کہا۔

’’کرنل رحیم شاہ نے اپنی مسکراہٹ کو بڑی احتیاط کے ساتھ دبا لیا تھا۔

’’تو پھر ٹھیک میں کوشش کرتا ہوں۔‘‘

’’اور سنائیں کوئی اور مسئلہ۔‘‘

’’نہیں، درویشوں کی دعاؤں سے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔‘‘ صوفی نے انسپکٹر جمشید مرزا کا نام بھی نہیں لیا تھا لیکن کرنل رحیم شاہ نے وزیرِ داخلہ شاہ میر خاں صاحب کو ساری تفصیل بتائی اور بولے۔‘‘ یہ غلط فہمی

ہے ایس پی صاحب کو کہ انہوں نے اس طرح سے سوچا ہے۔ صوفی کو اگر کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو علی الاعلان کر ڈالتا ہے ذرا جمشید مرزا کو سمجھا دیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے سمجھا دوں گا۔‘‘

اس طرف مکان کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور دوسری طرف ایس پی جمشید مرزا جو ہر طرح سے صوفی کی تاک میں لگا ہوا تھا اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب اسے وہ کال موصول ہوئی۔ شاہ میر صاحب نے براہِ راست اسے مخاطب کر ڈالا تھا اور ایس پی جمشید مرزا بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

’’لیس سر...... جی...... سر آپ نے براہِ راست ...... سر حکم۔‘‘

’’جمشید مرزا صاحب بول رہے ہیں۔‘‘

’’جی سر...... ہاں سر...... بالکل سر۔‘‘

’’جمشید مرزا صاحب آپ کی ایک شکایت آئی ہے میرے پاس ایک انتہائی خاص آدمی نے آپ کے بارے میں مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ہے کہ آپ اپنے اختیارات سے ناجائز کام لے رہے ہیں۔‘‘

’’س...... س...... سر...... میں م...... م۔ کچھ نشان دہی کر دی جائے۔‘‘

’’آپ کا ریکارڈ طلب کر لیا ہے میں نے، دیکھتا ہوں آپ کا ماضی کیا رہا ہے کس طرح آپ اس عہدے تک پہنچے ہیں۔ آپ نے خود اس کے لیے زمین تیار کی ہے ورنہ اس سے پہلے۔‘‘

’’سر اگر ایک بار مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جائے تو......‘‘

’’صوفی صاحب کو جانتے ہیں آپ جو ماضی میں محکمے میں انسپکٹر بھی رہ چکے ہیں۔‘‘

’’ص...... صوفی جی ہاں سر۔‘‘

’’کیا معلوم ہے اس شخص کے بارے میں آپ کو۔‘‘

’’سر یہی کہ کئی بار وہ محکمہ پولیس میں گئے اور اپنی ناقص کارکردگی کی بناء پر وہاں سے نکال دیے گئے۔‘‘

’’خیر آپ کی معلومات میں، میں کچھ ترمیم کر دوں، ناقص کارکردگی کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنی اصول پسند فطرت کی بنا پر ان کا گزارا آپ جیسے پولیس آفیسروں کے ساتھ نہیں ہو سکا۔ ورنہ یہ اس وقت کم از کم ڈی آئی جی کے عہدے پر ضرور ہوتے۔ بہرحال میں نے سنا ہے کہ آپ نے انہیں کسی قسم کی وارننگ دی ہے۔‘‘

’’سر...... وہ میرا بھتیجا قتل کر دیا گیا تھا اور اس سلسلے میں ہزاروں شواہد بھی ملتے ہیں کہ اس کے پس پشت صوفی صاحب تھے۔‘‘

’’ثبوت ہیں آپ کے پاس۔‘‘

’’نہیں سر، کوئی ثبوت نہیں ہے۔‘‘

’’تو دوبارہ اگر تم نے یہ جملے اپنی زبان سے ادا کیے تو میں آپ کی گرفتاری کے آرڈر جاری کر دوں گا۔ کسی معزز اور شریف شہری کے لیے بغیر ثبوت کے یہ جملے ادا کرنا بھی جرم ہے۔ اگر آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے تو آپ کو اس بات کا علم ہوگا۔‘‘

’’جی سر...... لیس...... سر...... ہاں سر......‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''خیال رکھیے گا اس کے بعد آپ صوفی صاحب سے کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ ورنہ آپ کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔''

''یس سر..... یس سر.....'' ایس پی جمشید مرزا نے کہا۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

صوفی کا نیا گھر بہت خوبصورت تھا۔ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا لیکن پھر بھی اچھی مکانیت تھی۔ چار بیڈ روم، بہت بڑا ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، ایک چھوٹا سا لان جس پر خوب صورت گھاس، موٹر گیراج، بہر حال ایک انتہائی مکمل مکان تھا۔ صوفی نے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو بھی مکان پسند آیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کیونکہ خود بھی پیر پرست انسان تھا اس لیے مکان کا افتتاح محفل قوالی سے ہوا اور صوفی کی فرمائش پر محمد خاں اور دوسرے تمام افراد کو وہاں دعوت دی گئی۔

''شازیہ، دلاور، عادل، فیضان، کرنل رحیم شاہ، غلام قادر کو تو گھر بے حد پسند آیا تھا اور اس نے خوشی سے کہا تھا۔

''ارے ماں قسم یہ تو گرین ہاؤس سے بھی اچھا ہے۔ چھوٹا بابا میرے کو ادھر چوکیدار لگا دو۔''

''تم لوگ یہاں سے براہِ راست تعلق رکھو گے۔ ظاہر ہے صوفی صاحب کو تنہا تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے ڑے، ابھی اپن تھوڑے دن تو ادھر سے نہیں جاتا اے میرے کو اجازت دیو مجھے یہ جگہ بہت پسند آیا ہے۔''

''ہاں ہاں اجازت کی کیا بات ہے۔'' باہر محفل قوالی میں بھی ایک عجیب سماں بندھا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگ بھی آ گئے تھے اور نئے پڑوسی کو خوش آمدید کہا تھا۔ ایک اور صاحب جو اس وقت مہمان خصوصی بن گئے تھے وہ معشوق نشیلے تھے۔ کافی عرصہ پہلے تقریباً پانچ چھ سال پہلے محمد خان کے ہوٹل کے پچھواڑے نعمت خالہ کے ہاؤس گیسٹ تھے اور اکثر نعمت خالہ دوسرے تیسرے دن ان کے پانچ برتن اور ایک ٹین کا صندوق اٹھا کر باہر پھینک دیا کرتی تھیں۔ پڑوسیوں سے مذاکرات ہوتے اور آخر کار معشوق نشیلے صاحب کو واپس تھوڑی سی مہلت دے دی جاتی۔ اصل میں شاعر قسم کے آدمی تھے اور جب انسان شعر کہنے لگتا ہے تو اس کو کسی اور کام کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔ کرتے دھرتے کچھ نہیں تھے۔ بیوی بچے بھی نہیں تھے جو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کرتے۔ بس الٹی سیدھی شاعری کرتے رہتے تھے۔ کہیں سے مل جاتا تو کھا لیتے۔ ادھار لینے میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور اکثر ادھار لے کر کام چلا لیا کرتے تھے۔ آخر کار ایک دن غیرت آئی ساری زندگی کا سرمایہ ایک کڑاہی دو دیگچیاں، دو پلیٹیں اور ایک گلاس مع صندوق کے نعمت خالہ کے حوالے کیا اور خود دوبئی کے لیے چل دیے۔ مشورہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ بس ایک خط لکھ گئے تھے کہ نعمت خالہ بھاری ساتھ لاؤں گا اگر لونا گلستان سے۔ پانچ سال تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ پانچ سال کے بعد اچانک وارد ہوئے تھے، لیکن بہاریں تو ساتھ نہیں لا سکے تھے البتہ خود خزاں بن گئے تھے۔ اچھی خاصی تر و تازہ شخصیت تھی کسی زمانے میں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دانت کچھ ضرورت سے زیادہ لمبے نظر آنے لگے تھے اس لیے چہرہ سوکھ گیا

تھا۔ بدن بھی ظاہر ہے اسمارٹ ہو گیا تھا۔

نعمت خالہ نے تو خیر نیا مہمان رکھ لیا تھا۔ محمد خان بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ ہوٹل کے ایک بیرونی حصے میں بستر بچھانے کی جگہ دے دی تھی۔ بہر حال صوفی کے نئے گھر کے بارے میں سن کر پہنچ گئے تھے۔ صحیح معنوں میں ان لوگوں نے خوشی کی محفل تو نہیں البتہ محفل تعزیت منعقد کر ڈالی تھی۔

''اماں صوفی صاحب اتنے عرصے کا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔'' محمد خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''محمد خاں صاحب عقل بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئی درویشوں کی دعاؤں سے میاں ہم تو یہ وصیت کر چکے ہیں کہ اسی گھر میں ہماری قبر بھی بنا دی جائے بھلا وہ گھر چھوڑیں گے۔ بس آپ سمجھا کریں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اب پتا نہیں کیوں ہوتی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے یہ صرف ایک عارضی ٹھکانا ہے جہاں کبھی کبھی قیام کر لیا کریں گے ورنہ اپنی بستی زندہ باد۔'' صوفی نے کہا اور سب لوگ مطمئن ہو گئے۔

صوفی نے بڑی گرم جوشی سے معشوق نشیلے کا استقبال کیا تھا اور پھر اس کے بعد معشوق نشیلے نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا تھا۔

''بس صوفی صاحب وقت نے ساتھ نہیں دیا تقدیر نے تعاون نہیں کیا یہاں سے بات ہوئی تھی ملک سے باہر بھجوانے والے ایک حضرت سے یہ طے کیا تھا کہ کما کما کر ان کی ادائیگی کریں گے۔'' لانچ سمندر میں سفر کر رہی تھی، کوسٹ گارڈ نے چھاپا مارا اور جانا کہیں تھا پہنچ کہیں گئے ایک جگہ پہنچے تو وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جانسن نام تھا کہنے لگے کہ میرے ساتھ لندن چلو، میں نے کہا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ دوبئی کے بجائے لندن پہنچ جائیں گے۔ لندن لیے گئے اپنا سامان ہمیں تھما دیا۔ اس سامان میں نشہ آور ادویات تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نکال لے جائیں گے لیکن ہم نے خود کسٹم حکام کو پیش کش کر دی کہ ذرا ہمارے سامان کا جائزہ تو لیں نتیجے میں ہمیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ سزا پوری کی تو ہمیں ہمارے وطن بھجوا دیا گیا۔ یہ ہے داستان نشیلا شعر و شاعری چل رہی ہے باقاعدہ۔ بلکہ ہم نے کچھ تبدیلیاں پیدا کر لی ہیں تاکہ اشعار کی چوری نہ ہو سکے کسی وقت محفل مشاعرہ منعقد کرا دیں۔ بندا پورا مشاعرہ نہ لوٹ لیں تو ہمارا نام بھی نہیں۔ محفل سماع میں بھی بہت لطیفہ گوئیاں ہوئیں۔ لیکن آخر کار یہ تقریب بھی ختم ہوئی اور اس کے بعد واقعی کرنل رحیم شاہ نے محترمہ حسینہ کو تحفے کے طور پر صوفی کو پیش کیا۔

''یہ حسینہ بی بی ہیں۔'' کرنل رحیم شاہ نے تعارف کروایا تو صوفی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پان کی پیک زمین پر ٹپکی تو حسینہ نے کہا۔

''اے، یہ اگال دان تو بند تو کرو، توبہ توبہ منہ سے غلاظت گر رہی ہے۔ اے۔ رحیم میاں کہاں لے آئے تم مجھے۔''

''حسینہ بیگم سمجھایا ہے آپ کو صوفی صاحب ہیں یہ۔ ان کی خدمت کرنی ہے۔''

''ہائے..... خدا کی نیکی یہ برا وقت مجھی پر آنا تھا۔ میں ان کی خدمت کروں گی میاں اگر کوئی گستاخی ہوئی تھی تو کسی جانوروں کے طویلے میں جھاڑو پونچھے پر لگا دیتے۔ کم از کم یہ ہوتا کہ دل میں خیال ہوتا کہ جانوروں میں رہ رہی ہوں۔ اب ذرا دیکھو۔ اے میں کہتی ہوں کہ اُن کا یہ اگال دان کھلا کیسے رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"صوفی صاحب حسینہ بیگم کو دیکھ کر آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

"ان کی بدنصیبی اور دنیا کی ستم ظریفی پر درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے بھی برجستہ جواب دیا۔ یہ کیفیت اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی کہ۔ اب وہ کسی کی زیادہ رکتا نہیں تھا۔

"بدنصیبی۔ ستم ظریفی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ان کا نام تو کالو نچی بیگم ہونا چاہیے تھا۔ ذرا معلومات کر کے بتایئے کہ حسینہ نام از راہِ مذاق رکھا گیا تھا یا پھر وہ لطیفے والی بات تھی یعنی بادشاہ کے سامنے بچوں کا مقابلہ حسن اور ایک عورت کا اپنی کالی کلوٹی اولاد کے لیے دنیا کے سب سے خوب صورت بچے کا انعام حاصل کرنا۔ والدین نے اگر یہ مذاق کیا ہے تو کیا وہ اس دنیا میں ہیں کہ ان سے باز پرس کی جاسکے درویشوں کے کرم سے۔ آپ ذرا ان کے چہرے پر یہ تارکول چڑھا ہوا دیکھیے اور اس کے بعد ان کے نام پر غور کیجیے۔" بجائے حسینہ بیگم اس بات پر غصہ ہوتیں اچانک ہنس پڑیں اور بولیں۔

"میاں خوب نبھے گی ہماری۔ تو چلو تم مجھے کالو نچی کہہ لو مگر میں تمہیں کیا کہوں۔ رحیم میاں خدا لگتی کیا ایسا نہیں لگتا جیسے راتوں رات دیمک کھا گئی ہو۔ منہ میں اگر بڑے بڑے دو سیب رکھیں تو گال چھ فٹ پھول جائیں اللہ معاف کرے داڑھی کا مذاق اڑانا گناہ ہے اس سے زیادہ یہ داڑھی کا مذاق خود نہیں اڑا رہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بکرے کی دم چھل گئی ہو اور پھر باقی لگتا ہے تھوڑے دن میں مر جائیں گے اللہ نہ کرے۔"

"حسینہ بیگم زبان پر قابو نہیں رکھ سکتیں آپ۔"

"ارے یہ بھی تو رکھیں نا زبان پر قابو۔"

"مگر کرنل صاحب آپ نے انہیں زحمت کیوں دی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہیں رہیں گی صوفی صاحب، اسی گھر میں، آپ کے ساتھ آپ کا ہر کام کریں گی اور ایک درخواست میں کروں گا آپ سے۔ ہم سب ان کی عزت کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی ان کا خیال رکھیں۔" اس موضوع پر گفتگو ختم کی جاتی ہے۔ حسینہ بیگم یہ گھر آپ کی تحویل میں ہے اور صوفی صاحب کو مطمئن کرنا آپ کا فرض۔"

"اللہ ہماری مغفرت کرے۔" حسینہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ پھر جب وہ کمرے سے باہر چلی گئیں تو صوفی بولا۔

"جناب عالی! کون سے دن کی پاداش میں آپ نے ہمیں۔"

"نہیں صوفی صاحب آپ یقین کریں بڑی اچھی خاتون ہیں۔ دل کی بھی اچھی ہیں اور ذمے دار بھی ہیں۔ تھوڑا وقت گزرنے دیجیے آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو ان کی اشد ضرورت ہے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

♥.....♥.....♥

گرین ہاؤس کافی خوب صورت عمارت تھی۔ دلاور خاں کا پورا خاندان اس میں رہتا تھا۔ شازیہ کی والدہ اور بہنیں بھی وہاں پر موجود تھیں۔ یہ عمارت بڑی وسعتوں میں تھی۔ ان لوگوں کی قیام گاہ کا بندوبست

ایک الگ تھلگ حصے میں کیا گیا تھا جب کہ ضروری امور کے لیے دوسرا حصہ مخصوص کرلیا گیا تھا لیکن صوفی کے نئے گھر کی اہمیت کچھ ایسی بڑھ گئی تھی کہ اب اکثر تمام لوگ وہاں جمع ہوجایا کرتے تھے۔ صوفی بھی اپنی فطرت کے خلاف بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو تبدیلی اس کے اندر رونما ہوئی تھی اس کے تحت عام طور سے اپنے اس نئے گھر میں ہی رہتا تھا۔ حسینہ بیگم کا تو واقعی کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ صوفی کو پھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ وقت پر کھانا، وقت پر اٹھنا، وقت پر پہننا لیکن صوفی نے حسینہ بیگم کی ذات کو اپنے آپ تک ہی محدود رہنے دیا تھا، کسی اور کو اس میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت جو سب سے بڑی مشکل درپیش تھی وہ معشوق نشیلے صاحب کی تھی۔ وہ تو ادھار کھائے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ جان کو آ گئے تھے۔ جب دیکھو نازل۔ پس گھر میں آتے تو ایک ایک سے اس طرح محبت اور شناسائی کا اظہار کرتے جیسے بڑی قدیم رشتے داری ہو۔ بہرحال ماحول میں تبدیلیاں سی پیدا ہوگئی تھیں۔ خاص طور سے غلام قادر کی تو ان سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ حسینہ میں یہ خوبی تھی کہ بے مقصد کسی کے سامنے نہیں آتی تھی لیکن غلام قادر سے دو چار بار جھڑپ ہوچکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ معشوق نشیلے نے ایک بار کہا۔

"آپ کو دیکھ کر تو واقعی ذوقِ شاعری چکنا چور ہوجاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی صورت نظر نہ آیا کرے۔"

"اڑے خدا قسم تمہاری آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے۔ ابھی یار میں کئی بار جھانک کر دیکھ چکا ہوں کہ کہیں تم وہ شیشے تو نہیں لگاتے جو آنکھوں کے اندر لگا لیتے ہیں۔ ابی جاؤ یار ورنہ تمہارا سارا نشہ نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"غلط فہمی کے مریض ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ تن توش میں ہم پر بھاری ہو، بخدا جو سنا ہے آپ نے نہ چھیڑ آگ لگا دوں گا آشیانے کو۔"

"اڑے جاؤ تم چپوابی آگ لگائیں گا تو میں تم کو اسی آگ پر سیخ میں پرو کر بھون لے گا۔"

"ہائیں..... ہائیں..... ہائیں، یہ تم لوگوں نے لڑنا کیوں شروع کر دیا درویشوں کے کرم سے۔"

"واہ صوفی صاحب واہ، آپ کی گفتگو مزہ دے جاتی ہے لڑنا بھی اگر درویشوں کے کرم سے شروع ہو تو بات کیا ہوئی۔" اس وقت بھی جب تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے پتا نہیں وہ کس طرح اندر گھس آئے تھے، گھنٹی بجائے بغیر۔ غلام قادر نے چونک کر انہیں دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"اڑے ماں قسم آپ لوگوں میں سے چراغ کس کے پاس ہے؟"

"چراغ"

"اڑے اور کیا اب یہ دیکھو یہ چھت سے اترا ہے۔"

"صوفی صاحب حیرت ہے۔ آپ نے ہمیں ان وحشیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ معشوق نشیلے نے نزاکت سے کہا۔ اتنی دیر میں حسینہ بیگم آ گئیں۔

چائے پئیں گے آپ لوگ یا ٹھنڈا۔ ویسے چلو خیر بات کروں گی تم سے ان شہد کی مکھیوں کے بارے میں، کیا لاؤں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چائے اور اس کے ساتھ۔"

"درویشوں کی دعائیں۔" معشوق نشیلے نے فوراً ہی جملہ پورا کیا اور ہی ہی کرنے لگے۔ شازیہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ آئے کیسے یہ تو بتایئے۔"

"بھئی کچھ بری عادتیں بچپن ہی سے پڑی ہوئی ہیں۔ عام طور سے کھیتوں میں احاطے کی دیواریں پھلانگ کے اندر جاتے تھے۔ آم اور کچے امرود کھایا کرتے تھے۔ گھروں میں آنے جانے کی عادت بھی ایسے ہی پڑ گئی۔ بس سوچتے ہیں کہ کون گھنٹی بجانے کا تکلف کرے۔"

"کسی دن پولیس والے نے دیکھ لیا تو ہم میں سے کوئی نہیں کہے گا کہ آپ سے ہمارا کیا تعلق ہے؟"

"چھوڑیے چھوڑیے کچھ ایسی محفل نظر آ رہی ہے جی کہ اشعار بالکل اس طرح دماغ میں آ رہے ہیں جیسے وہ خود کار زینے ہوا کرتے ہیں نہ ان کی سیڑھیاں۔" ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور حسینہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر بیرونی حصے میں چلی گئی۔

"صوفی صاحب وہ جو آپ نے معیار زندگی قائم کر رکھا ہے، یعنی یہ دروازہ کھلا رکھنا اگر آپ چوکیدار رکھ لیں گے تو بخدا اس گھر کا حسن خراب ہو جائے گا۔" ابھی زیادہ باتیں نہیں ہوئی تھی کہ حسینہ واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کارڈ دبا ہوا تھا۔

"لمبے تڑنگے ہیں لیکن شکل سے ہونق لگتے ہیں۔ اللہ مارے بڑی جلدی میں ہیں جیسے باتھ روم جانا چاہتے ہوں۔ کیا یہ کارڈ، صوفی صاحب کو دے دوں۔" صوفی نے چٹکی میں کارڈ پکڑا اور اسے دیکھنے لگا۔ لکھا ہوا تھا..... ایس ایس سجادی اس کے ساتھ ہی پتا لکھا ہوا تھا، جوبلی ٹیپل روڈ مکان نمبر 27 تھا۔

"بلاؤ ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ یہ ایس ایس سجادی صاحب نہ جانے کون ہیں، ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر یہاں تک آئے ہیں، کیونکہ اس نام کے کسی آدمی سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" حسینہ باہر چلی گئی تھی، لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ ہانپتی کانپتی آئی۔

"لیٹے ہوئے ہیں، لیٹے ہوئے ہیں، آوازیں دینے پر بھی نہیں اٹھ رہے۔"

"درویش رحم کریں، کون لیٹا ہوا ہے؟"

"ہونق جیسے، اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ حسینہ کے جملے ابھی پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ صوفی نے دروازے کی جانب چھلانگ لگا دی اور پھر اس نے بھی دروازے کے سامنے لیٹے ہوئے اس شخص کو دیکھا۔ واقعی عمدہ لباس تھا۔ چہرے سے بھی کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا، لیکن جو صورت حال نظر آ رہی تھی اسے دیکھ کر صوفی دنگ رہ گیا۔ شازیہ، غلام قادر اور باقی افراد بھی پہنچ گئے۔ فیضان کی آواز ابھری۔

"مر چکا ہے۔" معشوق نشیلے بری طرح اچھل پڑے۔

"کک..... کیا۔ رحلت فرما گئے ہیں۔"

"اٹھاؤ۔" صوفی نے کہا۔ ایک لمحے کے اندر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ ادھیڑ عمر شخص موت

کی آغوش میں جا چکا ہے۔ گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی زخم وغیرہ کا تو نشان نہیں ہے، چنانچہ لاش کو ایک محفوظ جگہ رکھ کر اس کے لباس کی تلاشی لی جانے لگی۔ لباس میں تھوڑی سی کرنسی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، نہ ہی پورے جسم پر زخم کا کوئی نشان، موت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اچانک ہی شازیہ کی نگاہ باہر کی جانب اٹھ گئی اور اس نے ایک دم صوفی سے سرگوشی کی۔

"چھوٹے بابا پولیس۔" صوفی نے بھی چونک کر سامنے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے سرگوشی کی۔

"پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ فوراً اور میری طرف سے اطلاع کا انتظار کرو۔" معشوق نشیلے نے یہ الفاظ نہیں سنے تھے۔ صوفی نے سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا۔

"معشوق صاحب آپ میرے پرانے محلے کے آدمی ہیں۔ یہاں آپ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ملنے آئے تھے آپ مجھ سے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔"

"حسینہ تم بھی سن لو، یہاں اور کوئی نہیں آیا تھا۔"

"ارے تو وہ موئے مارے کہاں چلے گئے اور جو چائے کے برتن اندر پھیلے ہوئے ہیں۔"

"درویش آپ کو ہمیشہ ہمیشہ خوش رکھیں، انہیں لے جا کر کچن میں دھو دیجیے اور ایسا ہر نشان مٹا دیجیے جس سے یہ پتا چلے کہ یہاں دوسرے کچھ افراد بھی موجود تھے۔" حسینہ میں یہ خوبی تھی کہ زیادہ بحث نہیں کرتی تھی۔ تنہائی کی بات دوسری تھی لیکن ایسے کسی مرحلے پر۔

پھر بیل بجنے پر صوفی نے معشوق نشیلے سے کہا کہ وہ جا کر دروازہ کھولیں، لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ آپ تو پہلے بھی اسٹیج ڈرامہ کرتے رہے ہیں۔ معشوق نشیلے صاحب آپ کے لیے تھوڑی سی اداکاری مشکل تو نہیں ہوگی، پتا نہیں چلنا چاہیے درویشوں کی دعاؤں سے۔" باقی ساری باتیں اپنے معمول کے مطابق تھیں۔ انسپکٹر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"لاش کہاں ہے؟"

"اندر سو رہی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا۔

"جی۔"

"آیئے تشریف لایئے۔ قدم رنجہ فرمایئے۔" انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک صوفی کو دیکھا تھا۔ صوفی کو پہنچانتا نہیں تھا خود بھی نوجوان آدمی تھا، لیکن بگڑے ہوئے مزاج مالک نہیں تھا۔ صوفی کو حیرت تھی کہ پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ انسپکٹر نے لاش کا معائنہ کیا اور بولا۔

"طریقہ قتل کیا ہے؟"

"بس اپنی مرضی سے گئے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس طرح کی موت پر ایک شعر پیش خدمت ہے۔"

"آپ کا تعلق کسی ناٹک کمپنی سے ہے، کیا حلیے بنا رکھے ہیں آپ لوگوں نے۔"

"حضور من برا مت مانیے گا ہم تو اس گھر میں تھوڑے دن پہلے آئے ہیں، بڑے مشکل حالات کا شکار ہوئے ہیں۔ آپ یہ فرمایئے آپ کو لاش کی اطلاع کس نے دی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹیلی فون ملا تھا مجھے۔ آپ کے مکان کا نمبر بتایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ دروازے پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے، بس۔"

"ہوں۔ اس طرح یہاں آ گئے۔"

"یہ حضرت تشریف لائے تھے، بیل بجائی تھی۔ ہماری عزیزہ جو یہاں گھر کے امور سنبھالتی ہیں۔ دروازے پر گئیں تو انہوں نے یہ کارڈ اندر بھجوایا اور ہم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم نے حسینہ عالم سے کہا کہ انہیں بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ وہ دوبارہ گئیں اور واپس آئیں تو کہنے لگیں کہ وہ تو لیٹے ہوئے ہیں۔ تب ہم نے جا کر دیکھا تو ہمیں یہ حضرت نظر آئے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اٹھا کر اندر لے آئے، بس اتنی سی کہانی ہے اور سارا کھیل تھوڑے سے وقفے کا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہ آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے درویشوں کی دعاؤں سے کیا لگا رکھی ہے۔" انسپکٹر نے تند لہجے میں کہا۔

"دیکھیے محترم ہم سے باز پرس نہ فرمایئے گا بات ہمارے اور درویشوں کے درمیان رہنے دیجیے گا۔ آپ اپنا کام کیجیے گا۔"

"ایس۔ ایس سجادی بی ٹیمپل روڈ مکان نمبر 27 آپ کا ان سے کیا تعلق تھا؟"

"تعلق قائم اس وقت ہوتا جب یہ زندہ سلامت اندر آتے۔ ہم نہیں جانتے کہ کیا قصہ تھا۔ مرحوم ملاقات سے پہلے ہی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

"ہم جائیں۔" معشوق نشیلے نے کہا۔

"کیا بکواس ہے آپ میں سے کوئی نہیں ہل سکتا۔ ویسے اس گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"حسینہ عالم اور ہم۔ یہ معشوق صاحب تو مہمان کے طور پر آئے ہوئے ہیں۔"

"اے دیکھو میاں، دو دفعہ تم نے مجھے حسینہ عالم کہہ کر میرا مذاق اڑایا ہے۔ اب قسم اللہ کی خاموش نہیں رہنے کی۔ میں کہتی ہوں اللہ نے شکل کالی بنائی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اے پولیس والے! تم ہی بتا دو بھیا کالے تو اللہ میاں کے پیارے ہوتے ہیں۔ میری غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے یہاں۔"

"بب..... بب..... بخدا پتا نہیں کیوں حسینہ کے ساتھ حسینہ عالم نکل جاتا ہے۔ معافی چاہتے ہیں آپ سے عزیزہ۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔"

انسپکٹر نے لاش کا معائنہ کیا۔ پھر بولا۔

"میرا خیال ہے ایس پی صاحب کو اطلاع دے دی جائے۔ انہیں اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ انہیں موقع واردات کا معائنہ نہیں کروایا جاتا۔ ورنہ ان کے خیال کے مطابق کوئی نہ کوئی نشان موقع واردات پر مل ہی جاتا ہے اور سنیے آپ کا نام کیا ہے؟"

"احقر کو صوفی کہتے ہیں۔"

"صوفی صاحب براہ کرم کسی چیز کو نہ چھوئیں، پولیس آپ کے گھر کی تلاشی بھی لے گی۔"

"ہمیں اعتراض نہیں ہے، بزرگوں کی دعاؤں سے۔" انسپکٹر نے ٹھنڈی سانس لی اور موبائل فون

پر اپنے افسر اعلیٰ سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ صوفی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"حسینہ نے کہا، چائے یا کافی بنا کر لاؤں۔"

"پولیس والوں سے ایسا مذاق نہیں کرتے۔" صوفی نے فوراً ہی حسینہ کو منع کر دیا۔ انسپکٹر نے تیکھی نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھا۔ کچھ بولا نہیں۔ معشوق نشیلے نے کہا۔

"میں جاؤں۔"

"ہتھکڑیاں لگوا دوں تمہارے ہاتھوں میں۔"

"جج..... جی..... کک..... کیوں؟"

"جاؤں..... جاؤں جو لگا رکھی ہے آپ نے۔"

"وہ کچھ اشعار تڑپ رہے ہیں سینے میں۔"

"ڈنڈے مار کر انہیں باہر نکال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"صوفی صاحب آپ اس قدر بے اختیار ہو گئے ہیں یہ صاحب مسلسل ڈنڈے اور ہتھکڑی کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے تمام عہدے ختم ہو گئے۔" صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جیب میں پانوں کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔

"ایک منٹ..... ایک منٹ۔ تلاشی لو ان کی جیبوں کی۔" انسپکٹر نے کہا اور پھر ریوالور صوفی کی سمت اٹھا کر بولا۔ "ہاتھ بلند کر دیجیے۔"

"غلطی فرما رہے ہیں آپ، لیکن فرما لیجیے آپ کی عمر ہی ایسی ہے درویشوں کے کرم سے۔"

اے۔ ایس۔ آئی نے پانوں کی ڈبیا، چھالیا، تمباکو کا ہٹوا اٹھا کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔

"اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

"میاں تین سو چھتیس روپے وہ کیا ہے آپ کے جیب میں منتقل ہو گئے؟"

"نہیں وہ تمہاری ہی جیب میں ہیں۔" اے ایس آئی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھ لیں۔" صوفی نے انسپکٹر سے اجازت لی اور انسپکٹر اسے گھورنے لگا۔ صوفی نے سامنے کی جیب میں رکھے ہوئے پیسوں سے اندازہ لگایا اور پھر بولا۔

"درویش آپ پر رحم کریں۔ بے حد شکریہ۔ غریب آدمی ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"غریب اسی لیے ہیں کہ کچھ نہیں کرتے۔"

"آپ نے کہا کہ آپ کو اس مکان میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا؟"

"جی ہاں۔ ایک دوسرے محلے میں رہتے تھے۔ نشیلے میرا مطلب معشوق نشیلے ہمارے پرانے پڑوسیوں میں سے ہیں اور مجھ سے ملنے آئے تھے۔"

"کیا کہلاتا ہے وہ علاقہ۔"

"ستارہ لائن کہلاتی ہے وہ جگہ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اب یہ ستارہ کون تھیں کم از کم پچاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے لے کر اسی سال تک کے رہنے والے یہ نہیں بتا سکتے کیونکہ ستارہ لائن ان کی پیدائش سے پہلے عالم وجود میں آ چکی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔" انسپکٹر نے برا سا منہ بنایا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک اور جیپ وہاں پر پہنچی اور اس سے جو شخصیت اتری اسے دیکھ کر صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ یہ ایس پی جمشید مرزا تھے۔ انسپکٹر نے زوردار سلیوٹ کیا۔ جمشید مرزا نے اسے دیکھا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ صوفی پر پڑی وہ اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"اخاہ صوفی صاحب کیسے مزاج ہیں؟"

"چشم ما روشن دل ما شاد۔ اپنے گھر میں قدم رنجہ فرمائی کا از حد شکر گزار ہوں۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ آپ اس طرح تشریف لائے اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلیے۔ حسینہ ڈرائنگ روم کھول دیجیے۔"

"ایک منٹ ایک منٹ صوفی صاحب۔ کیا بات ہے انسپکٹر تم نے کس لاش....." ایس پی کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس کی نگاہ پر لاش پڑی تھی۔ پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر لاش کے قریب آیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"قتل۔"

"کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔"

"کتنی دیر پہلے یہ قتل کیا گیا۔"

"جناب کل وقفہ ستائیس اٹھائیس منٹ کا ہے۔"

"تفصیل بتاؤ۔"

انسپکٹر نے مختصر سی تفصیل بتا دی تھی۔

"اور آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"ان کا کہنا ہے کہ یہ گھر انہی کا ہے۔ یہ کارڈ ان کے پاس بھجوایا گیا تھا۔ یہاں پر اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"اے پولیس بھیا میری بات سنو، ملازمہ نہیں ہوں میں ان کی وہ ہوں وہ..... وہ جو کہتے ہیں ناں۔"

"منگیتر۔" جمشید مرزا مذاق کے موڈ میں آ گئے۔"

"جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر۔ منگیتر ہوں گی میں تمہاری، اس لم ڈھینگ کی، معاف کیجیے گا کیوں زبان گندی کرا رہے ہیں آپ لوگ۔ میں کہتی ہوں....." حسینہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور صوفی نے کہا۔

"اس سلسلے میں میری معلومات ناقص ہیں کہ محکمہ پولیس کے لوگ ہر جگہ ہر طرح کا مذاق کر سکتے ہیں۔"

"اور اب آپ یہ شکایت لے کر وزیر داخلہ کے پاس چلے جائیں گے، جو آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔" انسپکٹر ان الفاظ پر چونکا تھا۔ ایس پی نے ہدایت کی۔

"جملہ کارروائیاں کریں اور لاش اسپتال پہنچوا دیں۔ مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ درکار ہے۔ یہ کارڈ مجھے دیجیے۔" اس نے انسپکٹر سے کہا اور انسپکٹر نے کارڈ ایس پی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"ایس ایس سجادی۔ بی ٹیمپل روڈ۔ میرا خیال ہے ہمیں فوری کارروائی کرنی چاہیے۔ ٹیلی فون وغیرہ پر اطلاع دینا مناسب نہیں ہے۔ ہم خود ہی چلتے ہیں۔ صوفی صاحب آپ کو بھی ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔ ایک سوال کا جواب مجھے دیجیے۔"

"جی..... جی..... ارشاد..... ارشاد۔"

"آپ کہتے ہیں کہ آپ اس شخص کو نہیں جانتے جس کی لاش آپ کے دروازے پر پڑی پائی گئی ہے۔"

"جی ہاں، ساری تفصیل آپ سے عرض کر چکے ہیں۔ مرحوم ہم سے ملنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ دل کا عارضہ ہوا اور قلب نے حرکت کرنا بند کر دی ہو۔ پھر یہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چل جائے گا۔"

"جی..... جی..... جی کیا خیال ہے آپ کا اس سلسلے میں آپ ہمارے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے یا ہماری کوئی اور شکایت وزیر داخلہ تک پہنچ جائے گی۔"

"آپ جو حکم فرمائیں۔"

"تو پھر لباس وغیرہ تبدیل کر لیجیے۔ تھوڑی سی تفتیش میں آپ کی قربت ویسے بھی ہمارے لیے ضروری ہے اور یوں بھی آپ محکمہ پولیس میں ایک بڑے آفیسر رہ چکے ہیں۔" انسپکٹر ایک بار پھر چونکا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا تھا لیکن ایس پی کے انداز میں تھوڑا سا طنز محسوس کر کے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

♥.....♥.....♥

صوفی کو دلچسپی تو خیر تھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ایس ایس سجادی اس سے کیوں ملنے آیا تھا۔ اس کی تفصیل اگر جمشید مرزا کے ساتھ جا کر حاصل ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ جمشید مرزا کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ صوفی کے ساتھ مفاہمت بھی کر رہا ہو اور سختی بھی کہ اگر صوفی نہ جائے تو وہ اسے زبردستی لے جائے۔ ویسے بھی تھوڑے بہت فرائض ضرور تھے۔ لباس تبدیل کیا اور باہر آ کر جمشید مرزا کی کار میں بیٹھ گیا۔

"ٹیمپل روڈ۔" جمشید مرزا نے اپنے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ سے کچھ ایسے حالات میں ملاقات ہوئی صوفی صاحب کہ ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ہم دوستی کریں یا دشمنی؟"

"درویش آپ پر رحم کریں۔ دشمنی سے کچھ حاصل تو نہیں ہوتا اگر آپ کو حاصل ہوتا ہے تو ضرور حاصل کیجیے گا۔"

"مجھے اپنے بھتیجے کے قاتلوں کا پتا چلانا ہے۔ راجا ناصر کی موت ہم اہل خاندان آسانی سے فراموش نہیں کر سکتے۔"

"ویسے آپ کی ذمے داری بھی ہے کہ قاتلوں کا پتا چلائیں۔ محکمہ پولیس میں رہنے کا فائدہ ہی کیا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہ درویش آپ کے سر پر کہاں سے سوار ہو گئے ہیں۔ ہر جملہ آپ کا اسی جگہ ختم ہوتا ہے۔"

"یہ آپ نہیں سمجھ پائیں گے اور جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اس کے پیچھے اس طرح نہ پڑا کریں۔"

"اس طرح تو تفتیش کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''درویشوں کے بارے میں کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقل اور دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''بہت خوب واقعی شاہ میر خاں صاحب نے آپ کو بڑے اختیارات دے دیے ہیں کہ آپ مجھ جیسے سینئر پولیس آفیسر کو عقل اور دانش کا مشورہ دیتے ہیں۔'' صوفی چند لمحات خاموش رہا پھر بولا۔

''بات دراصل وہی ہے۔ آپ ہر جگہ پولیس کا انداز اختیار کرتے ہیں چنانچہ آپ بھلا کیا دوستیاں قائم کریں گے۔'' صوفی نے بدستور نئے انداز کے مطابق کہا اور بڑی سنگین صورت حال پیدا ہوگئی۔ ایس پی کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے، لیکن بہر حال اس نے سنبھال لیا۔ بی ٹیمپل روڈ پہنچ کر کوٹھی نمبر 27 تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں آئی، البتہ یہ کوٹھی سب سے الگ تھی۔ دوسری عمارتوں سے تقریباً دو تین فرلانگ کے فاصلے پر، درمیانی جگہ پر بے ترتیب درخت پھیلے ہوئے تھے۔ پرانی اور مرمت طلب کوٹھی تھی۔ بیرونی گیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ ایس پی کے اشارے پر جیپ کمپاؤنڈ میں جا کر رکی۔ سالہا سال سے دروازوں پر سفیدی نہیں کی گئی تھی۔ کمپاؤنڈ میں چاروں طرف ویرانی نظر آئی۔ بے ترتیب درختوں نے کمپاؤنڈ کو جنگل بنا رکھا تھا۔ ایس پی اور صوفی نیچے اتر آئے اور پھر وہ ایک ناہموار روش سے گزرتے ہوئے پورچ تک پہنچے۔ کچھ لمحے وہاں رک کر ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر ایس۔ پی نے برآمدے میں جا کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر سے گھنٹی کی آواز آئی لیکن خاصے انتظار کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔

''لگتا ہے اندر کوئی نہیں ہے۔'' صوفی نے کہا اور ایس پی نے دروازے پر دباؤ ڈالا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔

''دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس کا مقصد ہے کوٹھی اندر سے خالی نہیں ہے۔'' ایس پی بولا اور ایک بار پھر اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اس بار اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک وحشت زدہ بوڑھا نظر آیا جو سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''سجادی صاحب یہیں رہتے ہیں۔'' جمشید مرزا نے سوال کیا، لیکن بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

''تم نے سنا نہیں کیا۔ سجادی صاحب یہیں رہتے ہیں؟''

''گونگا معلوم ہوتا ہے؟''

''اوہو۔ ہوسکتا ہے۔ پھر اب کیا کریں؟''

''وہ کارڈ آپ کے پاس موجود ہے۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''ایں..... ہاں، ہے۔ ایس پی جمشید مرزا نے جیب سے کارڈ نکال لیا۔ صوفی نے وہ کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور بوڑھے کے سامنے کرتے ہوئے اسے اشارہ کیا، لیکن بوڑھے نے ہاتھ کی جنبش سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

''ایس پی سخت غصے میں آ گیا تھا۔ وہ دروازے پر لات مارنے ہی والا تھا کہ صوفی نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیے اور بولا۔

''نہیں بے کار ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے۔''

''تمہارا مطلب ہے غیر قانونی طریقے سے اندر داخل ہوا جائے۔''

''تو آپ قانون کی چکی چلائیے درویشوں کی دعاؤں سے۔ میں چلتا ہوں۔''

''صوفی صاحب ہوش و حواس قائم رکھیے۔''

''تو پھر آیئے۔'' صوفی نے کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ بہر حال وہ عمارت کے گرد چکر لگانے لگے۔ ایک اور دروازہ نظر آیا جو عمارت میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ صوفی ہی نے یہ دروازہ دریافت کیا تھا۔ چنانچہ وہ داخل ہوگئے۔ سامنے ہی ایک طویل راہ داری بنی ہوئی تھی جس کے دونوں اطراف میں کمرے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس بوڑھے کے علاوہ عمارت میں کوئی اور موجود نہیں ہے پھر وہ آگے بڑھتے رہے اور کمروں میں گھس گھس کر دیکھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں صفائی کا تصور بھی نہ کیا جاتا ہو۔ ہر چیز پر گرد کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آخر کار وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچے جہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے اسٹول نظر آئے۔ ان پر مختلف چھوٹے چھوٹے پتھروں کے نمونے رکھے ہوئے تھے اور اس سے ایس ایس سجادی کی مصروفیات کا پتا چلتا تھا۔ پھر انہوں نے ایک خوب صورت مجسمہ دیکھا جو پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا تھا اور کسی حسین عورت کا تھا لیکن اس کے دونوں بازو ٹوٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر جگہ جگہ گندگی مل دی گئی تھی۔ برہنہ بدن پر ٹوٹ پھوٹ کے بہت سے نشان تھے۔ پاس ہی ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا جس میں پلاسٹر آف پیرس لگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک ہنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے اس سارے منظر کو دیکھنے لگے۔ جمشید مرزا بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ اس نے جھک کر مجسمے کو دیکھا ٹوٹی ہوئی جگہوں پر انگلی لگائی تو پلاسٹر آف پیرس صاف نظر آنے لگا۔

''مجسمہ زیادہ پرانا نہیں ہے اور ہنٹر اور ڈنڈے سے صاف پتا چلتا ہے کہ کوئی اسے پیٹ پیٹ کر توڑتا رہا ہے۔''

''اسی لیے کہتے ہیں کہ عورت سے بچا جائے۔ درویش رحم کریں۔''

''آپ کی الٹی سیدھی باتیں بس یوں سمجھ لیجیے برداشت کر رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ شاہ میر صاحب نے آپ کو زندگی بھر کا تحفظ دے رکھا ہے۔''

''کوئی گستاخی ہوگئی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے گستاخی تو نہیں ہوتی لیکن درویشوں کی بددعاؤں سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ میں آپ کو اپنا استادِ محترم بنا کر یہاں لایا ہوں۔ آپ پولیس کی تحویل میں ہیں کیونکہ آپ کے گھر سے ایک لاش دستیاب ہوئی ہے۔''

''میں درویشوں سے آپ کے لیے بھی دعا گو ہوں۔ حق اللہ۔'' صوفی نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایس پی جمشید مرزا پر رحم کھا رہا ہو۔ جمشید مرزا نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ صوفی کا انداز غصہ دلانے والا تھا لیکن اس نے بھی غالباً صبر کیا۔ موجودہ صورت حال نے اسے اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ وہ ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔

''آیئے۔''

''شکر ہے آپ کو یہاں سے باہر نکلنے کا خیال تو آیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس وقت بولیے جب میں آپ کو مخاطب کروں۔ سمجھے! مجھے غصہ نہ دلائیے۔''

''بب..... بہت بہتر..... ویسے آپ کا کیا خیال ہے یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ، ڈنڈا اور ہنٹر کسی دلچسپ کہانی کی طرف متوجہ نہیں کرتا۔''

''ایس۔ ایس سجادی کا ذریعہ معاش کیا تھا اس کا پتا چلنا چاہیے۔'' ایس پی نے بے اختیار کہا۔ پھر اس طرح چونک پڑا جیسے غلطی ہوگئی ہو۔ وہ دروازے سے باہر نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ کچھ آہٹیں سنائی دیں اور چند لمحوں کے بعد وہی گونگا ملازم اندر آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے حلق سے بے معنی آوازیں نکالیں اور ہاتھ نچانے لگا۔ یہ مقصد تھا کہ یہ لوگ اس طرح کیوں اندر گھس آئے اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''بکواس بند کرو اور ہمارے ساتھ ساتھ آؤ۔'' پتا نہیں وہ گونگے کے ساتھ بہرہ بھی تھا یا نہیں لیکن وہ ان کے پاس رک گیا تھا۔ صوفی نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور پھر جیبوں میں پان کی ڈبیا اور بٹوا تلاش کرنے لگا۔ پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''آپ لوگوں نے میرا اسلحہ اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ کیا وہ آپ کی جیب میں موجود ہے؟''

''اسلحہ.....؟'' جمشید مرزا نے چونک کر کہا۔

''جی ہاں آپ کا انداز تو یہی تھا جیسے وہ اسلحہ ہو۔ میری مراد پانوں کی ڈبیا اور چھالیہ تمباکو کے بٹوے سے ہے۔''

''اس وقت آپ پولیس کی تحویل میں ہیں اس لیے فضول باتوں سے گریز کیجیے گا۔ آیئے۔ ایس پی اس کمرے سے باہر نکل آیا، لیکن صوفی کو اس وقت غصہ آ گیا تھا۔ ایس پی کے ساتھ احمقانہ انداز میں اس عمارت کا جائزہ لینا بے معنی تھا۔ گونگے ملازم کو بھی جمشید مرزا نے اپنے ساتھ لے رکھا تھا۔ پھر جمشید مرزا گونگا ملازم ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ صوفی جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے صوفی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور خود وہاں سے دوڑ لگا دی لیکن وہ احمق نہیں تھا۔ عمارت کے باہر پولیس کی جیپ موجود تھی۔ کانسٹیبل بھی تھے۔ ایس پی کے پاس موبائل بھی تھا چنانچہ باہر نکلنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اس لیے وہ وہاں سے دوڑا اور پھر تی سے آگے بڑھتا ہوا کافی فاصلے پر نکل آیا۔ پھر ایک کمرے کی دو چھتی اس کی آرام گاہ بنی۔ دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صوفی نے ایک جمائی لی اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''یہ بٹوا اور ڈبیا کہیں داغ مفارقت نہ دے جائیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

♥.....♥.....♥

دل و دماغ میں جو تبدیلی آئی تھی۔ اس کا پس منظر رابعہ سلطان کی موت بھی تھی۔ جس انداز میں صوفی نے رابعہ سلطان کی موت کا بدلہ لیا تھا وہ اس کی فطرت کے بالکل خلاف بات تھی، لیکن راجہ ناصر نے اسے اس کے لیے مجبور کر دیا تھا اور پتا نہیں دل کی کون سی گہرائیاں متاثر ہوگئی تھیں۔ بہر حال یہ جگہ اس کے لیے خاصی بہتر ثابت ہوئی۔ آوازیں ہی سنتا تھا اور پھر یہ آوازیں بند ہوگئیں۔ غالباً ایس پی نے یہ سوچا تھا کہ

وہ کسی راستے سے نکل گیا ہے۔ ایس پی کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ یقینی طور پر موبائل فون پر اس نے باہر لوگوں سے رابطہ قائم کیا ہوگا اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا ہوگا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں تو آ ہی رہی تھیں۔ صوفی کو جب مکمل طور پر اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ جمشید مرزا جا چکا ہے تو وہ نیچے اتر آیا اور انتہائی محتاط انداز میں قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا۔ جمشید مرزا بھی چالاکی کر سکتا تھا یہ بات اس کے ذہن میں آ سکتی تھی کہ ممکن ہے وہ یہیں موجود ہو، چنانچہ وہ خاموشی اختیار کر سکتا تھا اور اس طرح صوفی پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بہر طور نیچے اترنے کے بعد صوفی کو احساس ہوا کہ ایسی کوئی بات ہے نہیں، جمشید مرزا جا چکا ہے البتہ انتہائی محتاط انداز میں دروازے تک پہنچ کر اس نے یہ پتا ضرور لگا لیا کہ گھر کا دروازہ باہر سے سیل کر دیا گیا ہے لیکن کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ امکانات تھے اس بات کے، باہر پولیس کا پہرہ بھی بلکہ یقیناً ہونا چاہیے کیونکہ جمشید مرزا مذاق ہی مذاق میں ایس پی کے عہدے تک نہ پہنچ گیا ہوگا۔ وہ خود بھی ذہانت رکھتا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات انسان خود اپنی ذہانتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ صوفی نے یہ مکمل پلان کرنے کے بعد کہ نہ تو یہاں سے نکلنا مشکل ہے اور نہ اب اندر کسی کے آنے کے امکانات ہیں۔ ایس ایس سجادی کے گھر کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا حالانکہ اس بات کے نشانات صاف مل گئے تھے کہ جمشید مرزا نے بھی بھرپور طریقے سے تلاشی لی ہے اور کوئی جگہ چھوڑی نہیں ہے لیکن صوفی کی تلاشی لینے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ ایس ایس سجادی نے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ صوفی بڑی گہرائی سے سوچ رہا تھا۔ پھر ایک میز کی دراز سے اسے ایک ایسی چیز مل گئی جو کسی کے لیے کارآمد ہو یا نہ ہو لیکن صوفی کے لیے ضرور کارآمد تھی۔ یہ ایک سادہ کاغذ تھا جس کے ایک گوشے پر بس ایک نشان بنا ہوا تھا اور یہ نشان.....'' صوفی اسے دیکھ کر سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ وہ کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور مزید تلاشی لینے لگا لیکن اس کاغذ کے علاوہ اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اس کے لیے کارآمد ہوتی البتہ اس کے دماغ میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔

یہاں مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد کہ سجادی کے گھر میں کوئی اور چیز موجود نہیں ہے وہ اس راستے پر چل پڑا جس پر پہنچ کر بہ آسانی باہر نکلا جا سکتا تھا اور واقعی اسے باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی جبکہ مکان کے باہر پولیس کی ایک باقاعدہ موبائل کھڑی ہوئی تھی اور پولیس والے مستعد بھی تھے۔ صوفی بہت دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر ایک راستے پر مڑا ہی تھا کہ ایک سایہ برق رفتاری سے اس کی طرف جھپٹا اور صوفی ٹھٹک گیا۔ یہ ایک لحیم شحیم آدمی تھا جس کے ہاتھ میں اعشاریہ دو آٹھ کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کی نال صوفی کی پسلیوں سے لگا دی اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''گلی میں مڑ جاؤ چلو، شاباش۔ زندگی بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے۔'' صوفی نے اسے دیکھا اور بے اختیار اس کے دانت باہر نکل آئے۔

''اچھا چلیے۔'' اور پھر وہ سہما ہوا سا اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈر کے مارے جان نکلی جا رہی ہو۔

''تیز چلو۔'' لحیم شحیم شخص پھر غرایا اور ساتھ ہی ریوالور کی نال کا دباؤ بھی کچھ بڑھ گیا۔ صوفی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفتار تیز کر دی۔ وہ ایک پتلی سی گلی میں مڑے جو حد نظر تک سنسان تھی لیکن دفعتاً صوفی لڑکھڑایا۔ ایسا لگا جیسے ٹھوکر لگی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بدن کو بیلنس کیا لیکن ایک پاؤں پیچھے کی جانب مڑا اور ریوالور والے کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکل گئی۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ صوفی کا عمل مقابل سمجھ بھی نہیں پایا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ کے نیچے رکھ کر جھکا تو صوفی کی دوسری لات اس کی گردن پر پڑی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس نے بڑی مشاقی کے ساتھ اس شخص کے ریوالور پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ وہ منہ کھول کر چیخنے ہی والا تھا کہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پر تڑاخ سے پڑا اور اسے کراہنے اور چیخنے کا ہوش بھی نہ رہا۔ پیشانی زمین سے لگی تو پھر نہ اٹھ سکی۔ صوفی نے ادھر ادھر دیکھا۔ قرب و جوار میں اب بھی سناٹا تھا جو کچھ ہوا تھا یا تو اضطرابی حرکت تھی یا پھر صوفی یہ ہی چاہتا تھا کہ حملہ آور سے فوراً جان بچائے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے سیدھا کیا اور جامہ تلاشی لینے لگا۔ تین چار وزیٹنگ کارڈ نکلے جو ایک ہی نام کے تھے۔ اس کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کارڈ جیب میں رکھ لیے۔ نیچے گرا ہوا آدمی بے ہوش سڑک پر گرا ہوا تھا۔ صوفی تیزی سے ایک جانب مڑ گیا۔ سامنے کشادہ سڑک تھی۔ اس سڑک پر سے اچھا خاصا ٹریفک گزر رہا تھا اس نے ایک ٹیکسی روکی اور بولا۔

"چلو۔" ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے ٹیکسی ایک سینما ہاؤس کے سامنے رکوائی اور نیچے اتر کر ڈرائیور کو بل کی رقم ادا کر دی۔ تھوڑی دور تک پیدل چلتا رہا۔ بہت محتاط انداز میں وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ کوئی بھی اس پر نگاہ نہیں رکھے ہوئے ہے تو اس نے ایک اور ٹیکسی کی اور اس میں بیٹھ کر گرین ہاؤس کی جانب چل پڑا۔

♥.....♥.....♥

گرین ہاؤس کی مجلس مشاورت جمع تھی۔ گرین فورس کے پانچوں ممبر موجود تھے اور صوفی انہیں اب تک کی تمام صورت حال بتا چکا تھا۔ یہ تبدیلی صوفی میں بالکل نئی رونما ہوئی تھی۔ اب سے تھوڑے ہی عرصے پہلے وہ اپنی ذات میں محدود رہتا تھا جو کچھ بھی کرنا ہوتا خود ہی خاموشی کے ساتھ کر لیتا۔ کرنل رحیم شاہ تک سے اتنی گہری مشاورت نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف ضروری امور پر باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ رابعہ سلطان کی موت کے بعد یہ تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ رابعہ سلطان شاید اس کی زندگی کی واحد لڑکی تھی جس نے اس پر محبت بھری نگاہ ڈالی تھی اور صحیح معنوں میں صوفی پر قربان ہو گئی تھی۔ شازیہ نے فیضان اور عادل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"چھوٹے بابا کی فطرت میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے کیا تم میری اس بات پر یقین کر سکتے ہو کہ ایسا صرف رابعہ سلطان کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب میں نہیں جانتی کہ تم لوگوں نے اس بات پر گہری نگاہ ڈالی یا نہیں کہ رابعہ سلطان چھوٹے بابا سے متاثر تھی۔ چھوٹے بابا کی موجودہ کیفیت یہ بتاتی ہے۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل پر بھی ایک بوند ٹپکی تھی۔ بس ایک بوند اور اس کے بعد کم بخت راجہ ناصر نے دوسری بوند کا موقع ہی نہ دیا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹے بابا کے اندر لچک ہے۔ یعنی اگر ان سے کوئی محبت کرے، انہیں چاہے تو اس مٹی میں کونپلیں اگ سکتی ہیں۔"

"انسان تو انسان ہی ہوتا ہے شازیہ۔" عادل نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

بہر حال اس وقت صوفی ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ پان کی گلوری منہ میں بے شک دبی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

"جمشید مرزا نے اور کوئی حرکت کی یا نہ کی لیکن ہماری قدیم پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ وغیرہ لے گئے۔ اگر وہ ان کی تحویل میں ہے تو اس کی واپسی کے لیے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ یعنی وہ چیزیں انہیں واپس کرنا پڑیں گی۔ اگر انہوں نے اسے ضائع کر دیا ہے تو پھر صوفی جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔"

"عارضی طور پر آپ....."

"نہیں.....نہیں، بہت سے کام عارضی نہیں ہوا کرتے درویشوں کی دعاؤں سے۔ خیر چھوڑو۔ ہم غیر ضروری باتوں میں الجھ گئے ہیں۔ میں تمہیں شارمن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس وقت کی بات ہے جب میں باقاعدہ محکمہ پولیس میں تھا۔ ٹکراؤ ہو گیا تھا اس سے، جو کچھ کرنے آیا تھا اسے چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور اتفاق کی بات یہ کہ اس کی محبوبہ میرے ہاتھ لگ گئی۔ بڑی عجیب عورت تھی۔ ہم اسے کوئی بڑا نقصان نہ پہنچاتے مگر اس نے خودکشی کر لی۔ لو بیتا اس کا نام تھا۔ نسلاً اسکوپ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شارمن کے دل میں میرے لیے انتقام کا جذبہ ضرور ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔ میرے ذہن میں یہ بات آ رہی ہے کہ ایس ایس سجادی کا میرے گھر کے دروازے کے آگے آ کر مرنا....."

"بدقسمتی سے ہمیں ایس ایس سجادی کے پروفیشن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ ڈیوٹی میں فیضان کے سپرد کر رہا ہوں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ ایس ایس سجادی کا ماضی تلاش کرو۔"

"ٹھیک ہے چھوٹے بابا۔ میں کام شروع کیے دیتا ہوں، لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔"

"کیا؟"

"اگر یہ کام باقاعدہ سازش کے تحت ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شارمن کو آپ کی نئی رہائش گاہ کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔" صوفی نے گدھ کی طرح گردن ہلائی اور بولا۔

"بڑی معمولی سی بات کہی ہے تم نے۔"

"نہیں۔ معمولی بات اس خیال سے نہیں ہے چھوٹے بابا کہ بڑے بابا نے یہ عمارت آپ کی رہائش کے لیے حاصل کی ہے اور آپ کی رہائش کو بہر طور خفیہ رکھا جانا تھا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔"

"مطلب۔"

"مجھے اس کی ہدایت دے دی گئی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس عمارت کو نمایاں رکھنا تھا تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ میں اس عمارت میں مقیم ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کرنل صاحب اب مجھے ایک باقاعدہ حیثیت دے رہے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ یہ بات تو میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ وزیر داخلہ ہماری پشت پر ہیں اور شاہ میر صاحب ہمارے ہر مسئلے میں ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اصل میں کرنل صاحب گرین ہاؤس کو خاص طور سے دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہی اس عمارت میں قیام کا مقصد ہے۔ وہ لوگ صوفی کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ شازیہ نے کہا۔

''ساری باتیں اپنی جگہ لیکن چھوٹے بابا ہوشیار ہونا ضروری ہے خاص طور پر میری رائے ہے کہ آپ کے آس پاس ہم لوگ خفیہ طور پر موجود رہیں۔'' صوفی کے ہونٹوں پر باریک سی مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے کہا۔

''نہیں، میرے اردگرد درویشوں کی دعائیں ہیں، ولیوں کا پہرہ ہے، میں اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہوں۔ تم لوگ میرے بارے میں فکرمند نہ ہو۔''

''جمشید مرزا کا مسئلہ کیا ہوگا؟''

''نہیں۔ کچھ نہیں۔ ایسے لوگوں کا اردگرد رہنا مناسب ہوتا ہے۔'' دلاور کی بیوی نے آ کر اطلاع دی کہ کرنل صاحب سردار پور سے آ گئے ہیں۔ سب نے باہر نکل کر کرنل کا استقبال کیا تھا۔ کرنل مسکراتا ہوا اپنی بیساکھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھا۔

''واہ گرین فورس پوری پاور میں ہے اس وقت۔ کوئی خاص بات۔''

''جی۔'' ڈرائنگ روم کے اس مخصوص حصے میں بیٹھ کر جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میٹنگ ہو رہی تھی۔ کرنل کو بھی ساری تفصیلات بتائی گئیں۔

''مجھے خاصی حد تک اس بارے میں معلومات حاصل ہیں لیکن صوفی صاحب اس شارمن کے بارے میں مجھے تفصیلات کا علم نہیں ہے۔''

''اسرائیلی ایجنٹ ہے۔ ایک بار پہلے بھی یہاں کسی مذموم مقصد کے تحت آیا تھا، لیکن درویشوں کی دعاؤں سے میری نگاہوں میں آ گیا۔ خوب چلی میرے اور اس کے درمیان۔ بھاگنا پڑا اسے، مگر اس کی محبوبہ ہمارے ہاتھ آ گئی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس نے خودکشی کر لی ورنہ اس سے خاصی اچھی معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔''

''لازمی بات ہے کہ اس کے ذہن میں انتقام کا جذبہ بھی ہوگا۔'' کرنل نے لقمہ دیا۔

''اگر سچ مچ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو یہ جذبہ ہونا چاہیے۔'' کرنل رحیم شاہ نے چونک کر صوفی کو دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاں صوفی صاحب ہونا تو چاہیے لیکن سب آپ کی طرح جواں مرد نہیں ہوتے۔ صوفی اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر تک یہ مجلس رہی۔ جمشید مرزا کا تذکرہ ایک بار پھر آ گیا۔ کرنل نے کہا۔

''اور تم اسے ایس ایس سجادی کے گھر میں بند کر آئے تھے۔''

''جی ضروری تھا۔''

''کس طرح کا آدمی ہے۔''

''اب میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرح کا آدمی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں شاہ میر صاحب سے کہہ کر کوئی مناسب کام کرا دیتا ہوں یعنی شاہ میر خاں

صاحب ان کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔''

''نہیں شاہ میر خان صاحب کو ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔''

''لیکن وہ تمہارے راستے روکے گا صوفی۔''

''درویشوں کا کرم چاہیے جناب یہ بہت اچھی بات ہے کہ تھوڑی سی ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ باقی سب ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں۔''

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔''

''ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ شارمن نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک دلچسپ لیکن ایک خطرناک بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ شارمن یارود کا ماہر ہے اور مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جو پچھلے دنوں تخریبی کارروائیاں ہوئی ہیں یعنی مختلف جگہوں پر دھماکے اور تباہی۔ اس میں شارمن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ تخریبی قوتیں ہر قیمت پر ہمارے ملک میں انتشار چاہتی ہیں اس کے لیے کچھ نام مخصوص ہیں۔ بہرحال اگر شارمن یہاں کسی ایسے مذموم مقصد کے لیے آیا ہے تو یہ اس کی زندگی کا آخری سفر ہوگا درویشوں کے کرم سے۔'' آپ اطمینان رکھیں۔''

''مجھے اطمینان ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

♥.....♥.....♥

جمشید مرزا اپنے طرز کی واحد ہی شخصیت تھی۔ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا آدمی۔ وہ ایک زمانے میں محکمہ پولیس میں براہِ راست ڈی ایس پی بھرتی ہوا تھا اور اس بھرتی ہونے کی وجہ ایک بہت بڑی شخصیت کی سفارش تھی، لیکن کبھی کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا تھا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ کوئی بڑا کام کر ڈالے لیکن ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ ڈی ایس پی سے ایس پی بننے کا راز بھی بڑا دلچسپ تھا۔ محکماتی طور پر کچھ لوگوں کو ترقیاں دی گئی تھیں اور وہیں ایک بدنصیب افسر کا نام تبدیل ہو گیا اور یہ ترقی جمشید مرزا کو مل گئی۔ خوش پوش آدمی تھا۔ اصل میں ساری کامیابی کا سہرا بیگم صاحبہ کے سر تھا، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ عہدہ سسرال کی عنایت تھا اور بیگم صاحبہ جہیز میں لے کر آئی تھیں، ورنہ بے چارے جمشید مرزا بہ ذات خود کچھ نہیں تھے۔ اس حساب سے بیگم ان کی شخصیت پر حاوی تھیں۔

حد سے زیادہ اداکاری کے شوقین تھے اور اپنے آپ کو ایک انتہائی مستعد اور قابل فخر پولیس والا سمجھتے تھے لیکن بیگم کے سامنے تو بڑے بڑے سورما بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ جمشید مرزا تو بھیگے چوہے تھے بلی تو بڑی چیز ہوتی ہے۔ گھر میں ملازم تھے لیکن جمشید مرزا بہ ذات خود بیوی کے ملازم تھے۔ دنیا کے سامنے کی بات اور تھی لیکن جب دنیا کے سامنے نہ ہوتے تو بیوی کے حضور دست بستہ کھڑے رہا کرتے تھے۔ طبیعت میں تنوع تھا اور خاص طور سے اپنے ماتحتوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت بلند ظاہر کرنے کے خواہش مند، لیکن صوفی جو کام دکھا گیا تھا وہ ان کے منہ پر بڑی گہری کالک بن گیا تھا۔ ایک ایسا آدمی جس کی بہ قول جمشید مرزا کے کوئی بھی سیدھی کل نہیں تھی اور انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''یار یہ شخص آدمی بھی ہے یا نہیں؟ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اونٹ ہزار سال کا ہونے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی جون بدلنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔'' اپنی دانست میں انہوں نے بہت دلچسپ جملہ کہا تھا اور انسپکٹر رازی جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا، بڑی مشکل سے ہنسنے میں کامیاب ہوا تھا، کیونکہ جمشید مرزا یہی چاہتے تھے۔ لیکن بہرحال انسپکٹر رازی کے سامنے صوفی ان لوگوں کو کمرے میں بند کر گیا تھا اور جمشید مرزا غصے کی شدت سے دیوانے ہو گئے تھے۔ موبائل فون پر انہوں نے باہر کھڑے اسٹاف سے رابطہ قائم کیا اور دو ایس آئی اندر آئے اور انہوں نے دروازہ کھول کر جمشید مرزا کو آزاد کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی شامت آ گئی۔ جمشید مرزا معلومات حاصل کر رہے تھے کہ صوفی کدھر سے باہر نکلا۔ کوٹھی کی سرسری تلاشی ضرور لی گئی تھی لیکن اتنی عقل کسی کو نہیں آئی تھی کہ وہیں صوفی کو تلاش کر لیتے جبکہ یہ بات سب کو بتا دی گئی تھی کہ وہ گیٹ سے باہر نہیں نکلا ہے۔ بہرحال ایس ایس سجادی کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی تھی اور وہاں اس کے بارے میں سرسری سی تحقیقات ہو رہی تھیں جو ایسے موقع پر ہوا کرتی ہیں۔

جمشید مرزا انسپکٹر رازی کے ساتھ تھانے آ گئے تھے اور سخت غصے کے عالم میں تھے۔

''اس شخص کے بارے میں مجھے تفصیلی رپورٹ درکار ہے۔ اس کی پہنچ محکمہ، داخلہ تک کیسے ہے۔ ماضی میں یہ کیا کرتا رہا ہے، یہ نہیں جانتا کہ اس نے بھیڑیوں کی بھٹ میں گھسنے کی کوشش کی ہے اس کے تمام کل پرزے الگ کر کے نہ رکھ دوں تو جمشید نام نہیں ہے۔'' انسپکٹر رازی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

''جرات دیکھیے جناب سیدھا سیدھا چونا لگا گیا۔''

''چلو دیکھوں گا جو کچھ ہوا ہے دیکھوں گا۔ تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں تم اس کا ماضی معلوم کرنے کی کوشش کرو۔''

''تھوڑا بہت تو مجھے معلوم ہے جناب۔'' انسپکٹر رازی نے کہا اور جمشید مرزا خوں خوار نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''احمقانہ باتیں، احمقانہ باتیں میں کہتا ہوں کہ سارے جہاں کے احمق میرے ہی نصیب میں لکھے گئے ہیں۔ یہی بتاؤ گے نا تم مجھے کہ ماضی وہ انسپکٹر رہ چکا ہے اور شاید یہ بھی تیر مارو گے تم مجھے بتانے کے لیے کہ وہ ایک نااہل پولیس انسپکٹر رہا ہے اور جس نے زندگی میں کبھی کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور نتیجے میں بار بار اسے محکمے سے نکالا جاتا رہا ہے۔''

''جی سر بالکل بالکل آپ تو واقعی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔'' انسپکٹر رازی نے مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

''اتنی معلومات بھی انسان کو نہ ہوں تو لعنت ہے اس پر۔''

''جی سر بالکل۔'' انسپکٹر رازی بولا اور جمشید مرزا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن انسپکٹر کے چہرے پر عقیدت مندانہ آثار تھے۔ چنانچہ جمشید مرزا مطمئن ہو گیا کہ اس کا مذاق نہیں اڑایا جا رہا اور اس نے کہا۔

''مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کا بیک گراؤنڈ معلوم کیا جائے۔ آخر وہ وزارت داخلہ تک کیسے پہنچ گیا۔''

''سر ایک بات ہے۔ وہ جو کچھ کر گیا اس کا ثبوت تو ہم نہیں دے سکیں گے۔ آپ یہ بتایئے کہ اس کے خلاف کیا کریں گے؟''

''میں.....'' تم وہ سوچ بھی نہیں سکتے میں جو کچھ اس کے خلاف کروں گا۔ چلو تیاریاں کرو ہمیں اس کے گھر پر ریڈ کرنا ہے جائے گا کہاں بچ کر جو کرنا ہے وہ کر لیں گے سفارشیں تو بعد میں آتی رہیں گی۔''

''جی سر، کیا کرنا ہے مجھے۔'' انسپکٹر رازی نے سوال کیا۔

''پولیس پارٹی تیار کرو ہم اس کے گھر پر چھاپا ماریں گے۔'' جمشید مرزا خود بھی تھوڑا سا انتہا پسند تھا۔ پولیس کی تین موبائلوں نے انسپکٹر صوفی کی اس نئی رہائش گاہ کو گھیر لیا تھا جو کرنل رحیم شاہ نے اس کے لیے مہیا کی تھی۔ اس وقت حسینہ کے علاوہ کوٹھی میں کوئی موجود نہیں تھا۔ جمشید مرزا کی بیل پر حسینہ نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ جمشید مرزا کو دیکھ کر بولی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''پیچھے ہٹو۔''

''مرد کی اولاد ہوں، پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا۔ اس طرف ہوئی جاتی ہوں۔'' حسینہ نے کہا اور دائیں سمت ہو گئی۔ جمشید مرزا اسے گھورتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ پھر بولا۔

''صوفی سے ملنا ہے۔''

''بات کرنے کی تمیز ہے یا نہیں، تم سے عمر میں تھوڑا بہت ہی چھوٹا ہو تو ہو۔''

''بکواس کیوں کرتی ہو تم، جانتی ہو یہ وردی نہیں دیکھ رہیں۔''

''ارے جاؤ..... جاؤ بہت سی وردیاں دیکھی ہیں۔ میری نند کے سسر فوج میں بہت بڑے افسر تھے۔ وردی پہن کر آتے تھے۔ سارے ڈرتے تھے۔ میں نہیں ڈرتی تھی۔ اللہ کے فضل سے، ارے یہ کیا تم اندھے گھوڑے کی طرح اندر گھسے چلے آ رہے ہو، گھر میں گھسنے کی تمیز ہے تمہیں۔''

''بڑھیا مار کھائے گی کیا۔''

''مر گئے مارنے والے میری..... نند کے سسر۔''

''فوج میں تھے۔'' انسپکٹر رازی نے جلدی سے کہا۔

''ارے تجھے کیسے معلوم بیٹا۔'' حسینہ سے حیرت سے انسپکٹر رازی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بہت سے پولیس والے اندر چلے آئے تھے۔ جمشید مرزا نے کہا۔

''جاؤ اندر تلاشی لو'' اور پولیس والے اندر دوڑ گئے۔

''ارے..... ارے خدا تمہیں سمجھے دیکھو گھر کی کوئی چیز چوری ہو گئی تو حلق میں انگلی ڈال کر نکلوا لوں گی۔ ارے سمجھا کیا ہے تم لوگوں نے۔''

''بڑی بی شرافت کے ساتھ اندر آؤ۔''

''کون ہے تم میں سے شرافت؟ شکلوں سے تو سارے لفنگے لگ رہے ہو اللہ مارے۔'' حسینہ نے کہا اور جمشید مرزا کے ساتھ قدم بڑھا کے اندر آ گئی۔

''میں کہتی ہوں تمہیں کیا موت پڑی ہے کیوں آئے ہو یہاں۔''

''تم خاموش نہیں رہو گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہائے کسی کے باپ کا دیا کھاتی ہوں کیا؟ کیوں خاموش رہوں گی؟"

"اندر آؤ۔"

"آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔ دھمکی کیوں دے رہے ہو مرضی کی مالک ہوں اندر آؤں یا نہ آؤں۔" حسینہ نے کہا اور اندر داخل ہوگئی۔

"صوفی کہاں ہیں؟"

"ہیں کہا ہے نا تم نے، چلو اب بتائے دیتی ہوں، گئے ہوئے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

"پھر وہی حکم نہیں بیٹھوں گی۔" حسینہ نے کہا پولیس والے سارے گھر میں صوفی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔"

"چیزیں ٹٹول رہے ہوں گے۔ رپٹ لکھواؤں گی پولیس میں باقاعدہ تمہارے ہی آدمی تمہیں پکڑیں گے۔ کوئی چیز غائب ہوئی ہو ذرا دیکھو تو سہی بتاتی ہوں تمہیں اچھی طرح سے۔"

"نہیں کوئی کچھ نہیں اٹھائے گا آپ ہمیں بتائیے کہ صوفی صاحب کہاں گئے ہیں؟" رازی نے مصلحت سے کام لیا۔

"اے میاں! تم ذرا شریف زادے لگتے ہو، مجھے نہیں معلوم نوکری کرتی ہوں اس گھر میں، مالک کہیں بتا کر جاتے ہیں۔"

"ہوں۔" آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں معزز خاتون۔" انسپکٹر رازی نے کہا اور جمشید مرزا نے چونک کر رازی کو دیکھا۔ رازی نے عاجزی سے گردن ہلا دی تھی۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان معزز خاتون کو ہینڈل کرنے کا طریقہ اسے آتا ہے۔ براہ کرم اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ جمشید مرزا دانت پیستا ہوا خاموش ہوگیا۔

"جی آپ نے بتایا نہیں معزز خاتون؟"

"اے میاں کیا بتاؤں بس بڑا اچھا انسان ہے فرشتوں کی طرح معصوم۔ نوکرانی میں ہوں گھر کی، نوکر وہ میرا بنا ہوا ہے۔ سارے کام کرتا ہے۔ بس ذرا مزاج کا چڑچڑا ہوگیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں پہلے ایسا نہیں تھا۔"

"کرتا کیا ہے۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"تم تو بھیا بات ہی نہ کرو مجھ سے۔ تمہاری صورت دیکھ کر خون کھولتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی طویلے میں بندر ہے ہو آج تک انسانوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔" جمشید مرزا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ رازی بہ مشکل تمام مسکراہٹیں روک رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں تو صوفی صاحب کے بارے میں آپ نے یہ نہیں بتایا خاتون کے وہ کیا کرتے ہیں۔"

"اے اگر وہ مجھے بتا دے تو میں تمہیں بتاتی ناں، بس باہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دو دفعہ میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگے کہ "بی بی اپنے کام سے کام رکھو۔ نوکروں کو زیادہ فضول باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"بھیا نوکر تو ہیں ناں۔ خاموش ہوگئے اپنا سامنہ لے کر۔ اللہ کسی پر یہ وقت نہ ڈالے۔" حسینہ کی آواز رندھ گئی۔ صوفی گھر میں نہیں ملا تھا۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"تلاشی لو۔"

"ارے ارے ارے..... یہ جب بھی بولے گا چھپر پھاڑ کر ہی بولے گا لے کر دیکھو تلاشی۔"

"نہیں معزز خاتون تلاشی لینا ضروری ہے۔ ہمیں اصل میں کچھ اطلاعات ملی ہیں صوفی صاحب کے بارے میں۔"

"کیا اطلاعات ملی ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟"

"یہی کہ وہ جرائم پیشہ ہیں اور غلط کام کرتے ہیں۔"

"آئے نہ..... نہ..... ایسا نہ..... ایسا مت کہو وہ..... اور..... غلط کام کرے گا۔" جمشید مرزا کو یہاں سے کچھ نہیں معلوم ہوا تھا۔ صوفی موجود نہیں تھا ورنہ شاید بات کوئی غلط رخ اختیار کر جاتی لیکن بدنصیبی اس وقت یہ تھی کہ معشوق نشیلے دروازہ کھلا دیکھ کر اندر گھس آئے تھے۔ پولیس والوں نے بھی انہیں نہیں روکا تھا۔ ہونق سے آگے بڑھ رہے تھے۔ احاطے میں بھی پولیس والے موجود تھے۔ حیران حیران سے اندر پہنچے تو دھر لیے گئے۔"

"اوہ..... ہو یہ بھی تھے یہ بھی صوفی صاحب کے ساتھی ہیں۔ ایس پی صاحب انسپکٹر رازی جو اس دن صوفی کے گھر آیا تھا۔ اس نے معشوق نشیلے کو بھی دیکھا تھا۔" معشوق نشیلے اس طرح اچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"نہیں..... نہیں..... ہاں..... ہاں..... کیا کیا۔"

"یہ آپ شاعری فرما رہے ہیں کیا؟ جمشید مرزا نے کہا۔

"ن..... نہیں۔ آپ کو..... شش..... شاعری سے دلچسپی ہے۔ ہم شاعر ہیں۔ نشیلے تخلص کرتے ہیں نام معشوق علی ہے۔"

"ہوں..... نشہ کرتے ہو تم۔"

"ن..... نہیں جناب تخلص کرتے ہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" جمشید مرزا نے سوال کیا۔

"ہوتا ہے سر شاعری میں ہوتا ہے۔"

"ایک شعر عرض ہے دھر چوں..... مہر چوں، مگر چوں خیال چوں۔"

"چوں چوں کے بچے منہ بند کر ایسا تھپڑ پڑے گا کہ منہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔"

"یہ داد دی ہے آپ نے ہم تو ٹیکنیکل شعر عرض کیا کرتے ہیں۔ اب دیکھیے ناں زمانہ حال میں یا زمانہ قدیم میں معشوق ہوا کرتے تھے۔ ہمارے جیسے نہیں، بلکہ عجیب عجیب۔ کسی کی کمر نہیں ہوتی تھی، کسی کی گردن کی جگہ صراحی لگی ہوتی تھی۔ نزاکتوں میں بے مثال تھے۔ انگلیاں ککڑیاں جیسی دباؤ تو ٹوٹ جائیں۔"

"اسے لے جا کر باہر گاڑی میں بٹھاؤ۔" جمشید مرزا نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ پیدل آئے ہیں پیدل ہی چلے جائیں گے۔" صوفی صاحب کے پاس آئے تھے۔

"بیٹھو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ ایک شعر عرض ہے اس سلسلے میں۔" جمشید مرزا نے غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"ایسے..... ایسے..... ایسے تو نہیں دماغ سے اتر گیا فوراً کے فوراً۔" ویسے مصرعہ بولا تھا۔ کھٹ پونیاں..... کھٹ پونیاں..... کھٹ پونیاں..... کھٹ کھٹ جمشید مرزا نے معشوق نشیلے کی گردن دبا دی تھی اور پھر معشوق نشیلے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جمشید مرزا نے اس کی گردن چھوڑی اور کہا۔

"لے جاؤ اسے یہاں سے، آج یہ میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔ تھانے میں پوچھ گچھ کریں گے اس سے۔"

"تھتھ..... تھتھ..... تھانہ۔ ارے باپ رے..... میں کہاں پھنس گیا۔ میں تو بس صوفی صاحب سے ملنے آیا تھا۔ دراصل کچھ پیسے درکار تھے۔ میری مدد کرتے ہیں وہ۔"

"لے چلو۔" جمشید مرزا دھاڑا اور پولیس والے معشوق نشیلے کو بازوؤں سے لٹکائے ہوئے باہر لے گئے۔ انہوں نے دونوں پاؤں سکیڑ لیے تھے۔

"کیا کہتے ہو؟"

"سر میرا خیال ہے۔ پولیس والوں کی ڈیوٹی لگا دیجیے وہ اطلاع دیں گے تو ہم یہاں آ جائیں گے۔"

"ہوں ٹھیک ہے"

"کہو، کیا اسے بھی لے چلیں؟"

♥.....♥.....♥

صوفی اندر داخل ہو گیا۔ حسینہ نے دروازہ کھولتے ہی آغاز کر دیا تھا۔

"وہ آئے تھے پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں۔ خوب توڑ پھوڑ مچائی۔ اے میں کہتی ہوں تمہارا کاروبار کیا ہے۔ آخر مجھ جیسی شریف زادی یہاں آ کر پھنس گئی۔ توبہ۔ توبہ۔ پولیس کے حملے ہوتے ہیں۔"

"پو..... پولیس کے حملے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"بکواس مت کرو بڑے کام کسی درویش کی دعا سے نہیں ہوتے۔ خود تم جیسے لوگ درویش بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ حلیہ جو تم نے بنا رکھا ہے ناں دنیا کو بے وقوف بنا لے تو بنا لے حسینہ بے وقوف نہیں بنے گی۔"

"حسینہ بے وقوف کہاں بنتی ہے مگر آپ ہمیں ذرا تفصیل تو بتائیں۔"

"جوتی بتائے میری تفصیل۔ گھس آئے کم بخت مارے، ذرا بھر میں، جیسے ابا نے کوٹھی خرید کر دی ہو۔ نہ جانے کیا کیا کچھ کیا اور پھر وہ آ گئے تمہارے لے پالک۔"

"لل..... لل..... لل..... لے پالک وہ کون ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"کہہ دیا ناں درویشوں کا تذکرہ میرے سامنے نہ کیا کرو۔ خود بھی گناہ گار ہوتے مجھے بھی گناہ گار

کرو گے۔ پتا نہیں کرنل صاحب نے کون سی دشمنی نکالی ہے۔ ملے تو کہوں گی کہ بھیا کسی مویشی خانے میں نوکری دلا دو یہاں سے نکال لو یہاں تو ایک ہی جانور نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔" حسینہ بکتی جھکتی رہی۔ صوفی اندر داخل ہو گیا۔ بہر حال پتا چل گیا تھا کہ جمشید مرزا نے پولیس کی نفری کے ساتھ یہاں پر تلاشی لی ہے۔ صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جمشید مرزا جو کچھ کر رہا ہے اس کا اسے شدید نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے لیکن صوفی کے اندر جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی وہ بالکل مختلف تھی۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ معشوق نشیلے کو تھانے لے جایا گیا ہے۔ بہر حال وہ سوچتا رہا پھر اس نے تھانے کا نمبر تلاش کر کے فون کیا۔

دوسری طرف اتفاق سے انسپکٹر رازی نے ہی فون اٹھایا تھا۔ اس کی آواز سنائی دی۔

"پولیس اسٹیشن۔"

"کون صاحب بول رہے ہیں۔"

"انسپکٹر رازی۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔"

"چلیے آپ ہی سہی، میں صوفی بول رہا ہوں۔"

"آہا۔ صوفی صاحب بڑے بہادر آدمی ہیں آپ۔"

"درویشوں کا کرم ہے ورنہ ہم کس قابل ہیں حق اللہ۔" صوفی نے کہا۔

"نہیں میرا خیال ہے آپ پر درویشوں کا کرم نہیں ہے۔ ایس پی صاحب کے ساتھ جو بدتمیزی آپ نے کی ہے اس کا آپ کو بھرپور نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔" صوفی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے تبدیل ہوا تھا لیکن پھر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولا۔

"درویش آپ پر رحم کریں۔ آپ کے برے وقت کی پیش گوئی کرنا ہماری مجبوری ہے۔"

"میرے برے وقت کی۔"

"جی ہاں کیوں کہ آپ نے ہم سے بدتمیزی کی ہے۔ باقی رہا ایس پی صاحب کا معاملہ تو میرا خیال ہے ایس پی کا عہدہ انہیں راس نہیں آ رہا۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ ڈی ایس پی ہو جائیں گے۔"

"آپ ولی اللہ ہیں۔"

"استغفر اللہ۔ ہمیں یہ درجہ کہاں سے مرحمت ہو سکتا ہے خیر باقی تو ساری بعد کی باتیں ہیں ہمارے دوست کو ہمارے گھر سے اٹھا کر لے گئے ہیں آپ، معشوق نشیلے ہے ان کا نام۔"

"جی ہاں لاک اپ میں ہیں۔"

"ایک منٹ کے اندر اندر انہیں معذرت کر کے چھوڑ دیجیے گا کوئی ضمانت وغیرہ نہیں ہو گی ان کی ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ صوفی نے ان کے لیے حکم دیا ہے۔"

"حکم۔"

"جی۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ سے درخواست کی جائے۔"

"صوفی صاحب بہت زیادہ ہواؤں میں اڑ رہے ہیں آپ۔"

"نہیں ہم تو زمین پر ہی قدم رنجہ فرمائے ہوئے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے البتہ آپ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑنے کا سامان نہ کیجیے گا۔ انسپکٹر کے عہدے سے سب انسپکٹر کے عہدے پر آنا اور پولیس ہیڈ آفس میں ڈیوٹی دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"جی..... جی..... جی۔ ایک بات آپ ذہن میں رکھیے صوفی صاحب۔ میں نے اگر آپ پر ہاتھ ڈال دیا تو آپ کی تمام اڑان ختم ہو جائے گی۔"

"یار کیسے لوگ ہیں آپ۔ خیر میں آپ سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔ معشوق نشیلے کو اب سے دس منٹ کے اندر اندر نہ چھوڑا گیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ ایس آئی بن گئے اور جمشید مرزا اے ایس پی۔"

"شٹ اپ۔" انسپکٹر رازی کی آواز سنائی دی اور اس نے غراتے ہوئے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

صوفی نے خود بھی ریسیور رکھا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ تھوڑی دیر وہ اسی طرح کھڑا سوچتا رہا اور اس کے بعد وہ ایک کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ یہاں سے تہ خانے میں اترنے کا راستہ تھا۔ تہ خانے میں سے اس نے کچھ چیزیں نکالیں اور ایک کینوس بیگ شانے پر لٹا لیا۔ یہ سفری بیگ تھا اور اس میں نہ جانے کیا کیا سامان بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ باہر نکلا اور پھر ایک گیراج سے اس نے نئی موٹر سائیکل نکالی۔ یہ وہ مشہور زمانہ موٹر سائیکل نہیں تھی جسے صوفی کی شخصیت کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت تھا بھی وہ بدلے ہوئے انداز میں اور اگر شاذ یہ اور دوسرے لوگ اسے اس انداز میں دیکھ لیتے تو بہت خوش ہوتے۔ اچھا خاصا اسمارٹ آدمی نظر آ رہا تھا۔ لباس بھی ڈھنگ کا ہی پہنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ بہت سے فاصلے طے کرتا ہوا وہ ایک لمحے کے لیے ایس ایس سجادی کی کوٹھی کے سامنے رکا اور پھر وہاں سے آگے بڑھتا چلا گیا لیکن زیادہ دور نہیں کچھ دور جانے کے بعد اس نے موٹر سائیکل جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں روکی اور خود محتاط انداز میں وہاں سے واپس ایس ایس سجادی کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ یہ بات اس کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی کہ ایس ایس سجادی آخر کرتا کیا ہے۔ شارمن کا نشان سامنے تو آیا تھا لیکن ابھی تک شارمن کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ اس کا نام نوبل شارمن تھا اور وہ بارود کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ صوفی کے ذہن میں بڑی تشویش تھی اگر وہ یہاں آیا ہے تو آخر کیوں اور ایس ایس سجادی کا سارا معاملہ..... شارمن نے اگر صوفی کو اپنی آمد کی اطلاع دی ہے ایس ایس سجادی کے قتل سے تو بہر حال یہ بھی ایک سنسنی خیز بات ہے، کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے عمل کا آغاز کرے گا اور اس کا عمل ظاہر ہے یہی سب کچھ تھا یعنی تخریب کاری، بم دھماکے اور پلوں وغیرہ کو اڑانے کی کوشش۔

صوفی کے دل میں اس قسم کی تشویش تھی۔ وہ کوٹھی کی پشت پر پہنچ گیا۔ یہاں ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں ایک جگہ رک کر تھیلے سے بڑا ٹرانسمیٹر نکالا اور اس پر گرین فورس کے ان لوگوں کو ہدایت دینے لگا جو اس عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔

"ہاں کیا صورت حال ہے؟"

"پولیس والے بے پروائی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ دو افراد ہیں جو بیداری کے شکار نظر آ رہے ہیں اور کوئی تبدیلی یہاں نہیں ہوئی۔"

"اوکے۔" اس نے ٹرانسمیٹر بند نہیں کیا تھا کہ اچانک اسے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں

سنائی دیں اور وہ بڑی احتیاط سے کسی لچک دار سانپ کی طرح نشیب میں اترتا چلا گیا۔ ابھی وہ سطح زمین تک اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ دفعتاً کوئی اس پر آ گیا۔ نہ صرف آ گرا بلکہ اس سمیت نشیب میں اترتا چلا گیا۔ صوفی نے گرتے گرتے کوشش کی تھی کہ حملہ آور کے دونوں ہاتھ اس کی گرفت میں آ جائیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن دفعتاً ہی اس کے حلق سے ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"درویش..... درویش۔ درویش رحم کریں۔" ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی مرد کا جسم نہیں ہے دونوں لڑھکتے ہوئے سطح زمین تک پہنچے۔ حملہ آور نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بال صوفی کی گرفت میں آ گئے اور دوسرے لمحے ایک نسوانی چیخ فضا میں لہرا گئی۔ وہ کراہ کر پلٹی اور صوفی کے بازو پر گھونسے مارنے لگی۔

"درویش..... درویش آپ پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی براہِ کرم جدوجہد نہ فرمایئے گا۔ ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔" صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"کتے میرے بال چھوڑو بال ٹوٹ جائیں گے۔"

"نہیں محترمہ غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔ آپ کے بال کسی کتے نے نہیں پکڑے بلکہ یہ ہم ہیں۔"

اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ جیسے حملہ آور نے ہاتھ پاؤں ڈال دیے ہوں لیکن صوفی اب بھی اس کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا۔"

"خدا کے لیے مجھے جانے دو میں چور نہیں ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک شر کا شکار ہو گئی مجھے کیا پتا تھا تم یہاں مرے رہے ہو۔"

"دیکھیے غلط بیانی نہ فرمایئے گا۔ ہمیں حقیقتوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔"

"تم پاگل ہو کیا پتا نہیں کیا کیا بک رہے ہو۔" وہ بولی۔

"کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کیجیے کہ بات آگے بڑھے۔"

"مجھے اٹھنے دو۔" وہ پھر منمنائی۔

"کیا مجھے تمہارا گلا گھونٹنا پڑے گا اب خاموش رہو۔" صوفی غرایا اور لڑکی ایک دم خاموش ہو گئی۔

صوفی خود بھی خاموش ہو کر مختلف قسم کی آوازیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد فضا میں سرچ لائٹ کی شعاعیں دکھائی دیں۔ صوفی نے کہا۔ اب کم از کم موٹر سائیکل تو ان کے ہاتھ ضرور آ جائے گی۔ ایسے میں پولیس کے علاوہ اور کون سرچ لائٹ استعمال کرے گا۔ اس کا مقصد ہے کہ گرین فورس کے کمزور نوجوانوں کو صورت حال کا علم ہی نہیں ہے۔ پولیس نے یہاں باقاعدہ ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔ بہر حال وہ خاموش پڑا رہا۔

کچھ دیر کے بعد سرچ لائٹ کی شعاعیں غائب ہو گئیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ لوگ نشیب کی طرف آنے کی ہمت نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وہ محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن اس بلا کا کیا کیا جائے جس کے بال اب بھی اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچتا رہا۔ دوسری طرف وہ لڑکی اس طرح خاموش ہو گئی تھی جیسے گہری نیند سو گئی ہو۔ صوفی کو کچھ خیال آیا اس نے اس کے بالوں پر گرفت مضبوط کر کے جھٹکا دیا اور وہ پھر کراہی۔

"کیا مصیبت ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سوتو نہیں گئیں تم۔"

"مجھے چھوڑ دو..... چھوڑ دو..... میں کہتی ہوں مجھے تم چھوڑ دو۔" یک بہ یک وہ زور آزمائی پر آمادہ نظر آنے لگی۔

"سارے بال اکھڑ کر مٹھی میں آ جائیں گے۔" صوفی نے کہا۔

"چھوڑ دو مجھے، ورنہ میں شور مچاتی ہوں۔"

"اوہ ہو..... تب تو شاید تمہارا گلا ہی گھونٹنا پڑے۔" صوفی کی آواز میں ایک انوکھی غراہٹ ابھر آئی۔ دفعتاً اوپر سے آوازیں آنے لگیں۔ کئی لوگ بہ یک وقت بول رہے تھے۔ صوفی ان کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ موٹر سائیکل ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان میں سے کوئی ادھر بھی آ نکلے۔ ان کے پاس سرچ لائٹ تو تھی ہی۔ اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر تاریکی کچھ زیادہ گہری معلوم ہوئی۔ غالباً یہ کسی قسم کی جھاڑیاں تھیں۔

"چلو کھسکو ادھر چلو۔" صوفی نے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے کہا۔

"کک..... کیوں؟"

"کیا تم آوازیں نہیں سن رہیں۔ وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

"کون ہیں وہ۔"

"پولیس۔"

"اور تم کون ہو؟" لڑکی نے سوال کیا۔

"ایک عاشق درویش۔" بس اس سے زیادہ کیا بتائیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے تم کوئی اچھے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔"

"حق اللہ..... حق اللہ..... حق اللہ۔ دفعتاً وہ اس پر پوری طرح جھکا اور دونوں ہاتھوں سے اس لڑکی کو اٹھا لیا۔ اب وہ جھکا جھکا جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ لڑکی اس کی گرفت سے نکل جانے کے لیے مچل رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس نے اپنی آواز بند رکھی تھی اور شور نہیں مچایا تھا۔ جھاڑیوں کی پشت پر پہنچ کر صوفی نے اسے کسی وزنی بوجھ کی طرح پھینک دیا۔"

"تم انسان ہو یا جانور۔"

"عام طور سے لوگ ہمیں اونٹ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے، لیکن ہم کسی کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

"میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟"

"تعارف اگر باقاعدہ ہو تو زیادہ دلچسپ رہے گا درویشوں کے کرم سے۔ آپ پہلے اپنے بارے میں بتائیے۔"

"میں کیوں بتاؤں؟"

"تو پھر ہماری یہ ڈیوٹی کیوں لگائی جا رہی ہے۔" صوفی نے کہا۔

"دیکھو میں اب بھی کہتی ہوں مجھے جانے دو۔"

"تعارف کے بغیر تو یہ ممکن نہیں ہوگا چاہے ساری رات یہیں گزر جائے..... چاہے ساری رات گزر جائے۔"

"ہوں۔ تو پھر یہ لو لڑکی نے جنبش کی۔ یہ بات تو اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ شدید تاریکی کے باوجود اس کے مدمقابل کی آنکھیں الوؤں کی طرح دیکھنے کی عادی ہوں گی۔ اس نے پستول نکالا ہی تھا کہ صوفی نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر صوفی کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ صوفی کو یقین تھا کہ وہ غیر مسلح نہیں ہوگی۔ جیسے ہی اس نے پستول کی جھلک دیکھی تیزی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور دوسرے ہی لمحے پستول اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی پھر اس کے بال اس کی مٹھی میں جکڑ کر رہ گئے تھے۔

"ہوں، تو آپ نے یہ ثابت فرما دیا محترمہ کہ آپ جرائم پیشہ ہیں، لیکن ہم اب بھی آپ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو کسی جرائم پیشہ فرد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اب آپ اوقات میں آ جائیں۔ اصل میں اگر یہاں کچھ لوگ ہماری تلاش میں سرگرداں نہ ہوتے تو ہم آپ کے ساتھ دوسرا سلوک کر سکتے تھے۔"

"میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو ورنہ دیکھو اچھا نہیں ہوگا۔"

"آخری الفاظ یہی ہوا کرتے ہیں اور اس کے بعد نیک بیبیاں ٹسوے بہانہ شروع کر دیتی ہیں۔"

"تم آخر ہو کون؟"

"عرض کر دیا اور جو ایک بار کہہ دیا سو کہہ دیا ورنہ۔"

"ڈیڈ کراس۔" لڑکی سرگوشی کے انداز میں بولی اور صوفی چونک پڑا۔ "ڈیڈ کراس شارمن کا نشان تھا اس کا مطلب کہ اس لڑکی کا تعلق شارمن سے ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"نوبل شارمن۔" لڑکی بری طرح اچھل پڑی تھی۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صوفی کو دیکھا اور بولی۔

"اتنی دیر سے کیوں جھک مار رہے تھے۔"

"اور آپ کیا کر رہی تھیں؟"

"لعنت ہے..... لاؤ میرا پستول مجھے واپس دو۔"

"یہ لو، صوفی نے انتہائی پھرتی سے اس کی پستول کے چیمبر خالی کیے اور پستول اس کے حوالے کر دیا۔

"مقامی آدمی معلوم ہوتے ہو؟"

"ظاہر ہے جس مقام پر ہیں اللہ نے وہیں اچھا رکھا ہے۔"

"میرے بال اکھاڑ کر رکھ دیے۔ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"بس جو کچھ بھی کر رہے تھے۔ اچھا کر رہے تھے۔"

"میں تو مقامی جگہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس آواز نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہو..... تو آپ بھی اسی آواز کا شکار ہوئی ہیں۔"

"تم کس سلسلے میں آئے تھے۔"

"بہت سے معاملات تھے۔"

"خیر ہوگا میں یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتی۔"

"لیکن ابھی ہم اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟"

"ارے دیکھ نہیں رہیں چھپے ہوئے لوگ حرکت میں آ گئے ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"کچھ تو باوردی ہیں جو کھلے عام پہرہ دے رہے تھے اور کچھ سی آئی ڈی والے جو ادھر ادھر چھپ کر عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم نے اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔"

"میں سچ کہتی ہوں کہ اس طرح اچانک آواز نے بوکھلا دیا تھا ورنہ میں اس طرح پہنچتی کہ سی آئی ڈی بھی جھک مار کر رہ جاتی۔"

"کوئی چور دروازہ۔"

"تو اور کیا۔ میرے علاوہ کسی اور کو اس کا علم نہیں ہے۔" صوفی دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ لڑکی سے کچھ معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر وہ بولی۔

"میں دیکھوں کہ سڑک کی کیا پوزیشن ہے؟"

"مردوں کا کام مردوں پر زیادہ سجتا ہے۔ آؤ۔" صوفی نے کہا اور اس کے بعد دونوں جھکے جھکے چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ کچھ دور چلنے کے بعد صوفی نے اسے پیچھے ہی روک دیا اور خود سینے کے بل کھسکتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ ماحول بہ ظاہر بالکل سنسان نظر آ رہا تھا۔ کچھ دور سامنے ایک دھبا سا نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر آنکھیں پھاڑنے کے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ موٹر سائیکل بھی وہیں موجود ہے جہاں صوفی نے چھوڑی تھی۔ وہ چپ چاپ پلٹ پڑا۔

"کیا بات ہے؟" لڑکی سرسراتی آواز میں بولی۔

"چال چل رہے ہیں۔ احمق کہیں کے۔" واپس چلو صوفی نے کہا۔

"مطلب۔"

"آؤ..... آؤ۔" صوفی نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور نشیب میں اترتا چلا گیا۔ اس بار وہ جھاڑیوں کے قریب رکنے کے بجائے آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"تم نے کہا تھا کہ تم قریب ہی رہتی ہو۔"

"ہاں ریڈ اسکوائر وہ سامنے۔"

"اوہو..... اچھا خاصا فاصلے پر ہے۔"

"ہاں۔"

"کیسے آئی تھیں یہاں پر پیدل۔"

"نہیں رکشا سے۔"

"میری موٹر سائیکل اب بھی ادھر ہی موجود ہے۔" صوفی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"تو پھر اسے کیوں نہ لے لیا جائے۔"

"بس درویشوں کی اجازت نہیں ہے ورنہ میں اتنا ہی عقل مند ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ انہوں نے موٹر سائیکل دیکھ لی ہے۔ ان کے پاس سرچ لائٹ بھی تھی لیکن انہوں نے میری گاڑی وہاں سے ہٹائی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ گاڑی کے آس پاس ہی چھپے ہوئے انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں وہاں جا کر گاڑی حاصل کروں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اوہ..... تم کافی چالاک معلوم ہوتے ہو، لیکن ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"گاڑی کے نمبر سے وہ تم تک نہیں پہنچ جائیں گے۔" صوفی خاموش ہو گیا۔

"جواب نہیں دیا تم نے۔"

"درویش اس سلسلے میں بھی کچھ کر ہی لیں گے۔"

"یہ تم نے درویش درویش کیا لگا رکھی ہے؟"

"میں صورت سے تمہیں کیا معلوم ہوتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔"

"بس درویشوں کے کرم ہی معلوم ہوتے ہو۔" لڑکی نے گہری سانس لے کر کہا اور گردن ہلائی پھر بولی۔

"مگر تم..... مطلب ہے۔ ریڈ کراس میں، مگر آدمی تو چالاک ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ مقامی طور پر تمہیں نمائندہ مقرر کر کے غلطی نہیں کی گئی۔ ویسے ایک بات کہوں۔"

"کتنی دور پیدل چلنا پڑے گا۔"

"چلتے ہیں۔" صوفی نے کہا اور وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ صوفی اس وقت بالکل ہی بدلی ہوئی کیفیت کا شکار تھا۔ واقعی اس کے شناساؤں نے اسے اس عالم میں شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ ایس ایس سجادی والی عمارت بہت پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ وہ لمبا چکر لے رہے تھے۔ صوفی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کہاں سے مڑ کر وہ سیدھے ریڈ اسکوائر والی عمارت تک پہنچ جائیں گے، لیکن دفعتاً انہیں پھر ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سرچ لائٹوں کی شعاعیں میدان میں دور تک چکرانے لگی تھیں۔ ایک بار روشنی کی زد میں آئے اور پھر اس کے دائرے میں جکڑ کر رہ گئے۔ سرچ لائٹ ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" وہ بوکھلا کر بولی۔

"رواہ نہ کرو درویشوں کے کرم سے ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"رینا..... رینا سیسل۔"

"عیسائی ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ مسٹر سیسل تمہارے شوہر ہیں۔"

"نہیں میرے فادر۔"

"تمہارے گھر پر اور کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں میں تنہا رہتی ہوں۔"

"اوہ..... ہو..... وہ دیکھو پولیس والے ہماری طرف آ رہے ہیں۔" سرچ لائٹ ان کے ساتھ ہی حرکت کر رہی تھی۔ اور وہ پوری طرح روشنی میں تھے۔ لڑکی بھی پوری طرح روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی کافی خوب صورت تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال ہی ہوگی۔ سیاہ جیکٹ اور سیاہ پتلون ہی میں ملبوس تھی۔ صوفی نے کہا۔

"تمہارے چہرے کی سفیدی تمہارے کپڑوں پر اتر گئی ہے۔ اپنے کپڑے جھاڑ لو۔" لڑکی نے یہی کیا تھا۔ دفعتاً ان کی طرف آنے والوں میں سے کسی نے گرج کر کہا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" صوفی نے ایک دم ہاتھ اٹھا دیے اور رک گیا۔ وہ تیزی سے قریب آ گئے تھے۔ صوفی نے کہا۔

"کیا بات ہے خیریت؟"

"تم لوگ یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"یہ کوئی ممنوعہ علاقہ تو ہے نہیں ہم یہاں چہل قدمی کر رہے ہیں۔"

"آپ کون ہیں۔"

"سر سے پاؤں تک آدمی۔"

"اصل میں یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"تو پھر۔" صوفی نے کہا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"وہ سامنے والی عمارت میں ریڈ اسکوائر فلیٹ نمبر 20۔" صوفی بہ دستور آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سرچ لائٹ کے دائرے سے باہر نکل گئے۔ لڑکی کچھ زیادہ ہی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، لیکن اس کے بعد کسی نے انہیں روکا نہیں۔"

"کمال کر دیا تم نے واقعی۔"

"یہ کمال میرا نہیں درویشوں کا ہے جن کے بارے میں تم بار بار پوچھ رہی ہو۔ اپنے نیک معاملات درویشوں کے سپرد کر دو تمہیں دقت نہیں ہوگی۔ وہ آبادی کے قریب پہنچ گئے اور پھر ریڈ اسکوائر کی عمارت تک لڑکی نے کہا۔

"مگر تم نے انہیں صحیح پتا کیوں بتا دیا؟"

"بے فکر رہو کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ انہیں تو کسی ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اس میں پھانسنا ہے۔"

"کیسے۔"

"جس کے گھر کے دروازے پر ایس ایس سجادی کی لاش ملی تھی۔"

"اس کا نام شاید صوفی ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"تم اسے جانتی ہو۔" صوفی ایک دم سمجھ گیا۔

"ہاں اکثر ہماری میٹنگوں میں اس کا نام آیا ہے۔"

"چلو..... چلو۔ رک کیوں گئیں اندر چلو۔"

"آؤ۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ عمارت کافی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کہیں بھی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ برآمدے میں آئے۔ سوئچ آن کرنے کی آواز سنائی دی اور برآمدہ روشن ہو گیا۔ صوفی چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"اتنی بڑی عمارت میں تنہا رہتی ہو؟"

"صرف دو کمرے میرے پاس ہیں اور بقیہ دوسرے معاملات میں استعمال ہوتے ہیں۔ صوفی نے گردن ہلائی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہ بڑی گہرائیوں میں پہنچ گیا ہے۔ نوبل شارمن بہت خطرناک آدمی تھا۔ صوفی کے ہاتھوں اسے یہاں بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے صوفی ان کے علم میں تھا لیکن شاید نوبل شارمن کے بقیہ افراد صوفی کی شکل سے واقف نہیں تھے اس لیے لڑکی بھی اسے نہیں پہچان سکی تھی۔ عمارت سنسان پڑی تھی۔ وہ مختلف راہ داریوں سے گزرتی ہوئی بلب روشن کرتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

"نشست کا کمرا تھا اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

"بیٹھو۔" لڑکی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور صوفی چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"اب یہ بتاؤ چائے پیو گے یا کافی۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"پی لو میرا خود بھی دل چاہ رہا ہے۔"

"میں زیادہ دیر رک نہیں سکوں گا، کیونکہ جو کچھ کرنا ہے اسی وقت کرنا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تم چور دروازے سے واقف ہو۔ میرا مطلب ہے ایس ایس سجادی کی رہائش گاہ کے چور دروازے سے۔"

"اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"کیا جاننا چاہتی ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا مطلب ہے تم ہماری آرگنائزیشن کے لیے کب سے کام کرتے ہو۔"

"خاصا وقت گزر گیا۔"

"ایک بات بتاؤ۔"

"کیا۔"

"سجادی کی موت کی خبر آج ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔"

"صرف دو گھنٹے کے بعد۔"

"تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کوٹھی میں داخل ہونا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں؟" وہ اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کاغذات۔" صوفی نے اندھیرے میں چیختے ہوئے کہا۔

"ہم بے خبر تو نہیں ہیں ویسے تم آرگنائزیشن میں کیا عہدہ رکھتے ہو؟"

"مقامی انچارج۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ اب جلدی سے چور دروازے کی نشان دہی کر دو اور یہ بھی بتا دو کہ کاغذات کہاں ملیں گے۔ لڑکی چونک کر اسے گھورنے لگی تھی۔ پھر اس نے کہا اگر تم انچارج ہو تو یہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہیے تھی۔"

"اب بحث بھی کرو گی۔ صوفی آنکھیں نکال کر بولا۔ لڑکی اسے بہ غور دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے صوفی کو گھورتے ہوئے کہا۔ اب جو کچھ ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے ہوگا۔" اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آنے لگا۔ نال صوفی کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ صوفی حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم ہم میں سے نہیں ہو لیکن تم نے بڑی کامیابی سے مجھے بے وقوف بنایا۔ آدمی بے شک چالاک ہو لیکن یہ نہیں جانتے کہ آرگنائزیشن کی کیفیت ذرا مختلف ہے۔ ہم لوگ مختلف انداز میں ایک دوسرے کے شناسا ہوتے ہیں۔"

"تو اب کیا تم اب مجھے مار دو گی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اب ان فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کون ہو تم؟" اور اس چکر میں کیسے پڑے ہو؟"

"بس نصیب کے بارے میں جانتی ہو۔ دو ہوتے ہیں خوش نصیب اور بد نصیب۔"

"بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اور ان معاملات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"دیکھو میری اور اپنی عمر کا فرق محسوس کرو تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہی ہو۔"

"پستول دیکھ رہے ہو یہ۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں..... پھر۔"

"مطلب یہ کہ تم اس کا نشانہ بھی بن سکتے ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بولو گے نہیں۔ میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟"

"لڑکی، بہتری اسی میں ہے کہ چور دروازے کا پتا بتا دو اور یہ بھی بتاؤ کہ کاغذات کہاں ہیں؟"

"سمجھ گئی میں تم یقیناً مقامی انتظامیہ کے آدمی ہو اور اگر یہ بات ہے تو تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔"

"میں زندہ ہی جاؤں گا، کیونکہ انتظامیہ کا آدمی نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو؟"

"بلیک میلر۔"

"ارے کیا تم نے یہ پینترا بدلا ہے۔"

"بس یوں ہی سمجھ لو۔" صوفی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر یہ لو۔" لڑکی نے دانت بھینچ کر ٹریگر دبا دیا۔

"ہائے میں مر گیا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے مسخرے پن سے کہا۔ لڑکی نے متحیرانہ انداز میں پستول کی طرف دیکھا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"اب بیٹھ جاؤ..... کافی اچھل کود کر لی ہے تم نے ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ کیا ہے لیکن تمہیں یاد ہے نا میں نے کس طرح تمہارے بال پکڑے تھے۔ اسی طرح تمہاری ناک دونوں نتھنوں میں انگلیاں ڈال کر اسے اوپر تک چیر دوں گا اور تمہارا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بگڑ جائے گا۔ چلو اگر پلاسٹک سرجری کرا بھی لیتی ہو تو بھی ناک ایسی تو نہیں رہے گی۔"

"یہ..... یہ..... یہ۔"

"ہاں..... ہاں..... ہاں، اس کے کارتوس میری جیب میں ہیں۔" صوفی نے کہا۔ پھر بولا۔

"چلو اب چلتے ہیں یہاں سے۔"

"کک..... کہاں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر زبردستی لے جاؤں گا۔" صوفی نے کہا۔

"دیکھو میں تمہیں بتا دیتی ہوں، سب کچھ لیکن صوفی رابعہ سلطان کے قتل کے بعد شاید ایک بار پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ بے شک وہ ایک مرنجان مرنج شخصیت کا مالک تھا لیکن پولیس کے مختلف محکموں میں اس نے جو کارنامے سرانجام دیے تھے وہ معمولی نہیں تھے اور اب بھی وہ اسی کیفیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس نے جھپٹ کر لڑکی کی گردن پکڑ لی اور اس کی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالنے لگا۔ لڑکی نے اس کی کلائیوں پر ہاتھ ڈال دیا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس نے دو فولادی سلاخیں پکڑ لی ہوں۔"

"کچھ ہی لمحوں کے اندر اندر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور صوفی نے اسے آہستگی سے فرش پر ڈال دیا پھر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا اور اس کے بعد خواب گاہ کی طرف چل پڑا جس توقع پر آیا تھا وہ بھی پوری ہو گئی یہاں فون موجود تھا۔ اس نے ریسیور پر گرین ہاؤس کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کون ہے ڑے؟"

"صوفی بول رہا ہوں۔"

"اڑے ماں قسم آواز نہیں پہچانا تھا چھوٹے بابا۔"

"ایک پتا نوٹ کرو۔ شازیہ اور دلاور کو اس پتے پر بھیج دو۔ گاڑی میں آنا ہے۔ ہوشیار رہنا ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ اسے کہو جلدی سے یہاں پہنچے۔"

"ٹھیک ہے چھوٹا بابا۔" وہ دونوں ابی پونچتا اے۔" غلام قادر نے کہا اور اس کے بعد صوفی نے فون بند کر دیا۔ ریسیور رکھ کر وہ اس کمرے کی تلاشی لینے لگا، لیکن کوئی کارآمد چیز ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ خطرہ تھا کہ کوئی آ ہی نہ جائے۔ ویسے بہت سی باتیں ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ لڑکی کسی آرگنائزیشن سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا سربراہ شارمن ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شارمن کسی خاص منصوبے کے تحت پورے گروہ کے ساتھ یہاں آیا ہے جہاں تک ایس ایس سجادی کا تعلق ہے اس بات کے امکانات تھے کہ ایس ایس سجادی کسی طرح اس کے پروگرام سے واقف ہو یا شریک کار ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان ساتھیوں میں سے ہی کوئی ہو اور مقامی طور پر اس کے لیے اسے راستے سے ہٹا دیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی شارمن اس فکر میں بھی ہو کہ سجادی کے کاغذات کوٹھی میں سے نکلوا لے۔ اس لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ نہ صرف چور دروازے سے واقف ہے اور اسے وہ مقام بھی معلوم ہے جہاں کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے لڑکی کا ایس ایس سجادی سے گہرا تعلق ہو۔ بہر حال چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ گاڑی کا انتظار عمارت کے اندر بیٹھ کر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ پوری عمارت اس کی دیکھی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے بے ہوش لڑکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور اپنے پیچھے ساری روشنیاں گل کرتا ہوا باہر چلا آیا۔ پائیں باغ میں اندھیرا تھا۔ وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس نے لڑکی کو پتھر کی بنچ پر لٹا دیا اور خود چار دیواری کے باہر دیکھنے لگا۔ اندازے کے مطابق ایک کار تاریکی میں پھاٹک پر رکی ہوئی تھی اور اس سے روشنی کی ایک لمبی سے شعاع فضا میں منتشر ہوئی تھی۔ شازیہ آ گئی تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر بے ہوش لڑکی کو کاندھے پر اٹھا کر ڈالا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ دلاور نے اس کی مدد کی تھی اور پھر وہ وہاں سے تیزی سے چل پڑے۔

"کیا قصہ ہے چھوٹے بابا؟" شازیہ نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک قصہ، قصہ درویش ہی بنا ہوا ہے۔ دیکھیں آگے کیا قصہ نکلتا ہے۔" صوفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"ہوش میں آنے کے بعد خود ہی بتائے گی۔ چلو چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گرین ہاؤس میں داخل ہو رہے تھے۔ لڑکی کو گرین ہاؤس کے ایک مخصوص کمرے میں پہنچا دیا گیا اور ایک بستر پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چونک کر دیکھا۔ صوفی نے اس وقت پان کی گلوری منہ میں رکھ لی تھی اور پان چبا رہا تھا لیکن ابھی مرغلہ پک

نہیں بن سکا تھا۔ وہ صوفی کو دیکھنے لگی اور پھر ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔

"کون ہو تم..... بتاؤ؟"

"عاشق درویش۔"

"میں کہاں ہوں؟"

"یہیں ہیں آپ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے مذاق کیا۔

"شٹ اپ۔ مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"ظاہر ہے یہ گستاخی ہم سے ہی سرزد ہوئی ہے جس کے لیے دست بستہ آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ یقین ہے کہ آپ اپنی فطری فراخ دلی سے کام لے کر....."

"تم بکواس بند نہیں کرو گے۔"

"کمال ہے خود سوال کر رہی ہیں اور خود بکواس بند کرنے کا حکم دے رہی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں پوچھتی ہوں مجھے یہاں لانے کا مقصد بتاؤ؟"

"مقصد تو ہم خود بھی نہیں جانتے۔ بس کبھی کبھی کوئی پسند آ جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں ساتھ لے آیا جائے۔"

"سنو..... اپنے آپ کو بہت زیادہ اسمارٹ ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو تم ایک احمق قسم کے آدمی ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو۔ میرا نام رینا ہے۔ رینا سیسل۔"

"یقیناً..... یقیناً۔ بھلا ہمیں اس سے کیا اختلاف ہوسکتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا پھر بولا۔

"اب آپ یہاں آرام فرمائیے۔"

"دیکھو مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔" صوفی نے کہا اور اس کے بعد دو کمرے سے باہر نکل گیا۔ ذہن میں ایک منصوبہ بنا لیا گیا تھا اور اب اس کے تحت ہی کام کرنا تھا۔ گرین ہاؤس میں یہ کمرا ایسے لوگوں کے لیے مخصوص تھا جنہیں یہاں کچھ وقت گزارنا ہو اور وہ باہر نکلنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ لڑکی کو وہاں آرام سے چھوڑ دیا گیا البتہ ٹیلیفون کی موجودگی وہاں قابل غور تھی، لیکن اس کے لیے باقاعدہ انتظام کر لیا گیا تھا۔ شازیہ اس وقت اس ٹیلیفون پر موجود تھی جو اس ٹیلیفون کا دوسرا کنکشن تھا۔ صوفی نے یہاں اپنی ذہانت کے مطابق بہت سارے انتظام کیے تھے۔ باہر نکل کر اس نے شازیہ کو ہوشیار کر دیا اور پھر خود ایک اور ٹیلیفون پر جا بیٹھا۔ اب وہ اپنی یادداشت سے کام لے رہا تھا، لیکن تقریباً جیسے بند کمرے کے ٹیلیفون کو استعمال کیا جا رہا ہو۔ صوفی ایک دم تیار ہو گیا۔ یہ بڑا زبردست سسٹم تھا کوئی بھی نمبر ڈائل کیا جائے وہ اس مخصوص ٹیلیفون سے آ ملتا تھا جو اس کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ بات وہاں نہیں ہوسکتی تھی جہاں یہ فون کیا جائے بلکہ جس جگہ دوسرا ٹیلیفون رکھا ہوا تھا وہاں سے بات کی جاسکتی تھی۔ صوفی اپنے طور پر شارمن کی آواز کی نقل کے لیے تیار تھا، حالانکہ شارمن سے ملاقات بہت سال پرانی تھی لیکن بہر حال کچھ ذہانتیں ہی تھیں جنہوں نے صوفی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو صوفی کی حیثیت دی تھی اور اس نے محکمہ پولیس میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کی آواز ابھری۔

"ہیلو..... ہیلو..... ہیلو" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ صوفی نے ایک بٹن آن کر دیا اور بولا۔

"ہیلو....."

"سر میں رینا سیسل بول رہی ہوں۔"

"ہاں بولو۔"

"سر وہ میں اپنے منصوبے میں ناکام رہی ہوں۔"

"مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ کہاں مر رہی ہو اس وقت۔" صوفی کے حلق سے آواز نکلی۔

"دیکھیے سر قصور میرا نہیں ہے میں ایک عجیب و غریب جال میں پھنس گئی ہوں۔"

"بکتی جاؤ کیا ہوا ہے اور رینا سیسل نے ساری تفصیل بتا دی لیکن بس اس حد تک کہ وہ کس طرح ایک عجیب و غریب شخصیت کے جال میں پھنسی ہے۔

"جانتی ہو وہ کون ہے؟"

"نہیں جانتی سر۔ بہ ظاہر دیکھنے میں بالکل گدھا لگتا ہے لیکن بہت چالاک ہے۔"

"صوفی ہے اس کا نام۔"

"جی رینا کی آواز چیخنے کے مترادف تھی۔"

"ہاں وہ صوفی ہے رینا اور تم میرے اصول جانتی ہو لنگڑے گھوڑے کو میں ہمیشہ گولی مار دیا کرتا ہوں وہ جو میرے مقصد کے لیے کسی طور صحیح کام نہیں کر پاتے بلکہ میرے لیے مشکلوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ میرے خیال میں جینے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ میرا اصول ہے شاید تمہیں اس کے بارے میں علم نہ ہو لیکن افسوس لڑکی اب تمہاری زندگی میرے لیے بے مقصد ہے۔"

"سر میری بات سنیے۔"

"نہیں بہتر یہ ہوگا کہ تم خودکشی کر لو۔ یہی بہتر ہے، اگر زندہ واپس نکل بھی آئیں تو میرے آدمیوں کا مخصوص مشن یہی ہوگا کہ تمہیں قتل کر دیں اور پھر....."

"س..... سس..... سر پلیز میری بات تو سنیے۔ سر..... سر..... لیکن اس کے بعد صوفی نے وہ بٹن آف کر دیا تھا۔ برابر ہی غلام قادر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"ارے ماں قسم چھوٹے بابا تمہارا تو جون ہی بدل گیا ہے۔ سانپ کے مافق دو ہزار سال کے بعد بھی بدل لیا ہے وہ ڑے۔" صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دانہ پھینکا تھا اور اس کے بعد انتظار تھا کہ صورت حال کچھ واضح ہو جائے۔ ایک گھنٹے کا وقت دیا اس نے رینا سیسل کو ایک گھنٹے کے بعد شازیہ کھانے پینے کا سامان لے کر اس کمرے میں داخل ہوئی۔ صوفی ساتھ ساتھ ہی تھا۔ ایک نگاہ میں دیکھنے سے اندازہ ہو گیا کہ رینا سیسل کے ہوش و حواس درست ہو گئے ہیں۔ وہ بے حد خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔ شازیہ نے کھانا اس کے سامنے رکھا۔ تو صوفی نے کہا۔

"مہمان نوازی ہمارا قومی ورثہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور میرا خیال ہے کہ آپ کھانے

پینے سے گریز نہیں کریں گی۔ ہیں رینا سیسل۔ رینا سیسل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے شازیہ کو دیکھا اور بولی۔

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جناب۔"

"ہاں ہاں ہم حاضر ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" شازیہ باہر نکل گئی تھی۔ رینا نے خوف زدہ نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں۔"

"ہاں خدا دشمن کو بھی ایسے لمحات نصیب نہ کرے لیکن ہم آپ سے ایک وعدہ کر سکتے ہیں..... وہ یہ کہ اگر آپ ہمیں ساری تفصیل بتا دیں گی تو ہم آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے پوری دیانت داری کے ساتھ۔" اور رینا سیسل نے گردن ہلائی اور بولی۔

"نہیں، میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ میری مدد کریں جناب!"

"ارے، ارے یہ اچانک ہماری مہمان بننے پر کیوں مصر ہو گئیں جب کہ اس سے پہلے تو آپ۔"

"آپ صوفی صاحب ہیں۔"

"الحمدللہ کیوں خیریت ہمارے بارے میں اچانک آپ کو معلومات کیسے حاصل ہو گئیں۔"

"صوفی صاحب میری زندگی خطرے میں ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"آپ سے نہیں مجھے دوسروں سے زندگی کا خطرہ ہے۔"

"کوئی بھی آپ کو یہاں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ آپ سے ہمارا وعدہ ہے۔"

"اب براہِ کرم آپ۔"

"ہاں۔ ہاں کہیے۔"

"دیکھیں میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"ہم بھی آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ ہمیں ان کاغذات کے بارے میں بتا دیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں گے۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی لیکن آپ براہ کرم میری زندگی بچائیے وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"کون؟"

"نوبل شارمن۔"

"ڈیڈ کراس۔"

"ہاں۔"

"یہی اس کا نشان ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"یہیں اسی شہر میں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کس جگہ۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں آپ کو یہ فون جو رکھا ہے سامنے، میری اس پر اس سے بات ہوئی تھی۔'' صوفی نے اس وقت فون کو دیکھا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''بیوقوفوں نے کتنی ہی بار مجھے اپنی حماقتوں کی وجہ سے نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کمرے سے فون کی لائن کاٹ دی جائے تو آپ نے اس کا مقصد ہے فون کیا ہے کسی کو۔''

''ہاں لیکن اس فون نے میری کایا پلٹ دی ہے۔''

''وہ کیسے.....؟''

''میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔ شارمن کے بارے میں مجھے اندازہ ہے کہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ آپ نے اس کا نام لیا تھا اور میں بھی جانتی ہوں کہ شارمن آپ سے خوف زدہ ہے۔ کیوں خوف زدہ ہے یہ میں نہیں جانتی۔ بہرحال آپ جانتے ہیں کہ وہ ایک تخریب کار ہے اور یہاں وہ کسی خاص منصوبے کے تحت آیا ہے، لیکن وہ آپ سے خوف زدہ ہے۔ شارمن کا یہاں مینجر ایس ایس سجادی تھا۔ وہ شخص جو آپ کے دروازے پر جا کر مرا، شارمن نے اسے ایک خاص قسم کا زہر دیا تھا اس زہر کے اثرات مرنے کے بعد ستم سے ختم ہو جاتے ہیں۔ شارمن آپ کو روشنی میں لانا چاہتا تھا۔ وہ آپ کو باعمل کر کے آپ پر نگاہ رکھنے کا خواہش مند تھا۔ یعنی یہ کہ پہلے چونکہ اس کے اور آپ کے درمیان کوئی ٹسل رہ چکی ہے وہ چاہتا تھا کہ آپ براہ راست اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تاکہ وہ آپ سے ہوشیار رہے۔ یہ صورت حال تھی۔ اس نے اس لیے ایس ایس سجادی کو آپ کے دروازے پر قتل کروا دیا لیکن کچھ ایسے کاغذات جو سجادی کے پاس تھے۔ وہیں عمارت میں رہ گئے اور وہ پریشان ہو گیا کہ کہیں وہ کاغذات آپ کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ یہ ہے ساری کہانی، لیکن میں چونکہ ان کاغذات کے حصول میں ناکام رہی اور آپ کے ہتھے چڑھ گئی اس لیے وہ مجھے قتل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرے گا۔ وہ اسی قسم کا انسان ہے۔

صوفی صاحب میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں ان کاغذات کے بارے میں بھی جو شارمن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بہ شرطیکہ شارمن فوراً ہی وہاں نہ پہنچ گیا ہو اگر آپ وہاں جائیں گے، تو بھی اس کی آپ سے وہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں۔'' صوفی پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''شارمن سے یہاں آپ کی ملاقات ہوئی مس رینا۔''

''نہیں۔ وہ خود عام لوگوں کے سامنے نہیں آتا لیکن پھر بھی میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔''

''تنہا ہے یہاں۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے ساتھ تین اور اسرائیلی جاسوس آئے ہیں۔ باقی کام مقامی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔''

''یہ مقامی لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''جو یہاں اس گروپ کو چلا رہا ہے۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''طاہر شاہ اگر تم نے اس کا نام سنا ہو۔''

''طاہر شاہ۔''

''ہاں بہ ذات خود بزرگ بنا رہتا ہے پیری مریدی کا چکر چلا رکھا ہے اس کے مریدوں کا ایک گروپ ہے جو جرائم پیشہ گروپ ہے اور بڑے پیمانے پر کام کرتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ شہر میں ہونے والے بے شمار ہنگاموں میں طاہر شاہ گروپ کام کرتا ہے۔''

''گڈ طاہر شاہ کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائے گی مگر تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم؟''

''مجھے شارمن کے بارے میں کیسے معلوم میرا مطلب ہے ڈیڈ کر اس میں سب کچھ مجھے بتایا گیا تھا۔''

''معاوضہ کیا ملتا ہے؟''

''بہت زیادہ اتنا کہ کسی اور کام میں نہیں مل سکتا۔''

''کیا کیا ہے اب تک درویشوں کے کرم سے۔''

''یقین کرو چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا لیکن یہ بات پہلے بتا دی گئی تھی کہ اگر دیے ہوئے کام کے سلسلے میں ناکام رہی تو گولی مار دی جائے گی۔''

''کون کون ہے۔''

''کہاں۔''

''میرا مطلب ہے تمہارا کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں ہے بہت دور گاؤں میں ایک خالہ اور اس کے بچے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے پروان چڑھایا۔ ان کی دیکھ بھال میں ہی کرتی ہوں پیسے بھیجتی ہوں باقاعدہ۔''

''یہاں اور کوئی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''جینا چاہتی ہو؟''

''کون نہیں چاہتا!''

''تو پھر ٹھیک ہے یہاں رہو اور خبردار ذرا ہوشیار رہنا میں جب چاہوں گا تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔ خود اگر نکلنے کی کوشش کرو گی تو میرا خیال ہے یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ شارمن گروپ سے کم نہیں ہیں۔ ویسے فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''اور کوئی معلومات؟''

''یہاں کوئی مزار بنا رکھا ہے اس نے جعلی مزار ہے۔''

''اوہو.....اوہو پیر ڈھکن شاہ۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کبھی گئی نہیں ہو؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں۔ بھلا عورتوں کا وہاں کیا کام؟" لڑکی نے بتایا اور صوفی گردن ہلا کر خاموش ہو گیا۔ بہر حال ایک دلچسپ صورت حال سامنے آ گئی تھی۔

♥......♥......♥

صوفی اپنے نئے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس گھر کو بھی گرین ولا کا نام دیا گیا تھا۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی حسینہ کی بھیانک صورت نظر آئی تو صوفی کے منہ سے نکلا۔

"جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو درویشوں کی دعاؤں سے۔" حسینہ نے یہ بڑبڑاہٹ سن لی تھی اور ترکی بہ ترکی بولی۔

"لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اللہ شیطان سے محفوظ رکھے۔"

"سبحان اللہ۔ اس گھر میں بڑا مذہبی ماحول پیدا ہو گیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اے خاک پڑے اس گھر پر۔ یہ گھر ہے یا بوچڑ خانہ۔"

"آپ کو یہاں بوچڑ کون نظر آتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو نصیب کا پھیر ہے۔ کہیں نیلے رحیم شاہ صاحب جی تو پوچھوں گی کہ بھیا ہم نے تو ہمیشہ نمک حلالی کی ہے یہ مرنے سے پہلے ہی جہنم میں کیوں بھجوا دیا۔"

جا سکتی ہیں آپ جب آپ کا دل چاہے۔ ہم تو آپ کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اپنی جھاڑو پھری صورت کو دیکھا ہے کبھی ملا دو پیازہ لگتے ہو پورے کے پورے صبح کو اٹھ کر شکل دیکھ لو تو دن بھر روٹی نہ ملے۔"

"آپ کو اپنے کالی بلا ہونے کا احساس نہیں ہے۔ کالونج پھری ہوئی ہے آپ کی شکل پر دل تو چاہتا ہی نہیں ہے کچھ اور کہنے کو سوائے کالونج کے۔"

"اے تو کہتا کون ہے تجھ سے کہ تم کچھ کہو۔ اونٹ کے پہلوٹی کے بیٹے۔ کسی کو دکھاؤ تو سہی اپنے آپ کو ہاتھ کہیں جا رہے ہیں، پیر کہیں جا رہے ہیں، گردن شتر مرغ کی طرح آگے بڑھی ہوئی اور اوپر سے یہ چکا۔ میں کہتی ہوں۔"

"کچھ نہیں کہتیں آپ، جس قدر جلد ہو دفعہ ہو جایئے یہاں سے۔"

"جاتی ہے میری جوتی۔" حسینہ نے انگوٹھا دکھا کر کہا۔

"بے شک جوتی پہن کر جایئے۔ اس جوتی میں آپ کے پاؤں ضرور ہونے چاہئیں۔"

"کیا جرائم پیشہ لوگوں میں آ پھنسی۔ میں کہتی ہوں یہ پولیس والے ہر وقت ادھر ہی کے چکر کیوں لگاتے رہتے ہیں۔"

"پولیس والے......؟"

"اور کیا تمہارے چچا ماموں......"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے کالونج بیگم۔ جب سے آپ تشریف لائی ہیں اسی طرح کے گھٹیا لوگ

یہاں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اپنے نام کی کافی تشہیر کر ڈالی ہو یا پھر لوگوں نے آپ کی ہولناک صورت دیکھ کر ایک دوسرے کو بتانا شروع کر دیا ہو کہ اس گھر میں چڑیلوں کا بسیرا ہے، مگر آپ کسی پولیس والوں کی بات کر رہی تھیں۔"

"وہ جنید جمشید مرزا۔ باپ کے گھر کی طرح منہ اٹھائے گھسے چلے آتے ہیں۔ دھمکیاں دیتے ہیں مجھے۔"

"آئے تھے......؟"

"تو اور کیا جھک مار رہی ہوں؟"

"ہوں کیا کہہ رہے تھے......؟"

"اے ڈکیت کو ہی پوچھ رہے تھے۔ بھیا ارے چوری ڈکیتی کرتے ہو تو پہاڑوں اور غاروں میں جا کر رہو۔ کھیتوں کھلیانوں میں جا کر رہو۔ عجب دیدہ دلیر ڈاکو ہو۔ شہر کی آبادی میں دھڑلے سے رہتے ہو۔ نا بابا نا۔ ایسا تو نہیں چلے گا۔ سوچنا پڑے گا اور کرنا پڑے گا۔"

"خیر جمشید مرزا صاحب کو ذرا دیکھنا ہوگا۔" صوفی کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے حسینہ بیگم کہ آپ نے کچھ اچھا سا کھانا وغیرہ پکایا ہوگا۔ اس سے تو مومن خان کا ہوٹل ٹھیک تھا۔ بھوکے ہوتے تھے تو دس منٹ میں کھانا آ جاتا تھا۔"

"دس منٹ میں آتا تھا نا۔ جاؤ اندر جا کے بیٹھو پانچ منٹ میں آیا جاتا ہے۔" حسینہ بیگم نے کہا۔

"فراغت حاصل کرنے کے بعد صوفی اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیلی فون کے قریب پہنچا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی سے رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے کہا۔

"احقر بول رہا ہے الباروس صوفی۔"

"جی ہاں بس دعائیں درکار ہیں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل زندگی گزر رہی ہے۔ جی ہاں جی ہاں ایک نام نوٹ فرمایئے گا۔ جی ظاہر ہے آپ کے شعبے کے مطابق آپ کو زحمت دی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ جی نام جمشید مرزا ہے۔ جی ہاں آپ کو تو پتا ہی ہے ایس پی کے عہدے پر فائز ہیں۔ جی۔ جی...... جی بالکل ہاں بس ذرا ان کی خفیہ معاملات کی ضرورت ہے ہم جانتے ہیں آپ کا ادارہ اس سلسلے میں بڑا نیک نام ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ جی...... جی چیک کوریئر کے ذریعہ بھجوا دیا جائے گا لیکن معلومات جلد از جلد درکار ہوں گی۔ شکریہ۔

"صوفی نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر دوبارہ ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ نمبر گرین ہاؤس کے تھے۔

"شازیہ سے رابطہ قائم ہوا تو اس نے کہا۔

"عزیزہ شازیہ ہم بول رہے ہیں۔"

"جی چھوٹے بابا حکم۔"

"شازیہ کھیل کھیلنا ہے آپ کو درویشوں کے کرم سے۔ ایک مزار ہے بابا پیر ڈھکن شاہ صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا۔ یہاں کے سجادہ نشین طاہر شاہ صاحب ہیں۔ غلام قادر اور دلاور کو ساتھ لے کر عقیدت مندوں کی حیثیت سے ڈھکن شاہ کے مزار پر چلے جاؤ۔ یہاں پر مکمل نگرانی کرنی ہے۔ میرا رابطہ رہے گا بلکہ ایسا کرو شازیہ کہ پورا کھیل کھیلو۔ تم مریضہ ہو۔ ہوش، حواس قائم نہیں ہیں۔ غلام قادر اور دلاور تمہیں لے کر وہاں جاتے ہیں اور بابا ڈھکن شاہ کے مجاور طاہر شاہ سے شازیہ کا علاج کرانا چاہتے ہیں۔ طاہر شاہ صاحب جو مانگے پوری کر دینا پیسوں کی پرواہ نہیں ہے۔ کہو کیسی رہے گی اداکاری۔ یہ اداکاری کر سکتے ہو نہ تم لوگ۔"

"جی چھوٹے بابا۔ آپ نے شازیہ کو حکم دیا ہے کبھی مایوس کیا ہے آپ کو۔"

"درویش رحم کریں۔ غلام قادر اور دلاور کو بھی سمجھا دینا۔"

"ٹھیک ہے چھوٹے بابا۔"

"خدا حافظ۔" صوفی نے کہا اور فون بند کر کے نیم دراز کیفیت میں آ گیا لیکن اسی وقت حسینہ اندر آ گئی۔

"چلیے تیار ہے کھانا۔"

"کیوں مذاق کر رہی ہیں کالو نچ بیگم۔"

"اے کالے تو اللہ کے پیارے ہوتے ہیں۔ چلیے اٹھیں۔ سمجھا نہیں ہے آپ نے ہمیں ابھی تک۔" صوفی کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا تھا۔

♥.....♥.....♥

جمشید مرزا نے معشوق نشیلے کو لاک اپ سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس کی آنکھوں میں بھوکے بلوں جیسی کیفیت تھی۔ صوفی نے واقعی اسے اتنا زچ کر دیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر صوفی کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا، حالانکہ شاہ میر خان صاحب کی طرف سے اسے وارننگ بھی ملی تھی لیکن جمشید مرزا اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے اس وارننگ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بہرحال معشوق نشیلے جمشید مرزا کے سامنے پہنچ گئے۔

"اصل نام کیا ہے تمہارا۔ نا میں تمہیں معشوق کہہ سکتا ہوں اور نا نشیلا۔ دونوں چیزیں حرام ہیں۔ تم جیسے منحوس صورت آدمی کو معشوق کہنا کوئی گدھا ہی پسند کرے گا اور اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم نشے میں ہو یا رہتے ہو تو میں تمہاری کھال اتروا کر تمہارے پیروں میں ڈال دوں گا۔"

"حضور من۔ مالک ہیں آپ۔ میں تو محکمہ پولیس کے اس قدر اختیار رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے بغیر کسی جرم کے مجھے گرفتار کر رکھا ہے۔"

"اختیارات کے قائل نہیں ہو۔ چلو مرغا بن جاؤ۔" جمشید مرزا نے کہا اور معشوق نشیلے کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ بولا۔

"یہ صحیح الدماغی کی نشانی نہیں ہے۔ آپ کسی انسان کو مرغا بنا کر رکھ سکتے ہیں تو پہلے یوں کریں کہ اس کانسٹیبل کو مرغا بنا کر دکھائیں۔ ہم بھی بن جائیں گے۔"

"بہت سرکشی کر رہے ہو تم۔"

"حد ہوتی ہے جناب ایک شعر ہے اس سلسلے میں۔"

ناکاشم اوں ناباشم آں
نارخشند دم ناکم لونا

"کیا بکواس ہے؟" جمشید مرزا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"فارسی ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"واقعی تمہاری شامت ہی آ رہی ہے۔ میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا لیکن یہ سمجھ لو اگر اٹھ گیا تو چمڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

"روایتی باتیں روایتی باتیں۔ رقیص دم دار نادارم، ناکفالت۔"

"ابے یہ کون سی فارسی ہے۔ گدھے کی دم۔" جمشید مرزا غصے سے دھاڑا پھر اس نے انسپکٹر رازی کو آواز دی۔

"انسپکٹر راضی۔" رازی اندر داخل ہو رہا تھا۔ سامنے آ کر اس نے سیلوٹ کیا۔

"یار یہ میرے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ اس سے پوچھو صوفی کہاں ملے گا؟"

"حضور یہ سوال تو آپ بھی کر سکتے تھے۔ اگر صوفی صاحب اپنے گھر میں نہیں ملے تو پھر آپ کو وہ ممن خان صاحب کے ہوٹل میں ملیں گے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں سر۔" انسپکٹر رازی نے کہا۔

"وہاں کیوں ملتا ہے وہ۔"

"سران کا پرانا گھر وہیں ہے۔" انسپکٹر رازی نے جواب دیا۔ جمشید مرزا کے چہرے پر نفرت کے نقوش پھیل گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"ایک بار میں اسے لاک اپ میں ضرور ڈالوں گا۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں مصروف ہوں اس وقت جیسے ہی فرصت ملے گی ہم اس کے اس پرانے گھر پر ریڈ کریں گے۔"

"ان صاحب کا کیا کیا جائے؟"

"لاک اپ میں ڈال دو۔ فی الحال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا، اسے ساتھ لے کر ہی چلیں گے۔" جمشید مرزا نے کہا۔

پھر فرصت دوسرے دن ہی ملی تھی۔ جمشید مرزا صوفی کے اوپر بری طرح خار کھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے ہر طرح کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انسپکٹر رازی معشوق نشیلے اور کچھ نفری کو ساتھ لے کر وہ صوفی کے اس گھر کی جانب چل پڑا جو روایتی حیثیت کا حامل تھا۔ یقیناً شامت آئی تھی، لیکن کس کی.....؟

گلی کے لوگوں نے درجنوں بار ایسے کھیل دیکھے تھے۔ صوفی کے مخالف بڑے کر و فر کے ساتھ صوفی پر حملہ آور ہوتے تھے اور اس کے بعد اسی کر و فر کے ساتھ ان کی واپسی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس شکل میں کہ عموماً وہ سر کھجا رہے ہوتے تھے۔ جو پتا جمشید مرزا کو معشوق نشیلے سے ملا تھا وہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ پولیس کی دو جیپیں جب محمد خان کے ہوٹل کے سامنے آ کر رکیں تو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں اس طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھ گئیں اور کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ صوفی کے گھر کا دروازہ تو خیر کبھی بند نہیں ہوتا تھا بلکہ جیسا کہ یہاں آنے والوں کو اس محلے کے بارے میں پتا چلا تھا کہ یہاں گھر کے دروازے بند نہیں ہوتے تو اسی کے مطابق اس وقت بھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر رازی نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

''کوئی ہے؟''

''درویشوں کا کرم ہے۔ کون صاحب؟'' اندر سے آواز آئی اور انسپکٹر رازی نے پلٹ کر جمشید مرزا کی طرف دیکھا اور گردن ہلا دی۔ مقصد یہ تھا کہ صوفی کی آواز اندر سے آئی ہے۔ یقیناً وہ اندر موجود ہے۔ جمشید مرزا نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور پھر انسپکٹر رازی سے کہا۔

''پولیس لگا دو چاروں طرف سے وہ بھاگنے نہ پائے۔'' چاروں طرف تو خیر پولیس کیا ہی لگتی صرف دو پولیس والے ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر کے پیچھے چلے گئے تھے باقی صوفی کے گھر کے آس پاس لگ گئے تھے۔ دو رائفل تان کر محمد خان کے ہوٹل پر بھی کھڑے ہو گئے تھے اور اس کے بعد جمشید مرزا انسپکٹر رازی اور دو سب انسپکٹر بغیر اجازت اندر داخل ہو گئے پہلے انہوں نے رائفلیں تانی ہوئی تھیں۔ اندر کا منظر قابل دید تھا۔ صوفی اوپر بدن سے ننگا تھا۔ نچلے جسم پر ایک اونچا سا تہمبند بندھا ہوا تھا اور وہ اپنے بنیان سے جوئیں نکال رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ بنیان ایک طرف رکھا اور مدہم لہجے میں بولا۔

''درویش رحم کریں۔ کیا آپ کے پیچھے کتے لگے ہوئے ہیں؟''

''کھڑے ہو جاؤ۔'' جمشید مرزا ڈپٹ کر بولا۔

''باہر جائیے آپ..... لل..... لنگی میں ہیں اور ہم ہمیشہ لنگی کو کس کر باندھنے میں ناکام رہے ہیں۔ یقیہ ذمے داری آپ پر ہوگی۔ دونوں اے ایس آئی ہنس پڑے۔ انسپکٹر رازی نے بہ مشکل تمام اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ لیکن جمشید مرزا کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''خوب اس کا مطلب ہے کہ آپ مذاق فرمانا بھی جانتے ہیں۔''

''مذاق تو آپ نے فرمایا ہے درویشوں کے کرم سے۔ پولیس کی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن ڈاکوؤں کی طرح گھر میں گھس آئے ہیں۔ کیا آپ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کون سے قانون کے تحت آپ اس گھر میں گھسے ہیں اور وہ بھی اس جارحیت کے ساتھ۔''

''صوفی صاحب ایک بات میں آپ کو بتا دوں میں نہیں جانتا کہ کس حوالے سے آپ اعلیٰ حکام تک پہنچ گئے تھے لیکن رات گئی بات گئی۔ غلط فہمی دل سے نکال دیجیے۔ اپنی توہین پر اپنے عہدے کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔ لیکن آپ کا وہ حشر کروں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔'' صوفی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ البتہ پیٹ پر بندھے ہوئے تہمبند میں اس نے مضبوطی سے گرہ لگائی تھی اور پھر وہ بولا۔

''تشریف رکھنے کے لیے کیا کہوں آپ سے۔ اس خانہ بے تکلف میں عمدہ فرنیچر تو ہے نہیں۔ یہ چارپائی پسند کریں تو حاضر ہے۔ البتہ بنیان سے کچھ جوئیں فرار ہو گئی ہیں اور اس چارپائی کے بانوں ہی پر کہیں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ ہم تو تلاش کرنے میں ناکام رہے درویشوں کی دعاؤں سے آپ کو نظر

آ جائیں تو ان کی ہلاکت کا انتظام خود فرما لیجیے گا۔ باقی آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ نہ آپ اپنے عہدے کو داؤ پر لگائیے نہ ہم اس کی فرمائش کریں گے۔ چلیے اب گدھوں کی طرح منہ اٹھا کر گھس ہی آئے ہیں تو ذرا بتائیے کہ آنے کی وجہ کیا ہے؟'' انسپکٹر رازی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں جمشید مرزا کی طرف دیکھا۔ جمشید مرزا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا البتہ اے ایس آئی نے چند قدم پیچھے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ ایس پی صاحب کی صحیح قسم کی بے عزتی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ جس قدر بھی گرم نہ ہو جاتے کم تھا۔

''میں آپ کو صرف ہتھکڑیاں نہیں بلکہ پیروں میں بیڑیاں لگا کر لے جاؤں گا کیا سمجھتے ہیں آپ؟''

''ایس ایس سجادی کے قتل کا الزام میں آپ پر عائد کرتا ہوں۔''

''آپ چشم دید گواہ تھے۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔''

''بہتر، اور.....''

''اور اس کے بعد آپ پولیس کے دو اعلیٰ افسروں کو اس مکان میں بند کر کے نکل بھاگے تھے۔''

''جی۔''

''میں نے آپ کے کارکن معشوق نشیلے کو لاک اپ میں بند کر رکھا ہے، آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے ایک ایک آدمی کے بدن کی کھال اتار دوں گا۔''

''الٹا لٹکا کر۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''یہ بھی کر کے دکھا دوں گا۔''

''نہیں میں نے کسی اور مقصد کے تحت کہا تھا میرا مطلب صرف یہ تھا کہ محکمہ پولیس میں آنے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟'' بات انسپکٹر رازی کی سمجھ میں آئی تو اس کا منہ بے اختیار ہنسی کے لیے کھل گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ ادھر دونوں سب انسپکٹروں کا برا حال تھا۔ وہ ہنسی روک رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا تھا جب کہ جمشید مرزا زندگی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ صوفی نے کہا

''مرزا جی سب سے برا کام آپ نے یہی کیا ہے کہ معشوق نشیلے جو فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور آپ سمجھتے کہ زمانہ قدیم کے بعد درویشوں کی دعاؤں سے فارسی کی شاعری کم از کم ایشیا میں نہیں بلکہ ہمارے وطن میں ختم ہو گئی ہے۔ اب تو اونگے بونگے شاعر شاعری کرتے ہیں اور اب تو ان کا انداز بیان بس اب آپ سے کیا عرض کریں درویشوں کی دعاؤں سے۔ بھلا بتائیے۔ ترارورہ، ترارورہ، ترارورہ، ہنچک، ہنچک، ہنچک۔ یہ شاعری کی کون سی صنف ہے اور ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟''

''ہتھکڑیاں لگا دو۔'' جمشید مرزا نے سب انسپکٹروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ایک منٹ، ایک منٹ، ایک منٹ۔ آپ نے سارا کیا دھرا چوپٹ کر دیا درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہم تو آپ سے ایک بہت ہی دل کش اور دلچسپ سودا کرنے والے تھے اور آپ یقین کریں کہ اگر آپ یہاں تشریف نہ لاتے تو بس ہم آپ سے رابطہ کرنے ہی والے تھے۔ اصل میں دو افراد ہمارے ہاتھ لگ گئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں، جن کا تعلق بدر ٹریڈرز سے ہے اور بدر ٹریڈرز والے، ہمیں ساری تفصیل بتا چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ انہوں نے اپنی فرم کو دیوالیہ قرار دے دیا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد رہائی عطا فرما دی تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے اور اس کے عوض آپ نے پچاس لاکھ روپے لیے تھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اصل میں بڑے ہی نالائق لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کا وہ اکاؤنٹ جو آپ نے حیدر علی شاہ کے نام سے کھولا ہے ہمارے علم میں آ گیا ہے اور حیدر علی شاہ کے بارے میں مکمل تحقیق ہو چکی ہے کہ اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ پچاس لاکھ روپوں سے تو خیر آپ کو ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔ لیکن حیدر علی شاہ کے جعلی شناختی کارڈ جس پر آپ کی تصویر موجود ہے کی فوٹو کاپی بینک کو فراہم کی گئی ہے مختلف کاموں میں استعمال کیا ہے۔ ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ آپ کے دستخطوں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کو جاننے کے بعد ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ آپ سے دوستی کی جائے۔ آپ جیسے کماؤ پوت کہاں ملتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھوڑا کمیشن ہم بھی لے لیں اور اگر آپ یہ کمیشن نہ دیں تو پھر یہ تمام چیزیں ہم منظر عام پر لے آئیں۔

کمال احمد ٹرسٹ کے ٹرسٹی بھی آپ کی سرپرستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں جو جو کچھ ہوتا ہے آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم بھی۔ چلیے باقی باتیں نہیں بتاتے ہم اور یہ انسپکٹر رازی ہیں۔ رازی صاحب آپ خود رازی رہتے ہیں دوسروں کو ناراض کر دیتے ہیں، مثلاً وہ کوٹھی جس پر آپ نے حال میں قبضہ کیا ہے اس کے مالک کے بیٹے کو قتل کے الزام سے بری کر کے، حالانکہ بہت سے عینی گواہ موجود ہیں۔ دو عینی گواہ اس وقت ہمارے قبضے میں موجود ہیں اور ہم.....'' صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انسپکٹر رازی جو اب تک آنکھیں اور منہ پھاڑے جمشید مرزا کے کارنامے سن رہا تھا، اپنی طرف توجہ پا کر ایک دم سکتے میں آ گیا۔ ادھر جمشید مرزا جسکی سٹی گم ہو چکی تھی اور جس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس کی سرخی ختم ہو گئی تھی۔ دہشت زدہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا اور سب سے پہلا کام اس نے سب انسپکٹروں کی طرف مڑ کر کہا۔

''تم لوگ باہر جاؤ۔'' دونوں سب انسپکٹر جانتے تھے کہ اب انہیں حکم ملنے ہی والا ہے۔ باہر نکل کر ایک نے دوسرے سے کہا۔

''اوہو یار سنا تم نے مر گئے ایس پی صاحب جان نکل گئی۔''

''مگر یار اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں ان لوگوں نے ہم تو بالکل الو کے پٹھے ہی ہیں کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔''

''بات بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''مگر.....'' دونوں سب انسپکٹر یہ باتیں کر رہے تھے اور اندر جمشید مرزا کے پیروں کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ صوفی کہہ رہا تھا۔

''جی ہاں آپ بڑے آرام سے آج کل اپنی مشکل ان کاؤنٹر حل کر لیتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ آپ یہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ چونکہ ایس ایس او ڈیپارٹمنٹ کے افسر اعلیٰ کو یہ تمام تفصیلات دے دی گئی ہیں اور ان سے کہا گیا ہے کہ اگر ہمیں کوئی خطرہ درپیش آ جائے درویشوں کی دعاؤں سے تو ان تفصیلات کو کھول کر دیکھ لیں۔ نقصان پہنچانے والے کا نام و نشان سب کچھ حاصل ہو جائے گا اور ادھر ایک تفصیلی رپورٹ

جمشید مرزا آپ کے اور انسپکٹر رازی کے نام سے وزارت داخلہ کو پہنچا دی گئی ہے اور اس تفصیلی رپورٹ میں یہ تمام چیزیں موجود ہیں لیکن سربمہر لفافے کی شکل میں۔ اصل میں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی درویشوں کی دعاؤں سے کہ ہمیں یہ سارے انتظامات کرنے پڑے ہیں۔ سب سے پہلے جمشید مرزا چند قدم آگے بڑھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ صوفی نے چونک کر کہا۔

''جوؤں سے ہوشیار۔'' انسپکٹر رازی بھی ایک دیوار سے ٹک گیا تھا۔ جمشید مرزا صوفی کو گھورتا رہا پھر بولا۔

''آپ اتنے خطرناک آدمی ہیں، یہ تو ہمیں معلوم ہی نہ تھا۔''

''درویشوں کا کرم ہے آپ کی دعاؤں سے ورنہ ہم کس قابل ہیں۔ پان کھائیے گا۔'' صوفی نے پلٹ کر ایک تپائی پر رکھی ہوئی پانوں کی ڈبیا اٹھائی اور بولا۔

''اصل میں آپ نے بڑی زیادتیاں فرمائی ہیں ذرا دیکھیے۔ یہ وہ تاریخی ڈبیا نہیں ہے جسے ہماری شخصیت کا ایک حصہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے وہ اپنے قبضے میں لے لی ہے ایک بات ہم آپ سے کہیں اگر پانوں کی ڈبیا اور وہ بٹوہ ضائع کر دیا گیا تو ہماری آپ کی مفاہمت زندگی بھر نہیں ہو سکتی درویشوں کی دعاؤں سے اگر آپ نے اسے حفاظت سے رکھا ہے تو سمجھ لیجیے کہ بات چیت کی جا سکتی ہے۔'' جمشید مرزا گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔

♥.....♥.....♥

شازیہ سے اچھی اداکاری کون کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کا بہترین کردار ادا کر رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ لباس بدن پر پورا تھا، بری طرح میلا کچیلا اور مسلا ہوا۔ دلاور اور غلام قادر بھی افلاس زدہ لوگوں کے روپ میں تھے۔ وہ ایک ٹیکسی سے اترے تھے اور پیر ڈھکن شاہ کے مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے تھے۔ غلط وقت تھا اس وقت ڈھکن کے مریض نہیں آتے تھے۔ یہ کام شام کو پانچ بجے سے شروع ہوتا تھا اور ڈھکن شاہ کا مجاور طاہر شاہ مریضوں کو دیکھتا تھا۔ احاطے میں چند افراد موجود تھے۔ انہوں نے خشک سی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا۔ شازیہ اپنے پیروں ہی سے چل کر آ رہی تھی، لیکن اس کی اداکاری اس قدر شاندار تھی کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ دماغی طور پر غیر متوازن ہے۔ اس کے منہ سے بڑبڑاہٹیں نکل رہی تھیں۔

''دے دے ولی..... ملا دے ولی۔ بچا لے ولی۔'' اس کا سر ادھر ادھر گردش کر رہا تھا۔ مزار کے احاطے کے اندر موجود لوگ دلاور اور غلام قادر کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے بھائی۔ یہ کہاں گھسے چلے آ رہے ہو۔'' غلام قادر نے خونی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی جگہ ہے یہ؟'' تم اندھے نہیں ہو دیکھ نہیں رہے کہ اس کی کیا حالت ہے اور تم یہ انداز اختیار کر رہے ہو؟''

''مم..... مطلب یہ نہیں ہے۔ طاہر شاہ صاحب تو پانچ بجے کے بعد آتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں کیا اس وقت وہ آسمانوں پر پرواز کر رہے ہوتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ شاہ جی کی شان میں یہ گستاخی۔"

"اڑے ماں قسم شاہ جی کا شان، گستاخی، گستاخی تم نہیں کیا ام پر لگتا ہے میرے کو تمہاری شان میں گستاخی کرنا پڑے گا۔ ابی کو تم دیکھتا نہیں اے کہ امارا بہن کا طبیعت کتنا کھراب اے۔ شاہ جی کو بلاؤ۔"

"آپ ادھر بیٹھیں ادھر بیٹھیں۔ ہم جا کر شاہ جی کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ وہ جیسا حکم دیں گے۔"

"اڑے تو جاؤ مڑو نہیں کہی کریں گا اطلاع۔"

"آؤ، آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔"

"یار تم عجیب باتیں کر رہے ہو۔ کیا شاہ جی اس وقت....." وہ آدمی جس نے غلام قادر سے بات کی تھی بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"چپ کرو۔ میں شاہ جی سے بات کرتا ہوں۔ آپ ادھر آ جاؤ آپ لوگ۔"

غلام قادر اور دلاور شازیہ کو لے کر..... اس احاطے کی طرف بڑھ گئے، جو ضرورت مندوں کے بیٹھنے کے لیے بنایا گیا تھا اور پھر وہ آدمی اندر چلا گیا۔ باقی لوگ کینہ توز نگاہوں سے انہیں دیکھتے رہے تھے کچھ ہی لمحوں بعد وہ اندر سے واپس آیا اور بولا۔

"ابھی پانچ منٹ لگیں گے میں نے طاہر شاہ صاحب سے کہا ہے کہ بچی کی حالت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔" پورا منصوبہ بنا کر آیا گیا تھا اور منصوبہ صوفی نے ہی پیش کیا تھا۔ احتیاط ہر چیز میں اچھی ہوتی ہے اور یہ احتیاط بہت کام آئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں اندر لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ سامنے ہی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پچھلی سمت ایک دروازہ تھا۔ سیاہ کفنی میں لپٹے ہوئے طاہر شاہ صاحب اندر داخل ہوئے تھے۔ لمبے چوڑے قد و قامت کا مالک یہ شخص چہرے ہی سے خطرناک لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خونیوں جیسی کیفیت تھی۔ اس نے سرسری سی نگاہ سے ان سب کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں شازیہ پر آ جمیں۔ شازیہ نے حلیہ تو بڑا خراب کر رکھا تھا لیکن جسمانی طور پر بہت خوب صورت تھی۔

دلاور اور غلام قادر نے اچھی طرح دیکھا کہ طاہر شاہ کے چہرے پر شیطنت ناچ اٹھی ہے۔ وہ غور سے شازیہ کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹھو۔" وہ تینوں بیٹھ گئے تو طاہر شاہ خود بھی گاؤ تکیے سے ٹک کر بیٹھ گیا۔

"ہوں..... کیا بیمار ہے یہ لڑکی۔" یہ سوال اس نے دلاور سے کیا تھا اور پھر اچانک ہی دلاور نے اس کے چہرے پر گہرے تجسس کے آثار پائے تھے۔ وہ تھوڑا سا محتاط ہو گیا۔ طاہر شاہ کچھ لمحے اس پر نگاہیں جمائے رہا اور پھر اس نے غلام قادر کو دیکھا۔

"بتایا نہیں تم نے کیا بیماری ہے اسے۔"

"اڑے ماں قسم پیر تم ہے کہ ہم ہے۔" غلام قادر نے کہا۔ طاہر شاہ سنجیدہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھنے لگا۔ جو بدستور خلا میں نگاہیں جمائے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ طاہر شاہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر شازیہ کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"تورا بویا بورا تورا۔ بس ایسا ہی ہی۔ ولیا، ولی، وول، اے۔ جی سی۔ وول۔"

"یہ کون ہے تمہاری۔" اس نے غلام قادر سے کہا۔

"بہن ہے بابا۔ ابی یار تم تو پورا ڈاکٹر ہے۔ ابی بائی بتاؤ نا پیر صاحب کو پورا کہانی۔"

"میں بتاتا ہوں شاہ جی! سچی بات دیکھی جائے تو ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہم پہلے جہاں رہتے تھے وہاں ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں نادرہ بیگم نام تھا ان کا۔ یہ ان کی بیٹی شازیہ ہے۔ بہت اچھی بچی ہے۔ نادرہ بیگم نے ہمیں اپنے گھر کے احاطے میں رہنے کی جگہ دے دی تھی۔ وہاں ہم زندگی گزار رہے تھے کہ پتا نہیں کیا ہوا ایک رات یہ دونوں ماں بیٹیاں آدھی رات کے وقت اچانک چیخنے لگیں۔ شاہ جی ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا، لیکن دونوں ایک دوسرے سے لپٹی دہشت سے چیخیں مار رہی تھیں۔ نادرہ بیگم کی وجہ سے ہم اس لڑکی کو اپنی بہن کا درجہ دیتے تھے۔ شاہ جی صبح ہوتے ہوتے تو نادرہ بیگم کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو گئے۔ چہرہ نیلا پڑ گیا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے پھر کچھ دیر کے بعد انہوں نے دم توڑ دیا اور یہ لڑکی ایسی ہو گئی۔ ہم خود معمولی سے لوگ ہیں شاہ جی علاج نہیں کرا سکے ٹھیک سے اس کا۔ سرکاری اسپتالوں میں دکھایا لیکن پیسے کے بغیر کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ شاہ جی بس آپ یہ سمجھ لو۔ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی خدمت میں لے آئے ہیں فی سبیل اللہ آپ ہی اس کی مدد کریں۔ بزرگ ہیں جی آپ۔ بلند درجہ ہے آپ کا۔ کسی کا بھلا ہو جائے تو آپ خود ہی سوچیے کتنی اچھی بات ہے۔ ہم اسے بہن کا مقام دیتے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی تو کوشش کر کے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔ اب یہ آپ کے قدموں میں ہے شاہ جی۔"

"دیکھیں گے، دیکھیں گے کہ کیا کر سکتے ہیں تم اسے چھوڑ جاؤ ہمارے پاس، ٹھیک ہو جائے گی۔"

"جی شاہ جی۔" دلاور نے کہا۔ "تم رہتے کہاں ہو آج کل۔" طاہر شاہ نے سوال کیا اور یہ..... میرا مطلب ہے یہ آدمی، طاہر شاہ کا اشارہ غلام قادر کی طرف تھا۔

"بس یہ میرا دوست ہے۔ یہی آپ کا عقیدت مند ہے اور اسی نے آپ کا پتا بتایا تھا کہ پیر دھکن شاہ کے مزار پر جاؤ۔ خود اس کا کوئی کام بن گیا تھا کوئی۔ یہ یہاں کا بہت عقیدت مند ہے۔"

"ہوں۔" میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ایسا کرو لڑکی کے لیے میں جگہ بتا دیتا ہوں اسے وہاں پہنچا دو۔ وہاں کچھ عورتیں بھی ہیں وہ اس کی دیکھ بھال کر لیں گی۔ فکر مند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے، جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے، کروں گا۔"

"اور تم کیا نام ہے تمہارا۔"

"غلام قادر۔" غلام قادر نے جواب دیا۔

"غلام قادر تم آ جاؤ آرام کرو۔" یہ لڑکی یہاں آرام سے رہے گی ہم اس کے کھانے پینے کا بھی بندوبست کر دیں گے اور اس کے علاج کا بھی۔ یہ آدمی ادھر رہے گا اور اس کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم آتے جاتے تو رہ سکتے ہیں نا شاہ جی۔"

"ہاں، صبح دس بجے اور شام کو پانچ بجے تم اسے دیکھنے آ سکتے ہو پھر تمہارا یہ ساتھی تو یہاں موجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ باہر کے معاملات تم دیکھ لو۔"

"ٹھیک ہے۔" غلام قادر نے دلاور اور شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ تمام باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں کہ کچھ فیصلے خود کیے جا سکتے ہیں اور ان کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر شازیہ کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں واقعی دو عمر رسیدہ عورتیں موجود تھیں، جنہیں ہدایت کر دی گئی۔ دلاور گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے طاہر شاہ کی نظریں پہچان لی تھیں۔ شازیہ کو اس نے جس انداز میں دیکھا تھا اس میں کوئی شرافت اور پاکیزگی نہیں تھی۔ لازمی امر تھا کہ وہ اس کے لیے دل میں برائی رکھتا تھا اور اس بات کے امکانات بھرپور تھے کہ شازیہ کے ساتھ کوئی سخت سلوک ہو لیکن اس خیال سے دلاور دل ہی دل میں ہنسا تھا کہ اگر اس نے شازیہ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو اپنی زندگی کے بدترین حادثے سے دوچار ہوگا۔ شازیہ پر اسے پورا پورا بھروسا تھا۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔ پانچ بجے کے بعد بہت سے معتقدین وہاں آئے اور طاہر شاہ نے خوب ڈرامے کیے۔ ساڑھے سات بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دلاور سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔

پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کھانے پینے کے لیے دیا گیا، لیکن دلاور کھانے کے سلسلے میں محتاط رہا تھا۔ یہ احساس اس نے نہ ہونے دیا کہ وہ کھانا نہیں کھا رہا لیکن وہ پوری طرح محتاط رہا تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً دس بجے تھے کہ دلاور شاہ نے طاہر شاہ کو دیکھا، جو خود چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ دلاور شاہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو۔" طاہر شاہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ خود اس کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"شاہ جی آپ، ادھر آ جائیے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔

"شاہ جی..... وہ....."

"رکو..... رکو، میں تمہارا نام بتاتا ہوں دلاور شاہ ہے نا تمہارا نام۔"

"شاہ جی سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔"

"ہاں دلاور شاہ بہت سی باتیں واقعی ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا اظہار ہم خود کر دیتے ہیں تم تو ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہو۔ بڑا نام تھا تمہارا اب یہ کس روپ میں نظر آ رہے ہو۔ تم اور کوئی غریب آدمی۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارا ایک علم ہے تمہارے بارے میں۔ بتاؤ دلاور شاہ کیا تم دلاور نہیں ہو۔ دلاور کی گردن جھک گئی۔ اس نے کہا۔

"ہاں شاہ جی۔ ایک سوال کرتے آپ مجھ سے، میں آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دیتا۔ میں دلاور ہی ہوں۔"

"اور یہ دلاور یہاں ڈھکن شاہ کے مزار پر کیوں آیا ہے کیا راز پوشیدہ ہے اس میں۔"

"راز نہیں جی بس انسان اسی طرح بدل جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے میری ایک کہانی ہے۔ ویسے تو میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ بیوی نے چھتیس بار کہا دلاور سے برا کام چھوڑ دے تو بال بچے والا ہے۔

شاہ جی میں نے سوچا کہ جو کام کر رہا ہوں وہ چھوڑ دوں تو کیا کروں گا۔ غربت دامن پکڑ لے گی۔ شاہ جی چھپ چھپا کر اپنے بیوی بچوں کے لیے سب کچھ کرتا رہا، لیکن پھر وہ بڑی اماں مل گئی جس کا نام نادرہ بیگم تھا۔ کچھ تھا شاہ جی اس کے اندر کچھ تھا۔ بڑے پیار سے مجھ سے بولی کہ دلاور بیٹا نہیں ہے تو میرا مگر دل چاہ رہا ہے کہ تجھے بیٹا کہوں پر بیٹا راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ بیٹا کیا تو اس رکاوٹ کو دور کر دے گا۔ دل نے کہا کہ مان لے اس کی بات۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے کام چھوڑ دے۔ بتایا تھا میں نے اسے کہ جو کچھ کرتا ہوں وہی جانتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔ شاہ جی چھوڑ دیے برے کام، ایک جگہ دلوا دی اس نے مجھے رہنے کے لیے۔ بیوی بچے وہیں ہیں خود تو مر گئی اپنی یہ بیٹی میرے لیے چھوڑ گئی۔ شاہ جی واقعی کچھ نہیں ہے میرے پاس اس کے علاج کے لیے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔"

"دلاور ایک بات بتاؤ۔"

"جی شاہ جی۔"

"دنیا اگر برائی کی طرف جائے تو اس کا بہترین خیر مقدم کیا جاتا ہے اور اگر وہ نیکیوں کے راستوں پر چل پڑے تو آخر کار موت کے وقت تک سارے معاملات ختم ہو جاتے ہیں اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی دلاور کہ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں مگر یہ سچ ہے دلاور یہ سچ ہے۔ اس لڑکی کا کوئی روحانی علاج نہیں ہو سکتا۔ روحانیت کہاں ہے؟ کیا جانتے ہو تم ڈھکن شاہ کے بارے میں کہ یہ کون تھے۔ تھے بھی یا نہیں تھے۔ کسی ضرورت مند نے یہ اینٹوں اور پتھروں کا مزار بنا کر لوگوں کے جذبات سمیٹ لیے اور کمائی شروع کر دی۔ دلاور واپس آ جاؤ اپنی دنیا میں لڑکی کو کسی اچھے اسپتال میں داخل کراؤ، اچھی ہو جائے گی۔ کوئی فضول خیال دل میں نہ لاؤ۔ کیا بیماری ہے اسے یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتا سکے گا۔ پیسہ چاہیے اس کے لیے پیسہ اگر واقعی اس کے لیے اپنے دل میں سچے جذبات رکھتے ہو۔ تو پھر علاج کراؤ۔ دلاور عجیب سی نگاہوں سے طاہر شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"شاہ جی ایک بات بتائیں گے آپ؟"

"ہاں پوچھو۔"

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"دلاور ظاہر ہے کہ ساری تفصیل تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا، لیکن اتنا ضرور بتاؤں گا کہ ڈھکن شاہ صرف ایک کہانی ہے۔ میرے پاس کوئی روحانیت نہیں ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر کچھ کام کر رہا ہوں۔ کیا تم فوری طور پر ایک لاکھ روپے کمانا پسند کرو گے۔"

"اے..... اے..... اے ایک لاکھ....." دلاور نے بدحواس ہو جانے کی اداکاری کی۔

"بہت بڑی رقم تو نہیں ہے یہ تمہارے لیے۔ لاکھوں میں کھیلتے رہے ہو تم۔"

"پرانی بات ہے شاہ جی بہت پرانی بات ہے۔ اب تو آپ یہ سمجھ لیجیے۔"

"جانتا ہوں..... جانتا ہوں تم لوگوں پر جب شرافت کا دورہ پڑتا ہے تو ایسی ہی زندگی گزارتے ہو تم۔ دلاور میں تمہیں کام دلوا سکتا ہوں۔ فوری طور پر ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس رکھو۔ میں دیتا ہوں تمہیں یہ رقم اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد تم یہ سمجھ لو کہ سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ دیکھو اگر تم دلاورانہ ہوتے اور صرف دلاور ہوتے تو بات بدل جاتی۔ لیکن مجھے نئے نئے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے اور تم مجھے کام کے آدمی نظر آئے ہو، کیونکہ میں تمہارا ماضی جانتا ہوں۔ ایک منٹ میں طاہر شاہ نے اپنے لباس سے ہزار کے نوٹ کی ایک گڈی نکالی اور دلاور شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم اپنے مسائل حل کرنے کے لیے رکھو۔ لڑکی کی طرف سے تم بے فکر رہو میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر میرا اور تمہارا ساتھ ہو جاتا ہے تو تم فکر مند نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دلاور شاہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

''واہ شاہ جی واہ۔ آیا کس لیے تھا، کام کیا کر ڈالا آپ نے۔ ٹھیک ہے لائیے بہت دن سے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اگر تقدیر نے اسی دائرے میں قید کر رکھا ہے تو میں یہ دائرہ قبول کر لیتا ہوں۔ کیا زندگی ہے۔ آ گیا واپس شاہ جی دلاورا واپس آ گیا۔'' طاہر شاہ نے مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر دلاور شاہ کا شانہ تھپتھپایا۔ پھر اس نے کہا۔

''کام فوراً کرو پرسوں اتوار ہے اور اتوار کو تمہیں ایک کام کرنا ہے؟''

''ٹھیک ہے شاہ جی میں حاضر ہوں۔'' دلاور نے کہا۔

''کھانا کھا لیا نا۔''

''جی شاہ جی۔''

''ٹھیک ہے آرام کرو، لڑکی کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ ایسا کرتے ہیں ایک آدھ دن میں اسے کسی صحیح جگہ داخل کرا دیتے ہیں۔ باقی اتوار کے دن تمہیں کام کرنا ہے اور سنو جذباتی ہونے کی کوشش نہ کرنا میرے کام برے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کسے نقصان پہنچتا ہے کسے فائدہ تم اس کی بالکل فکر نہ کرنا۔''

''جی شاہ جی آپ بالکل اطمینان رکھو۔'' دلاور نے جواب دیا۔

♥.....♥.....♥

دلاور نے غلام قادر سے ساری کہانی بیان کر دی تھی اور یہ کہانی ہاتھوں ہاتھ صوفی تک پہنچ گئی تھی۔ صوفی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ عارضی طور پر سہی جمشید مرزا اور انسپکٹر رازی ہوش میں آ گئے تھے لیکن صوفی جانتا تھا کہ پولیس والے ہیں۔ اپنی جیسی کوشش ضرور کریں گے۔ معشوق نشیلے کو بھی لاک اپ سے رہائی مل گئی تھی اور وہ سیدھے صوفی کے پاس پہنچے تھے۔

''عرض کیا ہے۔ کنوں کم کم، کنوں کم کم گھنے رستے سرا کم کم۔''

''دفع کم کم بھاگو کم کم چلو کم کم، غرق کم کم درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''واہ واہ کیا کاف اور کاف کے قافیے ملے ہیں۔''

''چلے جائیے نشیلے صاحب جمشید مرزا آنے ہی والا ہے کہہ رہا تھا غلطی سے چھوڑ دیا، ورنہ ابھی دس بارہ دن خاطر مدارات کا ارادہ تھا۔''

''مم، مگر، یعنی وہی بے قصوری غرقستی۔''

''میرا خیال ہے ابھی آنے ہی والے ہیں۔''

''دوبارہ کب ملاقات ہوگی صوفی صاحب۔''

''جیل سے واپسی پر۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''جیل سے واپسی۔''

''تو اور کیا سمجھ رہے ہو تم۔ خدا کی مار ہو سب پر۔ تھانہ، جیل، پولیس اور کچھ تو سننے کو ہی نہیں ملتا یہاں تو۔ حسینہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی۔

''ان پر ایک شعر ہو جائے۔'' صوفی نے کہا۔

''بغیر چائے کے ہو نہیں سکتا آخر یہ چائے کی ایک پیالی کیوں لائی ہیں؟''

''خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر رہی ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ ہم سمجھے نہیں۔ یعنی کہ وہی درما۔'' اچانک ہی باہر سے کسی ہارن کی آواز سنائی دی تو معشوق نشیلے ماما ہی کرتے رہ گئے اور صوفی نے کہا۔

''اب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آخر کار پولیس آ گئی۔''

''نن..... نہیں..... صوفی صاحب! یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے ساری زندگی کوئی جرم نہیں کیا۔''

''جائیے دیوار کود کر بھاگ جائیے۔ ورنہ گئے کام سے آپ۔ ہارن پتا نہیں کسی اور گاڑی کا بجا ہوگا، لیکن معشوق نشیلے صاحب جو احاطے کی دیوار کود کر بھاگے تو پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بہر حال دلاور نے غلام قادر کو ساری تفصیل بتائی تھی۔ شازیہ بھی وہیں تھی اور اس کے لیے کسی معقول اسپتال کا بندوبست ہو رہا تھا۔ صوفی نے غلام قادر کو کچھ ہدایات دیں اور غلام قادر نے یہ ہدایات دلاور تک پہنچا دیں جو ابھی وہیں رہ رہا تھا اور اسے اتوار کی صبح کام سے جانا تھا۔ اب یہ کام کیا تھا۔ یہ اللہ بہتر جانتا تھا۔ بہر حال دلاور وہیں رہ رہا تھا، لیکن نئی جو اطلاعات پہنچی تھیں ان کے تحت ہفتے کی رات کو شازیہ کو وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ پیر ڈھکن شاہ کے مزار پر آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ پہلی بات تو طاہر شاہ تک رسائی اور اس کے بعد باقی کارروائی، جس کے لیے دلاور کو ایک زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا۔

بہر حال شازیہ کو وہاں سے ہٹانے کا منصوبہ کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ سوائے اس کے کام میں طوالت ہو رہی تھی اور صوفی کے اندر یہی ایک خوبی تھی کہ وہ مختصر وقت میں بڑے سے بڑا کام کر لیا کرتا تھا۔

♥.....♥.....♥

دلاور نے یہ وقت بڑے سکون سے گزارا تھا۔ بہر حال اسے کوئی مشکل بھی نہیں پیش آئی تھی۔ اتوار کی صبح ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسے طلب کر لیا گیا۔ رات کو شازیہ کو فرار ہونا تھا لیکن ساڑھے بارہ بجے کے قریب غلام قادر کے ذریعے پیغام ملا کہ شازیہ کو ابھی یہیں رہنا ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے پروگرام میں چنانچہ دلاور مطمئن تھا۔

''بہر حال وہ مزار کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ یہاں طاہر شاہ اس کا منتظر تھا۔

''آج اتوار ہے دلاورا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی شاہ جی۔"

"پتا نہیں رہا ہوں تمہیں۔ اسے اپنے دل میں محفوظ رکھنا بات معمولی نہیں ہے۔ ذرا سی لغزش تمہاری زندگی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔"

"جی شاہ جی۔"

"سفید لائن اسٹریٹ نمبر بیس۔ وہاں جاؤ تمہارا تعارف ہو چکا ہے۔ وہاں تمہیں جو کچھ بھی ہدایت ملے اس پر عمل کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی۔ کب جاؤں؟"

"بس فوراً چلے جاؤ۔" اور دلاور وہاں سے باہر نکل آیا۔ ایک ایڈریس کا پتا چلا تھا اسے۔ فوراً ہی اس نے ٹرانسمیٹر پر صوفی کو کال کی۔

"ہاں دلاور بولو۔"

"چھوٹے بابا میں....."

"تم ابھی مزار سے باہر نکلے ہو۔ میں بذات خود تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ بولو آگے کیا ہدایت ملی ہے۔ خبردار! ادھر ادھر مت دیکھنا درویشوں کی دعاؤں سے، حالانکہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ ظاہر شاہ نے تم پر پورا بھروسا کیا ہے، لیکن احتیاط ضرورت کی بڑی اماں ہوتی ہے درویشوں کے کرم سے۔ بولو جلدی بولو۔"

"سفید لائن اسٹریٹ نمبر بیس۔"

"سفید لائن۔ وہیں جا رہے ہو۔"

"جی چھوٹے بابا۔"

"بالکل بے فکر رہنا۔ پریشانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو کچھ کہا گیا پورے اعتماد سے کرو۔"

"جی۔" دلاور کو بڑا اطمینان ہو گیا لیکن اسے حیرت تھی کہ اتنی صبح صبح صوفی اس کے آس پاس ہی موجود ہے۔ اس نے ایک ہی جملہ کہا تھا لیکن دلاور کو یقین ہو گیا تھا کہ صوفی ہزار آنکھوں سے اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ایک آٹو رکشا نے آخر کار اسے سفید لائن کے علاقے میں اتار دیا۔ ایک انتہائی خوب صورت اور جدید علاقہ تھا۔ عام طور سے اسے تفریحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں بہت سے فارم ہاؤسز بنے ہوئے تھے جنہیں دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا یہ فارم ہاؤس مختلف تقاریب کے لیے کرائے پر دیے جاتے تھے اور ان کے کرائے بے پناہ تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے خوش گوار ماحول کی وجہ سے چھوٹے مکانات بنا کر کرائے پر اٹھا دیے گئے تھے اور بعض مکانات دولت مند لوگوں نے خود بنائے تھے۔ بہر حال اسٹریٹ نمبر بیس بھی ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ دلاور کافی فاصلے پر اتر گیا تھا اور اس کے بعد بیس نمبر تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ گیا حالانکہ وہ گیارہ نمبر پر اترا تھا اور اندازہ تھا کہ بیس نمبر کہاں ہوگا۔ بیس نمبر پر پہنچ کر اس نے دروازے کی بیل بجائی۔ ایک انتہائی دراز قامت آدمی نے اسے اندر بلایا۔

"دلاور۔"

"ہاں۔"

"ادھر چلے جاؤ۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک گودام سا بنا ہوا تھا۔ اصل عمارت سامنے تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ اصل عمارت میں کون کون ہے۔ گودام نما جگہ میں داخل ہونے کے بعد اسی لمبے تڑنگے آدمی نے دلاور سے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہیں ساری تفصیل بتائے دیتا ہوں۔"

"آپ کون ہیں صاحب جی۔ آپ سے میرا تعارف نہیں ہو سکا۔"

"مجھ سے اگر کسی کا تعارف ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں ہوتے۔ میری لغت میں تعارف کا مطلب یہی ہے۔"

"اچھا..... ایسا تعارف میں نہیں چاہتا۔ کام بتاؤ۔ دلاور کا لہجہ بھی خشک ہو گیا اور وہ شخص مسکرانے لگا۔" پھر اس نے کہا۔

"اندازہ لگا رہا تھا دلاور! کہ تم اب بھی اتنے ہی گرم مزاج ہو یا کچھ ٹھنڈے پڑے ہو۔"

"کام بتاؤ کام۔"

"دیکھو تین آدمی یہاں اور آنے والے ہیں۔ تم چاروں بلیو گارڈن جاؤ گے۔ بلیو گارڈن میں سیاسی جلسے وغیرہ ہوا کرتے ہیں یا اور ثقافتی پروگرام ہوا کرتے ہیں۔ آج شام کو سات بجے وہاں ایک جلسہ ہے۔ بلیو گارڈن کو سجایا جا رہا ہے۔ جلسہ گاہ اس کے مشرقی گوشے میں ہے، وہاں حسین پودے رکھے ہوئے ہیں، تم چاروں مالی کی حیثیت سے وہاں جاؤ گے اور تمہیں وہاں بم نصب کرتے ہیں۔ باقی تین آدمی تو سادہ سادہ کام کریں گے لیکن یہ بم نصب کرنے کا کام تمہاری ذمے داری ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی تم یہ کام کرتے رہے ہو۔" دلاور کو اپنا ماضی یاد آ گیا اور اسے ایک ہلکی سی شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب جی! بم کا ٹائپ کیا ہے؟"

"ریکس۔ او۔ زیڈ۔ تم اس ٹائپ کو سمجھتے ہو۔"

"ریموٹ کنٹرول۔"

"ہاں۔"

"اور کیا کرنا ہوگا؟"

"ریموٹ تمہارے پاس رہے گا۔ جلسہ گاہ میں جب بہت سے آدمی آ جائیں گے تو ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر تم کو یہ بم بلاسٹ کرنے ہیں۔ ہوشیار رہنا تم جیسے تجربے کار آدمی سے کسی چوک کی توقع نہیں ہے۔ آؤ۔ میں تمہیں بم دیتا ہوں یہاں سے تم سیدھے بلیو گارڈن جاؤ گے اور وہاں اپنا کام کرو گے۔" دلاور نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے صاحب جی!" لمبے چوڑے آدمی نے ایک طرف رکھا ہوا کارٹن کھول لیا۔ دلاور کو جو کچھ دیا گیا اسے دلاور اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ باقی تین آدمی اس کے ماتحت تھے۔ اگر ان تینوں کو بھی بم دیے جاتے اور وہ بم ایکسپرٹ ہوتے تو دلاور کو اپنا کام مشکل نظر آتا۔ بات کافی وقت کی تھی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چنانچہ وہ مطمئن تھا۔ طاہر شاہ بھی دلاور کی جانب سے مطمئن ہی ہوگا۔ کیونکہ اس نے دلاور کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی تھی اور اسے اس کا کام سونپ دیا تھا۔ باقی تین افراد یہیں سے اسے دیے گئے اور اس کے ساتھ ہی ایک پرانی فورڈ کار بھی جسے انہی میں سے ایک چلا رہا تھا۔ اس نے دلاور کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''سر جی! بم محفوظ ہے نا۔''

''کیوں۔ کیا بات ہے کیا تمہیں یہ جملے کہنے چاہیے تھے۔''

''نہیں سر جی! میں غریب آدمی ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ حالات کی پریشانی کی وجہ سے یہ کام کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں ورنہ میں اندر سے ایسا نہیں ہوں۔''

''اگر تم نے دوسرا لفظ کہا تو تمہیں گولی ماردی جائے گی۔ تمہیں پتا ہے کہ ایسے کاموں کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاتی۔ دلاور نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی!'' وہ شخص بولا اور پھر مسکرانے لگا۔

''کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے یہ آپ کا امتحان تھا۔'' اس نے کہا۔ دلاور نفرت سے منہ سکوڑ کر خاموش ہو گیا تھا۔ بہر حال فورڈ کار بلیو گارڈن سے کافی فاصلے پر ایک جگہ روک دی گئی۔ اسی شخص نے کہا۔

''مالیوں کو مالیوں کے ہی انداز سے گارڈن میں داخل ہونا چاہیے۔ گاڑی کی ڈگی میں کھرپیاں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں، انہیں نکال لو۔'' سارے کام ہدایت کے مطابق ہی کیے گئے تھے۔ ان لوگوں کے حلیے بھی مالیوں جیسے ہی تھے، چنانچہ وہ بلیو گارڈن میں داخل ہو گئے۔ ابھی یہاں کچھ بھی نہیں تھا لیکن جلسہ گاہ کی پوری نشان دہی کر دی گئی تھی اور یہ لوگ مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تھے۔ سارے مالی کاموں پر مصروف ہو گئے۔ دلاور نے وہ خوف ناک بم نکالا جو انتہائی زبردست بارودی قوت کا تھا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بم کے تمام فیوز نکال کر جیب میں ڈال لیے۔ کسی بھی طرح کے خطرے کو وہ سامنے نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ یہ فیوز انتہائی احتیاط سے نکالے گئے تھے۔ بم کے بارے میں پوری طرح نہ جاننے والا کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

دلاور نے اپنی تمام تر مہارت کے ساتھ بم کو ایسی جگہ نصب کر دیا جہاں سے اگر وہ بلاسٹ ہوتو شدید ترین تباہی پھیلائے۔ اس کے بعد اس نے ریموٹ سنبھالا اور باقی لوگوں کو اشارہ کیا باقی لوگ بلاوجہ جو پودوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر بعد پرانی فورڈ واپسی کا سفر طے کر رہی تھی۔ دلاور نے ان کی دانست میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا وہ ان کی گڈ بک میں آ گیا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ بم کبھی بلاسٹ نہ ہوتا۔ ادھر صوفی کیا کر رہا تھا یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی، لیکن دوپہر کے بعد دلاور جب ڈھکن شاہ کے مزار پر اسی حجرے میں آرام کر رہا تھا جہاں شازیہ کو رکھا گیا تھا تو اس کی فوراً طلبی ہوئی اور طاہر شاہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''بم کا ریموٹ تمہارے پاس موجود ہے۔''

''جی شاہ جی خیر تو ہے۔''

''ہاں خیر ہے۔ اصل میں اس میٹنگ کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے جو وہاں ہونے والی تھی۔ چنانچہ اب تمہیں اسی احتیاط کے ساتھ بم وہاں سے واپس نکال لینا ہے۔''

''جی شاہ جی۔'' دلاور نے جواب دیا۔ اس طرح بات ٹل گئی تھی اور دلاور کو کچھ وقت مل گیا تھا جب کہ طاہر شاہ نے اس سے ملاقات کر کے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ بہر حال اس نے اپنا کام بہ خوبی سرانجام دے لیا ہے البتہ صوفی اپنے طور پر ادھر ایک کام سرانجام دے رہا تھا، چنانچہ سفید لائن کی کا ٹیج نمبر 20 کے سامنے ایک بہت ہی قیمتی گاڑی خراب ہو گئی اور ڈرائیور اتر کر احمقانہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ ایک ہونق سا آدمی تھا۔ شیروانی پاجامے میں ملبوس منہ میں پان کا ملغوبہ بھرا ہوا۔ سفید لائن کے چوکیدار نے اتفاقیہ طور پر اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ دیر تک ڈرائیور کو دیکھتا رہا پھر جیسے ہی ڈرائیور کی نگاہ اس پر پڑی اس کی آواز ابھری۔

''ماں او بھائی۔ بھائی جان۔ بھائی صاحب بھائی میاں، ذرا میری مدد فرمائیے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی درویشوں کے کرم سے۔ چوکیدار برا سا منہ بناتے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔''

''یہ گگ گاڑی...... گگ، کک کباڑہ درویش۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''پپ...... پتا نہیں۔''

''تمہاری گاڑی ہے؟''

''مذاق اڑا رہے ہو میرا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا......'' چوکیدار نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

''میری صورت تمہیں ایسی نظر آ رہی ہے کہ میں ایسی گاڑی کا مالک ہوں گا؟''

''تو پھر کہیں سے چرا کر لائے ہو؟''

''درویش رحم کریں۔''

''کیا درویش درویش لگا رکھی ہے۔ بات کیا ہے یہ بتاؤ اور گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔ ہمارے صاحب لوگ آتے جاتے ہیں۔ ہماری ڈیوٹی ہے۔''

''تت...... تو ذرا دھ...... دھ...... دھکا لگا کر آگے کرا دیجیے، میرے ناف نلے خراب ہیں درویشوں کے کرم سے میں خود۔''

''چلو، چلو۔'' چوکیدار نے اپنی رائفل فٹ پاتھ کے ساتھ لگے ہوئے ایک چھوٹے سے درخت سے لگائی اور گاڑی کے پیچھے آ گیا۔

''بونٹ تو بند کر دو بے وقوف آدمی۔ اس نے کہا۔

''جج، جی ہاں۔'' شیروانی والے نے بونٹ بند کیا اور پیچھے آ گیا۔

''ارے کیا گاڑی ناک کی سیدھ میں لے جاؤ گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس آپ تھوڑی سی آگے کرا دیجیے تا کہ آپ کے صاحب کا موڈ خراب نہ ہو۔ شیروانی والے نے کہا اور قوی ہیکل چوکیدار جھک کر گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس نے کوئی نیک کام کیا تھا جس کا صلہ اسے ملا۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی ہی طاقت ور تھی کہ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ دونوں ہاتھ پیچھے اور سر گاڑی سے جا لگا، لیکن دوسری اور پھر تیسری ضرب نے باقی تکلیفوں سے آزاد کر دیا۔ قوی ہیکل جسم کا مالک تھا لیکن شیروانی والے ڈرائیور نے اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔ کندھوں پر لاد کر وہ آگے بڑھا، دروازہ کھولا اور چوکیدار کو کار کی پچھلی سیٹ پر ٹھونس دیا۔ رائفل اٹھا کر گاڑی میں ڈالی اور اس کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر ہوا ہو گئی تھی۔

♥.....♥.....♥

گرین ہاؤس کے خصوصی کمرے میں چوکیدار کو ہوش آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ پلکیں جھپکتا رہا اور اس کے بعد ایک دم آنکھیں پھاڑ کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے ہی دو افراد بیٹھے ہوئے تھے جو اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ چوکیدار نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم، مجھے یہاں کون لایا ہے، میری رائفل کہاں ہے۔" اس نے جلدی سے اپنی پیٹی پر اپنا پستول تلاش کیا لیکن کپڑوں کے علاوہ کوئی چیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ دونوں افراد سنبھل گئے۔ چوکیدار نے ان کے ہاتھوں میں پستول دیکھے تھے۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے تم سے کچھ سوالات کیے جائیں گے۔" ابھی سامنے والے آدمی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہی ڈرائیور اندر داخل ہوا جو اسے بے ہوش کر کے یہاں تک لایا تھا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر دانت پیسنے لگا۔

"تو تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"صوفی صاحب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"اماں کیا پیٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بیٹھو ذرا، یہ صاحب ہمیں کچھ بتائیں گے بھائی صاحب کیا نام ہے تمہارا؟" صوفی نے بڑے نیاز مندانہ انداز میں پوچھا۔

"میں تجھے بتاؤں کہ میرا کیا نام ہے؟" چوکیدار غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہی درخواست کی ہے ہم نے آپ سے۔"

"قریب آؤ بیٹا اور ان دونوں سے کہو کہ ہمارے معاملے میں مداخلت نہ کریں۔ اگر تم پوچھ سکتے ہو پھر مجھ سے جو جی چاہے پوچھ لو اور اگر میں تمہاری چغلی بنا دوں تو پھر مجھے جانے دینا۔"

"عادل، فیضان تم لوگ کچھ نہیں بولو گے۔ کم از کم یہ حق ان صاحب کا ہے کہ ہمارا اور ان کا براہ راست رابطہ رہے۔" صوفی نے کہا اور شیروانی کے بٹن کھولنے لگا۔ اندر سے عجیب چیز برآمد ہوئی تھی اسے دیکھ کر چوکیدار کو ہنسی آنے لگی۔ اس نے بھی اپنی آستینیں وغیرہ چڑھا لیں۔ صوفی قریب پہنچ گیا۔

"دیکھیے کسی بھی شرط کے سلسلے میں ایمان داری پہلی شرط ہوتی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر

آپ ہمیں مارنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر ہمیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

"ہاں وعدہ کیا ہے اور تم نے بھی وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے تمہارا حلیہ خراب کر دیا تو تم مجھے جانے دو گے۔"

"بالکل بہ خدا بالکل ایمانداری سے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا۔ فیضان اور عادل دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ یہ بات تو پورے اعتماد کے ساتھ پتا تھی کہ کیا ہونے والا ہے؟ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسا عجیب و غریب روبوٹ ہے جو خالص اسٹیل سے بنا ہوا ہے لیکن بنانے والے نے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ہے۔ چوکیدار کو اپنے قد و قامت پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور کسی اندھے بھینسے کی طرح اس نے صوفی کے سینے پر ٹکر مارنے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی صوفی ہی کا کمال تھا کہ اس نے صرف اس کے سامنے سے ہٹنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ ذرا سا اپنی جگہ سے ہٹ کر چوکیدار کی گردن اپنی بغل میں لے لی۔ اس کے بعد جو تماشا ہوا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔

ہر بار ایک نیا ہی کھیل سامنے آیا کرتا تھا گرین فورس کے ممبروں کا۔ صوفی نے اس کی گردن پکڑی ہوئی تھی اور وہ صوفی کے پیٹ میں گھونسے مار رہا تھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چوٹ اسی کے ہاتھ میں لگ رہی ہے۔ صوفی تو ہل بھی نہیں رہا تھا۔ ڈرائیور نے جب مار پیٹ سے کوئی فائدہ ہوتے نہ دیکھا تو اس نے صوفی کو اپنے بدن کی قوت سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ پھر تو وہ عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اب وہ صرف اپنے آپ کو صوفی سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی دس منٹ تک وہ شدید جدوجہد کرتا رہا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں لٹک گئے۔ پاؤں گھٹنے لگے، بے ہوش تو نہیں ہوا تھا لیکن نیم بے ہوشی کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، کیونکہ بہت دیر سے گردن صوفی کے ہاتھ میں تھی۔ صوفی کی آواز ابھری۔

"اگر حکم فرمائیں تو چھوڑ دیا جائے۔" جواب میں چوکیدار کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آوازیں ہی نکلی تھیں۔ صوفی نے اسے چھوڑا تو وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا تھا لیکن اتنی سکت اس میں ضرور تھی کہ اوندھا زمین پر گرنے کے بعد وہ سیدھا ہو گیا البتہ شاید اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، چنانچہ زمین پر لیٹا پلکیں جھپکتا رہا۔ صوفی نے کہا۔

"پان نوش فرمایئے گا۔ معاف کیجیے گا پان نہیں پانی۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تو صوفی نے فیضان سے کہا۔

"اب یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ مہمان کو پانی پلایا جائے چوکیدار کو پانی پلایا گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ حیرت سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔" پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"کیا تم مشین کے انسان ہو؟"

"اللہ کے نیک بندے ہیں۔ درویشوں کا دیا کھاتے ہیں۔ آپ فرمایئے اپنی شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔"

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" چوکیدار نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

♥.....♥.....♥

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ میر خان صاحب کرنل رحیم شاہ کو بھرپور تعاون دیتے تھے چنانچہ استعمال پولیس کو ہی کیا گیا تھا لیکن اتنے بھرپور طریقے سے تقریباً آدھے دارالحکومت کی پولیس فورس نے ریڈ کیا تھا۔ سفید لائن کے کاٹیج نمبر 20 سے جس سفید فام کو گرفتار کیا گیا تھا وہ شارمن ہی تھا۔ دنیا کا چالاک ترین مجرم جس کا تعلق براہ راست تل ابیب سے تھا۔ دنیا بھر کی تمام تر کارروائیوں میں اسے حکومت اسرائیل کی بھرپور مدد حاصل ہوا کرتی تھی اور وہی اس کی پناہ گاہ بھی تھی۔ ایک مشکل مرحلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ شارمن کے نام کو منظر عام پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سلسلے میں ایک نیا ہی فارمولا پیش کیا جو صوفی کی مدد سے تیار ہوا۔ شارمن کے نام کو منظر عام پر نہیں لایا گیا بلکہ ایک اور نام سامنے کر دیا گیا اور پولیس مقابلے میں اس کی ہلاکت کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ صوفی نے اپنے ہاتھوں سے شارمن کا چہرہ مسخ کر دیا تھا تاکہ اسے پہچانا نہ جا سکے۔ یہ ایک انوکھا اختتام تھا کسی کیس کا، ورنہ اس سے پہلے ایسا کوئی کام نہیں ہوا تھا کہ کسی مجرم کی اصل حیثیت یا شخصیت بدل دی جائے۔ لیکن ضروری سمجھا گیا تھا۔ بعد میں شاہ میر خان صاحب نے کرنل رحیم شاہ اور صوفی کو بلایا تھا۔

"صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب قدرت کے کام ہوتے ہیں یعنی یہ کہ کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہو جائیں جو بے غرض اور بے لوث وطن عزیز کے لیے کام کریں اور ان کا نام بھی منظر عام پر نہ آئے۔ انہیں کوئی مالی فائدہ نہ ہو بس کیا کہا جا سکتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کے لیے میں کیا کروں۔" کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار وطن عزیز صرف تمہارا ہی تو نہیں ہے، ہم بھی اسی آسمان تلے زندگی گزار رہے ہیں۔"

♥......♥......♥

مقامی بینک کی یہ مصروف ترین شاخ تھی۔ کاروباری علاقے میں تھی اور چشم زدن میں یہاں کروڑوں آتے تھے اور کروڑوں جاتے تھے۔ عملے کے افراد کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی تھی اور اب تو دو دن کی چھٹیوں کے بعد بینک کھلا تھا چنانچہ اتنا رش تھا کہ عملے کے افراد جھنجھلا کر رہ گئے تھے۔ خوب صورت لابی میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے نشست گاہیں بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف شیشوں کے کیبن۔ اس بینک کی یہ خوب صورت ترین برانچ تھی اور اس برانچ میں وہ لمبے اور بے ڈھنگے بش کوٹ میں ملبوس شخص خاکی رنگ کی ملگجی پتلون پہنے ہوئے کندھے پر ایک بغلی تھیلا لٹکائے ہوئے داخل ہوا تھا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی خاص طور سے اس کی طرف توجہ دے۔ اس جیسے بہت سے تھے۔ بہر حال اس نے ایک کونے میں جا کر کندھے سے تھیلا اتارا اور زمین پر رکھ دیا پھر اس میں سے ایک سیاہ رنگ کا ڈبا نکال لیا۔ اس ڈبے کے نزدیک بیٹھ کر وہ اس میں کچھ کارروائی کرنے لگا۔ بینک کا چوکیدار تھوڑے فاصلے پر موجود تھا اور یہ اتفاق ہی کی بات تھی کہ اس کی نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ چوکیدار کی ڈیوٹی ہی یہی تھی کہ وہ لوگوں پر نگاہ رکھے ایسی کوئی عجیب و غریب کارروائی کرتے دیکھ کر وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بد ہیئت شخص سیاہ رنگ کے ڈبے میں لگے ہوئے تاروں کو جوڑ رہا تھا۔

چوکیدار اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کر کیا رہا ہے، لیکن اب اس کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ اس سے اس کام کے بارے میں پوچھے جو وہ کر رہا تھا چنانچہ وہ جھکا اور اس سے بولا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" چوکیدار کی آواز سخت نہیں تھی۔ نیچے ڈبے میں کارروائی کرنے والے شخص نے چونک کر چوکیدار کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"بھائی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔" چوکیدار نے پھر پوچھا۔ اس شخص کا کام شاید ختم ہو گیا تھا چنانچہ اس نے ڈبے میں لگا ہوا ایک گول بٹن ایک طرف گھما دیا۔

"یہ کیا چیز ہے؟" چوکیدار نے پھر پوچھا۔

"کیا بکواس کیے جا رہے ہو تم جو کچھ ہے سامنے آ جائے گا۔" اس نے خوں خوار لہجے میں کہا۔ چوکیدار ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور اسے گھورنے لگا۔

قریب سے اسے چوکیدار نے دیکھا تو اسے عجیب سا لگا۔ اس آدمی کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ نقوش بھی بری طرح بگڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چہرہ کسی نے کسی مشین میں رکھ کر پچکا دیا ہو۔

"کیا مطلب؟" چوکیدار نے پھر کہا۔

"بکواس بند کرو اپنا کام کرو۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا اور چوکیدار کو بھی غصہ آ گیا اور بولا۔

"سنو یہاں لوگ پیسوں کے لین دین کے لیے آتے ہیں تم یہاں بیٹھ کر کیا کوئی مشین تیار کر رہے ہو۔ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اور اگر نہ بتاؤں تو۔" وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"بتانا پڑے گا تمہیں۔"

"میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"اب بھی ہم تمہیں دفع کر دیں گے۔" چوکیدار نے غصیلے لہجے میں کہا اور ذرا ہٹ کر ادھر ادھر دیکھا اور دوبارہ اس شخص کے پاس آ گیا۔

"ابھی اگر تمہارا کوئی چیک دیک ہے تو ہمیں بتاؤ ورنہ یہ سامان اٹھاؤ اور سامان لے کر باہر نکل جاؤ۔ ادھر کوئی سامان رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ تھیلا اٹھاؤ یہ تم نے ادھر کیوں پھینک دیا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن چوکیدار کو اس کے دوسرے عمل کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے لمحے اس کا ہاتھ چوکیدار کے منہ پر پڑا اور چوکیدار کا بھیجا ہل گیا۔ ایسا زوردار ہاتھ تھا، حالانکہ چوکیدار بھی ایک قوی ہیکل آدمی تھا لیکن یہ ایسا تھپڑ تھا کہ اس کا سر چکرا گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اسے اپنے جبڑوں کی ہڈیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن بہرحال اس کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور شانے سے لٹکی ہوئی بندوق اتار لی لیکن اس سے قبل کہ وہ بندوق سیدھی کرتا اس خوف ناک آدمی نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور پھر ایک اور عجیب و غریب منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے بندوق کی نال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر موڑی اور اسے بالکل ٹیڑھا کر کے چوکیدار کے ہاتھوں میں اچھال دیا۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اس عجیب و غریب منظر کو دیکھا تھا اور حیرانی سے منہ پھاڑے رہ گئے تھے۔ پھر اس سے قبل کہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرتا وہ شخص اس سیاہ رنگ کے ڈبے کو ہاتھ میں لے کر کیش کاؤنٹر پر پہنچ گیا اور اس نے جیب سے ایک ریوالور نکالا اور کیشیئر کے سامنے رکھ کر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ میرے ہاتھ میں جو تم لوگ سیاہ ڈبا دیکھ رہے ہو، یہ ایک انتہائی طاقت ور بم ہے اور اس میں لگے ہوئے سرخ بٹن کو دباتے ہی بینک کی یہ عمارت ہوا میں اڑ جائے گی۔ اس لیے جو شخص جہاں کھڑا ہے اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑا رہے۔ اگر کسی نے بینک کے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی تو نتیجے کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔" اس کی آواز ایسی تیز اور گونج دار تھی جیسے کسی لاؤڈ اسپیکر سے نکل رہی ہو۔ یہ آواز تقریباً یہاں موجود تمام ہی لوگوں نے سنی تھی۔ کچھ تو سمجھ ہی نہیں سکے تھے کہ کیا ہو رہا ہے اور جو سمجھ گئے تھے وہ دہشت زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ بینک لوٹنے کا یہ ایک نیا طریقہ تھا جو بینک میں موجود لوگ حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نہ صرف حیران تھے بلکہ دہشت زدہ بھی تھے۔ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اگر یہ حقیقت ہے تو واقعی یہ ایک انوکھی داستان ہوگی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان دنوں سب کچھ ہو سکتا تھا خاص طور سے بم بلاسٹ تو اتنے ہو رہے تھے کہ خبریں پڑھتے پڑھتے کان پک گئے تھے۔ یہاں یہ لوگ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے بدن کے ٹکڑے نہیں ہوتے دیکھ سکتے تھے، لیکن بہرحال پھر بھی وہ لوگ جو دروازہ کے قریب تھے، دروازوں سے نکل بھاگے البتہ یہ پتا انہیں چل گیا تھا کہ بینک میں ڈاکا پڑ رہا ہے اور سڑک پر ڈاکا..... ڈاکا کے الفاظ گونجنے لگے لیکن اندر موجود تنہا ڈاکو نہایت اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ اسے کسی بھی قسم کے شور کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کینوس کا جو تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا اسے اس نے کیشیئر کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

"اسے بھرو اور سوچ لو اگر زندگی پیاری ہے تو جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ورنہ سب سے پہلے تمہاری ہی زندگی ختم ہوگی۔" لیکن کیشیئر کو زندگی پیاری نہیں تھی۔ وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہ رہ سکا، تھیلا ہاتھ میں لے کر اس نے دفعتاً فرش پر دے مارا لیکن وہ بے انتہا پھرتیلا ثابت ہوا۔ تھیلا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ اس نے تیزی سے باہر جاتے ہوئے تھیلے کو اپنے ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے پستول سے گولی چلا دی۔ گولی نے کیشیئر کا شانہ توڑ دیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ وہ سب دہشت زدہ تھے اس شخص نے پھر ایک آدمی کو اشارہ کیا جو کیشیئر کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور بولا۔

"چلو تم اٹھو اور اگر اپنی حالت اس جیسی نہیں چاہتے تو اس تھیلے کو نوٹوں سے بھر دو۔ وہ شخص کیشیئر کی طرح بہادر نہیں تھا اس لیے اس نے تھیلا پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں اس میں ڈالنے لگا۔ بینک کی عمارت کے سامنے بے شمار لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن اندر کے حالات کسی کو معلوم نہیں تھے۔ کسی نے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ پولیس والے بھی شاید قرب و جوار میں موجود نہیں تھے یا پھر اگر موجود بھی ہوں گے تو ایسے موقع پر وہ بھی احتیاط برتتے ہیں۔ فرض کی ادائیگی تو ڈاکا پڑنے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ اس شخص کا تھیلا بھر گیا اور وہ ساری دراز یں خالی ہو گئیں جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نزدیک رکھی ہوئی تجوری کے نوٹ بھی تھیلے میں پہنچ گئے تھے اور تھیلے کا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ تب اس نے تھیلے کا وزن اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنے کندھے پر لٹکا کر کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے کہا۔

"میں نے غلط نہیں کیا ہے تم لوگوں کو اگر زندگی پیاری ہے تو اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ سوچ لو تم سب لوگ اپنی موت کے ذمے دار خود ہو گے۔" ابھی اس کے منہ سے اتنے ہی الفاظ نکلے تھے کہ دفعتاً وہ رک

گیا۔ اس کا دایاں پاؤں آگے بڑھنے کے لیے اٹھا ہوا تھا لیکن وہ اسی طرح اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔ تھیلا کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس بم کا ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں موجود تھا جو ابھی کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ وہ جس ایکشن میں تھا اسی میں رہ گیا تھا بس یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو، جسے کسی ماہر سنگ تراش نے ایک خاص ایکشن میں تراشا ہو۔ اس کا چہرہ بھی بے جان نہیں لگ رہا تھا۔ لوگوں نے خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی یہ ادا کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب تک وہ اسے صرف دہشت اور خوف سے دیکھ رہے تھے لیکن اب اس دہشت میں حیرت بھی شامل تھی۔ دس سیکنڈ، بیس سیکنڈ، تیس سیکنڈ، پچاس سیکنڈ پورا ایک منٹ گزر گیا تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ باہر کھڑے ہوئے کچھ لوگ ایک دم اندر داخل ہو گئے اور اس کے بعد ہنگامہ ہو گیا۔ چاروں طرف سے لوگ اس آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے اسے گرانے کی کوشش کی، اسے مارنا چاہا، مجمع میں موجود ایک شخص نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے لیا اور بولا۔

"ایک منٹ..... ایک منٹ ٹھہرو۔" اس شخص نے کہا اور پھر پھرتی سے اس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا ڈبا اٹھا لیا اور الٹے قدموں پیچھے کھسکنے لگا۔ وہ غالباً اس بم کے خوف ناک اثرات سے لوگوں کو بچانا چاہتا تھا ورنہ کوئی بھی احمق اس منجمد ہو جانے والے شخص کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر بینک کی اس عمارت کو دھماکے سے اڑانے کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ اس آلے کو ہوا میں بلند کیے کیے ایک طرف چل پڑا۔ ڈاکو کو مارنے والے بے شمار لوگ تھے لیکن جس پہلے شخص نے اسے گھونسا مارا جو اس کے جبڑے پر رسید کیا گیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔ اس نے داہنے ہاتھ سے گھونسا مارا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپری حصے کی تمام انگلیاں چیخ گئی تھیں۔ اتنی شدید تکلیف ہوئی تھی ان ہڈیوں میں کہ وہ ہاتھ دبا کر دہرا ہو گیا تھا پھر جس شخص نے بھی اسے مارنے کی کوشش کی اس کا یہی حشر ہوا۔ اس کا بدن فولاد سے زیادہ سخت ہو گیا تھا جو چیز اس پر پڑ رہی تھی وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی تھی اور اس کے بعد مارنے والوں کو خود ہی عقل آ گئی۔ اب اتنی بہادری تو وہ دکھا ہی سکتے تھے۔ پھر ایک پہلوان نما شخص نے اس کی ٹانگوں میں گھس کر اسے گرانے کی کوشش کی۔ انداز ایسا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ڈاکو چاروں شانے چت ہو جاتا لیکن ذرا سی دیر میں اسے سخت شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ ان فولادی ٹانگوں کو ہلا بھی نہیں سکا تھا۔ یہاں تک اس کا جو پاؤں اٹھا ہوا تھا وہ بھی اٹھے کا اٹھا رہ گیا تھا۔ یہ لوگ چونک کر پیچھے ہٹ گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر کسی نے کہا۔

"یہ..... یہ..... تو جیسے پتھر کا ہو گیا ہے۔ ذرا دیر میں یہ افواہ چاروں طرف پھیل گئی لیکن بینک کے عملے کے لوگ وہ تھیلا اس کے ہاتھ سے اتارنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے اور کچھ افراد کیشیئر کو سنبھال کر مینیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور مینیجر خوف زدہ انداز میں اسپتال کو فون کر رہا تھا۔ دوسرے ٹیلی فون پر پولیس پولیس کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک پولیس موبائل وہاں پہنچی اور چند پولیس والے جو موبائل سے اترے تھے بینک میں گھس آئے۔ انہوں نے ڈنڈے سنبھال کر لوگوں کو منتشر کیا وہ شخص جو ریموٹ کنٹرول اور بم کا ڈبا سنبھالے ہوئے تھا بری طرح چیخ رہا تھا۔

"براہ کرم..... براہ کرم مجھ سے بچ کر نکلنا ورنہ یہ عمارت تباہ ہو جائے گی ہم سب مر جائیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے بچ کر نکلنا، مجھے ہلانا نہیں۔" لوگ اس سے بچ بچ کر نکل رہے تھے۔ ایک پولیس والا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم۔ کیا اٹھائے ہوئے ہو؟"

"یہ ایک خوف ناک بم ہے اور یہ اس کا ریموٹ کنٹرول۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"لاؤ ادھر لاؤ۔" پولیس والا بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم! یہ بم نہایت خوف ناک ہے پوری عمارت کو اڑا دے گا۔ یہ سرخ بٹن اگر دب گیا تو یہ سمجھ لو کہ عمارت تباہ ہو جائے گی۔"

"بکواس مت کرو۔ ادھر لاؤ اسے۔" پولیس والے نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"بکواس تم بند کرو۔ بے وقوف آدمی۔ میں ایک عام آدمی نہیں ہوں اور سیکورٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جو چیز ہے اگر تمہارے ہاتھ میں دے دوں تو تم سب کی موت کا باعث بن جاؤ گے۔"

"گویا تم بھی اس ڈاکے میں شریک ہو۔" پولیس والے کو اس کے یہ الفاظ اپنی توہین محسوس ہوئے تھے۔ بے شک اس نے اپنے آپ کو سیکورٹی کا آدمی کہا تھا لیکن کوئی ثبوت تو نہیں دیا تھا اس نے۔"

"ہاں میں شریک ہوں لیکن ابھی تم پیچھے ہٹ جاؤ، بعد میں اگر تم چاہو تو مجھے گولی مار دینا اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو....." اچانک اس شخص کی آواز میں غراہٹ پیدا ہو گئی اور پولیس والا اس آواز سے متاثر ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اب بھی جوں کا توں کھڑا تھا اور بینک میں عملے کے لوگوں کے سوا کوئی اندر نہیں رہ گیا تھا البتہ کچھ پولیس والے اس پتھر کے آدمی کو ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے اور ان کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے۔ اے تم لوگوں نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔" ایک پولیس آفیسر نے بینک کے عملے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھ لیجیے سر کار پتھر کا بنا دیا ہے ہم نے اسے۔ ایک آدمی نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

کچھ دیر کے بعد مزید پولیس زیادہ تیاریوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ انہیں یہاں کی تمام صورت حال بتائی گئی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ کیشیئر کو اسپتال بھجوا دیا گیا۔ ایک بڑا پولیس افسر اس پتھریلے مجسمے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے مینیجر سے کہا۔

"کیا ہے یہ.....؟"

"ڈاکو۔" مینیجر نے سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب.....؟"

"کیا عرض کر سکتا ہوں جناب۔"

"مذاق فرما رہے ہیں آپ....." پولیس افسر نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھلا یہ جرات کر سکتا ہوں۔ جتنے لوگ یہاں موجود ہیں ان سے پوچھ لیجیے۔" مینیجر نے کہا اور پولیس افسر نے حیرانی سے اس مجسمے کو دیکھا۔ بہر حال اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مینیجر وغیرہ سوالات کرنے

لگا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے ویسی ہی کہانی سنائی۔ بینک کی رقم لٹنے سے بچ گئی تھی۔ بس کیشیئر بے چارہ زخمی ہو گیا تھا۔ آفیسر نے تحقیقات مکمل کیں پھر اس نے پولیس والوں سے کہا۔

"چلو تصویریں وغیرہ بنواؤ۔" ابتدائی کام مکمل ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "اٹھواؤ اسے یہاں سے۔" چار پولیس والے مجسمے کی طرف بڑھے۔ لیکن پھر ان کے ہوش درست ہو گئے۔ وہ مجسمے کو اس کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکے تھے۔ آفیسر نے خود بھی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے موبائل سیدھا کر کے کہا۔ "میں ہیڈ آفس فون کرتا ہوں۔ بات کچھ آگے کی نظر آ رہی ہے۔" لوگ اس کے متحرک ہونے اور باتیں کرنے کی کہانی سنا رہے ہیں۔

وہ وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر ہیڈ آفس کال کرنے لگا۔ لیکن ابھی وہ فون پر بات ہی کر رہا تھا کہ دفعتاً کئی چیخیں ابھریں اور وہ چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چیخنے والے پولیس کانسٹیبل تھے جو اب بھی اس مجسمے کو اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چیختے ہوئے مجسمے کے پاس سے ہٹ گئے اور مجسمہ..... وہ آگ کی طرح سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے لوہے کا ٹکڑا بھٹی میں تپ کر سرخ ہو جاتا ہے۔ فضا میں اچانک سخت تپش اور حدت پھیلتی جا رہی تھی۔

پوری طرح دہکنے کے بعد وہ لوہے کا سرخ سیال بن کر زمین پر پھیلنے لگا۔ ماربل کا فرش گرم پگھلے ہوئے لوہے سے چٹخنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد زمین پر سرخ لوہے کے ڈھیر اور اس سے نکلنے والی لکیروں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پراسرار ڈاکو پگھل گیا تھا۔ تپے ہوئے لوہے کا ڈھیر کچھ دیر سرخ رہا پھر اس میں سیاہی آنے لگی۔ حیرت بھری آنکھیں اس ناقابل یقین منظر کو دیکھ رہی تھیں۔

♥.....♥.....♥

رانا سرکار کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی، لیکن ان کے قریبی حلقے کہتے تھے کہ یہ شخص چالیس کا جوان ہے..... اپنی کارکردگی سے اس نے یہ بات منوائی تھی۔ شدید محنت کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی سخت گیر فطرت کے باوجود اس کا اسٹاف اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن یہ سخت گیری صرف کام کے سلسلے میں تھی باقی حالات میں وہ ایک مشفق انسان تھا۔

نوجوان ریشم اس کی سیکرٹری تھی۔ وہ ریشم سے بھی بہت محبت سے پیش آتا تھا اور ریشم اسے اپنے بزرگ کی حیثیت دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس نوجوان بوڑھے کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے کام میں مصروف تھا۔ کتنی شان دار شخصیت ہے اس کی۔ سنجیدہ متین چہرہ، کھڑے کھڑے نقوش، کنپٹیوں پر سفید بال بے حد بھلے لگتے تھے۔ اس کے اور رانا سرکار کے درمیان شیشے کی ایک دیوار تھی۔ جب بھی رانا صاحب کو اس کی ضرورت ہوتی وہ ایک مخصوص انداز میں اسے دیکھتے اور ریشم جیسے ان کی منتظر ہوتی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ رانا صاحب نے ادھر دیکھا تو ریشم اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ ان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

"مس ریشم۔ آپ شاید کچھ بھول رہی ہیں؟"

"جی سر....." ریشم نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کوئی اپائنمنٹ تھا ہمارا شاید؟"

ریشم اچھل پڑی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شام پانچ بجے ایک اہم میٹنگ میں جانا تھا اور اس وقت پونے پانچ بج رہے تھے۔ یہ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ انہیں وقت پر روانہ کر تی لیکن وہ بھول گئی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس نے خوف زدہ نگاہوں سے رانا سرکار کو دیکھا۔

"نہیں......فکر مند نہ ہوں۔ یہ کچھ کاغذات بریف کیس میں رکھ دیں۔" رانا صاحب کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ ریشم نے جلدی جلدی کاغذات سنبھال کر رکھے اور بریف کیس لے کر آگے بڑھی۔ "ارے نہیں......لائیے بریف مجھے دے دیجیے۔" "پلیز......ابھی میں نخوت کی اس منزل تک نہیں پہنچا ہوں۔"

رانا صاحب نے بریف کیس اس کے ہاتھ سے لیا اور باہر نکل آئے۔ پھر انہوں نے رفتار کچھ تیز کر دی۔ باہر ڈرائیور کار کے قریب کھڑا تھا۔ رانا صاحب کو عمارت کے دروازے پر دیکھ کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ رانا صاحب نے جھک کر بریف کیس کار میں رکھا پھر ایک پاؤں اندر رکھا اور پھر ایک دم ساکت ہو گئے۔

ڈرائیور ان کے اندر بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا تا کہ دروازہ بند کر کے اسٹیئرنگ سنبھالے، لیکن رانا صاحب اندر داخل نہ ہوئے۔ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے سر......؟" لیکن سر کا کوئی جواب نہ ملا بلکہ ڈرائیور کو ایک دم احساس ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایک عجیب سی مردنی رانا صاحب کے چہرے پر نظر آئی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور بولا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے سر۔ کوئی بات......" یہ کہہ کر اس نے رانا صاحب کو کا بازو چھوا، لیکن...... پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا...... بازو فولاد کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

اس نے پریشانی سے سامنے دیکھا۔ ریشم باہر تک آئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی اور ڈرائیور کو دیکھ کر بولی۔

"کیا بات ہے خادم خان؟"

"ادھر دیکھو لی بی صاحب......کوئی دورہ پڑا ہے شاید۔"

"دورہ......؟"

"ہاں۔ بدن پتھر کی طرح اکڑ گیا ہے۔"

"ریشم نے بھی آگے بڑھ کر رانا صاحب کو دیکھا اور پھر بدحواسی سے بولی۔ "ہاں لگ تو رہا ہے۔ میں صاحب کے فیملی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ وہ اندر دوڑ گئی۔ فون تک جاتے جاتے اس نے اسٹاف کے چند افراد کو بھی صورت حال بتا دی اور بہت سے لوگ باہر دوڑ گئے۔ پھر سبھی نے کوشش کر لی لیکن کئی طاقت ور نوجوان بھی مل کر رانا صاحب کے بدن کو جنبش نہیں دے سکے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر کے اندر دفتر کا سارا اسٹاف وہاں جمع ہو گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کافی دیر ہو گئی۔ ہر طرح کی کوشش کر لی گئی لیکن کوئی رانا صاحب کی پوزیشن تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی پہنچنے میں دیر نہیں دکھائی تھی، لیکن وہ بے چارہ بھی کچھ نہیں کر سکا۔ آخر کار پولیس

کو بلا لیا گیا۔ پولیس والے الگ اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ابھی کچھ بھی نہ ہو پایا تھا کہ اچانک رانا صاحب کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور ان کے پورے بدن سے شعلے ابل پڑے۔ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن آگ صرف کپڑوں تک محدود نہیں تھی، رانا سرکار کا پورا بدن تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہو گیا تھا آن کی آن میں سر کے بال چرمرا کر جل گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان سرخ ہوتے ہوئے بدن کی تپش شدید سے شدید ہوتی گئی اور پھر دیکھنے والوں کو چکر آ گئے۔ رانا صاحب جواب ایک آتشیں مجسمہ بن گئے تھے نیچے زمین پر بیٹھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں فولاد کا ایک ڈھیر تھا جو آہستہ آہستہ سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔

❤......❤......❤

"تیرا بیڑا غرق۔ ستیاناس مارے پتا چل جائے کہ تجھے کس نے بنایا ہے تو منڈیا مروڑ کر رکھ دوں۔ ناک میں دم آ گیا ہے دو دفعہ ہنڈیا جل چکی ہے۔ عاجز کر دیا ہے اس ٹرن ٹرن نے۔ ارے ذرا صبر کرو......موت پڑے آ رہی ہوں۔"

حسینہ نے مگا بھر کر پانی ہانڈی میں ڈال دیا اور ہانڈی سے دھواں اٹھنے لگا۔ اس وقت کہیں سے صوفی کی آواز سنائی دی۔

"حسینہ بیگم......کیا رحلت کر گئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ کتنی دیر سے فون کی گھنٹی بج رہی ہے، سن نہیں رہیں۔"

"آئے ہائے۔ میں نے تو رحلت نہیں فرمائی۔ تم کیوں دفن ہو گئے غسل خانے میں۔ کتنی دیر تک ان کچھیوں کو رگڑتے رہو گے چوہے جیسی کھال اتر جائے گی۔ ارے باہر مرو آ کر میری ہانڈی جل رہی ہے۔"

"آپ فون دیکھیے۔ میں آ رہا ہوں۔" صوفی نے جواب دیا۔

"ہونہہ......فون دیکھیے۔" حسینہ نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے سے نکل آئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور دہاڑی۔ "ہاں۔ بھونکو کیا بھونکتا ہے۔"

"حسینہ بیگم۔" دوسری طرف سے کرنل رحیم شاہ کی آواز سنائی دی۔

"کون...... بڑے صاحب۔"

"میں ہی ہوں۔ لیکن آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"وہ جی بس......قسمت پھوڑ دی ہے آپ نے۔"

"کیوں......خیر تو ہے۔"

"شر ہی شر ہے صا[illegible]ں۔ کہاں پھنسا دیا آپ نے۔"

"آپ خوش نہیں [illegible]؟"

"کیا خوشی کیا غم......بس زندگی تو کاٹنی ہی ہے۔"

"بات کیا ہے بتائیے تو سہی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ بس لڑائی ہوتی ہے بات بات پر۔ اب آپ دیکھیے کالی ہوں تو کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناک نقشہ تو برا نہیں ہے آپ خود خدا لگتی کہیے کیا میں صرف کالونچ ہوں۔"

"کالونچ.....؟"

"ہاں۔ وہ تو جیسے وحید مراد ہیں۔"

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں حسینہ بیگم۔" کرنل رحیم شاہ سمجھ تو گیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صوفی تو ایک نہایت بردبار آدمی تھا۔

"ارے لپوریئے کی بات کر رہی ہوں جس کے پاس آپ نے بھیج دیا ہے۔"

"کہاں ہیں.....؟"

"اپنی تقدیر دھو رہے ہیں گھنٹے بھر سے۔"

"غسل خانے میں ہیں؟"

"ہاں۔ لیجیے آ گئے ہیں۔" حسینہ بیگم نے دروازے سے صوفی کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

صوفی نے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا۔ پھر بولا۔

"ہیلو۔"

"صوفی صاحب....."

"درویشوں کے کرم سے۔"

"میں رحیم شاہ بول رہا ہوں۔"

"چشم ما روشن.....حکم۔"

"کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"آپ حکم فرمایئے۔"

"سب لوگ بلا رہے ہیں۔ آ جایئے۔"

"بسر و چشم۔ حاضر ہوئے جاتے ہیں۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" دوسری طرف سے فون بند ہوا تو صوفی نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اور پھر کان میں انگلی ڈال کر زور زور سے ہلاتے ہوئے مڑا۔ سامنے ہی حسینہ بیگم کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"جی فرمایئے۔"

"یہ ڈھول ڈبا ہٹوا دو گھر سے۔ ایک کام کر سکتی ہوں میں یا باورچی خانے میں لگا دو یا دوسرے کاموں میں۔"

"ڈھول کس وقت بجاتی ہیں آپ؟" صوفی حیرت سے بولا۔

"اے وہی موا ٹرن ٹرن۔"

"فون.....؟"

"ہوگا۔ مجھے کیا۔"

"ہوں۔ درویش رحم کریں آپ پر۔" صوفی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ وہ جو جھاڑو پیٹا یہاں آتا ہے اسے سنبھال لو ورنہ کسی دن کچھ ہو جائے گا۔"

"جھجھ۔ جھاڑو پیٹا؟"

"منہ لال کر دوں گی اینٹ مار کر۔"

"یہ کون ہے؟" صوفی نے پوچھا۔

"اے وہی گنے کی مشین میں پچکا ہوا۔ وہ کم بخت جسے کون کتیا معشوق کہتی ہے۔ چرسی گھوڑے جیسی شکل کا۔"

"معشوق نشیلے عالم۔"

"خدا کی مار پڑے اس پر۔"

"کوئی بات ہو گئی اس سے۔"

"میری عمر پوچھ رہا تھا۔ میں کتنی ہوں، پچیس کی ہو گئی تو اسے کیا۔"

"پپ.....پچیس۔" صوفی تھوک نگل کر بولا۔

"مٹا مارا مجھے سلور جوبلی کہنے لگا ہے۔"

"گویا اس نے آپ کو پچیس کا تسلیم کر لیا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"وہ ہوتا کون ہے میرا سگا۔"

صوفی نے بات آگے نہیں بڑھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے حسینہ نہ جانے کیا کیا بکتی رہی تھی۔ صوفی نے جلدی جلدی تیاری کی اور پھر کار لے کر چل پڑا۔ کرنل رحیم شاہ سے ملنا تھا اس لیے لباس بھی ڈھنگ کا پہنا تھا۔

گرین ہاؤس میں گرین فورس کے تمام ممبروں نے صوفی کا استقبال کیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی صوفی صاحب، آپ کے بارے میں بڑی افواہیں گردش کر رہی ہیں آج کل۔"

"درویش پناہ میں رکھیں۔"

"حسینہ کیسی جا رہی ہے؟"

"بہت بہتر۔"

"خیر۔ یہ بتایئے شہر میں ہونے والی تازہ وارداتوں کے بارے میں کچھ سن گن ہے۔"

"تازہ وارداتوں کے بارے میں؟"

شازیہ اور فیضان نے ایک مختصر سی رپورٹ تیار کی ہے۔ میں وقت ضائع کیے بغیر وہ آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے سامنے رکھی ہوئی فائل کو کھول کر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔

صوفی خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ تب کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"پہلی واردات بینک میں ہوئی تھی۔ شہر کی ایک بھری پری شاہراہ پر ایک ڈاکو بینک میں داخل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا۔ اس نے وہاں لوگوں کو یرغمال بناتے ہوئے دھمکی دی کہ اس کے پاس ریموٹ کنٹرول بم ہے۔ بہت بڑی رقم اس نے ایک بیگ میں بھر لی، لیکن وہ وہاں سے گیا نہیں، بلکہ اچانک چلتے چلتے پتھرا گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بے شمار افراد نے اسے اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کی، لیکن وہ ایک انتہائی مضبوط سنگی مجسمے کی شکل اختیار کر گیا اور اسے ہلایا نہ جا سکا، پھر اچانک ہی وہ بھٹی میں تپے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوا اور پھر سرخ لوہے کی شکل میں ہی زمین پر بہ گیا۔ بینک کا ماربل کا فرش تڑخ گیا تھا۔

اس کے بعد دوسری واردات ایک انتہائی اہم محکمے میں کام کرنے والے افسر اعلیٰ رانا سرکار کی ہوئی۔ رانا سرکار کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا جیسے ہی وہ اپنی کار میں داخل ہوا اچانک پتھر کا گیا اور اس کے بعد سرخ ہو کر بہ گیا۔ تیسری واردات ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں ایک کال گرل اپنے گاہک کے ساتھ میٹھی رنگ رلیاں منا رہی تھی کہ اچانک اس کا گاہک اسی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اس شخص کے بارے میں یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کس حیثیت کا مالک تھا۔ ظاہر ہے وہ پانی بن کر بہ گیا تھا۔ یہ تین وارداتیں ہوئی ہیں۔ صوفی صاحب کیا آپ نے.....؟"

"مم..... معافی چاہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ پچھلے دنوں اخبار ذرا توجہ سے نہیں دیکھا اس لیے ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"ظاہر ہے صورت حال بھی ایسی ہی تھی۔ بہر حال لیبارٹریز میں لوہے کا یہ ڈھیر تجزیے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک رپورٹ نہیں دے سکے۔ شاید وہ صحیح تجزیہ نہیں کر پا رہے۔"

"ہوں..... درویش رحم کریں۔" صوفی داڑھی کھجانے لگا۔

"خیر ویسے تو ہر شخص ہر شہری ایک قیمتی فرد ہے، لیکن رانا سرکار کے بارے میں خصوصی طور پر لے دے ہو رہی ہے۔ وہ ایک اہم شخصیت کا مالک ہے اور پھر واردات بھی کچھ انوکھی سی ہی ہے۔ دیکھنا پڑے گا خاص طور سے۔"

"جی۔"

"میرا خیال تھا کہ بات آپ کے علم میں آ گئی ہو گی، لیکن خیر اب ذرا توجہ دیجیے اس سلسلے میں اور بھی وارداتیں ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پھر کوئی سر پھرا ہمارے وطن میں داخل ہو کر ہمیں چیلنج کر رہا ہے۔ ایسے سر پھروں سے ہمیں صرف اتنی ہی دلچسپی ہے کہ ہم ان کا منہ کالا کر کے انہیں ان کی حرکتوں سے روک دیں۔" کرنل رحیم شاہ پُر خیال انداز میں دیوار کو دیکھنے لگا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

♥.....♥.....♥

اسے ہال کہنا بڑی بدحالی کی بات تھی۔ بس کوئی کھنڈر ہی معلوم ہوتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں والا، چھتوں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چڑیوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ دیواریں بھی عجیب سی کیفیت پیش کر رہی تھیں، ان میں جگہ جگہ کوہان ابھرے ہوئے تھے، لیکن دیواروں کے نچلے حصے میں فرش کے پاس

روشن ہو رہے تھے۔ چمک دار نقطے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے اور وہ سب خاموش بیٹھے پھٹی نگاہوں سے ان نقطوں کو گھور رہے تھے۔ بار بار ان کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جو ناہموار تھا اور کسی غار کے دہانے میں ہی بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

یہ خاموشی کافی دیر تک اسی طرح جاری رہی پھر ان میں سے ایک نے گہری سانس لی اور دوسرے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں حیرت ہوئی ہو کہ ان میں سے کوئی اب بھی سانس لے سکتا ہے۔ سانس لینے والے شخص نے کہا۔

"یہ خاموشی ہمیں کیا دے سکے گی؟"

"ہاں۔ یہی ہم بھی سوچ رہے ہیں۔ ہمیں موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"موت اور صرف موت۔"

"کیا ہم اس قدر ناکارہ ہو چکے ہیں کہ اپنی زندگی کا بندوبست نہ کر سکیں؟"

"لیکن کیسے.....؟" ایک اور شخص نے سوال کیا اور ایک بار پھر پہلے جیسی خاموشی طاری ہو گئی البتہ یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔ انہی میں سے ایک نے کہا۔

"نہیں۔ اس طرح تو ہم اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر بولو کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی سہی، یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ جلاد ہے بلکہ اسے جلاد کہنا اپنا ہی مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ وہ بے حد بھیانک انسان ہے۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا، کیونکہ وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ اس کے پاس معافی کا لفظ نہیں ہے۔"

"یار ہم اس قدر بزدل ہو گئے کہ اب بیٹھ کر موت کا انتظار کریں۔"

"ہم بے بس ہیں کیا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں ایسا نہ کہو، میں جینا چاہتا ہوں، میں جینا چاہتا ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرنے والے کے لہجے میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔

"خود کو قابو میں رکھو۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد کے حالات ہمارے حق میں نہیں ہیں۔"

"تم نے ہی ہم سب کو موت کے حوالے کیا ہے۔ تم نے ہمارے ذہن خراب کر دیے ہیں۔"

"میں اپنے اندر کی آواز نہیں دبا سکتا۔ میرا دل وہی سب کچھ کہہ رہا ہے جو میری زبان تمہارے سامنے بیان کر رہی ہے۔"

"اپنے دل کو نکال کر باہر پھینک دو۔ میرے اعصاب اب خوف برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے۔"

ایک بار پھر ہر شخص خاموش ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ہی سناٹے میں ایک عجیب سی آواز ابھری۔ آواز غالباً اس انوکھی مشین میں لگے کسی اسپیکر سے ابھری تھی اور ان سب کے چہرے کچھ اور پیلے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر موت کی زردی پھیل گئی تھی۔ یہ مشکل تمام ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مشین کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے مشین کا ایک لیور آن کیا اور پھر اس میں لگے ایک اسپیکر سے کھیوں کی بھنبھناہٹ نشر ہونے لگی اور اس کے بعد ایک آواز ابھری۔

"انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔"

"ہم سب موجود ہیں سر۔" مشین کے پاس کھڑے ہوئے آدمی نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"موجود ہو، بھاگے نہیں یہاں سے۔" طنزیہ لہجے میں پوچھا گیا۔

"باس۔ ہم غدار نہیں ہیں جو کچھ ہوا اس میں بے شک کوتاہی تو ہوئی ہے، لیکن ہمارا قصور نہیں تھا۔"

"میرا تھا، میرا تھا...... مجھے تسلیم ہے دوستو! اور جو سزا میں تمہیں دینا چاہتا ہوں اصولی بات یہ ہے کہ وہ تم مجھے دے دو۔ کیا میں تمہارے سامنے آ جاؤں۔"

مشین سے ابھرنے والی آواز کے بارے میں یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی مرد کی آواز ہے یا عورت کی۔

"اب جو کچھ ہو چکا ہے بس ہم اس کے لیے معافی مانگنا چاہتے ہیں اگر اس کی گنجائش ہو تو۔"

"تم خود ہی بتا دو کیا گنجائش ہے؟"

"ہاں۔ ہے چیف۔"

"ویری گڈ! کمال کی شخصیت ہے تمہاری، بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"باس! جنریٹر کے بارے میں انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ صحیح کام نہیں کر رہا، وہاں سے دو آدمی آئے اور سارا دن جنریٹر پر مصروف رہے اور انہوں نے بتایا کہ جنریٹر ٹھیک ہو چکا ہے اور اب اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ باس اس وقت تک وہ حادثہ ہو چکا تھا۔ ہم اس میں بے قصور تھے۔ پھر بھی ہم نے اس سے پہلے جنریٹر کو استعمال نہیں کیا اور دوسرے جنریٹر سے کام چلاتے رہے لیکن وہ بھی فیل ہو گیا اور پھر مسلسل دو حادثے رونما ہوئے، آپ خود بتائیے باس یہ کام تو فرسٹ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کا تھا۔ خوف سے بے قابو ہو کر ہم نے پھر اسی جنریٹر پر اکتفا کی جو پہلے خراب ہو چکا تھا اور باس......"

"ہاں ہاں۔ ہاں ہاں جو دو افراد اس سلسلے میں ملوث ہیں انہیں بھی سزا دی جائے گی، لیکن تم نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ کیا جنریٹر کی خرابی کی انڈیکیشن نہیں ملتی۔ تم لوگ کہاں تھے اس وقت، بتاؤ کہاں تھے؟"

"آپ یقین کریں باس ہم اپنی ڈیوٹی پر تھے، ہم دھوکا کھا گئے۔"

"گڈ...... یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ میری لغت میں دھوکا کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے بھی یہ بات کہہ دی تھی۔ تمہیں ہر طرح کی پیش کش کی تھی میں نے۔ کہا تھا نا میں نے کہ دھوکا مت کھانا۔ غلطی مت کرنا، جو چاہے لے سکتے ہو جیسے چاہو زندگی گزار سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے باس اگر ہو سکے تو آپ ہمیں معاف کر دیں اور اس کے بعد ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی غلطی نہیں ہو گی۔"

"سوچ لو۔ انسان ہو، اگر غلطی ہو گئی تو؟"

"بالکل نہیں ہو گی باس۔" ان سب کے چہرے ایک دم سے کھل گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے باس کی آواز میں نرمی آ گئی ہے۔

"اگر غلطی ہو گئی تو؟"

"تو ہم خودکشی کر لیں گے باس۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ لیں گے۔"

"ارے واہ! یہ بھی ایک دلچسپ منظر ہو گا۔ بڑی عمدہ بات کہی ہے تم نے ہمیں پسند آئی چلو ٹھیک ہے۔ جاؤ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے جاؤ۔ وہاں جا کر نئے جنریٹر کھول لو، لیکن صرف ایک بات یاد رکھو۔ جنریٹر کو صحیح طور پر چیک کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ باس۔" آواز بند ہو گئی اور وہ سب ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ناچنے لگے۔

♥......♥......♥

مذاق مذاق میں ایس پی کے عہدے تک نہیں پہنچا تھا۔ عقل تھی یہ الگ بات ہے کہ زیادہ بھاگ دوڑ کا قائل نہیں تھا۔ بس خاص تیکنیک سے کام چلا لیتا تھا اور بہت سے کیس حل کر ڈالے تھے۔ محکمے میں بڑی بات تھی لیکن کچھ لوگ اسے جانتے بھی تھے کہ وہ کیا ہے۔

بہرحال پہلے تو صوفی کے ہاتھوں اسے زک پہنچی تھی لیکن دوسری بار جو کچھ ہوا تھا جو خفیہ راز صوفی نے منکشف کیے تھے وہ ایسے تھے کہ پوری زندگی کی نیک نامی خاک میں مل سکتی تھی۔ وہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا۔

بات صرف اس تک نہیں تھی، انسپکٹر رازی بھی شکار ہوا تھا۔ وہ تو اتنا خوف زدہ ہوا تھا کہ دو ماہ کی چھٹی لے لی تھی اس نے۔ بات چونکہ ایس پی کے سامنے کھلی تھی اس لیے اس کے اوسان اور خطا ہو گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایس پی صاحب کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ بہرحال جمشید مرزا ان دنوں بہت پریشان تھا۔ اس دوران اس نے صوفی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی تھیں اور اسے پتا چل گیا تھا کہ لوہے کے پنجر میں عقل کا بیش بہا خزانہ ہے اور وہ بڑے بڑے معرکے سر کر چکا ہے۔ فوجی حکام بے حد عزت کرتے ہیں۔ فطرتاً صوفی ہے ورنہ چاہے تو بہت کچھ بن سکتا ہے۔

ان ہی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا کہ ایک اور افتاد آ پڑی۔ کچھ انوکھی وارداتیں ہوئی تھیں جن میں ایک بینک کا واقعہ ہوا تھا، ایک راناسرکار کا اور ایک واقعہ ہوٹل میں ہوا تھا۔ انسپکٹر جنرل نے اسے طلب کر لیا۔ پوری تفصیل بتا کر انہوں نے جمشید مرزا سے کہا۔

"پانچ پینل بنائے گئے ہیں جو آزادانہ طور پر اس بارے میں تحقیقات کریں گے جو کوئی اس سلسلے میں سب سے اعلیٰ کارکردگی دکھائے گا اسے ایک اہم سرٹیفکیٹ اور دوسرے اعزازات ملیں گے۔ ایک پینل کی سربراہی تمہیں دی جا رہی ہے۔ اپنی ٹیم خود منتخب کر لو۔"

"یس سر......"

"یہ ایک خاص چیز ہے جو تمہیں امانت کے طور پر دی جا رہی ہے۔ آئی جی صاحب نے لوہے کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کیا ہے سر؟" جمشید مرزا نے پوچھا۔

"پگھلے ہوئے انسان کا ایک ٹکڑا۔"

"اوہ۔"

"اس کی صحیح رپورٹ کوئی لیبارٹری ابھی تک پیش نہیں کر سکی۔ تمہیں اجازت ہے کہ اپنے طور پر اس کے بارے میں معلوم کرو۔"

"یس سر......؟" جمشید مرزا نے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ یہ اعزاز تمہیں ملے۔"

"شکریہ سر......"

"اور یہ میرا حکم بھی ہے۔" جمشید مرزا یہ حکم لے کر وہاں سے چلا آیا، لیکن اس کی پیشانی شکن آلود تھی۔ بہت ہی الجھا ہوا معاملہ تھا۔ ان دنوں ویسے بھی اس کی ذہنی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اپنے آفس آ کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں تنور پڑ رہے تھے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں سے آغاز کرنا چاہیے؟ بہت دیر تک وہ مختلف انداز سے سوچتا رہا اور غور کرتا رہا پھر اچانک اس کے دماغ میں بجلی سی چمکی۔ انسانی شکل کا ایک اونٹ آنکھوں میں آیا اور وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ صوفی...... اس نے سوچا۔ اگر وہ کسی طرح اس کی مدد پر تیار ہو جائے تو......!"

پھر وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ باہر آ کر اس نے سرکاری جیپ لی تھی اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف دوڑ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں کچھ الفاظ گونج رہے تھے۔

اصل میں آپ نے بڑی زیادتیاں فرمائی ہیں۔ خود دیکھیے، یہ وہ تاریخی ڈبیا ہے جسے ہماری شخصیت کا ایک حصہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے وہ اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ ایک بات ہم آپ سے کہیں اگر پانوں کی وہ ڈبیا اور بٹوہ آپ نے ضائع کر دیا ہے تو ہماری آپ کی مفاہمت زندگی بھر نہیں ہو سکتی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

رات بھر وہ ذہن پر زور دیتا رہا تھا کہ دونوں چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ وہ اس کے گھر کی ایک الماری میں رکھی تھیں۔ جیپ پورچ میں کھڑی کر کے وہ دیوانوں کی طرح اندر بھاگا...... بیوی ارے ارے کرتی رہ گئی لیکن وہ دوڑ کر اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بڑی وحشت کے عالم میں اس نے الماری کھولی تھی اور اس جگہ پر نگاہیں دوڑائی تھیں جہاں پانوں کی وہ ڈبیا رکھی تھی اور پھر اس کی بینائی چلی گئی۔ دماغ چکرا گیا۔ گرنے سے بچنے کے لیے اس نے الماری کے پٹ کا سہارا لیا۔ دونوں چیزیں وہاں نہیں تھیں۔

جمشید مرزا دیر تک آنکھیں پھاڑے سکتے کے سے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر بیوی ہی کسی کام سے اندر آ گئی تھی اور اس نے جمشید مرزا کو اس طرح کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

"خیر تو ہے کیا ہو گیا ہے؟" بیوی کی آواز پر جمشید مرزا چونک پڑا، پھر مضمحل لہجے میں بولا۔

"یہاں کچھ رکھا ہوا تھا۔ کہاں گیا؟"

"کچھ......" بیوی نے حیرانی سے پوچھا۔

"زمانہ قدیم کی پان رکھنے والی گندی سی نقشین چوکور ڈبیا اور کپڑے کا سلا ہوا بٹوا۔"

"کسی عمر رسیدہ محبوبہ نے تحفے کے طور پر دیا تھا کیا؟" بیوی نے پر مزاح لہجے میں پوچھا۔

"آپ مذاق فرما رہی ہیں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"کچھ تعارف تو کروا دیں۔ ویسے تو ہم نے کبھی آپ کی عمر نہیں پوچھی لیکن اللہ خود ہی مشکلات حل کر دیتا ہے۔ کم از کم ستر سال کی تو ضرور ہوں گی وہ محترمہ جنہوں نے یہ چیزیں آپ کو تحفتاً دی تھیں۔"

"دیکھو تم مذاق کر رہی ہو۔ وہ مجرموں کے خلاف ایک بہت بڑا ثبوت ہے بتا سکتی ہو کہاں گئیں؟"

"ارے باپ رے سچ کہہ رہے ہو۔" بیوی اب کچھ سنجیدہ ہوئی تھی۔

"یہ مذاق کرنے کا وقت ہے میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ جمشید مرزا غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اصل میں الماری ٹھیک کرنے کے لیے آئی تھی۔ یہ دونوں بے تکی چیزیں دیکھیں بٹوا تو اتنا میلا تھا کہ آپ کی اس سفید قمیص پر دھبا لگ گیا اس سے اور ایسی ہی کچھ کیفیت پانوں کی اس ڈبیا کی تھی۔ مجھے غصہ تو آیا تھا مگر آپ سے کہنا بھول گئی۔ پلاسٹک کے شاپر میں ہی رکھ دیں یہ چیزیں۔"

"میں پوچھتا ہوں گئیں کہاں؟"

"بے تکی چیزیں تھیں اس لیے میں نے ملازمہ کو دے دیں۔"

"مم...... مم...... ملازمہ...... کون سی ملازمہ۔"

"ارے وہی بشیراں بی بی۔"

"بلاؤ اس کم بخت کو جلدی۔ تمہیں پتا نہیں کہ وہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔" بیوی جمشید مرزا کی کیفیت دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ باہر بھاگی تو جمشید مرزا بھی اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ ملازمہ بشیراں بی بی سرونٹ کوارٹر کے پچھلے حصے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ جھاڑو کی سر...... سر کی آواز فضا میں بلند ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی گرد اڑ رہی تھی اس سے اندازہ ہو گیا کہ بشیراں کس طرف ہے۔ ان دونوں کو اس طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر ملازمہ بھی بوکھلا گئی تھی۔ جمشید مرزا کی بیوی نے کہا۔

"بشیراں چھوڑو جھاڑو بات سن ادھر آ۔"

"جی بی بی۔" بشیراں سہمی سہمی سی آ گئی۔

"میں نے تجھے پانوں کی ڈبیا دی تھی اور وہ کپڑے کا بنا ہوا بٹوا؟"

"جی بی بی، یاد ہے۔"

"کہاں ہے وہ۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ صاحب کے کام کا ہے لا جلدی سے لا۔"

"لو جی، بی بی جی وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"نہیں ہے۔" جمشید مرزا حلق پھاڑ کر چیخا۔

"صاحب جی وہ میری خالہ آئی ہوئی تھی نور پور سے، میں نے اسے دے دیا جی وہ پان کھاتی ہے۔ میں تو پان کھاتی بھی نہیں ہوں۔ خالہ کو دونوں چیزیں بڑی پسند آئی تھیں۔ کہنے لگی یہ پرانے زمانے کا تحفہ ہے اب لوگوں کے پاس ایسی چیزیں کہاں ہوتی ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بک..... بک کیے جا رہی ہو وہ بڑے کام کی چیز تھی۔"

"لو جی پھر میرا قصور تو نہیں ہے۔ آپ نے مجھے دے دی تھی میرے لیے تو بے کار تھی۔ وہ خالہ لے کر نور پور چلی گئی۔"

"نور پور..... اوہ، مجھے نور پور جانا پڑے گا اس کے ساتھ۔" جمشید مرزا نے کہا اور پھر بولا۔

"جلدی سے تو منہ ہاتھ دھو کر اپنے کپڑے بدل لے وہ بڑے کام کی چیز تھی۔ غلطی سے تیرے پاس چلی گئی۔"

"لو جی ٹھیک ہے تو کیا تو رپور لے جا رہے ہو مجھے۔"

"نہیں جنت الفردوس لے جا رہا ہوں۔" جمشید مرزا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو بک بک کرنے کے بجائے جا اندر اور منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل۔ ہم باہر کھڑے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔" بشیراں کو ارٹر میں چلی گئی تو بیوی نے کہا۔

"خود جاؤ گے نور پور۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے ناں۔ اگر وہ ہڈا اور ڈبیا نہ ملی تو یہیں آس پاس کسی کنویں وغیرہ کو تلاش کر کے اس میں کود کر خودکشی کر لوں گا۔"

"آج کل کنویں کہاں ہوتے ہیں؟" بیوی نے کہا پھر چونک کر بولی۔

"مم..... میرا مطلب ہے کہ اگر میں بھی ساتھ چلوں تو۔"

"کیوں بشیراں کو لے کر میں ہنی مون منانے جا رہا ہوں کیا؟"

"نہیں وہ تو ٹھیک ہے مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ بشیراں کو میں نے چھانٹ کر رکھا ہے ورنہ تمہاری نظر بازی سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"دیکھو اس وقت میرا خون مت جلاؤ۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پانوں کی ڈبیا اور ہڈے کی قدر و قیمت کیا ہے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے تو میں چلو تیار ہو جاؤں، تو رپور اب کوئی پاس بھی نہیں رکھا ہوا ہے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ مردوں پر اعتبار کرنے والی بیویوں نے ہمیشہ ہی چوٹ کھائی ہے۔"

"لعنت ہو تم پر۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں ذرا چیک کر لوں خود ڈرائیو کر کے جاؤں گا۔ ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔"

"جیسا آپ پسند کریں۔" بیوی نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جمشید مرزا تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑ رہا تھا۔ بڑی جنونی کیفیت طاری تھی اس پر۔ یہ اتفاق تھا کہ یہ ذمے داری اس کے سپرد کر دی گئی تھی اور اس عجیب و غریب کیس کو حل کرنے کے لیے اس کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ کون نہیں چاہتا کہ ترقی ہو، مرتبے میں اضافہ ہو۔ جمشید مرزا نے اور کوئی کارنامہ تو انجام نہیں دیا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے ایک شان دار فیصلہ کیا تھا یعنی یہ کہ اگر صوفی سے اس کی دوستی ہو جائے تو صوفی جیسا دماغ اس کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے اس بات کے امکانات ہیں کہ صوفی جیسا ذہین آدمی ان وارداتوں کا سراغ نکال لے۔ پانوں کی

ڈبیا اور ہڈا تو ویسے بھی اسے واپس کرنا تھا، کیونکہ صوفی نے جو دھمکی دی تھی اس نے اس کے اعصاب کشیدہ کر دیے تھے۔ کمایا تو اس نے اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ تھا۔ کافی جائیداد تھی، شہر میں اثاثے بھی مختلف ناموں سے بینکوں میں تھے، لیکن صوفی نے جن چیزوں کی نشان دہی کی تھی اگر وہ واقعی منظر عام پر آ جائیں تو عمر قید تک ہو سکتی ہے۔ اس چیز نے بھی اس کے دل میں پنکھے لگا دیے تھے۔ بہر حال..... یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ صوفی سے بنائے رکھنے ہی میں فائدہ ہے اور اس کے لیے پانوں کی ڈبیا کا حصول لازمی تھا۔

خدا خدا کر کے نور پور پہنچا۔ بشیراں بی بی راستہ بتاتی جا رہی تھی۔ ایک گندے سے محلے کے گندے سے مکان کے سامنے قیمتی جیپ روک دی گئی اور جمشید مرزا نے بشیراں اور اس کی بیوی کو اندر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بشیراں وہاں سے واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں پانوں کی ڈبیا اور ہڈا موجود تھا جسے دیکھ کر جمشید مرزا کی جان میں جان آئی تھی۔ اس وقت تک اس کی جان سولی پر ہی لٹکی ہوئی تھی لیکن اب اس کے انداز میں سکون پیدا ہو گیا تھا۔

♥.....♥.....♥

نئی زندگی ملی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کسی غلطی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ انتہائی ظالم انسان تھا بلکہ اسے انسان کہنا بہت مشکل تھا۔ وہ انسان نہیں بلکہ درندہ تھا۔ آواز انسانوں کی سی تھی لیکن حرکتیں درندوں سے بھی شدید تھیں۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں تھی بہت سی جگہوں پر وہ اس کے ساتھ رہ چکے تھے بلکہ اپنی مرضی سے نہیں وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ اگر وہ اس سے دور ہونا چاہتے تب بھی زندگی کا کوئی امکان نہیں تھا اور اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی مانند تھے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور تھے حالانکہ وہ سب دنیا کے بہترین انجینئر تھے۔ ان کے پاس اعلیٰ ترین ڈگریاں تھیں لیکن جب سے وہ اس کے جال میں پھنسے تھے اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کھو چکے تھے۔ ان ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ انہیں بھی پیاری تھی اور زندگی ہی کے بدلے وہ اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور انہوں نے اس جانور کی غلامی قبول کر لی تھی۔ وہ اس درندے کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ وہ کون تھا اور کیا تھا؟ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس انہیں اس کی آواز سنائی دیتی تھی البتہ وہ اپنے آپ کو ایک بااصول آدمی پیش کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے کچھ اصول بہت اچھے تھے۔ ان کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن کون اس کی غلامی کی زندگی کو پسند کرتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں چلے جاؤ لیکن ہر وقت اس کی زد پر رہو..... اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں میں وقت گزارو..... بہترین قسم کے کلبوں میں ڈانس کرو..... عمدہ سے عمدہ کھاؤ..... اخراجات کی طرف سے بے فکر رہو..... شہنشاہوں کی طرح دولت لٹاؤ..... جو کچھ بھی چاہو کرو، لیکن اس کے بعد غلامی ہر حال میں کرنا پڑتی تھی اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس نے ان لوگوں کو بار بار اس بات کی وارننگ دی تھی کہ وہ اپنے کام کے دوران کوئی ایسی غلطی نہ کریں جو اس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے کیونکہ غلطی کی کوئی معافی اس کے پاس نہیں تھی اور اس کے آدمی خاص طور سے اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ سب کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی جگہ لیکن وہ غلطی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ اسے سزا دی جاتی تھی اور جب بھی کسی کو سزا دی جاتی تھی اس کی پوری پوری تشہیر کر دی جاتی تھی اور وارننگ دہرا دی جاتی تھی کہ سب کچھ برداشت ہے لیکن..... غلطی برداشت نہیں ہوگی اور غلطی کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ ہر ایک خیال رکھتا تھا۔ ایسے بہت ہی کم مواقع آئے تھے کہ اس نے کسی کو معاف کر دیا ہو لیکن ان پانچوں کو اس سنگین غلطی پر معافی مل چکی تھی۔ ان کی خوشیاں جس قدر بھی ہوتیں کم تھیں چنانچہ وہ خوشی سے ناچتے رہے..... لیکن ناچتے ناچتے ان میں سے ایک اچانک ساکت ہو گیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا..... اس کے بعد چوتھا اور پانچواں..... سب ہی ایک دوسرے کو خوف زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایک نے دوسرے سے خوف زدہ انداز میں پوچھا، لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"بس ایسے ہی۔"

"کوئی وجہ ہے تمہارے ذہن میں؟"

"ہاں ہے۔"

"کیا.....؟"

"ایک خیال آ گیا تھا۔"

"کیسا خیال.....؟" دوسرے نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ایک خوف زدہ کیفیت رچی ہوئی تھی۔

"وہی خیال جو تمہارے ذہن میں ہے۔"

"نہیں ناممکن ایسا نہیں ہو سکتا۔" دوسرا ہذیانی انداز میں بولا۔

"اس نے ہمیں معافی نہیں دی ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں ہمیں بے وقوف بنا دیا ہے۔"

"یہ نہ کہو، ایسا نہ کہو، خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔" چوتھا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"لیکن دوستو! صرف ایک مفروضے کی بنا پر خوف سے مر جانا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔" پانچویں نے ہمت کر کے کہا۔ چاروں امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"پرانا ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کام کرنے والوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ ہم لوگوں کو اپنی قوت نہیں سمجھتا۔ بس ہم لوگ تو اس کے لیے کام کرنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ کٹھ پتلیاں جن میں سے اگر کوئی کٹھ پتلی ناکارہ ہو جائے تو دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کتنی کٹھ پتلیاں کام کی پوزیشن میں ہیں اور کتنی نہیں ہیں۔ اس کے لیے ایسی کٹھ پتلیوں کو جمع کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"پھر بھی ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ چلو انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلیں ورنہ کہیں کسی دوسری غلطی کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ ان تینوں نے کہا اور پانچوں سہمے سہمے سے قدموں سے آگے بڑھ گئے۔

♥.....♥.....♥

حسینہ منہ بناتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئی اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ معشوق نشیلے کی شکل نظر آئی تھی۔ ہاتھوں میں ایک ڈبا پکڑے ہوئے کھڑا تھا..... حسینہ کو دیکھ کر مسکرایا تو حسینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"خدا کی مار ہو تم پر۔ تم تو ایسا کرو کہ نقاب بنوا لو اپنے لیے۔ منہ پر نقاب ڈال کر کسی کے سامنے آیا کرو۔ شکل دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔"

"حسینہ عالم ہم تو بس تمہاری زیارت کرنے آ جاتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں ناں کہ عقیدت کے پھول محبت کے پیڑے، یہ لیجیے آپ کی خدمت میں خالص ممن خان بدایونی کے پیڑے۔"

"جھاڑو پھیرے تمہارے منہ پر بھی اور ممن خان کے منہ پر بھی۔ میں پیڑے ویڑے نہیں کھاتی۔"

"ارے..... ارے..... ارے کیا بدذوقی ہے اور یہ دروازے سے پیچھے نہیں ہٹیں گی آپ مس سلور جوبلی۔"

"دیکھ جوتی اتاروں گی اور منہ پر اتنی لگاؤں گی کہ منہ سے خون ڈال دے گا۔" حسینہ نے غصے سے آگ بگولہ ہو کر کہا اور معشوق نشیلے کی نگاہیں اس کے پیروں پر پڑیں۔ وہ ایک دم ہنس پڑا۔

"نکالیے جوتے نکالیے آپ تو ننگے پاؤں کھڑی ہوئی ہیں مس سلور جوبلی۔"

"اے..... تیرا ستیاناس سلور جوبلی، سلور جوبلی کہے جا رہا ہے میں کہتی ہوں نظر لگائے گا کیا مجھے؟"

"نظر تو لگ گئی ہے آپ سے حسینہ بیگم اور اس سلسلے میں شاعری بھی شروع کر دی ہے ہم نے، آپ کی شان میں۔"

"میں تیری شان میں کچھ کروں؟"

"کر لیجیے۔ کون منع کرتا ہے آپ کو۔ ویسے شعر عرض ہے۔ دوھرا معکوش بن معشوق جانم۔"

"شروع ہو گیا بھونکنا اے تیری بات اللہ جانے کس کی سمجھ میں آتی ہو گی؟"

"ترجمہ کیے دیتا ہوں حسینہ بیگم۔"

"ٹھہر جا میں تیرا ترجمہ کرتی ہوں۔" حسینہ بیگم نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سامنے پڑی ہوئی اینٹ اٹھا لی۔ معشوق نشیلے کو صورت حال سنگین نظر آئی چنانچہ بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ حسینہ دروازے سے باہر تک آئی تھی۔ معشوق نشیلے نے رک کر کہا۔

"سوچ لیجیے حسینہ بیگم پورے آدھا کلو پیڑے ہیں۔ ایک دفعہ چکھ لیتیں تو ہمیں اس طرح اندر آنے سے منع نہ کرتیں۔"

"ٹھہر میں تجھے بتاتی ہوں۔" حسینہ بیگم نے کہا اور اینٹ پھینک ماری۔ معشوق نشیلے تیار تھے چنانچہ صاف اینٹ کو بچا گئے۔ اب حسینہ بیگم نہتی تھیں چنانچہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر قریب پہنچا اور کہنے لگا

"چھوڑیے بڑی محبت سے لائے ہیں یہ پیڑے..... قبول فرمالیجیے تو زہے عزت افزائی ہوزون بالا۔"

"تو یہ بتا ملنے کس سے آیا تھا؟ کیا اپنی نسل کے اس بندر سے۔"

"نہیں صوفی صاحب تو ممن خان کے ہوٹل پر بیٹھے ہیں اسی لیے تو ہم بھاگے وہاں سے نکاہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچا کر کہ تنہائی میں آپ سے ملاقات کرلیں۔"

"اے تیری..... تنہائی کی۔" حسینہ بیگم نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس بڑے پتھر کی طرف لپکیں جو سامنے ہی پڑا ہوا تھا۔

"لعنت ہو اس پتھر پر۔" معشوق نشیلے کے منہ سے نکلا اور اس نے ڈبا ہاتھ میں پکڑ کر پھر لمبی چھلانگ لگائی۔ باہر کا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ اگر حسینہ چور چور کا شور مچا دیتی تو کوٹھیوں کے دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ ضرور اس کی مدد کرتے اور ہوسکتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی گولی آتی اور معشوق نشیلے کو چاٹ جاتی۔ چنانچہ معشوق نشیلے سنجیدہ ہوگیا اور اس کے بعد ایک گھر کی آڑ میں پناہ لی۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پیڑوں کا ڈبا کھول کر دو تین پیڑے کھائے اور اس کے بعد گردن جھٹک کر وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ حسینہ ہاتھ میں بڑا پتھر لیے انتظار کرتی رہی، لیکن اس کے بعد جب معشوق سامنے نہ آیا تو واپس دروازے کی طرف مڑ گئی۔ پتھر اس نے باہر ہی پھینک دیا۔ دروازے کی طرف خاصا گند ہو رہا تھا اندر کی طرف سے اس نے سوچا کہ جھاڑو لگا دے۔ چنانچہ اندر جا کے جھاڑو اٹھائی اور دروازے کی دوسری طرف کی صفائی کرنے لگی۔ اسی وقت جمشید مرزا کی جیپ دروازے کے سامنے رکی تھی۔ جمشید مرزا اتر کر دروازے پر آیا۔ کال بیل پر انگلی رکھی اور حسینہ کا چہرہ غصے سے اور کالا ہوگیا۔ جھاڑو اٹھائی اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ قدموں کی چاپ نہیں ہونے دی تھی وہ یہی سمجھی تھی کہ معشوق نشیلے پھر آ گیا تھا۔ جھاڑو پوری طرح ہاتھ میں سنبھالی ہوئی تھی اور قدم آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دروازے کا پٹ کھولا اور جھاڑو سیدھی کی لیکن پتا نہیں اس کی خوش قسمتی تھی یا جمشید مرزا کی کہ اس نے پولیس کی وردی دیکھ لی اور جب جمشید مرزا نے اسے جھاڑو سے مسلح دیکھ لیا ادھر تو حسینہ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ادھر جمشید مرزا پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار نمودار ہوگئے۔

"تیرا دماغ بالکل ہی خراب ہوگیا ہے کیا۔ جوتے مار مار کے دماغ کے تمام کیڑے جھاڑ دوں گا کیا اس طرح آنے والوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ جمشید مرزا شدید غصے کے عالم میں بولا۔

"اے تو مجھے کیا معلوم کہ تم ہو وہ حرامی کا پلا بڑی دیر سے تنگ کر رہا تھا۔"

"صوفی صاحب ہیں۔"

"کٹر میں ڈوب کر مر گئے ہیں۔ جنازے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔"

"تیرا تو میں صحیح انتظام کروں گا تو فکر مت کر پھر ابھی تیرا دماغ ٹھیک کردوں صوفی صاحب ہیں اندر۔"

"گئے ہوئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہوئے ہیں کچھ پتا ہے؟"

"اماں نہیں ہوں اس کی جو مجھے بتا کر جائے۔ پہلے بھی کئی بار تم یہ سوال کر چکے ہو۔"

"ہوں..... اچھا ٹھیک ہے۔" جمشید مرزا نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑا۔ بہر حال وہ پانوں کی ڈبیا اور بٹوا لایا تھا۔ فولاد کا وہ ٹکڑا جو اسے آئی جی صاحب نے دیا تھا اگر کسی طرح کام میں آجائے تو پینل جو پانچ جگہ بنائے گئے تھے ان میں اسے فوقیت حاصل ہوجائے۔ ابھی اس نے

ایک بار صوفی سے مل لینا چاہتا تھا پھر شاید تقدیر ہی کچھ کہہ رہی تھی کہ اس علاقے سے باہر نکلا ہی تھا کہ صوفی اپنی مادر زاد موٹر سائیکل پر نظر آ گیا۔ کھڑکھڑ کی آواز سے وہ صوفی کی جانب متوجہ ہوا تھا اور اسے دیکھ کر چونک پڑا تھا۔

"بہر حال جیپ کو موٹر سائیکل کے برابر لے آیا اور آواز دی۔

"صوفی صاحب..... بھائی صوفی صاحب۔" صوفی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ بند کیے کیے ہاتھ ہلایا۔

"رُکیے۔ ذرا رکیے۔ آپ سے ہی ملاقات کرنے کے لیے حاضری دی تھی۔" صوفی نے موٹر سائیکل سائیڈ سے لگائی اور اس کا انجن اسٹارٹ کیے کیے جمشید مزار کا انتظار کرنے لگا۔ جمشید مرزا نے اس سے چند قدم کے فاصلے پر جیپ روکی اور خود اتر کر نیچے آ گیا۔

"آپ ہی کے گھر گیا تھا۔ پتا چلا کہ آپ کہیں تشریف لے گئے ہیں۔"

"گم..... گم ہم..... تم، صوفی نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"براہ کرم پان تھوک دیجیے آپ سے بات کرنی ہے۔ صوفی نے پیک کا پٹاخا زمین پر مارا اور پھر شیروانی کی آستین سے منہ پوچھتے ہوئے بولا۔

"فرمایئے۔ کیا خدمت ہے ہمارے لیے۔"

"آپ سے کچھ بات کرنی ہے صوفی صاحب۔ بہت ضروری بات چیت ہے۔"

"تو کریے۔"

"یہاں نہیں وہ سامنے ریستوران نظر آ رہا ہے۔ آپ کے ساتھ ایک پیالی چائے پینا میرے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوگا۔"

"در..... در..... درویش رحم کریں۔ کوئی لمبی چال معلوم ہوتی ہے آپ کے لہجے میں یہ شہد کہاں سے گھل گیا۔ لگتا ہے کوئی میٹھی چیز کھا کر آ رہے ہیں۔"

"آپ مجھے تھوڑا سا وقت تو دیجیے۔"

"یہ لیجیے درویشوں کے کرم سے۔"

"سامنے والے ہوٹل میں۔"

"جی نہیں ہوٹل میں جا کر تماشا بننا آپ کے لیے بھی مناسب نہیں ہوگا اور ہمارے لیے بھی۔ کیونکہ آپ کے جسم پر پولیس کی وردی ہے البتہ ادھر دیکھیے وہ زیر تعمیر عمارت کے برابر خان ریسٹورنٹ ہے۔ بیچن، چٹنیاں، چینک، درویشوں کے کرم سے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" جمشید مرزا نے کہا اور پھر بولا۔

"موٹر سائیکل اگر آپ یہیں رکھ دیں تو کیا حرج ہے؟"

"جناب من ایسا نہ فرمایئے گا۔ ہمارے لیے تو یہ جان جگر کا درجہ رکھتی ہے درویشوں کے کرم سے۔ آپ اپنی جیپ میں تشریف لایئے گا۔ ہم اپنی عزیزہ کے ساتھ آتے ہیں۔" صوفی نے کہا جمشید مرزا پر بری گزر رہی تھی لیکن وقت سب کچھ کرا دیتا ہے البتہ جھونپڑا ہوٹل کے سامنے جب پولیس کی جیپ رکی اور ا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ایک افسر اعلیٰ نیچے اترا تو بھگدڑ مچ گئی۔ بینچوں پر چائے وغیرہ سے شغل کرنے والے لوگ پیچھے سے کھسک لیے۔ چند ہی افراد بیٹھے رہ گئے تھے۔ خود جھونپڑا ہوٹل کا مالک بری طرح حواس باختہ ہو گیا تھا۔ کبھی اٹھتا کبھی بیٹھ جاتا۔ جمشید مرزا نے برا سا منہ بنا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر صوفی کے ساتھ ایک بینچ کی جانب بڑھ گیا۔ لوگوں نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو سکون کی گہری سانس لی۔ ویسے بھی وہ تنہا تھا اور ساتھ میں پولیس کانسٹیبل وغیرہ نہیں تھے۔

''آپ بھی بس صوفی صاحب، دیکھیے ناں کیا بدتمیزی کر رہے ہیں یہ لوگ۔''

''آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے۔ حضور اعلیٰ درویشوں کے کرم سے کہ لوگ آپ کی قربت کی تاب نہیں لا پاتے۔ بھئی خان صاحب ذرا عمدہ سی چائے بھجوایئے۔'' صوفی نے اونٹ کی طرح گردن لمبی کر کے کہا اور خاں صاحب پر پھر بدحواسی کے دورے پڑ گئے۔ جمشید مرزا کے لیے اب یہی لازم تھا کہ وہ ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے کام کا آغاز کرے۔

چنانچہ اس نے اپنی جیب سے پانوں کی ڈبیا اور بٹوا نکال کر صوفی کے سامنے رکھ دیا اور صوفی ایک دم اچھل پڑا۔

''اماں نہیں واللہ یہ تم ہو جان من۔'' اس نے جلدی سے پانوں کی ڈبیا اٹھا کر گلے سے لگا لی۔ بٹوے کو الٹا اٹھا کر چومنے لگا۔ جمشید مرزا خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک صوفی یہ چوما چاٹی کرتا رہا۔ پھر اس نے یہ دونوں چیزیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تو یوں سمجھیے مرزا جی کہ ہمارے اور آپ کے درمیان مفاہمت ہو گئی۔''

''شکریہ صوفی صاحب لیکن ایک سوال کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

''نہ رہیں..... نہ رہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''صوفی صاحب آپ نے تو خیر میرے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر ڈالیں لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کروں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ ہمیشہ سے ایک لاابالی آدمی رہے ہیں۔ بہت عرصے پہلے فرید پور سے ٹرانسفر ہو کر یہاں دارالحکومت آئے تھے اور اس کے بعد سے آپ محکمہ پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے مجھے کہ آپ..... سنجیدگی سے اپنے کام کرتے تو آج بہت بڑے عہدے پر ہوتے۔ چلیے میں آپ سے یہ پوچھنے کا حق تو نہیں رکھتا کہ ایسا کیوں کرتے رہے ہیں، لیکن اتنا بتا دیجیے کہ باقی معاملات کیا حیثیت رکھتے ہیں مثلاً وہ گھر جو اس گندی سی گلی میں ہے اور جہاں آپ بڑے ذوق و شوق سے رہتے ہیں مجھے پتا چلا ہے کہ یہ نیا گھر تو آپ نے بس لے ہی لیا ہے پانوں کی یہ ڈبیا اور بٹوا، یہ موٹر سائیکل اور زندگی کی یہ تنہائی یہ سب کیا حیثیت رکھتی ہیں؟''

''آپ نے پہلا سوال خود ہی رد کر دیا یعنی کہ ہم نے محکماتی عہدے کیوں قبول نہیں کیے تو عزیز من بات صرف اتنی سی ہے کہ درویشوں کی صحبت رہی ہے۔ قناعت پسندی درویشوں کا شیوہ ہوتا ہے اور ہم بھی ان کے سائے میں چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑے عہدے بڑی مصیبتوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ ہم ٹھہرے من موجی آدمی، جو دل چاہا کیا جو نہ دل چاہا اس پر کبھی مجبور نہ ہوئے اور جو گھٹتے بڑھتے رہے ہمیں اس

سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ یہاں تک کہ محکمہ پولیس سے نکال دیے گئے۔ اس کی بھی ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ بس دال روٹی چلنی چاہیے۔ ردی پیپر بیچے، اخبار بھی بیچے اور دوسرے کام بھی کیے۔ کیا فرق پڑتا ہے تو مطلب یہ کہ ہمارا اپنی زندگی سے سمجھوتہ ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ ہم تنہا ہیں۔ ایک جم غفیر ہمارے ساتھ ہے درویشوں کے کرم سے ممن خان کا ہوٹل اور بھی بہت سے لوگ۔ ہم مطمئن ہیں اپنی زندگی سے۔''

''بڑی بات ہے صوفی صاحب۔ ہر شخص غرض مند ہوتا ہے آپ کے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ یہ جگہ اس گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے لیکن آپ نے پسند فرمائی ہے اس لیے مجھے بھی سر آنکھوں پر قبول ہے۔''

''ارشاد..... ارشاد۔'' صوفی نے کہا اسی وقت خاں صاحب نے بہ نفس نفیس چائے کی کیتلی اور چھوٹی چھوٹی پیالیاں سامنے لا کر رکھ دیں۔ جمشید مرزا نے ناک سکوڑی تھی لیکن صوفی نے بڑے پیار سے ان پیالیوں میں دودھ پتی والی چائے نکالی تھی۔

''نوش فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یار پلیز یہ پیالیاں گندی ہیں میں نہیں پی سکوں گا۔''

''توہین نہ فرمایئے خاں صاحب سر پھرے ہیں۔ دو منٹ میں عزت اتار دیتے ہیں۔ دیکھیے انہوں نے باہر والے سے چائے بھیجنے کے بجائے خود آپ کے سامنے چائے رکھی ہے اور ہم ان کے مداح ہیں آپ چائے پی کر تو دیکھیے۔''

''یہ لوگ یہاں سے بھاگ کیوں گئے۔ پولیس کو دیکھ کر۔''

''ہر شریف آدمی بھاگتا ہے۔ یہ سب شریف لوگ تھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور جمشید مرزا تلملا کر رہ گیا، لیکن اس نے بڑی مشکل سے ضبط کر لیا تھا۔ صوفی کے اصرار پر اسے بہرحال اس گندی سی پیالی میں چائے پینا پڑی۔ جیسے بھی اسے زہر مار کیا اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

''صوفی صاحب۔ آپ سے گہری دوستی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔''

''غالباً آپ نے تیسویں مرتبہ یہ الفاظ ادا کیے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''جو کچھ بھی آپ سمجھیں صوفی صاحب۔ میں آپ کو بتاؤں میرا سلسلہ کچھ عجیب سا ہے۔ اس دن آپ نے میرے بارے میں کچھ انکشافات بیان فرمائے تھے۔ بات درست ہی تھی۔ واقعی میں نے وہ سب کچھ کیا تھا۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں لیکن آپ کو ایک بات ضرور بتاؤں صوفی صاحب جن لوگوں سے میں نے وہ سب کچھ حاصل کیا وہ بہ ذات خود بڑے آگے کی چیز ہیں۔ جو کچھ انہوں نے مجھے دیا وہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان پر ہاتھ ڈالنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگ ہیں۔ وہ بس یوں سمجھیے کہ انہوں نے مجھے ایک طرح سے بخشش دے دی تھی لیکن بہرحال رشوت تو وہ تھی صوفی صاحب ان تمام چیزوں پر میں اپنا حق نہیں سمجھتا میرا ماضی بہت عجیب ہے ذرا مختلف قسم کا انسان تھا کچھ اور بننا چاہتا تھا والد صاحب کی سختی نے محکمہ پولیس میں پہنچا دیا۔ جبلی طور پر یہاں کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا کام کچھ اور ہی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہرحال صوفی صاحب میں ذہین بھی نہیں ہوں۔ میرے سپرد بہت سے کام کر دیے جاتے ہیں۔ میری جان پر بن آتی ہے صوفی صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔"

"مذاق کر رہے ہو عزیزی! درویشوں کے کرم سے ہم کیا مدد کر سکیں گے ہم تو خود انتہائی غریب آدمی ہیں۔"

"نہیں میں مالی مدد کی بات نہیں کر رہا۔ بہت سارے کیس میرے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ نے بڑے بڑے مرحلے حل کیے ہیں اور بہت سے ملزموں کی گردنیں ناپی ہیں۔ صوفی صاحب میری آرزو ہے کہ اگر کوئی کیس مجھے ملے تو آپ میری مدد کریں۔ جتنا معاوضہ آپ چاہیں گے میں آپ کو ادا کروں گا۔"

"اچھا۔" صوفی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پانوں کی ڈبیا اور بٹوا اس نے بڑے پیار سے جیب میں رکھ لیا تھا۔

"آپ اپنا حلیہ بالکل تبدیل کر لیں۔ آپ جس چیز پر ہاتھ رکھ دیں گے وہ میں خرید کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ فی الحال ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"صوفی صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے نہیں ہے لیکن آپ کے تعلقات اور آپ کی پہنچ کا میں دل سے قائل ہوں۔ اس وقت ایک عجیب و غریب مرحلہ درپیش ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ محکمہ پولیس کے کئی ڈیپارٹمنٹوں میں پینل بنائے گئے ہیں اور ان کے سپرد ایک ذمے داری کی گئی ہے آپ نے یقینی طور پر وہ واقعات ضرور پڑھے ہوں گے اخبارات میں جن میں زندہ انسان اچانک ہی پتھرا جاتے ہیں اور اس کے بعد پگھل کر بہ جاتے ہیں۔ اب یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ فولاد میں ڈھل جاتے ہیں۔"

"جی..... جی..... جی پڑھے ہیں میں نے۔"

"صوفی صاحب ایک پینل کا انچارج مجھے بھی بنایا گیا ہے۔ ابھی میں نے اپنی ٹیم کی تشکیل نہیں کی ہے لیکن میں نے کچھ اور ہی سوچا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں باقاعدہ کوئی ٹیم نہیں بناؤں گا بلکہ آپ سے مدد حاصل کر کے کام کروں گا۔"

"درویش آپ پر رحم کریں۔" صوفی نے چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پھر دوسری پیالی بھر لی۔"

"اس سلسلے میں کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں آپ کو۔"

"بالکل نہیں۔ ابھی میں نے کام کا آغاز ہی نہیں کیا ہے۔ آئی جی صاحب نے لوہے کا ایک ٹکڑا مجھے بھی دیا ہے جو ان میں سے ایک پگھلے ہوئے شخص کا ہے اور مکمل اختیارات دیے ہیں کہ اپنے پینل کے ذریعے میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ یہ دیکھیے یہ ہے وہ فولاد کا ٹکڑا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ ایک انسانی جسم کا ٹکڑا ہے۔" صوفی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ چینک کی دوسری پیالی خالی کر کے اس نے میز پر رکھی اور پھر لوہے کے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر

اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی چمک لہرائی۔ ٹکڑے کو مٹھی میں دبا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جمشید مرزا تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"خیریت۔"

"نہیں۔" صوفی نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ جمشید مرزا تو اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ کیا ہوا ہے تو وہ بھی جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا لیکن اتنی دیر میں باہر سے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور جمشید مرزا ناچ کر رہ گیا تھا پھر وہ جیپ کی طرف بڑھا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ موٹر سائیکل ایک پتلی سی گلی میں گھس کر غائب ہو گئی تھی اور اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر زبردست دھوکا دیا تھا۔ لوہے کا وہ ٹکڑا ایک طرح سے بہت بڑی حیثیت کا حامل تھا اور اگر آئی جی نے اس کے بارے میں سوال کر لیا اور جمشید مرزا ٹکڑا حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اسے سسپینڈ بھی کیا جا سکتا تھا۔

♥.....♥.....♥

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غاروں ہی غاروں میں یہ سارا تہ خانہ بنا ہوا ہوگا۔ یہ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پانچوں اندر داخل ہو گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت ہی بڑا کارنامہ سرانجام دیا جا رہا ہو۔ چاروں طرف خاص طرح کی مشینیں نصب تھیں۔ ایک طرف ایک اسٹور بھی بنا ہوا تھا۔ یہاں بے شمار چیزیں کارٹنوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کارٹنوں میں زیادہ تر اسٹیشنری پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء بھی جس غار میں یہ داخل ہوئے تھے وہ بہت بڑا تھا اور اس میں داخلے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسے دوسرے بقیہ دروازے تھے۔ ناہموار اور ٹیڑھے میڑھے۔ کوئی دوسرا انکا سی کا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا بڑی بڑی پیٹیوں میں سامان پیک رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ایک پیٹی جانب بڑھ گئے۔ اس پر جنریٹر لکھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا خیال ہے اسے یہیں کھول لیا جائے۔"

"ہاں۔ یہی جگہ مناسب رہے گی۔ لکڑی کی تختی یہیں رکھ دیں گے ورنہ انہیں واپس رکھنے آنا ہوگا۔ جنریٹر کو ٹرالی پر رکھ کر لے چلیں گے۔"

"ٹرالی لے آؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ کونے میں رکھی ہوئی ٹرالی نزدیک لے آیا۔ بقیہ لوگ اوزاروں کا بیگ اٹھا کر اس میں سے اوزار نکالنے لگے۔ پھر جنریٹر کی پیٹی کی جانب متوجہ ہو گئے جو بہت مضبوطی سے پیک کی گئی تھی۔ اس میں پتریاں لگی ہوئی تھیں۔ لوہا کاٹنے والی قینچی سے پتریاں کاٹی گئیں اور پھر ان میں سے ایک نے پلاس پیٹی کے رخنے میں ڈال کر اندر ٹھونکا۔ اچھی طرح ٹھونکنے کے بعد اس نے پلاس کے دوسرے حصے پر زور ڈالا۔ تختے نے چرچرا کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تختہ تھوڑا سا نہیں پورا ہٹ گیا۔ دوسرے آدمی نے دوسرے تختے کو اٹھایا اور پوری قوت سے اوپر اٹھا دیا لیکن ان کے کان وہ آواز نہ سن سکے تھے جو اچانک تختہ اٹھنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرا تختہ بھی اٹھ گیا تھا۔ اس لیے پیٹی میں کافی خلا پیدا ہو گیا تھا اور اتنا خلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیدا ہو گیا کہ انہوں نے وہ آواز سنی لی اور حیرت زدہ رہ گئے۔ عجیب سی آواز تھی جیسے جنریٹر ہلکی سی آواز کے ساتھ چلنے لگا ہو۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں اندر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت بہت سے ڈیمو کھلے تختے سے باہر نکل پڑے۔ یہ کالے رنگ کے ڈیمو تھے اور ان کی شکل انتہائی بھیانک تھی۔ پورا غول ایک دم باہر نکلا تھا اور اس طرح بھرا مار کر نکلا تھا کہ وہ پوری طرح ان کے پورے چہروں سے ٹکرائے وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن ڈیمو کے گروہ نے اچانک ان پر حملہ کر دیا تھا اور ان کے جسم کے کھلے حصوں سے چمٹ گئے تھے۔ وہ انہیں کاٹ رہے تھے۔ ان کی دل دوز چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ یہ بڑے بڑے ڈیمو جس جگہ کاٹتے تھے وہاں اس قدر تکلیف ہوتی تھی جیسے کسی نے سوراخ کر کے تیزاب بھر دیا ہو اور ایسی ناقابل بیان تکلیف جس کا الفاظ میں بیان ناممکن ہے۔ وہ چاروں طرف بھاگتے پھر رہے تھے لیکن ننھی ننھی خوف ناک بلاؤں نے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ بہ مشکل تمام ان میں سے دو دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی یہ دیکھ ان کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں کہ پتھریلے غار کا...... وہ خودکار دروازہ جو ایک خاص انداز سے کھلتا تھا باہر سے بند تھا۔ اسے کھولنے کی کوشش اندر سے کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ڈیمو مسلسل ان کے جسموں سے چمٹے ہوئے تھے اور ان پر جو اذیت گزر رہی تھی وہ ایسی ہی تھی کہ انہیں چند ساعت میں مر جانا چاہیے تھا لیکن زندگی بچانے کی کوششوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ زمین پر لوٹیاں لگا رہے تھے۔ زمین سے اپنے بدن کو رگڑ رہے تھے لیکن ڈیمو تھے کہ ان کا بدن کھا کھا کر ان میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ اب وہ کپڑوں سے بھی چمٹ گئے تھے اور ان کے لمبے لمبے تیز ڈنگ کپڑوں سے گزر کر جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔ ایک ایک آدمی سے ہزاروں ڈیمو چمٹے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ان سے اپنے آپ کو چھڑانے میں بالکل ناکام ہو گئے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ سب کے سب سیاہ دھبوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس قدر آدم خور مکھیاں ان کے بدن سے چمٹ گئی تھیں کہ اب ان کا بدن نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھیں، ناک، کان، بال، گردن غرض کہ بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں کالے رنگ کے ڈیمو نہ چمٹے ہوئے ہوں لیکن ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ڈیمو ان کے بدن کا گوشت کھا رہے تھے اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہاں پانچ انسانی ڈھانچوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پنجرا ان میں صرف ہڈیاں نظر آ رہی تھیں یا کہیں کہیں خون کا کوئی قطرہ یا گوشت کا کوئی ریزہ جو کسی ڈیمو کی نگاہ سے محفوظ رہ گیا ہو ورنہ آدم خور مکھیاں ان کا سارا گوشت ختم کر چکی تھیں۔ یہاں تک کہ دل، کلیجہ، پھیپھڑے بھی ختم ہو چکے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز سزا تھی۔ اتنی حیرت انگیز کہ انسانی ذہن اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈیمو اور مکھیاں منتشر ہونے لگے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اسی پیٹی کی طرف جا رہی تھیں جہاں سے وہ آئی تھیں۔ چند ساعت کے بعد کمرے میں کسی ایک بھی ڈیمو کا وجود نہیں تھا حالانکہ پیٹی کے تختے اکھڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد خودکار دروازہ کھل گیا۔ باہر چند افراد کھڑے ہوئے تھے جنہیں خاص طور سے ہدایات دی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ یہاں کھڑے ہو کر ان پانچوں افراد کا انجام دیکھیں جن کی وجہ سے جنریٹر خراب ہوئے اور ان کا راز ان غاروں سے نکل کر منظر عام تک پہنچ گیا۔ دیکھنے والوں نے ہڈیوں کے یہ پنجر دیکھے اور ان کے بدن خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔ وہ سب خشک ہونٹوں پر

زبان پھیرتے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

♥......♥......♥

چھوٹا سا درمیانے درجے کا گھر تھا۔ تین بیڈروم، ایک ڈائننگ، کچن اور دوسری تمام چیزیں۔ خوب صورت لڑکی کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ ایک کمرے میں ایک انتہائی بدشکل آدمی جس کا چہرہ بے حد مکروہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... موٹے موٹے لٹکے ہوئے ہونٹ...... درمیانہ سا قد کوبڑ نکلا ہوا، پتلی پتلی ٹانگیں۔ ایک عجیب و غریب مخلوق معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی آنکھیں کسی درندے کی آنکھیں محسوس ہوتی تھیں۔ اس قدر خوف ناک کہ صرف آنکھوں کو دیکھ لیا جائے تو دل کی حرکت بند ہونے لگے۔ لڑکی تھوڑی دیر کے بعد کھانے کی ٹرے لیے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ بدہیئت آدمی سامنے رکھے ہوئے ٹیلی ویژن سیٹ پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ ٹیلی ویژن سیٹ انتہائی مخصوص انداز کا تھا جو اس پر نظر آ رہا تھا وہ بھی بے حد خوف ناک تھا۔ یہ وہی منظر تھا جس میں غاروں کے اندر ان پانچ افراد کو زہریلی مکھیوں یا آدم خور مکھیوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ لڑکی نے ٹرے رکھی اور افسوس بھری نگاہوں سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ خوف ناک آدمی نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔ لمبے لمبے مکروہ دانت جو انتہائی غلیظ تھے نمایاں ہو گئے۔ لڑکی نے آنکھیں بھینچ کر ٹھنڈی سانس لی اور اس شخص نے سوئچ آف کر دیا پھر اس کی نرم آواز ابھری۔

”سوری ایلیٹ مجھے پتا ہے کہ تمہیں یہ منظر دیکھ کر دکھ ہوا ہوگا۔“

”شانگو میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ یہ تم غلط کر رہے ہو۔ انسانوں کی زندگی اس قدر بے وقعت نہیں ہوتی کہ تم انہیں یوں ختم کر دو۔“

”تم نہیں سمجھتیں ایلیٹ مجھے تاج محل بنانا ہے اس نئے دور میں مجھے تمہاری محبت کا تاج محل تعمیر کرنا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری راہ میں رکاوٹیں آئیں۔ میری زندگی کے بارے میں تم جانتی ہو۔ آہ! جب بھی زندگی کی کتاب کھولتا ہوں ایک عجیب و غریب کہانی یاد آ جاتی ہے۔ سان فرانسسکو کی سڑک پر ایک عورت ایک بچے کو جنم دے رہی تھی۔ وہ ایک بے سہارا بھکارن تھی۔ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تھی۔ وہ بدشکل بھی تھی۔ بس اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ عورت تھی اور کوئی مادر زاد اسے تباہ کر گیا۔ وہ بے چاری نیم دیوانی عورت نہیں جانتی تھی کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے اس مکروہ بچے کو جنم دیا۔ پتا نہیں وہ لوگ کون تھے جو اس عورت کی لاش اور نوزائیدہ بچے کو کسی خیراتی ادارے میں لے گئے اور بس۔ عورت کی تو تدفین کر دی گئی۔ بچے کی پرورش اس خیراتی ادارے نے کی۔ لیکن پانچ سال کی عمر میں ہی اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر اس ادارے نے اسے ایک ایسے ادارے کے حوالے کر دیا جو سرکاری پیمانے پر بچوں کی پرورش کرتا تھا اور ان کے رجحان کو دیکھ کر ان کے لیے راستے متعین کرتا تھا۔ بچے کا نام انہی لوگوں نے شانگو رکھا اور مجھے ایک سائنسی ادارے کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے سائنس میں کمال دکھانا شروع کر دیا اور گیارہ سال کی عمر میں میری شہرت کا ڈنکا بج گیا۔ میں ایک عظیم سائنٹسٹ تھا۔ یہ عظیم سائنٹسٹ اپنے فن میں آگے بڑھتا چلا گیا لیکن بدنصیبی ایلیٹ بدنصیبی، کم بخت انسان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا انسانوں کی طرح جینا چاہتا تھا مگر اس کا مکروہ چہرہ اس کی بھیانک شخصیت اسے جنون کا شکار بنائے رہی۔ اسے اپنے جیسے انسانوں سے نفرت ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو روپوش کرلیا۔ اسے محبت کی تلاش تھی جو اسے کہیں سے نہ مل سکی اور اس کا ذہن تخریبی کارروائیوں کا شکار ہوتا رہا۔ دنیا اس کے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ بھٹکتا رہا اور یہاں آ گیا۔ ایلیٹ اس کے بعد تم مجھے یہاں کی سڑکوں پر ملیں۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں میرے لیے یہ جذبے کیسے پیدا ہوگئے کہ تم نے مجھے، میری مکروہ صورت کو نظر انداز کر کے محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی میرے لیے سب کچھ تھا۔ ایلیٹ میں نے تمہارا اچھی طرح تجزیہ کیا ہے تم کوئی فریب نہیں کر رہی ہو مجھ سے۔ بس تمہارے دل میں میرے لیے پیار جاگ اٹھا ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایلیٹ میں تو ایک سائنسی دماغ رکھتا ہوں اور اس کے بعد میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایلیٹ ابھی میں تعمیر کی منزل میں ہوں جن لوگوں کو میں دنیا کی ہر آسائش مہیا کر دیتا ہوں ان کی غلطی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے بینک رابری کے لیے کچھ لوگوں کا انتخاب کیا تاکہ میرے پاس دولت اکٹھی ہو جائے اور میں اپنے مقصد کی تکمیل کرلوں لیکن ان لوگوں نے جنریٹر غلط طریقے سے چلا کر میرا منصوبہ فیل کر دیا۔ کیا میں انہیں زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ شہر میں تشہیر تو ہوگئی اور اب اس پر تحقیق ہو رہی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے لوگ بالکل ہی احمق ہوں گے اور میری کاوشوں کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ خود سوچو اگر اسی طرح یہ لوگ غلطیاں کرتے رہے تو پھر میرا مشن کیسے پورا ہوگا۔ مجھے تمہارے پیار کا تاج محل تعمیر کرنا ہے اور اس کے لیے میں کوئی غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ کیونکہ کوئی بھی غلطی میری نشان دہی کر دے گی اور اس کے بعد ایلیٹ تم خود سوچ لو مرجانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اپنا مشن پورا کیے بغیر میں نہیں مرنا چاہتا۔"

"میں نقصان کرنے والوں کو کبھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا اس لیے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان میں سے کسی نے یا پھر یہ سمجھ لو کہ ان جیسوں میں سے کسی نے میرے ساتھ کوئی رحم کا سلوک نہیں کیا تو پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کے ساتھ رحم کا سلوک کروں۔"

"مگر شائیکو مجھے یہ..... درندگی پسند نہیں ہے۔"

"ایلیٹ اب دیکھو نا!..... میں تو یہ کوشش کرتا ہوں کہ جس طرح میں ان لوگوں کا خیال رکھتا ہوں اسی طرح وہ بھی میرے مقصد کی تکمیل کرنے میں میری مدد کریں۔ بہرحال صورت حال ذرا مشکل ہوگئی ہے میرے لیے۔ مجھے کچھ دن کے لیے اپنا کام روکنا پڑے گا۔"

"چلو کھانا کھاؤ۔" لڑکی نے نرم لہجے میں اس سے کہا اور کھانے کی ٹرے اس کے آگے رکھ دی۔

بدہیئت آدمی کھانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے کہا۔

"بہت محنت کی ہے میں نے، جن پہاڑی غاروں میں میں نے اپنی لیب بنائی ہے میں ہر وقت خوف زدہ رہتا ہوں کہ کہیں ان کا راز وقت سے پہلے منظر عام پر نہ آ جائے۔ دیکھو ایلیٹ میں نے وہاں کیا کیا جمع نہیں کیا۔ دنیا کی جدید ترین سائنسی مشینیں وہاں موجود ہیں اور میں ان میں اضافہ کر رہا ہوں۔"

"مجھے تمہاری ضرورت ہے شائیکو۔ اپنی حفاظت کا بھی بندوبست رکھو۔ میرا تاج محل تو تم ہو۔

مجھے کسی تاج محل کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم زندہ سلامت رہو۔" بدہیئت شائیکو ایلیٹ کو دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ناچ رہی تھی۔

♥.....♥.....♥

انسپکٹر جنرل صاحب نے جو ذمے داری اسے سونپی تھی اس کے سلسلے میں جواب طلبی ہونے ہی والی تھی اور فولاد کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بس اس کے بعد جو ہونا تھا وہ خود جانتا تھا۔ دماغ کھچڑی بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ صوفی سے وہ فولادی ٹکڑا نکلوانا ایک مشکل کام ہے۔ بیوی اس کی پریشانی سے الگ پریشان تھی اور اکثر اس سے پوچھتی رہتی تھی کہ بات کیا ہے۔

"دیکھو میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو دفتری معاملات کے سلسلے میں اپنے گھر میں بیٹھ کر مشورے کرتے ہیں۔ تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ اگر بتانے کی کوئی بات ہوئی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔ دوسری صورت میں درخواست کرتا ہوں میں تم سے کہ میرے کان کھانے کی کوشش مت کیا کرو۔"

"تم ان مردوں میں سے نہیں ہو۔" بیوی نے اوپری ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا.....؟"

"ٹھیک ہے کسی مناسب پر وقت تمہارے اس سوال کا جواب دوں گی۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔ بجائے اس کے کہ میری پریشانی سے متاثر ہوتیں۔ مجھے دھمکیاں دے رہی ہو۔" بیوی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ جمشید مرزا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آخر کار اس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اس سے پہلے کہ آئی جی صاحب اسے طلب کر کے ذلیل کریں اور اس کے لیے سزا تجویز کی جائے کیوں نہ اس جھگڑے کو ختم ہی کر دیا جائے چنانچہ وہ تیار ہو کر چل پڑا اور پھر خود ہی آئی جی صاحب کے سامنے پیش ہوگیا۔ آئی جی صاحب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔

"ہوں..... اس کا مطلب ہے کہ تم کوئی اعلیٰ کارکردگی دکھانے میں کامیاب ہوگئے ہو۔ کہو کیا رپورٹ ہے؟ کیا بتا رہے ہو مجھے.....؟"

"سر! میرے پاس کوئی رپورٹ نہیں ہے بلکہ میں آپ سے کچھ ہدایات لینے آیا ہوں۔" آئی جی صاحب ٹیڑھی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

"ایک شخص ہے جناب! کسی زمانے میں محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ لوگ اس کے بارے میں بہت سی داستانیں گھڑے ہوئے ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو کہنا یہ ہے کہ وہ اگر چاہتا اور اپنے معاملات میں سنجیدہ ہو جاتا یا محکمے کی ہدایات قبول کر لیتا تو شاید وہ آپ کی جگہ بیٹھا ہوتا۔ یہی کہا جاتا ہے اس کے بارے میں، صوفی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔" آئی جی صاحب نے چونک کر جمشید مرزا کو دیکھا بولے۔

"اچھا..... آگے کہو؟"

"سر! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

"نہیں۔ میرے دور میں شاید وہ انسپکٹر نہیں رہا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی سر! نکال دیا گیا تھا محکمہ پولیس سے۔"

"تم اپنا مقصد بتاؤ۔ بڑا تفصیلی تعارف کرا رہے ہو۔ کیا قصہ ہے؟"

"سر وہ بڑی جارحیت کرتا رہتا ہے اور اسے وزیر داخلہ صاحب کا تعاون حاصل ہے۔"

"کہاں کی اڑا رہے ہو۔ ایسا کوئی شخص میرے علم میں کیوں نہیں ہے؟"

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب! اسے بڑا تحفظ حاصل ہے۔ ہوم منسٹر اس کے کسی معاملات میں مداخلت پر خود متحرک ہو جاتے ہیں۔"

"ہوں..... اچھا پھر؟"

"سر! میری بھی اس سے تھوڑی بہت سلام دعا ہے لیکن بس اس حد تک کہ بعض معاملات میں میں اس سے مشورے لے لیتا ہوں۔ سر! فولاد کا وہ ٹکڑا جو آپ نے مجھے دیا تھا وہ لے کر بھاگ گیا ہے۔" آئی جی صاحب بری طرح چونک پڑے۔

"بھاگ گیا ہے.....؟"

"جی سر۔"

"ایک بات بتاؤ جمشید مرزا! کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟"

"نہیں سر! جو کچھ کہہ رہا ہوں ہوش و حواس کے عالم میں کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر لوہے کا وہ ٹکڑا کیا تم نے گلے میں لٹکا رکھا تھا جسے وہ لے کر بھاگ گیا۔"

"نہیں سر۔ اس کم بخت کے کچھ تعلقات ہیں مختلف جگہوں پر۔ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں اتفاقیہ طور پر اس سے بھی رابطہ کرنا پڑا اور اس نے دھوکے سے وہ ٹکڑا اپنی مٹھی میں لیا اور فرار ہو گیا۔"

"پھر.....؟"

"بس سر! تھوڑے سے اختیارات چاہتا ہوں۔ وزارت داخلہ اگر پولیس کے ان معاملات میں مداخلت نہ کرے تو کیا زیادہ بہتر نہیں ہے؟"

"یہ سوال تم براہ راست وزارت داخلہ سے کر سکتے ہو۔" آئی جی صاحب نے طنزیہ کہا۔

"نہیں سر! ظاہر ہے آپ کے حکم کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جاؤ احتیاط کرو۔"

"سر! تحکماتی طور پر۔"

"نہیں۔ محکمہ کسی سے یہ بات فخر سے نہیں کہہ سکتا کہ ایک غیر متعلق آدمی کوئی اہم چیز محکمے کے ایک بڑے آفیسر سے چھین کر بھاگ گیا ہے اور وہ آفیسر فریاد کرتا پھر رہا ہے۔ یہ بات میں کہوں گا۔"

"لیکن سر۔"

"مس..... سر..... سر مت کرو۔ میں نے ایک اہم چیز تمہارے سپرد کی ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میں اس کی واپسی چاہتا ہوں اور اس کے بعد یہ کیس تم سے لے لیا جائے گا۔ پانچ میں سے چار پینل کام شروع کر چکے ہیں اور تم صرف کسی ایک آدمی کی شکایت لے کر میرے پاس آئے ہو۔؟"

"لیکن سر۔"

"کچھ نہیں۔ مسٹر جمشید مرزا! آپ جائیے اور چوبیس گھنٹے کے اندر مجھے فولاد کا وہ ٹکڑا واپس لا کر دیجیے۔ اسے کسی غیر متعلق ہاتھ میں جانا کسی بھی طور قابل قبول نہیں ہے۔ یہ آپ کی اپنے ذمے داری ہے۔"

"سر میں۔"

"آپ جا سکتے ہیں۔"

"یس سر۔" جمشید مرزا نے سیلوٹ کیا اور واپس پلٹ پڑا۔ تقدیر ہی خراب تھی، لیکن صوفی..... وہ بری طرح کھولتا ہوا آئی جی صاحب کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

♥.....♥.....♥

شائیکو نے جو کچھ ایلیٹ سے کہا تھا وہ بڑا متاثر کن تھا۔ وہ ایک کبڑا اور انتہائی بدشکل انسان تھا لیکن نہ جانے کیوں ایلیٹ کے ذہن کا کون سا حصہ اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس لوگ بیٹھنا بھی پسند نہ کریں ایلیٹ درحقیقت اس سے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنا تجزیہ کرنے لگتی تھی اور نہ جانے کیوں خود بھی اسے کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ زمانہ قدیم میں ناٹرڈیم کے جس کبڑے عاشق کی داستانیں کتابوں میں درج تھیں۔ فلموں اور ڈراموں میں ناٹرڈیم کے کبڑے کو دکھایا جاتا تھا اور..... محبت کی لازوال داستانیں رقم کی جاتی تھیں ایلیٹ کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ زمانہ قدیم کے اس کبڑے کی محبوبہ ہے اور زیادتیاں اور مظلومیاں..... ناٹرڈیم کے اس گھنٹہ بجانے والے کبڑے کو برداشت کرنا پڑی تھی۔ اس کا فرض ہے کہ ان کا ازالہ کرے اور یہ احساس کچھ اس طرح اس کی ذات پر مسلط تھا کہ وہ شائیکو کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی عورت تھی۔ شائیکو کی ظاہری کیفیت کچھ بھی ہو لیکن اس کی دماغی صلاحیتوں کا دل سے اعتراف کرتی تھی۔ چار دیواری میں جس طرح اس نے اس پورے علاقے کو کنٹرول کر کے وہاں اپنی تجربہ گاہ بنائی تھی اور جس طرح اس نے بے شمار افراد کو اپنا غلام بنا رکھا تھا یہ اس کی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کا عکس تھا اور ایلیٹ کچھ اسی ٹائپ کی لڑکی تھی۔ چہرہ مہرہ شکل و صورت اسے زیادہ نہیں بھاتا تھا۔ بس صلاحیتوں کی دل سے قائل تھی۔ بہرحال ایلیٹ شائیکو کے عمل سے اتفاق نہیں کرتی تھی لیکن اس کے مقصد سے اسے محبت تھی۔ شائیکو ایلیٹ کو ملکہ برطانیہ کے برابر کی حیثیت دینا چاہتا تھا اور اسی کے لیے مصروف عمل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے بھی ایک تاج محل بنانا ہے ایلیٹ کے لیے اور بہرحال دنیا کی شاطر ترین عورت بھی محبت کے ان الفاظ کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال وہ خود بھی شائیکو کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی اور شائیکو نے ان دنوں اسے ایک شخص کے پیچھے لگایا تھا۔

"اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مقامی یونیورسٹی میں بڑی عزت دار حیثیت کا مالک۔ پروفیسر اطہر کے نام سے لوگ اسے جانتے ہیں۔ صاحب حیثیت اور شوقیہ طور پر یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ تمہیں اس سے دوستی کرنی ہے اور احتیاط کے ساتھ اسے یہاں تک لانا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اسے اغوا بھی کرا سکتا ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ شخصیتوں کا تجزیہ میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں اسے یہاں لانے سے پہلے اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں اور ایلیٹ انتہائی کوششیں کر کے پروفیسر اطہر تک پہنچ گئی تھی۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے شائیکو یا ایلیٹ کی بدقسمتی کہا جاسکتا ہے کہ شائیکو کو پروفیسر اطہر کے بارے میں ساری تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ کمال کی شخصیت تھی اس کی، اس سے پہلے وہ اس طرح کا انسان نہیں تھا لیکن ایک بار ایک پہاڑی مقام پر لینڈ سلائیڈنگ سے اس کی کار کو ایک حادثہ پیش آیا تھا اور اس کے سر پر شدید چوٹ لگی تھی۔ علاج سے وہ ٹھیک تو ہوگیا لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا دماغ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے اور دونوں حصوں کا ایک دوسرے سے رابطہ نہیں ہے۔ اس کے بعد جو شناسا اسے جانتے تھے انہیں یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ پروفیسر اطہر..... اس حادثے کے بعد خاصا بدل گیا ہے لیکن دماغ کی دہری کیفیت کے بارے میں انہیں بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ بہت گہرا معاملہ تھا اور ڈاکٹروں کے سامنے نہیں آسکا تھا۔ پروفیسر اطہر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ پہلے سے بے پناہ ذہین ہوگیا تھا۔ دماغ کے جس حصے کو وہ چاہتا تھا استعمال کرتا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ڈبل برین ہوگیا ہے۔ پھر ایلیٹ نامی حسین لڑکی اس کی زندگی میں آئی۔ وہ بہت زیادہ حسن پرست نہیں تھا۔ شادی کی تھی اس نے، لیکن بیوی صرف ڈیڑھ سال زندہ رہی اور اس کے بعد اس نے اپنے ڈیڑھ سالہ تجربے سے فائدہ اٹھایا اور دوسری شادی کے چکر میں نہیں پڑا۔ اہل خاندان تھے۔ اسے دوسری شادی سے بھی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن وہ حسین لڑکی کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی کہ وہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔ ایلیٹ سے اس کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ اس کے بارے میں کھسر پھسر کرنے لگے کہ یہ غیر ملکی لڑکی کس طرح اطہر کی زندگی پر اثر انداز ہوگئی ہے۔ ایلیٹ کے ساتھ پروفیسر اطہر شام کے بعد مختلف پبلک مقامات پر دیکھا جاتا تھا۔ اس کے لباس کی نفاست کچھ اور بڑھ گئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ پراثر شخصیت کا مالک نظر آنے لگا تھا۔ پھر ایک شام ایلیٹ نے اسے اپنی ماما سے ملانے کے لیے کہا۔

''ہم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا پروفیسر اطہر! ماما کے سوا میری زندگی میں کوئی نہیں ہے، ہمارے پاس کچھ اثاثے ہیں جن سے ہم اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹتے ہیں۔ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اس کائنات میں ماما کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ میں نے آپ کا تذکرہ ان سے کردیا ہے، آپ ماما سے مل کر خوش ہوں گے۔'' پروفیسر اطہر ہنس کر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے ملاؤ مجھے ان سے۔ میں خوش ہونا چاہتا ہوں اور ایلیٹ پروفیسر اطہر کو اپنے گھر لے گئی۔ اسی چھوٹے سے گھر میں جس کے بیسمنٹ میں چھوٹی سی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی۔ اوپر کا گھر سادہ سادہ سا تھا لیکن اس سادگی کے نیچے بڑی پُرکاری تھی۔ پروفیسر اطہر مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ سادہ سا ڈرائنگ روم معمولی سے فرنیچر سے آراستہ..... ایلیٹ کہنے لگی۔

''آپ کو یہاں آکے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ پروفیسر میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں ہم جس حیثیت کے مالک ہیں آج آپ اس سے بھی واقف ہوگئے۔''

''ہاں..... اور انتہائی متاثر ہوں تمہارے گھر کے اس سادہ سے ماحول سے۔''

''آپ بہت بڑے آدمی ہیں جو آپ نے ہماری اس حیثیت کو قبول کرلیا۔ اچھا بیٹھیے میں ماما کو بلا کر لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ایلیٹ باہر نکل گئی لیکن ماما کے بجائے وہ ایک بار پھر خود آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو پلیٹ میں رکھا ہوا تھا اور اس میں ایک خوش رنگ مشروب رکھا ہوا تھا۔ اس نے مشروب پروفیسر

اطہر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ماما باتھ روم میں ہیں۔ میں ذرا ان کی ہیلپ کررہی ہوں۔ آپ پلیز یہ لیجیے میں ابھی آئی۔''

''اوکے..... اوکے۔'' پروفیسر اطہر نے کہا اور ایلیٹ باہر نکل گئی۔ پروفیسر مسکرا کر آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکنے لگا۔ اس نے خود نہیں سوچا تھا کہ اس قربت یا اس یگانگت کا انجام کیا ہوگا۔ کیا دوسری شادی کرکے زندگی کے سفر میں تبدیلی کیا ہونی چاہیے اس نے مشروب کا گلاس اٹھایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگا۔ بہت خوش ذائقہ مشروب تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہے۔ ابھی کچھ چار پانچ ہی سپ لیے ہوں گے کہ ایلیٹ ایک بار پھر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے لباس تبدیل کررکھا تھا اور اس کے پیچھے جو شخص داخل ہوا اسے دیکھ کر پروفیسر اطہر حیران رہ گیا۔ انتہائی بدہیئت اور بھیانک شخصیت تھی۔ اس نے اس شخص کے پیچھے دیکھا تو ایلیٹ ہنس پڑی۔

''ماما کو تلاش کررہے ہو پروفیسر۔'' پروفیسر کو نہ جانے کیوں ایلیٹ کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنے والے شخص نے کہا۔

''میرا نام شائیکو ہے۔ پروفیسر اطہر میں کیا ہوں اس کی تفصیل جان کر نہ تو آپ کو خوشی ہوگی نہ کوئی فائدہ۔ چنانچہ کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں۔''

''ایلیٹ ماما کہاں ہیں تمہاری.....؟''

''میری ماما کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پروفیسر اطہر میری زندگی کا مقصد میرا محبوب میرا مالک دنیا کے کسی بھی رشتے کا تصور کرلو۔ شائیکو سے میرا جو بھی رشتہ ہے میری مراد ہے محبت کا رشتہ۔'' پروفیسر اطہر نہ سمجھنے والے انداز میں ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''لیکن تم نے مجھ سے کہا تھا ایلیٹ.....''

''ہاں یہ ضروری تھا۔ مسٹر شائیکو آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ آرام سے بیٹھیے پروفیسر میری نگاہیں تمہارے پورے وجود کا جائزہ لے چکی ہیں۔ ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں ہے تمہارے پاس۔ آپ ویسے بھی نرم و نازک طبیعت کے مالک ہیں جبکہ میں سخت گیر ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا کام کرلیتا ہوں۔''

''ایلیٹ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' پروفیسر اطہر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ہاں پروفیسر۔ شائیکو کی خواہش پر۔'' ایلیٹ نے جواب دیا۔

''ٹھیک اور شائیکو کی خواہش میرے لیے ان لائن کا درجہ رکھتی ہے۔''

''تم چاہتے کیا ہو مسٹر شائیکو۔''

''پروفیسر اب تک میں ہر طرح کے تجربات کرتا رہا ہوں۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں میں نے خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔ اگر آپ کسی بینک کو لوٹتے ہیں یا دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی مجرمانہ قدم اٹھاتے ہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کے قریب ترین شناسا تک اپنی دماغی کیفیت پر شک کرنے لگیں گے اور یہ سوچیں گے کہ انہیں ضرور کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سوچ رہے ہیں اور سمجھ رہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ میں ایسے نیک نام لوگوں سے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کام لینا چاہتا ہوں جن پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے اور جب کام کی تکمیل ہو جائے تو مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ میرے لیے کام کرنے والے پر کیا گزری؟ آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات۔ طریقہ کار یہ کہ آپ کے دماغ کا چھوٹا سا آپریشن کر کے میں اس میں ایک مائیکرو چپ پوشیدہ کر دوں گا اور ایک دور دراز مقام سے ریڈیائی جنریٹر کے ذریعے اس مائیکرو چپ کو کنٹرول کیا جائے گا جو آپ کے ذہن میں موجود ہوگی۔ پروفیسر اطہر آپ اس طرح ہمارے لیے کام کریں گے اور جب آپ دنیا کی نگاہوں میں مشکوک ہو جائیں گے تو پھر آپ کی چھٹی کر دی جائے گی۔ یہی ہمارا طریقہ کار ہے۔"

"تم اس طرح آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پا سکو گے مائی ڈیئر۔"

"نہیں پروفیسر آپ پر قابو پایا جا چکا ہے۔ آپ اگر کھڑے ہونے کی کوشش کریں گے تو کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ کیونکہ جو مشروب آپ پی چکے ہیں وہ بس اب آپ پر اثر انداز ہونے والا ہی ہوگا اور آپ کے اعصاب بے جان ہو جائیں گے۔" شائیکو نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"آپ کوشش کیجیے اٹھنے کی۔" پروفیسر اطہر نے واقعی اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ نہیں سکا تھا

♥.....♥.....♥

کرنل رحیم کو سردار گڑھ سے اس کی بیٹی کا فون موصول ہوا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ آپ کے دوست پروفیسر اطہر آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے کہا کہ یہ ملاقات فوری طور پر ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

"تم نے اسے میرا موبائل نمبر نہیں دیا۔" کرنل رحیم نے پوچھا۔

"نہیں پپا۔ آپ سے اجازت لیے بغیر میں آپ کا موبائل نمبر کیسے دے سکتی تھی؟"

"اس کا فون نمبر یا موبائل نمبر لیا ہے تم نے۔"

"جی..... جی۔ انہوں نے خود اپنا موبائل نمبر دیا ہے۔"

"بتاؤ۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور اس کی بیٹی اسے پروفیسر اطہر کا موبائل نمبر بتانے لگی تھی جسے کرنل رحیم شاہ نے نوٹ کر لیا۔ ان دنوں وہ دارالحکومت میں ہی تھا اور گرین ہاؤس میں گرین فورس کے درمیان ایک دلچسپ وقت گزار رہا تھا۔ ویسے پچھلے دنوں جو وارداتیں ہوئی تھیں وہ بھی اس کے لیے دلچسپی کا باعث تھیں اور اب وہ پوری طرح ان کا تجزیہ کر رہا تھا اور ان کے بارے میں اپنے طور پر رپورٹیں تیار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پروفیسر اطہر سے رابطہ قائم کیا۔

"میں کرنل رحیم شاہ بول رہا ہوں۔"

"اوہو..... کرنل براہ کرم ایک پانچ منٹ صبر کر لو لیکن اپنا موبائل آن رکھنا میرے موبائل کی سی ایل آئی پر تمہارا نمبر موجود ہے۔ میں پانچ منٹ کے بعد تمہیں رنگ کرتا ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے موبائل آف کر دیا اور پھر ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے پروفیسر اطہر کا فون موصول ہوا۔

"جی کرنل....."

"کیسے ہو پروفیسر۔ بہت عرصے کے بعد میری یاد آئی۔ خیریت۔"

"بالکل خیریت نہیں ہے۔ میں ایک انتہائی اہم اور سنگین قومی مسئلے پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے فوری طور پر وقت دو جب میں تمہیں تفصیل بتاؤں گا تو تم اس بات کو تسلیم کرو گے کہ فوراً ہی تمہارا مجھ سے ملنا بہت ضروری تھا اور بات انتہائی غیر معمولی ہے۔"

"ٹھیک ہے جگہ بتاؤ۔"

"میں بہت پریشان بھی ہوں اور یوں سمجھ لو کہ کچھ ایسے جرائم پیشہ لوگوں کی نگاہوں میں ہوں جو بے حد خطرناک ہیں اور مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر تم ایسا کرو کہ آدھے گھنٹے کے بعد گھر سے باہر نکل آؤ۔ لٹی آرکیڈ نام کی عمارت راکسن روڈ پر ہے جانتے ہو اس کے بارے میں۔"

"اچھی طرح....." پروفیسر کی آواز سنائی دی۔

"لٹی آرکیڈ میں ایک بہت بڑا شوروم رابرا سٹور کے نام سے ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ اور سیدھے مینیجر کے کمرے میں پہنچ جاؤ۔ وہاں سے تمہیں پک کر لیا جائے گا۔"

"مینیجر کو میرے بارے میں علم ہوگا؟"

"ہاں بالکل مطمئن رہو۔"

"اوکے۔" پروفیسر نے جواب دیا اور کرنل رحیم شاہ نے موبائل بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے صوفی کو موبائل پر کال کی اور کچھ لمحوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

"کہاں ہیں صوفی صاحب؟"

"گرین ہاؤس کے گیٹ پر درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے فوراً ہی جواب دیا۔

"کیا.....؟"

"جی ہاں گرین ہاؤس کے سامنے ہوں۔"

"بھئی واہ! آپ تو اللہ دین کا جن ہو گئے۔ آیئے آپ کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"بہ سر و چشم..... بہ سر و چشم حاضر ہوئے۔" صوفی نے کہا اور کچھ دیر بعد وہ کرنل رحیم شاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔

"صوفی صاحب آپ ایسے ہی ادھر آ رہے تھے یا کوئی کام تھا؟"

"نہیں مجھے حاضری دینا تھی۔ کچھ رپورٹیں تھی ہمارے پاس۔"

"ٹھیک ہے آیئے پھر تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد چلنا ہے ہمیں۔"

"شکریہ۔" صوفی نے کہا اور سامنے بیٹھ گیا۔

"کہیے کیا رپورٹیں ہیں؟"

"وہی لوگ مدنگاہ ہیں درویشوں کی دعاؤں سے جو بے چارے گوشت پوست کا جسم چھوڑ کر اپنی وجود اختیار کر گئے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں اس وقت اہم ترین مسئلہ یہی ہے۔"

"یہ لوہے کا وہ ٹکڑا ہے جو ان کے وجود کا ایک حصہ ہے۔" صوفی نے جیب سے لوہے کا ٹکڑا نکال کر کرنل رحیم شاہ کے سامنے رکھ دیا اور کرنل رحیم شاہ کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

"یہ..... یہ آپ کو کہاں سے حاصل ہوا؟"

"ایس پی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کون ایس پی.....؟"

"ایس پی جمشید مرزا۔"

"اوہو اس نام کا تذکرہ آپ مجھ سے کر چکے ہیں۔"

"جی ہاں۔ بڑے پر مذاق آدمی ہیں۔ اکثر مذاق فرماتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کر رکھی ہے۔" صوفی نے کہا اور مختصر الفاظ میں کرنل رحیم شاہ کو جمشید مرزا کے بارے میں اور لوہے کے اس ٹکڑے کے حصول کے بارے میں بتانے لگا۔ کرنل رحیم شاہ جیسا سنجیدہ آدمی بھی ہنس پڑا تھا۔

"بھئی صوفی صاحب یہ شازیہ، غلام قادر، دلاور وغیرہ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے بتا رہے ہیں کہ آپ کی شخصیت میں ایک اہم تبدیلی رونما ہو چکی ہے اور آپ کے اندر جارحیت بیدار ہو گئی ہے۔ آپ کے اس عمل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"حضور من! ہمیں انسانیت کی فہرست سے خارج کیوں کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر ہم بھی حس لطیف رکھتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس لطافت اور ظرافت کو ہماری ذات سے الگ کر دینا ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔"

"ارے نہیں..... نہیں۔ یہ مقصد نہیں ہے۔ ایس پی جمشید مرزا تو سخت ناراض ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ سرکاری پیمانے پر ایک توپ منظور کرا رہے ہوں گے کیونکہ اس سے کم ہمیں وہ سزا نہیں دے سکتے۔ توپ کے دہانے سے باندھ کر ہمیں ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہوں گے۔ ان کی کاوشیں یہی بتا رہی ہیں البتہ یہ حسینہ عالم جو آپ نے ہمیں تحفتہً مرحمت فرمائی ہیں، ہمیں خطرہ ہے کہ کسی دن جمشید مرزا پر حملہ آور نہ ہو جائیں اور باقاعدہ پولیس کیس نہ بن جائے۔"

"واقعی صوفی صاحب سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے اندر اس قدر حسن ظرافت ہوگی۔ چلیے فکر نہ کریں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دیکھ لیتے شاہ میر صاحب زندہ باد۔ اچھا اب یہ بتایئے کہ اس میں سے آپ نے کوئی نتیجہ اخذ کیا؟"

"ہم کیا نتیجہ اخذ کرتے البتہ ہم نے اس کا لیبارٹری میں تجزیہ کرایا ہے اور مکمل رپورٹ یہ ہے کہ یہ صرف لوہے کا ایک ٹکڑا ہے اس کا کوئی ماضی نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی طرح کے کسے مادے کی آمیزش پائی گئی ہے۔"

"بابا یہ سائنسی باتیں ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اچھا خیر چھوڑیئے اس وقت ذرا ایک اہم شخصیت کے تحفظ کی بات آ گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہم اسے گرین ہاؤس تک لے آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" صوفی نے یہ سوال تک نہیں کیا تھا کہ یہ اہم شخصیت کس کی ہے۔ کرنل رحیم شاہ کو اس کی بہت ساری عادتیں بے حد پسند تھیں۔ ان میں سے ایک یہ عادت بھی تھی۔ صوفی سے اس نے ایک بار سوال کیا تھا تو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ سر کہ اعتماد بہت بڑی چیز کا نام ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کیا ہے اور اسی اعتماد کے رشتے پر چل رہے ہیں۔ جس دن یہ رشتہ ختم ہوا ہم ایک دوسرے سے صورت آشنا بھی نہ رہیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔ تھوڑی دیر کے بعد کرنل رحیم شاہ اور صوفی مطلوبہ جگہ جا رہے تھے۔ غلام قادر، شازیہ اور دلاور کو ایک دوسری کار میں خاص قسم کی ہدایات دے کر لایا جا رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ رابرا سٹور سے واپسی پر اگر ان کا تعاقب کیا جائے تو تعاقب کرنے والوں کا نہ صرف رستہ روکنے کی کوشش کی جائے بلکہ ان میں سے کسی ایک کو زخمی کر کے قبضے میں لے لیا جائے۔ یہ مخصوص ہدایات دینے کے بعد ان لوگوں کو ساتھ آنے کے لیے کہا گیا تھا اور وہ دوسری کار میں تعاقب کر رہے تھے۔ کار صوفی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آخر کار وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ یہاں رابرا سٹور نامی شوروم تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں کرنل رحیم شاہ نے اپنے شناسا شوروم مینیجر کو ہدایات دے دی تھیں۔ یہ لوگ رابرا سٹور میں داخل ہو گئے۔ صوفی اس وقت پوری طرح چوکنا نظر آ رہا تھا۔ وہ کرنل رحیم شاہ کی حفاظت کر رہا تھا جو اپنی بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا مینیجر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ یہاں پروفیسر موجود تھا۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی اور مینیجر اس سے بہت اچھی طرح پیش آ رہا تھا۔ چنانچہ پروفیسر اطہر کرنل رحیم شاہ سے گلے ملا۔ کرنل رحیم شاہ نے مینیجر کا شکریہ ادا کیا۔ مینیجر نے اسے بھی چائے کی پیش کش کی تھی لیکن کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"نہیں ڈیئر توفیق بعد میں۔ اس وقت اجازت دو اور ہاں سنو میں نے خاص طور سے رابرا سٹور کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ تمہارے ہاں پچھلا دروازہ بھی موجود ہے۔ ہم پچھلے دروازے سے باہر جائیں گے۔"

"ٹھیک میں کھلوائے دیتا ہوں، وہ ایمرجنسی ڈور ہے۔"

"بالکل ٹھیک اسے ایمرجنسی ہی تصور کرو۔" صوفی باہر نکل کر کار پچھلی گلی میں لے آیا۔ اس نے شازیہ اور گرین فورس کے باقی دونوں ممبرز کو مستعد دیکھا تھا۔ کرنل رحیم شاہ پروفیسر اطہر کے ساتھ پچھلے دروازے سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گیا اور کار گرین ہاؤس کی جانب چل پڑی۔ ان لوگوں نے ایک دوسری کار کو اپنے تعاقب میں دیکھ لیا تھا جس میں شازیہ وغیرہ موجود تھے۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر گھوما جائے گا اور اس کے بعد گرین ہاؤس کا رخ کیا جائے گا۔ راستے میں کرنل رحیم شاہ نے پروفیسر اطہر سے پوچھا۔

"آپ کی کار کہاں ہے؟"

"میں نے بھی اسی طرح اپنے گھر کا عقبی راستہ اختیار کیا تھا اور اپنی کار میں نہیں بلکہ ٹیکسی میں یہاں آیا تھا۔"

"گڈ....." اس کا مطلب ہے کہ تعاقب کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"پھر تھوڑی دیر کے بعد کرنل رحیم شاہ نے شازیہ سے رابطہ قائم کیا اور شازیہ نے فوراً ہی فون ریسیو کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا پوزیشن ہے؟"

"نہیں سر۔ دور دور تک کسی کے تعاقب کا شبہ نہیں ہے اس سے زیادہ محتاط طریقہ کار کوئی اختیار نہیں کر سکتا۔

"او کے۔ اب ہم گرین ہاؤس کا رخ کر رہے ہیں۔ پروفیسر اطہر کو گرین ہاؤس لے آیا گیا۔ ابھی تک کرنل رحیم شاہ نے اس سے کسی سنگین صورت حال کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بہرحال وہ لوگ گرین ہاؤس کے مخصوص کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں صرف صوفی اور کرنل رحیم شاہ نے پروفیسر سے گفتگو کی۔ رحیم شاہ نے مختصر الفاظ میں صوفی کا تعارف کرا دیا تھا۔ پروفیسر اطہر نے کہا۔

"میں ایک بہت ہی سنگین صورت حال سے دوچار ہوں۔ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ پچھلے دنوں کچھ عجیب و غریب واقعات ہوئے ہیں۔ بینک لوٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہاں ایک ڈاکو لاوے کی طرح سرخ ہو کر پگھل کر بہ گیا ہے۔ بات...... مذاق معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا پس منظر مضحکہ خیز نہیں ہے اور بھی چند واقعات ہوئے ہیں جن میں ایسی ہی صورت حال پیش آئی ہے مثلاً ایک شخص رانا سرکار اور دوسرا......"

"کیا تمہیں اس بارے میں کوئی معلومات حاصل ہیں پروفیسر۔" کرنل رحیم شاہ نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"نہ صرف معلومات بلکہ جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ میں ایک سنگین صورت سے دوچار ہو چکا ہوں، لیکن یہ بالکل اتفاق ہے کہ ایک حادثہ اس صورت سے بچاؤ کا ذریعہ بن گیا۔ کرنل رحیم شاہ آپ میرے دوست بھی ہیں اور بہرحال میری گڈ بک پر بھی ہیں۔ بے شمار بار اپنے اسٹوڈنٹس کو پڑھاتے وقت میں نے آپ کی محب وطن شخصیت کا ذکر کیا ہے اور ان سے یہ کہا ہے کہ کرنل رحیم شاہ میرا آئیڈیل ہے۔ بے لوث، بے غرض، محب وطن۔ کرنل کچھ عرصے قبل میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے میں زندگی تو بچ گئی لیکن مجھے ایک عجیب و غریب قوت حاصل ہو گئی۔ اب تک اس قوت سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا لیکن لگتا ہے قدرت نے مجھے ان ہی لمحات سے دوچار ہونے کے لیے یہ قوت بخشی تھی۔ اس وقت سے میرا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذہنی قوتوں سے پوری طرح واقف ہوں جو حصہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے میں جانتا ہوں وہاں سے کیا کیا، کیا جا سکتا ہے، بہت دن سے میں اسی سوچ میں تھا کہ اپنے دماغ کے دونوں حصوں سے میں الگ الگ کون سے فائدے اٹھا سکتا ہوں۔ کوئی ترکیب تو سمجھ میں نہیں آ سکی تھی لیکن بہرحال میں سوچتا ضرور تھا۔

یہ واقعات جو مجھے پیش آئے ہیں بڑے سنسنی خیز اور حیران کن ہیں۔ کرنل مجھے اغوا کر لیا گیا۔ طریقہ کار بہت عجیب و غریب تھا۔ اپنی حماقت سے میں ایلیٹ نامی ایک لڑکی سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا اور وہی لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک عمارت میں گئی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ سے ملانا چاہتی ہے۔ وہاں مجھے ایک بہت مکروہ اور بدشکل شخص ملا، جس نے اپنا نام مجھے شانیکو بتایا اور مجھ سے کہا کہ وہ ایک عظیم سائنٹسٹ ہے۔ وہ شخص ایلیٹ نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے دولت کے انبار لگانا چاہتا ہے۔ وہ ایک سائنٹسٹ ہے۔ اس نے ساری تفصیل مجھے بتائی اور مجھ سے کہا کہ وہ میرے دماغ میں ایک مائیکرو چپ فٹ کرنا چاہتا ہے جس سے وہ مجھے اپنے طور پر تمام ہدایات دے سکتا ہے۔ وہ مجھے بہت سے معاملات میں استعمال کرنا چاہتا تھا جس میں شاید بینکوں کو لوٹنا بھی شامل ہے اور کچھ ایسے کام بھی جن کے

بارے میں میری شخصیت پر کوئی شبہ نہ کیا جا سکے اور میں وہ کام کر ڈالوں اور سرکاری طور پر یہ بات تسلیم ہی نہ کی جائے کہ ایسا کوئی کام نیک نام پروفیسر اطہر نے کیا ہے۔ وہ میری نیک نامی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے مفلوج کر دیا تھا اور اسی کیفیت میں اس نے میرا آپریشن کیا اور وہ مائیکرو چپ میرے دماغ میں فٹ کر دی۔ وہ اپنے فن کا ماہر ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں ڈبل برین ہوں۔ اس نے میرے دماغ کے جس حصے پر مائیکرو چپ فٹ کی ہے وہ تو اس کا مطیع ہو گیا ہے لیکن دوسرا حصہ آزاد ہے اور اس آزاد حصے سے میں اپنے طور پر ہر بات سوچ سکتا ہوں اور وہ مائیکرو چپ متحرک نہیں ہو گی۔ بس اسی سے فائدہ اٹھا کر میں نے تم سے رجوع کیا ہے۔ مائیکرو چپ دماغ میں فٹ ہو جانے کے بعد مجھے اس شخص کی مکمل تفصیل معلوم ہو چکی ہے کیونکہ وہ سب کچھ اس کی یادداشت میں موجود ہے، وہ ایک عظیم سائنس داں تھا لیکن انتہائی حد تک بدصورت ہونے کی بنیاد پر اسے جگہ جگہ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں وہ کوئی نمایاں حیثیت نہیں حاصل کر سکا اور بہت سی دکھی کیفیتوں کا شکار رہا۔ مطلب یہ کہ اسے اپنی زندگی کا ناکام ترین انسان کہا جا سکتا ہے، لیکن پھر ایلیٹ نامی لڑکی نے اس کے دل میں تحریک پیدا کی اور وہ زندگی کی جانب راغب ہو گیا۔ اسے ایلیٹ کا مستقبل بنانے اور سنوارنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس نے اس پر کام شروع کر دیا۔

چنانچہ اپنے طور پر اس نے ہمارے وطن کا انتخاب کیا۔ عقل کے اندھے مغربی شاطر یہ سوچتے ہیں کہ ایشیا میں بے وقوفوں کی بھرمار ہے اور یہاں آ کر وہ ہر طرح کی من مانی کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں انہیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس شخص نے بھی یہاں آنے کے بعد ہمارے شہر کے مغربی حصے کے پہاڑی سلسلے میں غاروں کے اندر اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا اور وہاں کچھ سائنسی مشینیں نصب کر دیں جو اس کی اپنی ایجاد کردہ ہیں اور ان مشینوں کے ذریعے وہ عجوبے وجود میں آئے یعنی انسانی جسم کا پتھرا جانا اور پھر پگھل کر بہ جانا یہ عمل ہوا ہے۔ وہ اپنے طور پر بڑے معمولی انداز میں یہاں رہتا ہے لیکن اس کی فطرت میں تھوڑی سی دیوانگی ہے۔ ایلیٹ کے سوا شاید اسے دنیا میں کسی سے دلچسپی نہیں ہے اور وہ ایلیٹ ہی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ بڑی عجیب و غریب اور مکروہ شخصیت ہے اس کی۔

بہرحال اس نے اپنی دانست میں مجھے مکمل طور پر ٹرانس میں لے لیا ہے۔ خدا کے فضل سے میرے دماغ کا یہ دوسرا حصہ میرا اپنا ہے اور مائیکرو چپ اس حصے پر اثر انداز نہیں ہو سکی ہے چنانچہ میں اس کے ذریعے آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ اب بتائیے میری ڈیوٹی کیا ہے؟"

"صوفی پروفیسر اطہر کی یہ کہانی حیرت اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ خود کرنل رحیم شاہ کی عجیب و غریب کیفیت تھی اور وہ بار بار صوفی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ صوفی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے ذہن کے دوسرے حصے سے کام لے کر اسے شکست دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔ قدرت نے شاید وہ حادثہ اسی لیے کیا تھا کہ اس طرح میں اپنے وطن کے لیے کچھ کر سکوں۔"

"آپ یقینی طور پر اس کی نشان دہی بھی کر سکتے ہیں۔"

"سو فی صدی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس وقت آپ کے ذہن پر اس کا کنٹرول نہیں ہوگا۔"

"نہیں۔ چونکہ میں اپنے دماغ کے دوسرے حصے کو استعمال کر رہا ہوں۔"

"تب براہ کرم اس کے بارے میں ہمیں ساری تفصیلات فراہم کر دیجیے۔" صوفی نے کہا اور پروفیسر اطہر انہیں مکمل تفصیل بتانے لگا۔ صوفی باقاعدہ یہ تفصیل تاریخ پر نوٹ کر رہا تھا۔

♥.....♥.....♥

شاہ میر خان نے بھرپور مدد کی تھی۔ باقاعدہ فوجی حکام سے رابطے قائم کیے گئے تھے اور انہیں ساری صورت حال بتائی گئی تھی چنانچہ انتہائی خاموشی کے ساتھ رات کو پانچ ہیلی کاپٹر کمانڈوز کے ساتھ ان پہاڑیوں میں اتر گئے تھے جہاں غاروں کے اندر ایک عجیب وغریب مشینی نظام قائم کیا گیا تھا اور یہ بات تعجب خیز تھی کہ کسی غیر ملک میں اور وہ بھی دارالحکومت کے قریبی علاقے میں اس طرح کی مشینری نصب کر لی گئی تھیں۔ پھر جب شائیکو کی رہائش گاہ پر چھاپہ مارا گیا تو وہ ایلیٹ کے قدموں میں بیٹھا ہوا اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ صوفی، کرنل رحیم شاہ اور بریگیڈیئر آفاق احمد نے اس گھر پر ریڈ کیا تھا۔ شائیکو مسلح افراد کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایلیٹ بھی سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی شائیکو زمین پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا اور ان لوگوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اس نے اس طرح لیٹ کر اپنے آپ کو گول کر لیا تھا جیسے کوئی چیز فولڈ کر دی جاتی ہے اور پھر اپنی جگہ سے اچھلا تو چھت سے ٹکرایا تھا۔ بہ ظاہر اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ششدر کر کے نکل جانے کی فکر میں تھا لیکن جب وہ پھرکی کی طرح گھوم کر کھلا اور دروازے کی طرف لپکا تو صوفی نے بڑے اطمینان سے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی گردن اپنی گرفت میں لے لی اور ایک دم سے گھوم کر اسے زمین پر دے مارا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

"حق اللہ۔ تم بہت بڑے فن کار ہو شائیکو، لیکن درویشوں کے کش میں بڑی قوت ہے۔ ایک بار پھر شائیکو نے پلٹ کر اپنی ٹانگیں صوفی کی گردن سے لپیٹیں اور طاقت صرف کرنے لگا لیکن صوفی نے اسے زمین پر رگڑ دیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کی کھال چھل گئی۔ ایلیٹ بے اختیار چیخنے لگی تھی لیکن اسے بھی بازوؤں سے پکڑ کر دبوچ لیا گیا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"نہیں..... نہیں..... چھوڑ دو اسے، وہ بہت اچھا انسان ہے۔ پلیز چھوڑ دو اسے..... اس نے زندگی میں کچھ نہیں پایا، چھوڑ دو اسے پلیز۔" لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد صوفی کے رگڑوں نے شائیکو کو بے سدھ کر دیا۔ بریگیڈیئر کرنل رحیم شاہ سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کا ساتھی باکمال شخصیت کا مالک ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبدہ گر نے ہم لوگوں کو تو حیران ہی کر دیا تھا۔"

"جی ہاں۔ اصل میں اس سے بڑا شعبدہ گر اس کے سامنے تھا۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

♥.....♥.....♥

وزارت داخلہ نے خصوصی طور پر کرنل رحیم شاہ کی گرین فورس کو سرکاری محکمے میں جگہ دی تھی اور اس کے لیے ایک خصوصی گرانٹ منگوائی تھی۔ چنانچہ اب گرین فورس کے تقریباً اخراجات حکومت برداشت کر رہی تھی حالانکہ کرنل رحیم شاہ نے شاہ میر سے کہا تھا کہ وہ اور صوفی یہ تمام کاوشیں ایک محب وطن کی حیثیت سے کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں جو ٹیم تشکیل دی گئی ہے وہ بھی اسی جذبے سے مالا مال ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا تھا۔

"شاہ میر اصل میں انسان کو اگر اس کی محنت کا صلہ مل جائے تو میرے خیال میں تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے اور کسی کو اگر زندگی کا تحفہ ملے تو تم خود بتاؤ کہ اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوتا ہے۔ مجھے فوجی ذمے داری سے وقت سے پہلے رہا کر دیا گیا کیونکہ میرے اندر ایک کمی پیدا ہو گئی تھی۔ یقین کرو شدید غم کا شکار تھا لیکن میرا عزم مردہ نہ ہوا۔ میں نے اپنی جدوجہد کے لیے ایک راستہ منتخب کیا اور درحقیقت وہ شعر اچھا تو لگتا ہے جو مجھے یاد نہیں ہے یعنی یہ کہ کارواں بنتا گیا، شاید وہ ہے کہ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر ہم سفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا، شاید ایسی ہی کوئی بات ہے لیکن مجھے صوفی کی شکل میں جیسی شخصیت ملی ہے تمہیں اس کا اندازہ ہے بس اسی کی بنا پر گرین فورس تشکیل دے سکا ہوں ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ میں اس قدر فعال نہیں ہوں کہ ہر طرح کی بھاگ دوڑ کر سکوں لیکن صوفی کو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

"واقعی کمال کی شخصیت ہے مگر میرے دوست یہ جو کچھ تمہیں سرکاری طور پر مل رہا ہے ناں ظاہر میں اپنی جیب سے نہیں دے رہا اور نہ ہی یہ ان کاوشوں کا صلہ ہے۔ اب ذرا غور تو کرو کیا خوف ناک صورت حال تھی لیکن صوفی نے سنبھال لی۔ کوئی معمولی بات ہے۔ کتنی خاموشی سے ایک خوف ناک مجرم کو ختم کر دیا گیا۔ خود میری بھی زبردست عزت افزائی ہو رہی ہے اگر اتنا سا کام ممکن ہو سکا تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم ان لوگوں پر جو بھی اخراجات کر رہے ہو کرتے رہو۔ تھوڑی سی کوشش سے جو کچھ انہیں حاصل ہو رہا ہے اسے جاری رہنے دو۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔" کرنل رحیم شاہ مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا اور شاہ میر نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کرنل رحیم شاہ ایک خالص فوجی ہے اگر انکار پر تل جاتا تو پھر اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال شاہ میر کو بھی دلی تقویت حاصل ہو گئی تھی اور محکمہ فورس میں وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنا سکتے تھے کیونکہ محکمے میں ایسے لوگوں کی کمی ہی ہوا کرتی ہے جو پوری طرح اپنی ذمے داریاں سرانجام دے سکیں۔ نااہلیت اس دور کی سب سے بڑی لعنت ہے اور دنیا جانتی ہے کہ یہ لعنت کس طرح مسلط ہو چکی ہے۔

♥.....♥.....♥

چھٹی کا دن تھا۔ صوفی ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ باورچی خانے سے حسینہ کی ہانڈیاں بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی کے کمرے میں آئی۔ صوفی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ حسینہ نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔

"مر گئے۔" صوفی نے چونک کر حسینہ کو دیکھا اور بدن کو چادر سے ڈھکنے لگا۔

"بلی کا لونچ اکثر میں نے دیکھا ہے تم چوری چھپے آتی ہو اور اگر میں سو رہا ہوتا ہوں تو مجھے گھورتی ہو۔"

"جھاڑو پھرے تمہاری شکل پر اگر کبھی صبح ہی صبح جاگ جاتے ہو تو آنکھیں بند کیے کیے پھرتی ہوں کہ کوئی اور صورت نظر آ جائے تو اچھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلی شکل تمہاری دیکھ لوں اور اس کے بعد دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھر مصیبت میں گرفتار رہوں اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں جھانکنے آتی ہوں۔ اے میں کہتی ہوں کہ کبھی کسی سوئے ہوئے گدھے کو دیکھا ہے تم نے جس کے جسم کی کھال اتر گئی ہو۔"

"خیر میں نے مرے ہوئے گدھے کو دیکھا ہے یا نہیں ہے لیکن بہ خدا کالی بلی سے میں بھی بہت ڈرتا ہوں اور تم نے یہ تو بڑے مزے کی بات کہی یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم میری صورت دیکھنے سے بچتی ہو اور میں تمہاری صورت دیکھنے سے بڑا پریشان کن مرحلے پر آ جاتا ہوں۔ اگر تم ایسی صورت میں نظر آ جاؤ۔"

"اب مرو گے یا نہیں.....؟"

"تم پر تو کبھی نہیں مروں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس بھول میں کبھی مت رہنا۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں.....؟"

"کس پر مرنے کی بات کر رہی ہو کالی بلا۔" صوفی کو درحقیقت حسینہ کے ساتھ اس چھیڑ چھاڑ میں خاصا لطف آنے لگا تھا۔ حسینہ اسے گھورتی رہی پھر ایک دم ہنس پڑی۔

"اماں کا کیا نام تھا تمہاری.....؟" اس نے سوال کیا اور صوفی اس سوال سے چکرا گیا۔ یہ سوال ذرا انوکھا اور اجنبی تھا۔

"مطلب کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"تمہیں نہیں بتاؤ..... بتاؤ۔" اب فضول باتیں کیے جا رہی ہو یا کچھ چائے وغیرہ لاؤ گی۔"

"یہی دیکھنے تو آئی تھی کہ اگر زندہ ہو تو چائے کا پوچھ لوں گی۔ دوپہر ہونے والی ہے، کھانا بھی پکانا ہوگا۔"

"تم پر بھی درویشوں کی مار حسینہ بیگم کھانے میرے لیے پکاتی ہو یا اپنے لیے۔ اول تو میں کبھی گھر میں کھاتا ہی نہیں ہوں اور اگر کھاتا بھی ہوں تو دو چار لقمے اور تم اہتمام ایسے کرتی ہو جیسے پتا نہیں کیا میرے لیے دیگ پکا رہی ہو۔"

"دیگ تو خیر میں تمہارے چالیسویں پر ہی پکاؤں گی۔ میں خود بھی یہی کہتی ہوں کہ پتا نہیں کہاں کہاں کتوں کی طرح منہ مارتے پھرتے ہو۔ گھر میں کچھ کھاؤ تو میں کچھ پکاؤں۔"

"تمہیں پکانا آتا ہی کیا ہے جو کبھی گھر میں ڈھنگ سے کھاؤں۔" صوفی کو بھی ایک مشغلہ ہی ملا تھا۔ حسینہ ہر نئی مرچ سے زیادہ تیز تھی اور بہر حال صوفی کی زندگی میں یہ ایک انقلاب تھا ورنہ ممن خان والی گلی میں دوست تو بہت سے تھے لیکن چونچیں لڑانے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ کرنل رحیم شاہ کا بھی ایک طرح سے شکر گزار تھا کہ اس نے کم از کم زبان کی تیزی کا معقول بندوبست کر دیا تھا اور صوفی حسینہ بیگم سے خوب مزے لیتا تھا۔

"بہر حال حسینہ چلی گئی اور صوفی اٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے اسے ممن خان کے ہاں جانا تھا۔ بلاوا آیا تھا معشوق نشیلے کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ گلی میں چندہ ہو رہا ہے تاکہ عرس کا بندوبست کیا جا سکے۔ بہت دن سے صوفی نے ایسی کسی چیز میں حصہ نہیں لیا تھا چنانچہ یہ فیصلہ کر کے کہ عرس کا بہترین انتظام کرے گا۔ وہ تیاریاں کرنے لگا۔

♥.....♥.....♥

ہاشم درانی اپنی شان دار لینڈ کروزر سے نیچے اتر گیا۔ ملاقات ذاتی ہی سہی لیکن وزیر داخلہ کی

رہائش گاہ کی سیکورٹی اپنی جگہ تھی۔ ہر شخص کو ان مدارج سے گزرنا ہوتا تھا جو سرکاری نوعیت کے تھے۔ ہاشم درانی کو بہر حال تمام تر مراحل سے گزرنے کے بعد ہی شاہ میر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونا نصیب ہوا تھا البتہ شاہ میر نے اسے انتظار نہیں کرایا تھا بلکہ جیسے ہی شاہ میر کے سیکرٹری نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی شاہ میر اندرونی کمرے سے باہر نکل آیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ہاشم درانی سے گلے ملا۔

"یار اب تو یہ حسرت ہی رہ گئی دل میں کہ جس طرح ہم لوگ اسکول اور کالج میں ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے اسی طرح دوبارہ بھی تم سے ملاقات ہو سکے۔"

"میں شرمندہ ہوں مگر تھوڑی سی غلطی تمہاری بھی ہے۔ مجھے بلا لیتے تو میں اس سیکورٹی کے بغیر تمہارے پاس حاضر ہوتا۔ اب یہ یہاں کی روایات میں سے ہے تو میری بھی مجبوری ہے۔"

"مذاق کر رہا ہوں تم تو سنجیدہ ہو گئے۔" ہاشم درانی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اور ہاشم درانی بیٹھ گیا۔

"اکیلے ہو۔" یہ سوال کر کے دل نہیں دکھاتے تم میرا۔

"نہیں یار میرا مطلب ہے کوئی ساتھ نہیں آیا تمہارے۔"

"نہیں۔ ایک اہم مسئلے میں تمہارے پاس آیا ہوں اس لیے ناظمہ کو بھی ساتھ نہیں لایا حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ میرے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہے۔"

"کیسی ہے؟"

"شکر ہے خدا کا ٹھیک ہے۔"

"معاف کرنا ذاتی سا سوال ہے اس کے لیے جو مخالفتیں ہو رہی تھیں جاری ہیں یا....."

"کسی کی مجال ہے، میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر ناظمہ کے خلاف کسی کے منہ سے ایک لفظ نکلا یا کسی کے ردعمل میں کوئی خرابی آئی تو وہ کوئی بھی ہو کم از کم میرے گھر میں وہ اس کا آخری دن ہوگا۔"

"خدا تمہیں اس کا اجر دے۔ بہت اچھے انسان ہو یہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اصل میں ناظمہ درانی، ہاشم درانی کے بھائی کی بیٹی تھی اور ہاشم درانی کا بھائی عادل درانی بہت بری فطرت کا مالک شخص تھا۔ اس نے ہاشم درانی کے خاندان کو شدید ترین نقصان سے دوچار کیا تھا۔ یہاں تک کہ ہاشم درانی کی بیوی عالیہ درانی عادل درانی کے ہاتھوں ہی ماری گئی تھی۔ گو وہ ایک حادثہ تھا لیکن ہوا عادل درانی کے ہاتھوں سے تھا۔ نہ صرف عالیہ درانی بلکہ عادل درانی کی اپنی بیوی بھی اسی حادثے میں عالیہ درانی کے ساتھ ماری گئی تھی اور اس وقت ناظمہ جو عادل درانی کی بیٹی تھی صرف چھ سال کی تھی خود ہاشم درانی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور اہل خاندان میں سے بہت سے لوگ ساتھ رہا کرتے تھے۔

بہر حال عادل درانی یہ حادثہ کرنے کے بعد فرار ہوا اور ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ سارا خاندان اس بات پر اتفاق کرتا تھا کہ ناظمہ جو عادل درانی کی بیٹی تھی اسے گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ لیکن ہاشم درانی نے اس سلسلے میں بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور بچی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد سے بے چاری ناظمہ درانی پورے خاندان کی نفرتوں کا شکار رہی۔ اسے ہاشم درانی کی شفقت ہمیشہ حاصل رہی۔ ہاشم درانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اسے اپنی سیکرٹری بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ناظمہ نے ہاشم درانی کے ہر لمحے کو سنبھال رکھا تھا اور واقعی ہاشم درانی اس وقت اس کا اس طرح مقروض ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتا تھا اور یہ بات اس کے بہت سے قریبی دوستوں کو معلوم تھی اور شاہ میر بھی اس کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک تھے۔ دونوں نے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی ہاشم درانی چونکہ ایک بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ بڑی جاگیریں تھیں اس کی وہ تو اپنی منصب پر نکل گیا اور شاہ میر نے اپنی ذمے داریاں سرکاری محکمے میں سنبھال لیں اور ترقی کرتے کرتے وزارت داخلہ تک پہنچ گیا۔ ہر چند کہ ہاشم درانی ایک بزنس مین تھا اور بڑی کامیابی سے اپنا بزنس چلا رہا تھا لیکن اس کی فطرت میں بھی مہم جوئی اور آوارہ گردی موجود تھی چنانچہ آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکا تھا۔ بزنس کے معاملے میں بھی اسے اس آوارہ گردی سے بڑے فائدے حاصل ہوئے تھے۔ یہ تھی ہاشم درانی کی شخصیت اور اس وقت وہ شاہ میر کو اطلاع دے کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے شاہ میر سے یہی کہا تھا کہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جس کے لیے اسے کچھ وقت درکار ہے۔

ابتدائی گفتگو اور ہلکی پھلکی خاطر مدارات کے بعد ہاشم درانی نے کہا۔

"میں جانتا ہوں شاہ میر کہ تمہارا وقت بے حد قیمتی ہے اور میں اس قیمتی وقت میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہا تھا جس کی بنا پر میں بات کو ٹالتا رہتا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں انتہائی خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔"

"خطرات....."

"ہاں یہ ضروری ہے کہ میں تمہیں وہ پوری تفصیل بتاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ تم بھی دلچسپی سے سنو اور اگر تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تم اپنے قیمتی وقت میں سے مجھے وقت نہیں دے سکو گے تو یقین کرو کہ میں برا مانے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ یہ میرے لیے ایک اہم معاملہ ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

"ارے..... ارے خود بہ خود مفروضات کا شکار ہو کر غصے میں آ رہے ہو۔ ارے بھائی میں نے کہا کہ میں مصروف ہوں اور تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم اگر چاہو تو میں چوبیس گھنٹے تک اسی جگہ بیٹھا ہوا تمہاری باتیں سنتا رہوں اور تم سے باتیں کرتا رہوں۔ یہ کیا بات کہی تم نے یار۔ اب وقت اتنا ناسازگار بھی نہیں ہو گیا ہے۔ نہ میرے لیے اور نہ تمہارے لیے۔"

"شکریہ۔ اصل میں بس یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم کسی مشکل میں دوسرے کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں۔"

"میں دوسرا نہیں ہوں اور اب یہ باتیں کیے بغیر اصل موضوع پر آ جاؤ۔"

"شکریہ لاؤ پھر مشروب کا ایک اور گلاس مجھے دو۔" ہاشم درانی نے شاہ میر کی باتوں سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور شاہ میر اپنے دوست کی دل جوئی کرنے لگا۔ مشروب کے گھونٹ لیتے ہوئے ہاشم درانی اس طرح خاموش ہو کر غور کرتا رہا جیسے گزرے ہوئے واقعات مجتمع کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

"تقریباً گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے یہ تو تمہارے علم میں ہے کہ میں کبھی بزنس ٹور پر اور کبھی اپنی

فطرت کے مطابق دوسرے ملکوں میں بھی جاتا رہتا ہوں، وہاں کی مختلف تفریحات میں بھی حصہ لیتا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں اور ان تفریحات کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔" شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گیارہ مہینے پہلے کی بات ہے کہ میں ہانگ کانگ میں تھا اور اس وقت میں ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا کہ ایک دبلا پتلا آدمی میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ یہ ہانگ کانگ کا مقامی آدمی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور وہ چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ تھوڑا سا اندازہ تو مجھے یہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ آدمی مجھے غلط سمجھا تھا۔ اس نے جیب سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر میز کے نیچے سے میرے گھٹنوں پر رکھ دیا اور آہستہ سے بولا کہ۔

"میں خطرے میں ہوں تم اس لفافے کو ڈی آر پہنچا دینا۔"

"اس نے مجھے تاکید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لفافہ ہر قیمت پر ڈی آر پہنچ جانا چاہیے پھر اس سے قبل میں اس سے کچھ کہتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس شخص کی خوف زدہ شکل اور اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو واقعی خطرے میں محسوس کر رہا ہے۔ یہ خطرہ کیا تھا اور اسے کون سی مشکل پیش آنے والی تھی۔ اس کا ذرہ برابر مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بات بہت ہی حیرت انگیز تھی۔ بہرحال میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس شخص کے پیچھے نکل کر بھاگنا میرے لیے ممکن نہیں تھا، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہوا کیسے ہے اور ڈی آر کیا چیز ہے۔ میں بہت دیر تک حیران حیران سا بیٹھا رہا اور پھر ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے لفافہ جیب سے نکالا۔ لفافے پر کئی سیلیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اسی حالت میں رکھ دیا اور دوسرے دن میں نے اپنی کوشش کے مطابق ڈی آر کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن انتہائی چھان بین کے باوجود مجھے یہ نہیں پتا چل سکا کہ یہ ڈی آر کون ہے۔ سرکاری محکمات کے بارے میں بھی میں نے اپنی صلاحیت سے کام لے کر معلومات حاصل کیں لیکن ڈی آر نام کی کوئی چیز اس میں موجود نہیں تھی۔ آخر کار میں نے تنگ آ کر اس لفافے کو کھول ڈالا اور اس میں رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ ان کاغذات میں کسی شمیان ہوہو کے بارے میں تفصیل درج تھی۔ ان میں کچھ تجارتی قسم کے کاغذات بھی تھے لیکن تجارت کی نوعیت بڑی سنسنی خیز تھی۔ شمیان ہوہو کا نام جگہ جگہ دہرایا گیا تھا۔ کاغذات مختلف زبانوں میں تھے۔ میں پوری طرح انہیں سمجھ نہیں سکا تھا البتہ ایک نیا نام مجھے اور معلوم ہوا تھا ڈی آر کے علاوہ اور یہ تھا شمیان ہوہو۔ بعد میں میں نے شمیان ہوہو کے بارے میں چھان بین کی اور مجھے بہت کچھ معلوم ہوا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شمیان ہوہو کون ہے اور کہاں ہے؟ وہ ایک آفاقی قسم کا جرائم پیشہ آدمی تھا اور اس کے ایجنٹ آئے دن گرفتار ہوتے رہتے تھے لیکن ان ایجنٹوں میں سے بھی کوئی شمیان ہوہو کا صحیح پتا نہ بتا سکا۔ اس کے علاوہ ایک اور انوکھی بات مجھے معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ شمیان ہوہو ایک روایتی نام ہے اور ہانگ کانگ کی قدیم تاریخ میں یہ نام اسی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ تقریباً کئی سو سال سے یہ نام زندہ تھا۔"

"واہ..... زبردست۔ شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہرحال کاغذات میری تحویل میں ہی رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ان کاغذات کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کاغذات ملنے کے چند ہی ماہ کے بعد وہ لوگ میرے پیچھے لگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے تھے اور اس قدر سنسنی خیز حالات ہوئے تھے کہ کئی بار انہوں نے مجھے پالیا وہ مجھے ہلاک کر سکتے تھے لیکن کاغذات کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے اور مجبوراً مجھے وہ کاغذات اس طرح چھپانا پڑے کہ انہیں دستیاب نہ ہو جائیں۔ پھر کتنی ہی بار وہ چوری چھپے میری قیام گاہ میں بھی داخل ہوئے لیکن انہیں کاغذات کی ہوا بھی نہ لگ سکی پھر اس کے بعد انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے دھمکیاں دیں اور دوسرے ذرائع سے موت کے نشانات بھیجنا شروع کر دیے۔ کبھی کسی اژدھے کی شکل میں، کبھی مڑے ہوئے خطرناک خنجروں کی شکل میں اور کبھی زہریلے تیروں کی شکل میں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بتایا جاتا رہا کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"وہ شخص کبھی دکھائی دیا جس نے کاغذات آپ کو دیے تھے۔"

"نہیں۔ وہ کبھی نہیں نظر آیا۔ میں جانتا ہوں شاہ میر کہ ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ میں کاغذات دیکھ چکا ہوں اور شمیان ہوہو کے بارے میں مجھے بہت سی تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے میں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی جدوجہد نہیں کی لیکن وہ لوگ صرف کاغذات کی وجہ سے مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں اگر کاغذات ان کے قبضے میں پہنچ گئے تو سب سے پہلا کام وہ یہ ہی کریں گے کہ مجھے ہلاک کر دیں گے۔"

"ہاں۔ اس بات کے امکانات تو ہیں۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں ان کاغذات کو واپس نہیں کرنا چاہتا ورنہ مجھے ان سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میں نے ایک سانپ کا سر پکڑ رکھا ہے اگر میں نے سانپ کا سر چھوڑا تو وہ پلٹ کر مجھے ڈس لے گا۔"

"کیا وہ کاغذات میں بھی دیکھ سکتا ہوں؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں کسی بھی قیمت پر سانپ کی گرفت ڈھیلی نہیں کروں گا؟"

"اچھا۔"

"نہیں۔ اپنے لہجے میں یہ کیفیت پیدا نہ کرو۔ میرے موقف کو سمجھو۔ ان کاغذات کو کسی بھی شکل میں منظر عام پر لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے علم میں آ جاویں۔ وہ اسی طرح میری نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ہوں۔ بات واقعی سنسنی خیز ہے۔"

"اس سارے معاملے کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میری کچھ مدد کر سکو گے؟"

"پولیس کی مدد لینا چاہو گے؟"

"یار دیکھو ٹالنے والی بات مت کرو۔ پولیس روایتی طریقے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے بھلا اسے کیا پڑی ہے کہ وہ سنجیدگی سے میرے اس مسئلہ پر کام کرے میں مارا جاؤں گا۔"

"ہوں..... اچھا..... اوہو..... اوہو۔" اچانک ہی شاہ میر کے منہ سے نکلا اور ہاشم درانی اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"خیریت۔ کیا بات ہے؟ کوئی کلیو ملا ہے کیا شمیان ہوہو کے بارے میں۔"

"نہیں شمیان ہوہو کے بارے میں تو کوئی کلیو نہیں ملا لیکن ایک شخص یاد آ گیا ہے۔ تمہارا کام بن گیا ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔" شاہ میر نے کہا اور ہاشم درانی غور سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"شاہ میر! دیکھو زندگی میں بہت کم میں نے دوسرے پر انحصار کیا ہے۔ ہر طرح کی مشکلات اور

تکلیفیں خود ہی جھیلتا رہا ہوں۔ یہ معاملہ میری زندگی اور موت کا ہے۔ اس بات پر میں بھی ہر مسلمان کی طرح عقیدہ رکھتا ہوں کہ موت آئی تو کوئی روکنے والا نہیں ہوگا لیکن پھر بھی انسان اپنے طور پر ایسی کسی موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ معاملہ اتنا غیر سنجیدہ نہیں ہے کم از کم میرے لیے۔"

"او بھائی تو کون یہ کہہ رہا ہے تم سے کہ وہ غیر سنجیدہ ہے۔ ایک کردار میرے ذہن میں آیا تھا جس پر مجھے بہت اعتماد ہے۔ میں اس بات پر چونکا تھا۔ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں کوئی مسخرہ پن کر رہا ہوں۔ میں ایک ذمے دار شخص ہوں اور مسخرے پن سے ملکوں کے داخلی معاملات نہیں چلتے۔ نہ جانے کیوں تم نے اس انداز میں سوچا۔" شاہ میر کا لہجہ بدستور ناخوشگوار تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے؟"

"میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔ ایک شخص کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں بہت جلد وہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا اس وقت تک تم اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔"

"ٹھیک ہے..... اوکے..... اوکے۔" ہاشم درانی نے کہا۔ شاہ میر نے بھی اپنا رویہ تبدیل کر لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ذہنی طور پر الجھے ہوئے اور پریشان ہو لیکن فکر مت کرو ایک انتہائی پر اعتماد شخصیت تمہارے پاس پہنچے گی تمہیں اس پر بھروسا کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ واقعی تم نے یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی کہ مسخرے پن سے ملکوں کے داخلی معاملات نہیں چلتے۔ اس بات پر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور میرا خیال ہے تم برا مان گئے میری بات کا۔ برا نہ مانو دوست! بس یہ سمجھ لو کہ ذہنی طور پر اتنا ہی الجھا ہوا ہوں کہ دل چاہتا ہے کہ کوئی میرا ساتھی بن جائے۔" شاہ میر نے اسے بڑی تسلیاں دی تھیں۔

♥.....♥.....♥

صبح ساڑھے سات بجے تھے ویسے تو صوفی بھی جلدی اٹھ جایا کرتا تھا لیکن حسینہ کی وجہ سے وہ جاگنے کے باوجود بستر میں پڑا رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حسینہ کو اس کی وجہ سے صبح ہی صبح تکلیف ہو۔ ویسے بھی وہ دیر تک سونے کی عادی تھی لیکن صوفی کی وجہ سے جلدی جاگ جاتی تھی اور ناشتہ بناتے ہوئے بک بک جھک جھک کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ بستر میں اینٹھ رہی تھی کہ دروازے کی بیل بج اٹھی اور حسینہ اچھل کر بیٹھ گئی۔

"یہ صبح ہی صبح کون آن مرا۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے انداز میں کہا۔ بیل دوسری اور تیسری بار بجی تو حسینہ زور سے چیخی۔

"آخری وقت آ گیا ہے کیا۔ موت پیچھے لگی ہوئی ہے۔ موت پڑے! ذرا صبر تو کر آ رہی ہوں۔"

صوفی نے بھی یہ آوازیں سنی تھیں لیکن منتظر تھا کہ حسینہ کی چیخ دھاڑ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کون نازل ہوتا ہے۔ ادھر حسینہ گیٹ پر پہنچ گئی تھی اور پھر اس کا پارہ آسمان کو پہنچ گیا کیونکہ جو شکل اسے نظر آئی تھی وہ معشوق نشیلے کی تھی۔

"اللہ توبہ..... اللہ توبہ..... ہائے یہ کیا ہو گیا۔ ارے کس کی شکل دیکھ لی میں نے صبح ہی صبح اے موذی تجھے کہیں اور رزق موت نہیں ہے یہاں کیوں آ مرا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس وقت منہ نہ لگو حسینہ بیگم۔ موڈ ٹھیک نہیں ہے میرا۔" معشوق نشیلے نے سنجیدگی سے کہا۔

"تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے تیرا موڈ ٹھیک نہیں ہے تو یہاں کیوں آ مرا؟"

"تمہارے باپ کا گھر ہے یہ کیا۔ جب دیکھو بدتمیزی کرتی رہتی ہو۔"

"تیرے باپ کا ہے؟" حسینہ نے کہا۔

"بابا ہٹ جاؤ سامنے سے صوفی صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ بات کرنی پڑے گی تمہارے سلسلے میں ورنہ میں ہوں ذرا بگڑے دماغ کا آدمی۔"

"تو آدمی ہے ہی کب۔ خبر کرتی ہوں ابھی سور ہے ہوں گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صوفی صاحب کو تم چار دن سے جانتی ہو ہم ان کے ہمیشہ کے شناسا۔ وہ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔"

"ارے اب تیرے منہ کیا لگوں۔ آ مر اندر آ جا۔" معشوق نشیلے اندر داخل ہو گئے۔ صوفی یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ بہرحال کچھ دیر کے بعد معشوق نشیلے اس کے پاس پہنچ گئے۔

"اتنی صبح واقعی کیسے آنا ہوا؟"

"مرشد! بس یوں سمجھ لیجیے کہ زندگی آپ کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔"

"درویش رحم کریں ہمارے ہاتھ تو خالی ہیں۔"

"نہیں مرشد! آپ کے ہاتھ خالی نہیں ہیں۔ آپ کی ولایت کو پہنچ گیا ہوں میں۔"

"اماں! کیا بک رہے ہو۔ ہم ولایت میں کہاں ہم تو اپنے وطن میں ہی ہیں۔"

"نہیں سرکار عالی! بس رات کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے۔"

"تاڑی پی تھی کیا صبح ہی صبح۔" صوفی نے پریشان لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں پیا۔ پیر گگن شاہ نے آپ کے نام ایک پیغام بھیجا ہے۔"

"پیر گگ..... گگ..... گگ۔" صوفی اچھل کر بیٹھ گیا۔

"بہ خدا آپ جانتے ہیں کہ پیر گگن شاہ کے نام سے کوئی جھوٹی روایت منسوب کرتا ہے تو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کوڑھی ہو جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہے ہیں کہ پیر گگن شاہ کا نام لے کر تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"خواب نہیں تھا۔ صوفی صاحب خواب نہیں تھا۔ جاگ رہا تھا۔ بالکل جاگ رہا تھا کہ آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا اور اس دھویں میں مردِ خدا کی تصویر نظر آئی۔ کہنے لگا کہ معشوق نشیلے کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ تمہارے سامنے ایک اتنی عظیم شخصیت موجود ہے اور تم نجات کے راستے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ جاؤ صوفی کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اماں تمہیں واللہ۔" صوفی اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر عقیدت کے نقوش نظر آ رہے تھے۔ حسینہ ابھی تک دروازے سے باہر نہیں گئی تھی دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور انہیں دیکھ رہی تھی جلبلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جھاڑو پھرے دونوں ہی باولے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ واپس مڑی تو صوفی نے جلدی سے آواز دی۔

"اب جاگ ہی گئی ہیں حسینہ بیگم! تو ذرا اچھا سا ناشتہ بنا دیجیے۔۔۔ یہ معشوق نشیلے بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔"

"گوبر میں زہر ملا کر لے آؤں۔ چائے کے ساتھ کھا لینا دونوں کے دونوں۔ خود بھی دنیا کے جھگڑوں سے بچو گے اور دوسروں پر بھی رحم کر جاؤ گے۔" حسینہ بیگم نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور معشوق نشیلے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں۔ آگے کہو۔"

"آگے کیا کہوں صوفی صاحب؟ پہلے یہ بتائیے کہ اس عورت سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"ار..... رر..... رشتہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ بس کرنل صاحب نے ہمیں یہ تحفہ عنایت فرمایا ہے۔"

"تب پھر تم ایسا کرو کہ کرنل صاحب پر شہد کی مکھیاں چھوڑ دو۔" معشوق نشیلے نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"آخر کیوں؟"

"اماں صوفی صاحب! یہ کالی مرچ گھروں میں رکھنے کے قابل ہے۔ صبح ہی صبح منہ دیکھ لو تو دن بھر روٹی نہ ملے۔ نخرے ایسے جیسے آکاش سے اتری ہوئی اپسرا ہو۔ جب یہاں آ گئیں سمجھ لو کہ گالی گفتاریوں سے ہی بات کرتی ہے آخر سمجھتی کیا ہے یہ اپنے آپ کو۔"

"چھوڑو گگن شاہ کا بتاؤ۔"

"وہی بتانے جا رہے تھے کہ یہ کم بخت گلے میں اٹک گئی۔ صوفی صاحب کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ ہمیں پھر دوش نہ دیجیے گا۔ بہرحال گگن شاہ صاحب نے ہم سے کہا کہ معشوق نشیلے دنیا میں بھٹکتا پھر رہا ہے نجات کی تلاش میں جا۔ صوفی کی شاگردی اختیار کر لے وہ جو کہے وہ کرتا رہ خبردار اس کا دامن مت چھوڑنا ورنہ نقصان اٹھائے گا۔"

"دد..... دد..... دامن۔" صوفی نے جلدی سے اپنی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔

"اب کتنا ہی اجتناب کریں ہم دردولت نہیں چھوڑنے کے صوفی صاحب۔"

"یعنی یہیں رہو گے؟"

"سڑک کے کتے کی طرح پڑے رہیں گے۔ یہ آپ کے در سے جائیں گے نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک..... ٹھیک ہے لیکن۔"

"بس صوفی صاحب..... بس کچھ نہ کہیے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔" صوفی گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ گگن شاہ سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا نام بھی وضو کر کے لیا کرتا تھا۔ بہرحال گگن شاہ کا حوالہ دیا گیا تھا۔ کیا کہتا کیا نہ کہتا۔ معشوق نشیلے کو پتا نہیں کیا سوجھی تھی۔ بہرحال اس کے بعد حسینہ نے ناشتہ لگا دیا اور دونوں گگن شاہ کی باتیں کرتے رہے پھر تھوڑی دیر کے بعد صوفی کو کرنل رحیم شاہ کا فون موصول ہوا۔

"صوفی صاحب جاگ گئے تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ......وہ......درویشوں کے کرم سے۔"

"ناشتہ وغیرہ کرلیا۔"

"جی ہاں۔"

"آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"گرین ہاؤس آجایئے۔"

"آ رہا ہوں۔" صوفی نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔ معشوق نشیلے نے کہا۔

"کہاں چلے صوفی صاحب۔ یہاں اگر آپ ہمیں چھوڑ جائیں گے تو یوں سمجھ لیجیے کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے کوئی خون نہ ہوجائے۔"

"جذباتی نہ ہوں آیئے ہمارے ساتھ۔" صوفی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ موٹر سائیکل پر معشوق نشیلے کے ساتھ گرین ہاؤس جا رہا تھا۔ دونوں دیکھنے کی چیز لگ رہے تھے۔ بہت لوگوں نے رک رک کر انہیں دیکھا تھا۔

"بہرحال کرنل رحیم شاہ نے کسی خاص کام سے ہی طلب کیا ہوگا۔ صوفی سوچ رہا تھا اور واقعی کام خاص ہی تھا۔ ایک نئی اور دلچسپ مہم کا آغاز۔

معشوق نشیلے موٹر سائیکل پر اسی طرح بیٹھے تھے جیسے کوئی شہسوار گھوڑے کی سواری کر رہا ہو۔ صوفی مخصوص سج دھج میں تھا۔ یہاں تک کہ دونوں گرین ہاؤس پہنچ گئے اور پھر موٹر سائیکل گرین ہاؤس میں پارک کردی گئی۔ اس وقت صرف دلاور کا خاندان اور خود دلاور یہاں موجود تھا۔ صوفی نے دلاور سے کہا۔

"عزیزی یہ معزز مہمان ہیں، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ کرنل صاحب کہاں ہیں؟"

"لائبریری میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں صوفی صاحب۔"

"آپ یہاں تشریف رکھیے معشوق صاحب۔ میں ذرا کسی سے مل کر آتا ہوں۔" معشوق نشیلے کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ بھی صوفی کا کوئی اور گھر ہے، وہ یہی سمجھا تھا کہ صوفی کسی سے ملنے آیا ہے۔ خود تو بے کار آدمی تھا۔ پیچھے لگا چلا آیا تھا۔ بہرحال صوفی تو اندر چلا گیا۔ دلاور اور معشوق نشیلے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

"سبحان اللہ کیا خوب صورت گھر ہے۔ آپ شاید یہاں ملازم ہیں۔"

"جی نوکر ہوں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کیا نام ہے آپ کا۔"

"دلاور۔"

"ارے واہ......فارسہ جانتے ہیں آپ؟"

"جی؟"

"زبان ہے ایک۔"

"فارسی کے بارے میں تو جانتا ہوں، فارسہ کا لفظ پہلی بار سنا ہے۔"

"بس یہی تو جدت ہے۔ اس جدت پر ایک شعر عرض ہے۔

گناہ چم گناہ چم در گناہ چم
بد سو مشکل بہر سو چم چما چم

"جی۔" دلاور نے بھنویں سکیڑ کر کہا اور کچھ لمحے کے بعد غلام قادر بھی اندر پہنچ گیا۔ اس نے معشوق نشیلے عالم کو تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پھر وہ دلاور سے بولا۔

"اڑے ماں قسم کتنے میں لیائی اچھا ہے۔" یہ سوال معشوق نشیلے کے بارے میں ہی کیا گیا تھا۔ دلاور کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"صوفی صاحب کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کے مہمان ہیں۔"

"اڑے ہاں باہر میں نے صوفی کا موٹر سائیکل دیکھا پڑ یہ مہمان اوہ ہو۔ ہو۔ صوفی صاحب نے اپنی نسل کا کوئی پیس منگوایا ہوگا ڑے۔ ابی سلاں ویلکم بھائی صاحب۔"

"یہ افریقہ سے کب آئے۔" معشوق نشیلے نے دلاور سے کہا۔

"اڑے ماں قسم اتنی فنٹی افریقہ کا ابی میں غلام قادر ہوں آپ کا نام۔" غلام قادر نے کہا۔

"فدوی کو معشوق نشیلے کہتے ہیں۔"

"اڑے آپ کو کیا کہتے ہیں فدوی کی بات چوڑو۔"

"میرا مطلب ہے میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔"

"پھر یہ فدوی کون ہے؟"

"آپ کی حسین اردو بتا رہی ہے کہ فدوی آپ کی سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔"

"اڑے یار تو پر......سی کا بات بولوتی۔ یہ پدوی اور فدوا کیا ہوتا ہے؟"

"فدوی اور فدوا، بکشتم ناز بردم چونا، چونا۔"

"وی اوکتا کتا کدرا سے توڑا سا اس میں تمبا کو کو بی مارو۔" غلام قادر نے اپنی طرف سے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"شاعری کا مذاق اڑا رہے ہیں آپ۔"

"نئی ڑے اپن خود بھی شاعر اے۔"

"اچھا کیا کہتے۔"

"ابی کچھ نئی کہتے یار۔ تیرے کو بتاتے ہیں کہ اپنی بی شاعر ہے۔ شعر ماروں۔"

"مم......مم......مار پیٹ مناسب نہیں ہوتی۔"

"وئی ہمارا مطلب ہے یار ابی تم نے کیا میرے کو شعر سنایا۔"

"فارسہ میں تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ۔ نکال کر باہر رکھو فارسہ سے ابی یہ میرا شعر سنو! وائی خدا قسم سیاں نے انگلی مروڑا اے، خدا کا قسم میں شرما گیا تم سناؤ، تم سناؤ۔"

"میں تو فارسہ ہی میں سنا سکتا ہوں۔"

"اڑے بابا فارسہ سے نکال کر سناؤ۔" دلاور ہنس رہا تھا پھر دونوں کے درمیان شاعری شروع ہوگئی۔ غلام قادر اپنی مخصوص اردو میں معشوق نشیلے صاحب کو شعر سنا رہا تھا اور معشوق صاحب ایسے ایسے انوکھے شعر ہانک رہے تھے جو شاید کسی کی سمجھ میں کبھی نہ آسکیں۔ غلام قادر بہ دستور ان کا مذاق اڑا رہا تھا پھر شازیہ بھی آگئی اور جیسے ہی شازیہ اندر داخل ہوئی۔ معشوق نشیلے اٹھ کھڑے ہوئے اور لکھنوی انداز میں اسے سلام کرتے ہوئے بولے۔

"آداب پیش کرتے ہیں آداب پیش کرتا ہوں۔"

"اڑے سیدھا بیٹھو۔ کھوتے کا بچے ابی جو کچھ پیش کرے گا اس کو دیکھ کر تم زبر ہو جائے گا۔ شازیہ کے منہ سے قہقہہ نکل گیا اس نے دلاور کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"صوفی صاحب کے ساتھ آئے ہیں، شاعر ہیں۔"

"بہ خدا آپ ہمیں کچھ غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ اس مناسبت سے ہم اگر آپ کو غنیمت کہیں تو کیا آپ ناپسند فرمائیں گی۔"

"سوچ لیجیے۔ خاموشی ہی غنیمت ہے ورنہ میں اسپتال سے بھاگ کر آ رہی ہوں۔" شازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اسپتال سے، خیریت دشمنوں کی نگاہوں سے دور کیا کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تھی۔"

"جی نہیں دماغی اسپتال کی بات کر رہی ہوں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔"

"پپ..... پپ..... پاگل۔" معشوق نشیلے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بچپن ہی سے اسے پاگلوں سے شدید خوف محسوس ہوتا تھا۔ اصل میں ایک پاگل نے پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ بس جب سے پاگل کے لفظ سے ہی اسے سخت وحشت ہوتی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"اب تو کوئی شعر بھی یاد نہیں آئے گا۔ وہ ذرا صوفی صاحب کو اطلاع کر دیجیے ہم کچھ حاجت محسوس کر رہے ہیں۔ ہم وہاں جاتے ہیں۔ آپ ذرا صوفی کو بتا دیجیے کہ معشوق نشیلے بور ہو گئے ہیں۔ انہیں تسلی عطا فرمایئے۔ وہ واش روم۔"

"آیئے۔ آیئے۔" دلاور نے کہا اور معشوق نشیلے کو لے کر واش روم کی طرف چل پڑے۔ شازیہ ایک دم چل پڑی تھی۔

"غلام قادر یہ ہے کیا چیز۔"

"بس اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ صوفی صاحب لائے ہیں۔" غلام قادر نے جواب دیا اور شازیہ دوبارہ ہنس پڑی۔

کرنل رحیم شاہ سے پوری تفصیل معلوم کرنے کے بعد صوفی سر ہلانے لگا۔

"دلچسپ صورت حال ہے میرا خیال ہے لطف آئے گا۔"

"آپ کی پسند کا کیس ہے۔"

"جانا کہاں ہوگا۔" صوفی نے سوال کیا۔

"سراج پور۔ ہاشم درانی بہرحال ایک بہترین شخصیت ہیں۔"

"سراج پور۔" صوفی انگلیوں پر کوئی حساب لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"سمجھ گیا درویشوں کی دعاؤں سے، اکیلا جانا ہے۔"

"یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں صوفی صاحب۔ بھئی آپ کی مرضی ہے۔ دیکھیے اور ایک بات خاص طور سے کہوں گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح سے آپ مطمئن رہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ویسے ٹیم تو ہماری جائے گی لیکن خفیہ طور پر تاکہ بہ وقت ضرورت ہماری مدد کر سکے البتہ ایک مسئلہ ٹیڑھا ہے۔"

"وہ کیا؟" کرنل رحیم شاہ نے سوال کیا تو صوفی بے اختیار مسکرانے لگا۔ کرنل رحیم بھی مسکرایا تو انہوں نے کہا۔

"یقیناً کوئی اتنی ہی اہم بات ہوگی کہ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔"

"آپ نے ہمیں حسینہ عنایت فرمائی ہے۔"

"ارے..... وہ، ہاں۔ بس یوں سمجھ لیجیے صوفی صاحب آپ کی تفریح طبع کے لیے، زبان کی بری ہے مگر دل کی بہت اچھی عورت ہے۔ اگر آپ اسے ہینڈل کر گئے تو آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

"بھلا ایسی معصوم اور ننھی سی جان کا ہمیں کیا کرنا ہے کرنل صاحب درویشوں کی دعاؤں سے، لیکن ہماری جو عزت افزائی کرتی ہے وہ بے مثال ہے بہرحال آپ کا تحفہ ہے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس کے لیے ایک تریاق دریافت کر لیا ہے۔"

"تریاق.....؟"

"جی ہاں۔ نام ہے معشوق نشیلے۔ فارسی کے بجائے فارسہ میں شاعری کرتے ہیں اور جب شاعری فارسہ میں ہو تو اس قدر آزاد ہوتی ہے کہ آپ شرم سے نظریں جھکا لیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

کرنل رحیم شاہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"تب تو دیکھنے دکھانے کی چیز ہوگی۔"

"جی ہاں۔ دیکھنے کی بھی اور دکھانے کی بھی۔ کسی وقت اس کی نمائش کریں گے، ویسے ہم ان دونوں ہی کو ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

"کک..... کک..... کیا.....؟" کرنل رحیم شاہ اچھل پڑا۔

"جی ہاں۔ ذرا تھوڑی سی دل لگی رہے گی۔ دل لگانے کے لیے دل لگی رہنا تو بہت ضروری ہے ناں.....؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ جیسا مناسب سمجھیں۔ ویسے ہاشم درانی کو بھی مزہ آجائے گا۔ میں نے اس سے کہہ بھی دیا ہے کہ ذرا خیال رکھے۔''

''جی۔ جی۔؟ میں بہ ذریعہ ٹرین ہی روانہ ہونا ہے، کیونکہ ان دونوں کو بھی لے جانا ہے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ صوفی صاحب آپ کے کسی مسئلے میں، میں نے تو ٹانگ اڑائی ہی نہیں ہے۔'' اس کے بعد صوفی دو دن تک تیاری کرتا رہا تھا۔ استاد معشوق نشیلے صاحب بھی بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ کیونکہ صوفی کی نئی کوٹھی ہی میں آگئے تھے۔ صوفی نے اک کمرہ انہیں دے دیا تھا۔ اسی میں قیام تھا۔ حسینہ کی اور معشوق صاحب کی ایسی چلتی تھی کہ صوفی کو کانوں کو ہاتھ لگانے پڑتے تھے۔ ویسے صوفی نے معشوق نشیلے صاحب سے کہہ دیا تھا۔

''دیکھیے استاد ایک بات ہم آپ سے عرض کردیں۔ حسینہ بیگم ہمارے ایک بہت ہی معزز کرم فرما کے لیے ایک محترم ہستی ہیں۔ انہیں کبھی ملازمہ نہ سمجھیے گا۔ عزت اور احترام سے بات کیجیے باقی جہاں تک ان کے اور آپ کے معاملات کا تعلق ہے تو بس اس قدر زچ نہ فرمایئے انہیں کہ ہاتھا پائی پر اتر آئیں۔ وہ ہمیں پسند نہ ہوگی۔''

''ارے جناب! صوفی صاحب! اتنی کرم فرمائیاں کی ہیں آپ نے کہ بھلا آپ کے کسی حکم سے سرتابی کی مجال کرسکتے ہیں؟'' ویسے وہ محترمہ سلور جوبلی ہمارے دل میں اترتی جارہی ہیں۔''

''آپ جانے اور آپ کا دل۔ ہم تو صرف یہی کہیں گے آپ سے کہ درویش آپ پر رحم کریں۔ پھر صوفی نے ان دونوں کو سفر پر جانے کی اطلاع دی تھی۔ حسینہ کو جب اس نے بتایا کہ اسے اس کے ساتھ چلنا ہے تو حسینہ نے شرما کر آنکھیں جھکالیں۔

''آخر خدا نے تمہارے دل میں ڈال ہی دی ناں۔''

''کک..... کک..... کیا؟''

''ہماری محبت۔''

''لل..... لل..... لاحول ولا قوۃ۔ درویشوں کی دعاؤں سے بھلا آپ سے بھی کوئی محبت کرسکتا ہے حسینہ عالم۔''

''چھوڑو آنکھیں کچھ اور کہہ رہی ہیں زبان کچھ اور یہ دورخی نہیں چلے گی میاں ہمارے ساتھ۔''

''بک..... بکواس بند کیجیے۔ آپ نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ کوّے پالنے کا شوق نہیں ہے مجھے محترمہ۔''

''کوّے.....؟''

''جی ہاں کوی کہہ لیجیے۔''

''مجھے کوی کہہ رہے ہو.....؟''

اور کسی دیوار کو کہوں گا۔

''واہ!..... جس طرح فارسی کو ہم نے فارسہ کیا، صوفی صاحب اس طرح آپ نے کوّے کو کوی

کردیا۔ ویسے اگر یہ لقب آپ نے ان محترمہ کو دیا ہے تو آپ یقین کیجیے کہ آپ پر ہزار بار قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔''

''اے مری کے لیے تیری قربانی تو میں کردوں گی..... میں کہتی ہوں کہ آخر آپ اسے لائے کیوں ہیں صوفی صاحب! کمبخت کو میرے ہی ہاتھوں مروانا ہے۔''

''آپ لوگ فضول باتوں سے پرہیز فرمائیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''لو اسے بھی چلنا ہے پھر کیا خاک مزہ آئے گا چنی مون میں۔''

''جج..... جج..... جی۔'' صوفی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر اچانک ہی اس نے لہجہ سخت کرلیا۔ پھر بولا۔

''دیکھو حسینہ یہ کرنل صاحب کا حکم ہے کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں۔''

''اور اس کے لیے کس کا حکم ہے۔'' حسینہ نے معشوق نشیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ آپ میری بات سمجھ لیجیے۔ آپ دونوں کو جس جگہ ہم لے جارہے ہیں وہاں اعتدال میں رہنا ہے۔ اگر کوئی بے تکی حرکت کی تو سمجھ لیجیے کہ آپ دونوں کی وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔''

''اف میرے مولا! کوئی خطرناک جگہ ہے کیا.....؟''

''تیاریاں کیجیے اور بکواس سے گریز کیجیے گا۔''

''آئے ہائے اتنی دیر سے احترام کر رہی ہوں اس خیال سے کہ سیر کرانے لے جارہا ہے۔ دھمکیوں پر دھمکیاں دیے جارہا ہے کرلے بات کرنل سے میں کسی کا دیا نہیں کھاتی۔ محنت کا کھاتی ہوں۔''

''ماشاء اللہ کیا محنت کرتی ہیں آپ زبان چلانے میں، کتنی محنت کرنا پڑتی ہے یہ کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔'' معشوق نشیلے کی زبان پھسلائی۔

''بس تیری تو میں.....'' حسینہ نے جھک کر پاؤں کی جوتی اٹھائی اور معشوق نشیلے باہر نکل بھاگے۔ حسینہ ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی تھی صوفی نے چھت کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''در..... در..... درویش رحم کریں۔''

♥..... ♥..... ♥

ہاشم درانی کے دونوں بھتیجے حسن اور نصرت ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کی آمد کے منتظر تھے۔ ان دونوں کو مختصر طور پر جو تفصیل بتائی گئی تھی۔ ہاشم درانی نے کہا تھا۔

''میں جس کام کے لیے گیا تھا۔ شاہ میر صاحب نے مجھ سے تعاون کرتے ہوئے کسی خاص شخص کو مخصوص کیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ سیکرٹ سروس کا کوئی آدمی تھا۔ ہوم سیکرٹ سروس میں ایسے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

بہرحال یقینی طور پر کوئی بڑی پرسنلٹی ہوگی، تم لوگ بڑے عزت و احترام کے ساتھ انہیں یہاں تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے آنا۔ دونوں راستے میں باتیں کرتے آئے تھے۔

"یار اس طرح کی شخصیتوں کے بارے میں فلمیں وغیرہ تو دیکھی ہیں۔ کبھی بہ ذات خود واسطہ نہیں پڑا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی اعلیٰ ہی پائے کی چیز ہوگی۔ اسمارٹ، شان دار دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھنے والی۔" یہ باتیں کرتے ہوئے وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تھے اور اب ٹرین کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ دونوں جوان خوش شکل، اسمارٹ اور تعلیم یافتہ تھے اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

"ٹرین کچھ لیٹ ہوگئی ہے شاید۔" حسن نے کہا۔

"ہاں۔ وقت تو ہو چکا ہے ٹرینیں وقت پر پہنچتی ہی کہاں ہیں؟"

"میں تو اس آدمی کے بارے میں سوچ رہا ہوں تمہیں مشن امپوسیبل یاد ہے۔"

وہ فلم تھی یار، میرا خیال ہے اس قسم کا آدمی کوئی چڑچڑا اور بد دماغ سا شخص تھا۔ سڑیل قسم کا بھی۔"

"مگر حالات واقعات بڑے سنسنی خیز ہیں چچا میاں جتنے پریشان ہیں تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔"

"میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ چچا جان نے اتنی دولت کیسے کمالی۔ ایسے لوگوں کو تو بہت اسمارٹ ہونا چاہیے۔ کوئی تک بھی ہے آخر۔ گھر میں بلیاں روئیں تو گھر میں کوئی نہ کوئی آفت ضرور آئے گی، الو کی آواز سن کر دم نکل جائے گا، اگر کھانا کھاتے وقت کسی نے پلیٹ میں چھری اور کانٹے کو کراس کر کے رکھ دیا تو بدشگونی، صبح ہی صبح اگر کوئی کانا آدمی نظر آجائے تو مصیبت، کہیں جاتے ہوئے بلی راستہ کاٹ جائے تو واپسی۔"

"ہاں۔ یہ واقعی تعجب کی بات ہے۔ انکل درانی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔"

"بس پرانے زمانے کی تعلیم میں بھی یہ سب کچھ سکھایا جاتا ہوگا۔"

"مگر وہ پرانے ہیں کہاں۔ سوائے پرانے خیالات کے۔"

"یہ ہی سہی۔ بہرحال یہ پرانے خیالات ہی پرانے لوگوں سے منتقل ہوتے ہیں۔ تیز قسم کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک پڑے۔ یہ ٹرین کی آمد کا اشارہ تھا۔ سراج پور ایک چھوٹا سا پہاڑی اسٹیشن تھا چنانچہ جدید ترین انتظامات تو یہاں تھے نہیں مسافروں کو ہوشیار کرنے کے لیے گھنٹی بجائی جاتی تھی۔ اس وقت بھی پورے پلیٹ فارم پر چند ہی افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں تیلی وردی والے خلاصی بھی تھے جو اتنی شان سے اکڑ اکڑ کر چلتے تھے جیسے وہ اسٹیشن ماسٹر سے بھی کوئی بڑی چیز ہوں کھانا فروخت کرنے والے اپنے جالی دار لکڑی کے صندوق جن کے اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔ مونڈھے سے اٹھا کر کاندھے پر رکھ کر چل پڑے۔ پان بیڑی سگریٹ بیچنے والے لڑکے نے جو اپنے منہ سے طبلہ بجا بجا کر ایک گیت گا رہا تھا اپنی ٹرے اٹھا کر گردن میں لٹکالی۔

ٹرین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم سے لگ گئی اور حسن اور نصرت دونوں گیٹ پر کھڑے ہوگئے تھے۔ ٹرین سے صرف تین افراد نیچے اترے حسن اور نصرت کی نگاہوں نے انہیں دیکھا پھر دوسرے ڈبوں کا طواف کرنے لگے۔ یہ تین تو نہیں ہو سکتے تھے جو ہاشم درانی کے مہمان تھے۔ یہ تو انتہائی فرسودہ قسم کے پرانے طرز کے لوگ تھے۔ دو افراد نے شیروانیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ایک کا تو حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چکی داڑھی، ترکی ٹوپی، پرانی شیروانی، کھلے پائچوں کا پاجامہ، ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی۔ منہ میں پان کی جگالی کرتا ہوا۔

دوسرے نے بھی شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی ہی پہن رکھی تھی۔ یہ بھی اپنی نسل کا انکوتا ہی لگتا تھا۔ تیسرے ایک خاتون تھیں جنہوں نے سر سے پاؤں تک والا سفید برقعہ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ دونوں مردوں نے اٹیچیاں اٹھا رکھی تھیں اور خاتون نے پان دان اٹھایا ہوا تھا جو نقشین تھا اور شاید تانبے کا بنا ہوا تھا۔

ٹرین یہاں صرف چار پانچ منٹ ہی رکتی تھی۔ ان چار پانچ منٹوں میں حسن اور نصرت ٹرین سے ایک سرے سے دوسرے تک نہیں نظریں دوڑاتے رہے مگر اور کوئی ٹرین سے نہیں اترا تھا۔ ان کی نگاہیں ان تینوں کا طواف کرنے لگیں۔ حسن نے کہا۔

"یہ کیا ہوا.....؟"

"پتا نہیں۔"

"کیا وہ لوگ نہیں آئے؟"

"انکل سے بات کریں موبائل پر۔"

"یہ تینوں۔"

"اے دماغ خراب ہے کیا، یہ کون سی نسل کے بکرے ہیں؟"

"یار مگر پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا؟"

"ٹھہرو ایک منٹ میں معلوم کرتا ہوں۔"

"دماغ خراب ہوا ہے نصرت کون آنے والا ہے تمہیں اس بات کا پتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر انکل کو فون کرنے سے پہلے کم از کم ان لوگوں سے بات ہی کر لی جائے۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ کرو۔" حسن نے منہ بنا کر کہا اور نصرت آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان تینوں کے نزدیک پہنچ گیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے کہا اور دونوں مرد چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ پھر انہوں نے سلام کا جواب بڑے احترام سے دیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔

"جی فرمایئے۔"

"آپ لوگ دارالحکومت سے آئے ہیں۔"

"درویشوں کے کرم سے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اصل میں ہم بھی یہاں کچھ لوگوں کی تلاش میں آئے ہیں جو دارالحکومت ہی سے آنے والے تھے۔ ہاشم درانی کے مہمان۔"

"بہ خدا ہم ہی ہیں وہ۔" یہ کہہ کر چکی داڑھی والا دونوں ہاتھ پھیلا کر نصرت کی طرف جھپٹا اور نصرت اچھل کر پیچھے اٹھ گیا۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا۔

"گلے نہیں ملیں گے عزیزی ہم ہی تمہارے مہمان ہیں۔"

"آپ کو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی ہاں۔ ہاشم درانی ہی کی طلبی پر یہاں بھیجا گیا ہے۔"

"اوہ آیئے۔"

"لیجیے یہ تھیلے سنبھال لیجیے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"فارسہ جانتے ہیں آپ۔" دوسرے صاحب نے سوال کیا۔

"کیا.....؟" نصرت بولا۔ اس دوران حسن بھی صورت حال کا جائزہ لے کر آگے بڑھ آیا تھا۔

"ہم نے عرض کیا آپ فارسہ جانتے ہیں؟"

"فارسہ.....؟"

"جی ہاں.....؟"

"جی نہیں، میں نہیں جانتا۔"

"مجبوری ہے پھر بھی ایک شعر حاضر ہے۔ کنا، کنم، کنی، کنے کنا کنوں کنام دم"

"دوسرا مصرعہ پیش ہے۔" اتنی دیر میں حسن قریب آ گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"یہی لوگ ہیں۔" نصرت نے کہا۔

"کیا.....؟" حسن کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تھیلے نہیں پکڑے آپ نے۔"

"جی نہیں۔ یہ آپ ہی پکڑیئے۔" دونوں کا موڈ خاصا خراب سا ہو گیا تھا۔ سوچ کر تو کچھ آئے تھے لیکن نکلا کچھ تھا۔ پھر راستے بھر ان کے منہ بنے رہے تھے۔ انہوں نے ان سے باقاعدہ تعارف کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کار پہاڑی راستوں میں چکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، لیکن جب ان کا شروع کا تاثر ختم ہوا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ صوفی تو بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، لیکن معشوق نشیلے پوری طرح ان کی جانب متوجہ تھے انہیں یوں لگا جیسے یہ دونوں ہنس کر ان کا مذاق اڑا رہے ہوں۔

چنانچہ انہوں نے بھی ایک جوابی قہقہہ لگا ڈالا۔ سب لوگ بے اختیار چونک پڑے تھے۔ حسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک بار پھر ہنس پڑا۔ اصل میں وہ سوچ رہا تھا کہ خاصی تفریح رہے گی۔ ہاشم صاحب ویسے بھی ایک تند مزاج آدمی تھے۔ ان کی جھلاہٹ قابل دید ہوگی۔ یہ معزز مہمان ان کے لیے بڑے شان دار ثابت ہوں گے اور وہ پاگلوں کی طرح سر پیٹتے پھریں گے ادھر نصرت بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہاشم جھلائے ہوئے ذہن کا مالک ہے اگر اسے کوئی بات دوبارہ دہرانی پڑتی تھی تو ان کا پارہ ہائی ہو جاتا تھا۔

چہ جائیکہ یہ تینوں۔ دفعتاً ہی ایک نسوانی آواز ابھری۔

"اے تیرا بیڑا غرق۔ تجھ سے آرام سے نہیں بیٹھا جاتا۔ چمٹا جا رہا ہے مری کالیا اے تو نے کبھی ماں بہنیں نہیں دیکھیں یہ دوسری مصیبت تھی۔ آواز شٹل کاک سے آئی تھی اور دھکا معشوق کو لگا تھا۔

"اے بی بی آپ درمیان میں آ کیوں بیٹھی ہیں۔ کالی منحوس شکل ایسے ہی موقعوں سے فائدہ آ ہیں۔ اماں صوفی صاحب اس بھوتنی کو ادھر کنارے پر بٹھا دو، بھیا گاڑی روک لیجیے ذرا سر پہ سوار

ہو جائے گی کالی چڑیل۔"

"اور تو منحوس مارے غارت ہو جائے خدا کرے، کہیں بھی چین نہیں لینے دیتا، اے تجھے بھی اس مردے کو ساتھ لانے کی پڑی ہوئی تھی۔ میں کہتی ہوں اس کا اچار ڈالے گا یہاں۔

"اس کا ڈال لینا کالی جامن کا۔" حسن اور نصرت حیرت سے منہ کھولے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی ہنسی گم ہو گئی تھی جیسے ہی وہ خاموش ہوئے ان کی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا اور اس کے بعد تو ان سے ہنسی روکے بغیر رک نہیں رہی تھی اسی طرح ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ گھر پہنچے تھے۔ ناظمہ کو تلاش کر رہے تھے۔ ناظمہ تو نظر نہیں آئی تھی سمیر مل گیا۔ دونوں نے کار سے اترتے ہی چھلانگ لگا دی تھیں اور سمیر کی طرف لپکے تھے۔ سمیر حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ناظمہ..... ناظمہ کہاں ہے ناظمہ۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اگر تم ہنس نہ رہے ہوتے تو میں یہی سمجھتا کہ ناظمہ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کیا ہوا، کیا ہو گیا بتاؤ تو سہی کچھ۔"

"وہ دیکھو، وہ دیکھو، وہ دیکھو۔" حسن نے اشارہ کیا۔ صوفی ایک طرف سے اور معشوق نشیلے دوسری طرف سے اتر آئے تھے جبکہ حسینہ بیگم ابھی کار میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفی نے انہیں بہ مشکل اتارا تو سمیر حیرت سے بولا۔

"یہ کیا لائے ہو تم؟"

"لاجواب چیزیں اور تین تین خدا کی قسم سراج پور کی کوٹھی میں بہار آ گئی ہے۔"

"بہار....."

"ہاں۔ قہقہوں کی بہار۔"

"اور یہ دونوں کون ہیں۔ ان بہار صاحبہ کے ساتھ۔" سمیر نے سوال کیا۔

"بہاری۔" حسن بولا اور ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔

"اب سنجیدہ ہو جاؤ اور بتاؤ قصہ کیا ہے؟"

"یار قصہ کیا ہونا تھا۔ یہی وہ مہمان ہیں جو دارالحکومت سے آئے ہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا تھا۔ بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم سب بات کر رہے تھے کہ انہیں وزارت داخلہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور یہ انکل کے معاملات کو دیکھیں گے۔"

"تو پھر....." حسن نے کہا اور ایک بار پھر ہنس پڑا۔

"نہیں ہنسو نہیں وہ انتظار کر رہے ہیں ان کا۔"

"چلو تو پھر لے کر چلو ان کو ہم تو پھر بعد میں باتیں کر لیں گے بلاوجہ انکل کا غصہ مول لینا پڑے گا۔" وہ تینوں ان تینوں کے قریب پہنچ گئے۔

"عجب سی بات ہے آپ لوگ وہاں پر جا کر لطیفہ گوئی فرما رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور ہم یہاں احمقوں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں۔ آپ احمقوں کی طرح تو نہیں کھڑے ہوئے احمقوں کے کھڑے رہنے کا تو انداز ذرا تبدیل ہوتا ہے۔ آیئے۔" نصرت نے کہا اور وہ تینوں چل پڑے پھر وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچے تھے جہاں ہاشم درانی بیٹھا ہوا انکا انتظار کر رہا تھا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اس نے انہیں دیکھا اور پھر چونک کر حسن نصرت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"انہیں آنے۔"

"یہی ہیں۔"

"کیا......؟" ہاشم درانی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھا اور پھر دونوں لڑکوں کی طرف سمیر پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ انہی سے پوچھ لیجیے۔"

"آپ لوگ دارالحکومت سے آئے ہیں۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"نہیں میرا مطلب ہے شاہ میر صاحب نے آپ......"

"جی ہاں ہمیں انہوں نے ہی بھیجا ہے۔" ہاشم درانی سکتے کے عالم میں کھڑا انہیں گھورتا رہا پھر ایک دم چونک کر بولا۔

"آپ تینوں...... تعارف نہیں ہوا آپ کا؟"

"خود بہ خود تو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ہوتا جناب عالی! آپ اگر حکم فرمائیں گے تو ہم اپنا تعارف پیش کر دیں گے...... درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کس کی دعاؤں سے۔"

"دو...... دو...... درویشوں کی دعاؤں سے جن کا سایہ اس کائنات کے سارے عیب ڈھکے ہوئے ہے۔"

"آپ یہاں کسی مذہبی پروگرام میں تشریف لائے ہیں۔"

"ہر پروگرام میں اگر مذہب کو شامل کر لیا جائے تو برکت ہی برکت ہوتی ہے۔ آپ کبھی قوالیاں نہیں کراتے اپنے گھر میں۔" ہاشم درانی کا پارہ چڑھ گیا اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب کراؤں گا۔ ذرا بات کر لوں شاہ میر صاحب سے۔" ہاشم درانی غصیلے لہجے میں باہر نکل گیا تھا۔ صوفی پریشان نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کچھ عجب رویہ نہیں ان لوگوں کا معقولیت سے خارج درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"ہائے ہائے تیرے درویش ارے اس سے زیادہ اور تمہاری عزت کیا ہو سکتی ہے موئے شکل سے جوکر لگتے ہیں۔"

"اور آپ جوکری۔" معشوق نشیلے نے کہا۔

"تو تو بس بولا ہی مت کر کوّے جیسی آواز ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کم از کم آواز تو تم سے میل کھاتی ہے۔"

"آیئے آپ لوگ آپ کو رہنے کی جگہ دے دی جائے۔" حسن نے کہا حالانکہ معزز مہمان کے لیے خوب صورت حویلی کے ایک بغلی حصہ میں ایک بہت اچھا کمرہ منتخب کیا گیا تھا اور اسے ہر طرح سے سجا دیا گیا تھا لیکن ہاشم درانی کا رویہ بھی دیکھ لیا گیا تھا چنانچہ لوگ انہیں حویلی سے باہر نکال کر مہمان خانے میں لے آئے جو ملازموں کے کوارٹروں کے نزدیک تھا اور ایک کمرے میں اپنی دانست میں تینوں کو ہانک دیا۔

♥......♥......♥

ہاشم درانی ایک ادھیڑ عمر کا قوی الجثہ اور پُر رعب چہرے والا آدمی تھا۔ مونچھیں گھنی اور نیچے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھیں۔ بار بار اپنے شانوں کو اس طرح جھٹکا دیتا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کا کوٹ کاندھوں سے ڈھلک کر نیچے آ جائے گا۔ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی۔ کم از کم ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے شانوں کو اس طرح ضرور جنبش دیتا تھا۔ وہ شدید غصے کے عالم میں ادھر آیا تھا لیکن ناظمہ نے دور سے اس کی کیفیت کو دیکھ لیا تھا۔ دروازے میں ناظمہ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے انکل؟"

"ایسی تیسی۔"

"جی۔"

"شاہ میر یہ مسخرے پن کرے گا مجھے پتا نہیں تھا۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟"

"دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟"

"وہ شاہ میر صاحب نے جس شخص کو بھیجا تھا۔"

"شخص نہیں اشخاص۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے...... انہوں نے۔" ہاشم درانی کوئی برا سا جملہ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش ہی ہو گیا۔

"آپ کیوں اتنے الجھے ہوئے ہیں۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ اتنا سنجیدہ مسئلہ تھا اور شاہ میر غیر سنجیدہ نہیں تھا۔ اس نے بڑی دل سوزی سے مجھ سے کہا کہ ایک ایسے آدمی کو بھیج رہا ہوں جس سے کام بن جائے گا۔"

"میں دیکھوں کہاں ہیں وہ لوگ۔"

"دیکھ لو بھئی۔ میرا تو دماغ بالکل ہی گھوم کر رہ گیا ہے۔" ناظمہ ان لوگوں کو دیکھنے چل پڑی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا یہ کہنے کی بات نہیں ہے۔ ناظمہ بھی ان تینوں کے ساتھ شریک ہو گئی تھی لیکن وہ تھوڑی سنجیدہ تھی۔ اس نے کہا۔

"دیکھو ایک بات میں کہوں جب تک انکل شاہ میر سے بات نہ کر لیں ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں ہونی چاہیے۔"

♥......♥......♥